ماہنامہ
نئے افق
کراچی
aanchalpk.com
aanchalnovel.com

''میرے خواب زندہ ہیں'' نادیہ فاطمہ رضوی کی قسط وار تحریر

''دل کے دریچے'' معروف مصنفہ صدف آصف کی قسط وار تحریر

''تیرے لوٹ آنے تک'' سلمیٰ فہیم گل کا منفرد ناولٹ

''آگئے چاہتوں کے موسم'' شازیہ مصطفیٰ کے قلم سے خوب صورت تحریر۔

حمیرا نوشین، فرحین اظفر، زینب اصغر مغل، حریم الیاس، ام ایمان قاضی، عالیہ حرا، سمیہ عثمان، شازیہ خان، نسیم سحر کی دل چھو لینے والی تحاریر

اس کے علاوہ مستقل سلسلوں میں پڑھیے

طب نبوی، آپ کی الجھن، بزم سخن، کچن کارنر، آرائش حسن، عالم میں انتخابات، شوخیٔ تحریر حسن خیال، شوبز کی دنیا، ٹوٹکے

بہنوں کی پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے اور بھی بہت کچھ

ماہنامہ نئے اُفق کراچی

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز
رکن چیمبر آف کامرس

NAEYUFAQ PUBLICATION

مدیر اعلیٰ: مشتاق احمد قریشی
مدیر: عمران احمد
مدیر معاون: اقبال بھٹی
مدیر منتظم: طاہر احمد قریشی
منتظم: نور الدین

پاکستان (فی پرچہ) ....50 روپے
پاکستان (سالانہ) ....600 روپے

اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242

جلد	40
شمارہ	02
جنوری	2015

aanchalpk.com
aanchalnovel.com
naeyufaqonlinemagzine
aanchalpk.com/blog
onlinemagazinepk.com/recipes
editorufaq@aanchal.com.pk

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

خط وکتابت کا پتہ "آنچل" پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون 021-35620771/2

فیکس: 021-35620773 ایک از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز ای میل info@aanchal.com.pk

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1

مشتاق احمد قریشی

یقیناً یہ بات درست ہے کہ ہماری دنیا کا سارا نظام اللہ رب العزت کے ہاتھ میں ہے ذرے ذرے پر اس کی حکمرانی ہے ایک پتہ تو پتہ ایک ذرہ بھی اس کی مرضی ومنشا کے بغیر نہیں حرکت کر سکتا۔ گزشتہ دنوں وطن عزیز میں بلدیاتی انتخابات ہوئے ہر طرف ہر طرح کی گہما گہمی دیکھی گئی۔ شاید پاکستان کی تاریخ کے پہلے الیکشن تھے جو کسی قدر ہی سہی سہولت سے ہوئے وہ خون خرابہ اور مار کٹائی جو اس سے قبل وطن عزیز میں رائج رہا اس بار ایسا کم ہی ہوا اور یہ تو ہمیشہ سے رہا کہ ہارنے والا امیدوار جیتنے والوں پر دھاندلی اور زبردستی کا الزام لگاتے ہیں بہت کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ ہارنے والے اپنی شکست کو تسلیم کر لیں۔

الیکشن دراصل ایک سیاسی دنگل کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ سیاسی پہلوان قومی وصوبائی اسمبلیوں کے لیے تو خود میدان میں اترتے ہیں لیکن بلدیاتی الیکشن میں اپنے پٹھوں کو آگے بڑھاتے ہیں کیونکہ بلدیاتی انتخابات تو براہ راست گلی محلوں کی سیاست اور کارکردگی کے معاملات سے متعلق ہوتے ہیں لوگوں کی شکایات براہ راست منتخب کونسلر تک پہنچتی ہیں، وہی ان کے ازالے کا بندوبست کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے یوں ممبر قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی تک نہ فریادی پہنچ پاتا ہے نہ اس کی فریاد۔ بلدیاتی انتخابات میں اس بار جو شفافیت کا عنصر نظر آ رہا ہے وہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے کیونکہ جو نظر آ رہا ہے ویسا ہے نہیں حکمرانوں نے اور مقتدر حلقوں نے جہاں جس کا بس چلا اس نے اپنی کی، لیکن ایسا پہلی بار ہوا کہ بلدیاتی انتخابات میں بڑی ہوشیاری بڑی خاموشی سے اور بڑے ہی سیاسی طریقے سے اپنی مرضی ومنشا کے مطابق نتائج حاصل کیے گئے بہت کم ایسا ہوا کہ نتیجہ خلاف توقع آیا ہو، سنا گیا کہ تمام بڑی اور اہم سیاسی جماعتوں نے پولنگ کا عملہ اپنے جاں نثار افراد ہی کو مقرر کیا گیا تھا الزامات چاہے جتنے بھی لگائے جائیں لیکن حقیقت یہ ہے اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے عزت عطا فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلت ورسوائی سے دوچار کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑا ہی مسبب الاسباب ہے وہ اپنی قدرت کے مظاہر کے لیے پہلے اسباب پیدا فرماتا ہے انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس نے اپنی عقل مندی، ہوشیاری، چالاکی سے میدان مارا ہے لیکن ایسا ہوتا نہیں، اس بار بلدیاتی الیکشن کے موقع پر بڑے بڑے تیس مار خان میدان میں تھے اور بڑے بڑے دعوے بڑے بڑے بول بول رہے

تھے لیکن آخر میں منہ کے بل زمین پر آ گرے۔ تمام بڑائی صرف اور صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات عالی شان کے لیے کل تو کل آنے والے لمحوں میں کیا ہونے والا ہے انسان تمام تر دعوؤں کے باوجود نہیں بتا سکتا لیکن اللہ جل شانہ کو سب پتا ہوتا ہے کب کہاں کیا کرنا ہے کیسے کرنا ہے وہ سب پر قادر ہے وہ جس سے چاہے جو کل لے سکتا ہے۔ تمام مخالفین کراچی میں خصوصاً متحدہ قومی موومنٹ کے خلاف بھرپور طریقے سے مہم جوئی میں ہی لگے ہوئے تھے بلکہ پر یقین تھے کہ وہ متحدہ کو زمین چٹا دیں گے لیکن ہوا اس کے برعکس کہ وہ سب کے سب خود ہی منہ کے بل گرے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس بار خلاف معمول متحدہ قومی موومنٹ نے اپنی سیاسی سرگرمیوں کا رخ تبدیل کر رکھا تھا بظاہر وہ جوش وخروش جو انتخابات کا خاصہ ہے وہ وہاں نظر نہیں آ رہا تھا بقول ان کے مخالفین کے رینجرز نے ان کی ہوا خراب کر رکھی تھی ان کے فعال کارکنان کی گرفتاریوں نے متحدہ قومی موومنٹ کو دیوار سے لگا رکھا تھا لیکن ہوا کیا الیکشن کے نتائج نے کچھ اور ہی منظر پیش کر دیا دراصل رینجرز کی تمام سرگرمیوں اور حکمرانوں کی الطاف حسین کے خلاف ایف آئی آر نے ان سے برگشتہ یا کسی قدر ناراض ووٹر کو بھی ایک بار پھر متحدہ سے اپنے اتحاد پر مجبور کر دیا اور سارا سیاسی منظر نامہ بدل کر رکھ دیا اگر ان حالات میں اس معاملے کو دیکھا جائے تو یہ اللہ کی حکمت اور جبکہ ان کے مخالفین کے مطابق اللہ کا عذاب ہے کہ متحدہ کے ہاتھ کراچی جیسے بڑے شہر کی باگ دوڑ ایک بار پھر آ گئی ہے۔ اس بار ایم کیو ایم نے انتخابات کی تشہیر ذرا مختلف انداز سے کی جوان کی سیاسی بصیرت اور دانش کا مظہر ہے تمام سیاسی جماعتوں نے اپنی جماعت کے تعلق کے حوالے سے اپنے نمائندگان کی تشہیر کو ضرور سمجھا جبکہ ایم کیو ایم نے اپنے امیدواروں کو پس پردہ رکھتے ہوئے صرف اپنے قائد اور اپنے انتخابی نشان کی تشہیر کی ان کی تشہیر کا انداز سب سے مختلف اور منفرد رہا شاید اسی وجہ سے ایک بار پھر بھرپور انداز میں منتخب کر لیا۔ اس بار یقیناً ان پر بڑی بھاری ذمہ داری کا بوجھ ان کے ووٹرز نے ان کے کاندھوں پر ڈال دیا ہے جس اعتماد کا اظہار ان کے رب نے ان کے ووٹرز کے ذریعے ڈالا ہے اسے وہ پوری ذمہ داری اور دیانت سے ادا کر کے دکھانا پڑے گا اور مخالفین کے تمام الزامات و خدشات کو شکست دینا ہوگی اپنا بھرم قائم رکھنا ہوگا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آگے آگے ہوتا ہے کیا۔

گفتگو

عمران احمد

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے ”اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں فکر سے، غم سے اور کم ہمتی اور کاہلی و بزدلی سے اور بخل و کنجوسی سے اور لوگوں کے دباؤ سے۔“ (البخاری و مسلم)

عزیزان محترم...... سلامت باشد

شروع کرتا ہوں اس ذات باری تعالیٰ کے نام سے جس نے انسان کو عقل وشعور اور تمام تر اختیارات کے ساتھ پیدا کیا تاکہ وہ اپنی زندگی کے فیصلے پورے شعور کے ساتھ کر سکے تاکہ وقتِ حساب وہ یہ نہ کہہ سکے کہ اس تک ہدایت نہیں پہنچی تھی یا اس میں بھلے برے کی تمیز کی صلاحیت نہیں تھی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو وسیلہ بنا کر پورا آئین انسانیت تک پہنچا دیا تھا کہ ہمیں کیسے زندگی گزارنا ہے۔ اس رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے قدم قدم پر زندگی کے ہر گوشے اور پہلو کے حوالے سے واضح کر دیا تھا انہوں نے واضح طور پر بتایا تھا کہ وہ ہم میں سے نہیں جن کے شر سے اس کا مسلمان بھائی یا پڑوسی محفوظ نہیں۔ انسانی جان کی حرمت کعبہ سے بھی زیادہ ہے اگر کوئی شخص رات کو بھوکا سو گیا تو اس کا جواب اس کے پڑوسی سے لیا جائے گا جیسی قوم ہوگی اس پر ویسے ہی حکمران مسلط کیے جائیں گے۔ اس سے آگے ہم کچھ نہیں کہیں گے۔ سوائے اس کے کہ فرصت کی گھڑیوں میں سے چند لمحے کشید کر کے ذرا اپنے حالات اور اردگرد کا جائزہ لے لیجیے آج جو کچھ ہمارے وطن عزیز میں ہو رہا ہے اس کے محرکات کیا ہیں اور ذمہ دار کون ہیں؟

ہم شکر گزار ہیں مولا کریم کے کہ نئے افق کے حوالے سے ہماری بلکہ پورے اسٹاف اور لکھاریوں کی کوششیں رنگ لا رہی ہیں۔ تبدیلی کا جو عمل ہم نے شروع کیا تھا اسے قارئین نے پذیرائی بخشی۔ اس ماہ برصغیر کی معروف ادیبہ اور شاعرہ محترمہ صدف اقبال جو کہ بھارتی ریاست بہار کے شہر گیا اور مہر افروز نے بھارت کی ریاست کرناٹک سے نہ صرف اپنا افسانہ بلکہ دیگر زبانوں میں تخلیق کیا جانے والا ادب بھی ترجمہ کر کے ارسال کیا ہے یہ تحریریں واقعی فن پارہ ہیں یہ تحریریں مدتوں یاد رہیں گی۔ ہمارے بہت سے قارئین نے نئے افق کے نام سے فین گروپ بنا رکھے ہیں جن کے ہم مشکور ہیں۔ ادارے نے بھی آفیشل گروپ تشکیل دیا ہے نئے افق، آنچل، حجاب کے نام سے۔ جس پر ایک شعر ایک کہانی کے عنوان سے مختصر کہانیوں کا مقابلہ شروع کرایا تھا اور کچھ تجربہ کار ادیبوں اور شاعروں کو جج مقرر کیا گیا تھا کہ وہ تین کہانیاں منتخب کریں۔ جنہیں نئے افق میں نیٹ کہانیوں کے عنوان سے شائع کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ بھی گروپ میں ہر ماہ ایک معروف لکھاری کا انٹرویو کا سلسلہ بھی شروع کیا ہے ان دونوں سلسلوں کی پہلی کڑی اس ماہ نئے افق میں شامل ہے۔ قارئین اس بارے میں اپنی رائے سے ضرور آگاہ کریں۔

اب آیئے اپنے محبت ناموں کی طرف۔

﴿اس ماہ کا انعام یافتہ خط﴾

علی حسنین تابش...... چشتیاں۔ محترم چیف ایڈیٹر، ایڈیٹر، تمام اسٹاف اور قارئین کو میرا اسلام عقیدت قبول ہو، ایک ماہ کا انتظار یوں گزرا کہ صدیوں سے وقت اک جگہ تھم گیا ہو، اک اک پل صدیوں برابر لگنے لگا

بالآخر اللہ اللہ کر کے 17 نومبر بھی آ ہی گیا اور انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں، نئے افق ماہ دسمبر ایجنسی کے کاؤنٹر پر اپنی دلکش آب وتاب کے ساتھ براجمان تھا سورج کی کرنوں میں چمکتا ٹائٹل دور سے ہی دھنک رنگ بکھیر رہا تھا اور یہ حسین منظر آنکھوں کو بھا رہا تھا۔ جلدی سے ایجنسی میں داخل ہوئے انکل سے سلام دعا کے بعد سب دوستوں نے نئے افق کا شمارہ خرید لیا۔ اپنی نظم او، لیٹر پا کر دل خوشی سے جھومنے لگا اور تمام دوستوں نے مبارکباد دی اور نظم پڑھ کر تعریفوں کے پل باندھنا شروع کر دیے مجھے بھی اک انجانی سی خوشی محسوس ہوئی۔ ایڈیٹر صاحب صدا خوش رہیں بہت شکریہ۔ ”دستک“ کے کالم میں لکھے گئے تمام الفاظ مانند پارس چمک رہے تھے۔ تمام الفاظ کا چناؤ اک گلدستہ سا محسوس ہوا جس سے بے خود کر دینے والی خوشبو آ رہی تھی اوہ، اپنی باتوں میں بھول گیا تمام قارئین، اسٹاف، ایڈیٹر اور چیف ایڈیٹر صاحب کو میری طرف سے نیا سال مبارک ہو، دعا ہے خداوند کریم اس سال میں ہمارے تمام غم دور فرمائے اور تمام امت مسلمہ کا دامن خوشیوں سے بھر دے آمین۔ سال 2015ء کو ہم بھول تو نہیں سکتے۔ ملک پاکستان پر بے شمار غموں کے پہاڑ ٹوٹے، سانحہ پشاور اک ایسا واقعہ جسے ہم عمر بھر نہیں بھلا سکتے۔ اک نیا پاکستان ایک عظیم گلستان کے پھول وکلیاں مرجھا گئے لیکن سیکڑوں ماؤں کے سپوت نور چشم چھن گئے خداوند کریم ان سب ماؤں کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین اور درحقیقت ان ماؤں کو ہم ایک عظیم ماں کا خطاب بھی دے سکتے ہیں جن کے لخت جگر جام شہادت نوش فرما گئے اور ان کا سر فخر سے بلند کر گئے کتنی خوش نصیب مائیں ہیں جن کے سپوت اس ملک پر قربان ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ خیر بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ دعا ہے کہ خداوند کریم اس سال میں سب کو خوشیاں دے، آمین اور اس ملک پاکستان کی حفاظت فرمائے۔ یہ نیا سال ایک خوشحال پاکستان کی نوید لائے۔ شرپسند عناصر کا خداوند کریم خاتمہ فرمائے، آمین۔ گفتگو میں بہت سے دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ سب کے لیٹر اچھے تھے خوب لکھا تھا سب دوستوں نے۔ مجید صاحب کیسے ہو بھائی۔ آپ کا لیٹر بہت اچھا تھا خوب الفاظ کا چناؤ کرتے ہوئے آپ، اور ہاں آپ سے اک بات پوچھنی ہے کیا آپ نئے افق میں بھی ہمیں کڑوے بادام ہی کھلائیں گے کہانیاں سب ہی اپنی مثال آپ تھیں، اک کہانی سے کچھ دل مطمئن نہ ہوا خیر اب کیا ذکر کرنا اس کا، رائٹر کی دل شکنی ہوگی لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ چھوڑنے کی بھی حد ہوتی ہے۔ نامعتبر، قلندر ذات، آگ کشکول، ناتمام عشق، کہانی کار اور تمام کہانیاں بھی خوب صورت تحریریں تھی، فن پارے اور خوشبوئے سخن بے حد خوب صورت سلسلے ہیں۔ خوشبوئے سخن میں ونر قرار پانے والی محترمہ کو دلی مبارک باد ہو، قبول فرمائیں۔ امجد جاوید صاحب کا نیا سلسلہ ”عورت زاد“ کا ایڈ دیکھ کر دل خوشی سے جھومنے لگا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ تمام شمارہ ہی اپنی مثال آپ تھا۔ خداوند کریم سے دعا ہے کہ نئے افق تاعمر بلندیوں کی منازل طے کرتا رہے آمین۔ حرف آخر سب کو سلام، اللہ نگہبان۔

مجید احمد جائی...... ملتان شریف۔ سلام، محبت وخلوص! سال نو مبارک! اللہ جی! یہ سال ہمارے لیے ڈھیروں خوشیاں، رحمتوں اور نعمتوں کا نزول لائے، پاک وطن میں امن قائم ہو اور محبت و بھائی چارہ کا نظام قائم ہو جائے۔ زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں، غموں کا دُور دُور تک نام ونشان نہ ہو، بیماریاں، سسکیاں، آہیں نہ ہوں، غربت، تنگدستی نہ ہو، غریب وامیر ایک صف میں کھڑے نظر آئیں، آنچل بے آبرو نہ ہوں، عزتوں کی نیلامی نہ ہو، جسموں کا کاروبار نہ ہو، والدین اولاد کے ہاتھوں ذلیل وخوار نہ ہوں، اساتذہ، شاگردوں سے چھپتے نہ پھرتے ہوں، کرپشن، رشوت، سود ختم ہو جائے، ہر سو امن ہی امن ہو، آمین ثم آمین! کیسے ہیں آپ سب،؟ نئے اُفق کی ٹیم، قارئین، لکھاری، اُمید ہے لبوں پہ مسکراہٹ، دلوں میں یاد خدا اور آنکھوں میں محبت لیے ہوئے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سبھی کو بیماریوں، پریشانیوں اور مصیبتوں سے محفوظ رکھے، امن کی زندگی جینے کی توفیق عطا

فرمائے اور دوسروں کے کام آنے کی لگن ہمیشہ رہے آمین ثم آمین۔! ماہ دسمبر کا 2015 کا آخری پرچہ بہت جلد مل گیا۔ نئے اُفق ہاتھوں میں سماتے ہی دل کو مسرور کر گیا۔ سرورق دیدہ زیب تھا۔ معصوم، سادگی میں لپٹی، سر جھکائے، کسی کے انتظار میں گم صم بیٹھی لڑکی بھلی لگی۔ اِس بار ٹائٹل نئے اُفق کے لیے جچ رہا تھا۔ سالگرہ نمبر...... واہ...... کس کی سالگرہ...... نئے اُفق کی یا......؟ اس کے اندر جو مواد شامل اشاعت تھا وہ سالگرہ نمبر کے حوالے سے بالکل نہیں تھا، نہ کوئی کہانی سالگرہ کی ملی، نہ کچھ اور دستک میں مشتاق احمد قریشی، پاکستان کے مکار دشمنوں کے حوالے سے دل گیر باتیں کر رہے تھے۔ واقعی سچ ہی کہتے ہیں۔ دُنیا کے کسی کونے میں کوئی دھماکا، خودکش حملہ ہو، الزام پاکستان پر آتا ہے۔ ابھی پیرس میں دہشت گردی کے جو واقعات ہوئے ہیں، بھارت نے فوراً پاکستان پر الزام تھوپ دیا۔ اِس کو شرم نہیں آتی اور افسوس طلب بات تو یہ ہے کہ ہمارے مسلمانوں نے فیس بک پروفائل پکچر میں فرانس کا جھنڈا لگا کر، اہل مسلم کے سر جھکا دیے ہیں۔ ان لوگوں کو فلسطین میں مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم نظر نہیں آئے، دُنیا کے کونے کونے میں مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹتے نظر نہیں آئے۔ کشمیر نظر آیا نہ فلسطین...... افسوس ہم مسلمان ہو کر مسلمان نہ رہے۔ گفتگو میں عمران احمد نے خوب فرمایا کہ ہم یہود و نصاریٰ کے آلہ کار بن کر ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں۔ محترم! حجاب مارکیٹ میں آ گیا مگر ملتان میں نہیں ملا۔ ریاض حسین قمر صدارت کی کرسی پر براجمان انعام یافتہ رقم سے مٹھائیاں تقسیم کرتے جا رہے ہیں اور گلاب جامن خود نوش فرما رہے ہیں...... واہ...... مبارک باد قبول کریں اور ہمارے حصے کی برفی کہاں گئی جناب اتنے اچھے الفاظ سے نوازا، ہم تو محبتوں کے مقروض ہو گئے، جیتے رہیں، سلامت رہیں۔ زبردست تبصرہ فرمایا۔ صائمہ نور شاندار انٹری فرما رہی تھیں، عمر فاروق ارشد، آپ سے رابطہ کر کے اچھا لگا، محمد یاسر، اشفاق شاہین، ساحل ابڑو، فلک شیر ملک، گل مہر، پیارے بشیر احمد بھٹی (کافی عرصے بعد نظر آئے) تبصرے خوب رہے، پیارے ممتاز احمد صاحب، آپ نے خوب فرمایا کہ خطوط، محبت نامہ ہوتے ہیں، دوستوں سے رابطہ کا ذریعہ ہیں، مگر کم عقلوں کو عقل نہیں آنے والی، منشی عزیز مئے زبردست تبصرہ فرماتے ہوئے ہمیں نہیں بھولے، نوازش۔ پیارے علی حسین تابش، ارے بھائی آپ ہماری دعوت پر نئے اُفق میں آئے دل باغ باغ ہو گیا۔ ریاض بٹ صاحب، بہت نوازش، محبتوں کا ثبوت دیا۔ اقراء میں طاہر قریشی (قرآن بتاتا ہے کہ اللہ کا قیام کہاں ہے) جامع اور واضح ترتیب دی، اللہ تعالیٰ سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ کاش! ہم رسول اکرم ﷺ کے اسوہ حسنہ پر عمل پیرا ہوتے۔ تو یوں ذلیل و خوار ہوتے، پچھلے دنوں فیصل مسجد کے دس دن مہمان ہوئے، دعوۃ اکیڈمی میں، وہاں جو مناظر دیکھے، دل خون کے آنسو روتا ہے، مسجد کے احاطے میں ہماری عورتیں، لڑکیاں، کھلے عام بیٹھی میک اپ کر رہی ہیں، نوجوان، مسجد میں بیٹھ کر فیس بک چلا رہے تھے کہ مسجد کے باہر سگنل نہیں آتے تھے، ہماری عورتیں عریانی، بے نام لباس کے ساتھ، ننگے سر مسجد میں گھوم رہی ہیں، جیسے مقدس مقام نہیں، تفریح گاہ اور وہاں میں نے ترکی کی لڑکیاں دیکھی جو مسجد کا وزٹ کرنے گئیں تو ان کے سر مکمل ڈھانپے ہوئے تھے۔ یہ ہے ہمارا حال، پھر کیوں نہ زلزلے آئیں، آفات کیوں نہ آئیں، یہ مناظر جو میں نے دیکھے، حالیہ زلزلے کے دوسرے روز کے ہیں۔ ہاں جی 27 نومبر 2015 کے۔ اللہ تعالیٰ سے ہمہ تن دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں صراط مستقیم پر چلائے آمین۔! کہانیوں کی وادی میں غوطہ زن ہوئے تو ''ناتمام عشق'' پڑھی، طنز و مزاح میٹھی چھری سے دلوں کو چیرتی تحریر تھی۔ لبوں پر مسکراہٹ سجی، لیکن ہمارے لئے لمحہ فکریہ بھی ہے، جس کی عکاسی، پیارے یاسین صدیقی بھائی نے تحریر کی صورت میں کر دی۔ ہمارے معاشرے میں ایسے بھی ہیں جن کو منہ دھونا نہیں آتا اور عشق فرما رہے ہیں۔ ''راہ شناس'' ایک بات کی سمجھ نہیں آئی سہیلہ کے وکیل نے بیٹی کہہ دیا تھا، مان لیا تھا، پھر اُس سے شادی کیوں کی، کسی اور سے شادی کروا سکتا تھا۔

وکیلوں کے پاس تو سو حربے ہوتے ہیں۔ کشکول اچھی تحریر تھی، مگر جب منڈی میں اکا دُکا لوگ تھے، وہاں سے آٹھ سالہ ''نکی'' کا اغوا ہونا حیران کن ہے، رش میں اغوا ہونا سمجھ میں آتا ہے مگر...... بحرحال جدید معاشرے کی عکاس تحریر تھی۔ بہت خوب، ''شکاری'' منعم اصغر نے تحریر کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ لغرش، عمر فاروق ارشد نے خوب جملوں کا استعمال کیا، شراب میں واقعی انسان، انسان نہیں حیوان بن جاتا ہے اور پھر رشتوں کی تمیز بھول جاتا ہے، دانیال شراب کے نشے میں دھت تھا لیکن دروازہ بند کرنا نہیں بھولا تھا، کیا شرابی جو شراب کے نشہ میں دھت ہو، اُسے یہ ہوش رہتا ہے کہ شیطانیت کا لبادہ اوڑھنے کے لیے دروازہ بند کرنا ضروری ہوتا ہے۔؟ مدیحہ نے بہن ہونے کا حق ادا کر دیا تھا۔ کلید...... شاہدہ قریشی نے خوب لکھا، قاتل کتنا چالاک کیوں نہ ہو، کوئی نہ کوئی سُراغ، ثبوت چھوڑ ہی جاتا ہے۔ اُسی طرح، اغوا برائے تاوان، نظم قدرت، کہانی کار، آگ اور فن پارے خوب رہیں۔ قلندر ذات کا اختتام ہوا، لیکن جو کتاب نہ خرید سکے، اُس کے لیے پریشانی کا سامان ضرور کر گئی، نامعتبر، ناصر ملک، کیا خوب قلم چلاتے ہیں، واہ۔ ذوق آگہی، اور خوشبوئے سخن میں انعام پانے کو دلی مبارک باد قبول ہو۔ اب دعائیہ کلمات کے ساتھ اجازت طلب ہوں، جہاں رہیں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور نعمتوں کا نزول رہے آمین ثم آمین۔

صائمہ نور...... بہاول پور روڈ ملتان۔ السلام علیکم! سردیوں کی آمد، 2015 سال کی رخصتی اور نئے سال کی آمد آمد ہے۔ میری طرف سے سال نو کی ڈھیروں مبارک باد۔ اللہ کرے یہ سال عالم اسلام کے لئے امن کا سال ہو۔ مسکراہٹیں ہوں، خوشیوں کے ترانے ہوں، محبتوں کی محفلیں ہوں، گلیاں، بازاروں میں خوف کے سائے نہ منڈلاتے ہوں۔ چہروں پہ اُداسی کی بجائے خوشیوں کا لیپ ہو۔ ہونٹوں پہ مسکراہٹ، لبوں پہ محبتوں کے پیغام اور دل میں خوف خدا ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمارے گناہوں کو معاف اور رحمتوں سے نوازے۔ آمین ثم آمین۔ ٹھٹھرتی شام کو دسمبر کا نئے اُفق ملا۔ سرورق خوبصورت تھا۔ نیلے آسمانی ڈوپٹے میں معصوم، سادگی کا پیکر لڑکی دل کو بھا گئی۔ چہرے سے معصومیت ٹپکتی تھی اور شاید سوچوں کے نگر آباد کیے ہوئے تھی۔ اُبھرتے سورج کی روشنی میں سالگرہ نمبر اُجلے حروف میں چمک رہا تھا۔ دستک میں انکل مشتاق احمد قریشی، پاکستان دشمنوں کو بے نقاب کر رہے تھے اور ان کے کرتوت بتا رہے تھے۔ اِس میں شک نہیں ہے کہ بھارت، پاکستان سے ڈرتا ہے۔ وہ اِس لیے کہ بھارت کے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے جذبہ ایمانی نہیں ہے۔ اُس کے اندر خوف ہی خوف ہے۔ بھارت اپنے حربے، ہتھکنڈے استعمال کرتا رہتا ہے، پاکستان کے ٹکڑے کرنا چاہتا ہے۔ مگر اِس کا خواب، خواب ہی رہے گا، یہ خود نیست و نابود ہو جائے گا۔ الحمدللہ! پاکستان کے دوست بہت اچھے ہیں، جو ہر وقت ساتھ دیتے ہیں۔ بس ہمیں اپنوں میں میر جعفر، میر صادق ڈھونڈنے ہیں۔ گفتگو میں عمران احمد نے خوب پیغام دیا ہے، ہمیں نفرتوں کو بھلا کر محبتوں کو فروغ دینا ہے۔ ریاض احمد قمر بھائی انعام ملنے پر مبارک باد قبول کریں، آپ کی باتیں سو فیصد درست ہیں، لیکن بعض لمحے ایسے ہوتے ہیں کہ دل روتا ہے، بچھڑنے والے یاد آتے ہیں اور ماں باپ کے علاوہ بہترین سہارا کوئی نہیں ہے۔ میں تو ماں کی نرم نرم گود میں سر رکھنے کو ترس سی گئی ہوں۔ اک بت کی طرح زندگی گزرتی ہے، گزر تو جائے گی، آخر ایک دن برداشت کا پیمانہ بھی ٹوٹ جائے گا۔ دوسری بات۔ واقعی یہ جرم ہے کہ کسی شاعر اور ادیب کا افسانہ، کلام اپنے نام سے شائع کروایا جائے، سچ تو یہ ہے کہ ادب کے میدان میں حاسدین بہت ہیں، ایک لکھاری، دوسرے لکھاری سے جلتا، کڑھتا ہے۔ اُس کی شہرت، عزت سے جلتا ہے، محنت نہیں کرتا...... حسد کرتا ہے...... حیران کن بات ہے حساس ترین طبقہ بھی اس بیماری میں مبتلا نظر آتا ہے۔ مجید احمد جائی، جاندار اور شاندار جملوں کے ساتھ حاضر تھے۔ عمر فاروق ارشد آپ کا بہن کہنا، میرا سیروں خون بڑھا گیا۔ مجھے دعاؤں کی ضرورت ہے۔ جب بھی دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائیں مجھے یاد

رکھنا، ،بہن بنایا ہے تو لاج رکھنا۔منشی عزیز مئے بھیا، اللہ تعالیٰ آپ کی زبان مبارک کرے، ہر طرف خوشیاں ہوں اور میری زندگی میں بہار ہی بہار ہو، پیارے انکل ممتاز احمد جی، کیسے ہیں، آپ سچ ہی تو کہتے ہیں خطوط دوستوں میں رابطہ کا ذریعہ ہوتے ہیں، بشیر احمد بھٹی، گل مہر، علی حسنین تابش، فلک شیر ملک، محمد یاسر، ریاض بٹ، ساحل ابڑو، اشفاق شاہین، کے تبصرے اچھے تھے۔اقرا نے دل کو منور کیا، اللہ تعالیٰ ہمیں غور وفکر کرنے والا بنائے آمین کہانیوں میں لغزش پڑھی، عمر فاروق ارشد نے اچھا موضوع اُٹھایا تھا، افسوس اِس بات کا ہے، مسلم معاشرے میں شراب کھلے عام بک رہی ہے، قانون خاموش ہے، لوگوں نے بہانے بنا لیے ہیں، شراب سے علاج ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ، ہم حلال کو چھوڑ کر حرام کی طرف راغب ہو گئے ہیں، اِسی لیے معاشرے میں بدامنی ہے، خوف ہے، بے چینی سی ہے۔شکاری، منعم اصغر ، نے خوب قلم اُٹھایا۔یہ سچ ہے جیسا بوئیں گے ویسا کاٹیں گے۔کشکول، ریحانہ عامر نے خوب لکھا، مگر کہیں کہیں کہانی میں کمی نظر آئی۔راہ شناس، جواد حسیب علی، نارمل سی کہانی تھی۔ناتمام عشق، یاسین صدیقی نے ہلکی پھلکی تحریر خوب لکھی، طنز ومزاح کے ساتھ موجودہ معاشرے کی تصویر کشی خوب کی ہے۔ویلڈن، کلید، میں شاہدہ صدیقی، نے خوب قلم اُٹھایا، مجرم آخر مجرم ہوتا ہے، کہیں نہ کہیں غلطی کر ہی جاتا ہے، جس کے پیچھے خوف ہوتا ہے۔اس کے علاوہ آگ، کہانی کار، اغواء برائے تاوان، فن پارے، نظم قدرت بہترین تحریریں تھیں، ذوق آگہی، خوشبوئے سخن، خوب رہے، نامعتبر تمام ہوئی اور جنوری سے سلسلے وار ناول کا انتظار ہے۔اِس بار تمام رسالہ خوب تر لگا۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ نئے اُفق کو ادب کی دُنیا میں ہمیشہ قائم ودائم رکھے آمین ثم آمین۔

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔ محترم ومکرم جناب عمران احمد صاحب، السلام علیکم قوی امید ہے کہ آپ اور آپ کے تمام رفقا اللہ کے فضل وکرم سے باخیریت ہوں گے۔اپنے پیارے میگزین کا پیارا سالگرہ نمبر اس بار وقت پر ہی بک اسٹال پر نظر آ گیا۔اس بار ٹائٹل بہت خوب صورت اور جاذب نظر ہے۔دستک میں جس طرح محترم ومکرم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے چند عالمی خبیثوں کے چہروں سے نقابوں کو نوچا ہے یہ انہی کا اعزاز ہے۔خداوند کریم انہیں صحت وتندرستی اور درازی عمر سے نوازے اور وہ اسی طرح مسلمانوں اور پاکستان کے مستقل دشمنوں سے ہمیں خبردار فرماتے رہیں۔گفتگو کے آغاز میں آپ نے جو حدیث پاک بیان فرمائی ہے کاش ہم مسلمانوں کی سمجھ میں آ جائے ہم اس پر عمل پیرا ہو کر عصر حاضر کی سب بیماریوں سے شفایاب ہو سکیں یہ قتل وغارت یہ راہزنی یہ ڈاکے یہ ایک دوسرے کی عزتوں سے کھیلنے جیسی قباحتوں سے ہماری جان چھوٹ جائے کاش ہم مسلمان ایک ہو جائیں اور نیک ہو جائیں۔گفتگو کے شروع میں اپنی بات میں سب کچھ سچ فرمایا ہے حجاب ابھی نظر سے نہیں گزرا یقیناً وہ بھی نئے افق اور آنچل کے معیار کا ہوگا۔میں رب ذوالجلال کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے میرے قلم کو یہ عزت بخشی ہے کہ اس میں سے نکلے نظم ونثر کے لفظوں کو مہربان لوگ پسند فرماتے ہیں۔اس کا ثبوت میرا اس ماہ چھپنے والا خط ہے۔صائمہ نور ایک بہت ہی جاندار تبصرے کے ساتھ تشریف لائیں۔انہوں نے نہایت خوب صورت انداز میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔مجید احمد جائی صاحب اس ماہ کے سب سے طویل خط کے ساتھ تشریف لائے طوالت کے باوجود خط میں کہیں جھول نہیں تھا اور تبصرہ جاندار تھا۔اشفاق شاہین کا مختصر تبصرہ پسند آیا۔جناب ساحل ابڑو کا خط بھی بہت خوب صورت ہے۔پیارے بھائی عمر فاروق ارشد صاحب حسب عادت ایک خوب صورت خط کے ساتھ شریک محفل ہوئے۔بھائی آپ نے محترمہ صائمہ نور کے ساتھ اتنا پیارا، پاکیزہ اور انمول رشتہ جوڑ کر کمال کر دیا۔مبارک ہو بھائی آپ کی کہانی لغزش بھی کمال کی تھی آپ کبھی کبھی چھپتے ہیں مگر اچھی تحریر لاتے ہیں۔پیارے بھائی ریاض بٹ صاحب کا تبصرہ ان کی کہانیوں کی طرح لاجواب ہوتا ہے ہماری ان سے ملاقات ہر ماہ ہو ہی

جاتی ہے کہانی نہ چھپے تو تبصرہ پڑھنے کو مل جاتا ہے اور اگر دونوں ہی نہ ہوں تو ذوق آگہی میں ان سے ملاقات ہو جاتی ہے۔رب کریم ان کو صحت کاملہ وعاجلہ عطا فرمائے اور انہیں عمر دراز سے نوازے آمین۔جناب محمد یاسر صاحب پہلی دفعہ شریک محفل ہوئے اور ایک اچھا انکشاف کیا محمد یاسر بھائی آپ کی یادداشت ماشاءاللہ بہت اچھی ہے ہمارا حال تو اس مریض جیسا ہے جو ایک ڈاکٹر کے پاس گیا اور کہا ڈاکٹر صاحب مجھے اپنی کہی ہوئی بات بہت جلد بھول جاتی ہے آپ میرا علاج کریں، ڈاکٹر نے پوچھا آپ کو یہ شکایت کب سے ہے تو مریض نے کہا کون سی شکایت ڈاکٹر صاحب۔فلک شیر ملک صاحب کا تبصرہ بھی قابل ستائش ہے۔انہوں نے ہر کہانی کو غور سے پڑھا اور اس پر تبصرہ فرمایا۔گل مہر صاحبہ کا خط قابل غور ہے۔آپ کس عوام کی بات کرتی ہے ہم عوام تو عقل سے پیدل ہیں ہم آزاد ہو کر بھی غلام ہیں ہم ذہنی طور پر آزاد نہیں ہوئے بلکہ وہی غلامی کی زنجیریں پہنے ہوئے ہیں۔ہم پینسٹھ سیٹر بس میں سوار ہوتے ہیں تو تین بندوں نے (ڈرائیور، کنڈیکٹر اور ہیلپر) نے ہمیں یرغمال بنایا ہوتا ہے۔وہ اگر چاہیں تو ایک ایک سواری کو بے عزت کر دیں مگر ہم میں سے کوئی انہیں روکنے والا نہیں ہوگا۔ہم نے کس مقام پر عوام ہونے کا ثبوت نہیں دیا ہم ہر بار سیاستدانوں کی چکنی چپڑی باتوں میں آ جاتے ہیں اور پانچ سال تک اپنے کیے کی سزا بھگتتے ہیں، جناب بشیر احمد بھٹی صاحب عرصہ بعد تشریف لائے ہیں بھائی جی آیاں نوں۔اب مسلسل تشریف لاتے رہیے گا۔اپنا یہ پیارا میگزین کوپن شوپن کے بغیر ہی خوب صورت لگتا ہے اور قارئین کے دلوں میں بستا ہے۔جناب ممتاز احمد صاحب کا طویل تبصرہ پسند آیا۔آخر میں جناب منشی محمد عزیز مئے کا خط بھی لائق تعریف ہے۔اقرا کا سلسلہ وہ پیارا سلسلہ ہے جس کا کوئی مول نہیں یہ عقل ودانش کو روشن کرنے والا سلسلہ ہے جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔خوشبوئے سخن میں منتخب تمام کلام اپنی اپنی جگہ خوب صورت ہے۔فریدہ خانم کی انعام یافتہ غزل لاجواب ہے ذوق آگہی کو گلہائے رنگا رنگ سے سجایا گیا ہے اور انعام یافتہ آرٹیکل کا انتخاب بڑی ذہانت کے ساتھ کیا گیا ہے۔باقی مختصر اور طویل کہانیوں کا انتخاب آپ کی ذہانت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

فلک شیر ملک...... رحیم یار خان۔ جناب مشتاق قریشی، عمران احمد مدیر معاون اور مدیر عمومی صاحبان، سدا خوش رہو۔دسمبر کا شمارہ پڑھ کر جہاں خوشی ہوئی وہیں غم بھی ہوا۔خوشی اس بات پر کہ سرورق بھی اچھا تھا اور تحریریں بھی معیاری تھیں اور دکھ، ارضی وسماوی آفات پر جیسے چھبیس اکتوبر کو زمین ہلی تو ہزاروں افراد لقمہ اجل بن گئے۔پھر لاہور میں فیکٹری کی عمارت منہدم ہوئی اور بے شمار مزدور جن میں کم عمر بچے بھی تھے ملبے تلے دب کر مر گئے۔کراچی میں جھگیوں کو آگ لگ گئی۔سمجھدار ہے وہ جو اپنے آپ کو آنے والی زندگی کے لیے تیار رکھے کیونکہ موت اچانک اچک لیتی ہے۔کاتب تقدیر کے فیصلوں کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا بس دکھ ہوتا ہے۔دستک پڑھی واقعی ہندو، مسلمان کا دوست نہیں ہو سکتا یہودی اور اسرائیلی بھی کبھی خیر خواہی نہیں کر سکتے۔شیو سینا نے جو ظلم وبربریت کا بازار گرم کیا ہوا ہے اسے کون لگام دے گا۔انہی لوگوں کے خلاف جہاد فرض ہوا ہے اگر آج ہم نہ اٹھے تو بھارت میں مسلمانوں کی زندگی اجیرن کر دی جائے گی۔گفتگو میں عمران صاحب نے جو حدیث پاک بیان کی وہ اس بات کا تقاضہ کر رہی ہے کہ اگر دنیا میں کہیں بھی کسی مسلمان کو تکلیف ہو تو ہمیں بھی محسوس ہونی چاہیے۔انفرادیت کی بجائے اجتماعیت پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ہمیں انڈیا کا پکا بائیکاٹ کر دینا چاہیے پھر کرکٹ سیریز کھیلنے کی باتیں ہو رہی ہیں پی سی بی کے چیئرمین کے ساتھ جو کچھ ہوا ہمیں سبق لینا چاہیے تھا خطوط کی محفل میں تقریباً تمام احباب نے مجھے مبارک باد دی۔سب لوگوں کا تہہ دل سے مشکور ہوں خصوصاً ریاض حسین قمر، صائمہ نور صاحبہ، مجید جائی صاحب برقی آپ تک پہنچ چکی ہوگی۔ساحل ابڑو صاحب جب بڑا انعام ملے گا تو ضرور ففٹی ففٹی کریں گے۔ریاض بٹ صاحب شکریہ۔بشیر احمد بھٹی

صاحب آپ نے بندہ ناچیز کی کچھ زیادہ ہی تعریف کردی دل وجان سے (صدقے واری) ممتاز احمد تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ منشی محمد عزیز مے کا بھی شکر گزار ہوں اور میرے افسانے کو اتنی پذیرائی دی گئی میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ بہر کیف دوبارہ آپ سب دوستوں کو میری حوصلہ افزائی کرنے پر تہہ دل سے شکریہ، نوازش، کرم، مہربانی۔ اقرا میں طاہر قریشی صاحب نے رب کائنات کے بارے میں جو دلیلیں دیں برحق تھیں اللہ تو ہر جگہ موجود ہے اس کا گھر مومن کے دل میں ہے اور واقعہ معراج میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو زمین سے آسمانوں تک سب کچھ دکھا دیا گیا۔ پھر شک کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے اور ہر جگہ موجود ہے۔ اب تحریروں پر کچھ تبصرہ۔ اغوا برائے تاوان امریکی صدر کے بیٹے کے اغوا اور اس کی موت کے بارے میں بڑا مفصل انداز میں بیان کیا گیا۔ کہانی کو لمبا بہت کیا گیا مگر دلچسپ انداز میں۔ جہاں کوئین نے بڑی تن دہی سے اپنے فرائض سرانجام دیے وہاں صدر کارک کے حوصلے کو بھی داد دینی پڑے گی۔ کلید چھوٹی سی تحریر تھی۔ سلویا نے اپنے شوہر جان کو مار دیا پھر پکڑی گئی۔ کیونکہ ہر مجرم کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کرتا ہے۔ ''ناتمام عشق'' خوب صورت تحریر تھی۔ عشق میں مار تو کھانی پڑتی ہے۔ چوپڑیاں اور دو دو یہ نہیں ہوسکتا۔ جہاں پھول وہیں کانٹے والی مثال سمجھ لیں۔ ''قلندر ذات'' آخری قسط بھی مزے دار تھی اب عورت زاد آئے گی تو پتا چلے گا کہ امجد جاوید کی کتنی اسپیڈ ہے۔ ''شکاری'' ایک سبق آموز تحریر بہت خوب انداز میں لکھی گئی۔ ہوس پرست لوگوں کو بے نقاب کیا گیا جن کا حشر بھی ویسا ہی ہوتا ہے جو وہ مکروہ کام کرتے ہیں۔ ''لغزش'' بھی سبق آموز کہانی تھی۔ نشے میں رشتوں کی پہچان بھول جانا بہت بڑا المیہ ہے خاص کر نوجوان نسل اس دلدل میں دھنستی جا رہی ہے۔ ''نظم قدرت'' آسٹرالوجی پر لکھی گئی یہ تحریر پڑھنے کی حد تک تو ٹھیک ہے مگر اس عمل پر یقین کرنا جائز نہیں تحریر کو خوامخواہ طول دیا گیا۔ موت کی پیش گوئی کرنا یا آنے والے دنوں کے متعلق بتانا ناقابل معافی گناہ ہے۔ جو شرک کے زمرے میں آتا ہے سو فی صد کیا ایک فی صد بھی یہ سچ نہیں ہوسکتا۔ ''کشکول'' زبردست، خوب صورت، ہلکے پھلکے انداز میں لکھی گئی یہ تحریر نے بڑا متاثر کیا۔ میڈم اور شاموجیسے مکروہ کردار آج بھی کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ ''راہ شناس'' پیسے کا لالچ اور ہوس نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہوا ہے یہی اس کہانی کا مرکزی تھا۔ سیلہ جیسی لالچی عورت شادی پر شادی کرتی رہی۔ اچھی تحریر تھی۔ ''آگ'' یہ تحریر بھی راہ شناس جیسی تھی۔ سیلنہ نے بھی اپنی ہوس کی آگ مٹانے کے لیے نادر شاہ، آصف شیخ سے شادی کی اور آخر میں ایک وسیم نامی جٹ کے ہتھے چڑھ گئی جس نے سب کچھ جلا دیا۔ خوب صورت اور سبق آموز کہانی تھی۔ ''کہانی کار'' پراسرار تو اس کو نہیں کہا جا سکتا گر ایک خبطی شخص کی داستان تھی۔ بے چارہ ڈیوڈ مارا گیا۔ فن پاروں میں پانچوں تحریریں بہترین تھیں مگر پنو اور چھتنار ٹاپ پر رہیں۔ خلیل جبار کے لکھنے کا انداز دل کو بھایا اور پھر کہانی میں باپ کی محبت بڑی پسند آئی۔ ''جھٹکا'' بھی دلفریب تھی مختصر مگر جامع۔ مہر پرویز کی اجلے لوگ بھی خوب رہی۔ ابھی بھی دنیا اچھے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ نجمہ نے اپنی بیٹی کے لیے صحیح فیصلہ کیا تھا جس کے نتیجے میں ایک بھلے مانس آفیسر نے عابدہ کو اپنا لیا ''رفتار وقت'' میں شاہد جمیل نے گھڑی اور وقت کی رفتار کو خوب بڑھایا۔ ذوق آگہی میں کلمے کی طاقت جیت گئی۔ بے شک بہت اچھا لکھا گیا تھا ملک جواد نواز مبارکاں، انمول موتی، سنہری باتیں زبردست تھیں خوشبوئے سخن میں فریدہ خانم صاحبہ کو مبارکباد، باقی کلام بھی خوب صورت تھا پروین شاکر مرحومہ کی غزل عمدہ تھی۔ سب رنگ تحریر ''نامعتبر'' ناصر ملک نے کمال کردیا ابتدا سے اینڈ تک سسپنس رہا۔ اس تحریر میں سسپنس، تجسس، تھرل، رومانس بہت کچھ تھا سنبل اور سمیر کا کمبینیشن بڑا زبردست رہا۔ اگلے ماہ تک کے لیے اجازت، اللہ نگہبان۔

صداقت حسین ساجد...... **شور کوٹ سٹی جھنگ**۔ السلام علیکم! محترم عمران احمد قریشی صاحب! امید ہے کہ آپ اللہ تعالی کے فضل وکرم سے خیریت سے ہوں گے...... سال کا آخری شمارہ اور میرا پہلا تبصرہ...... یہ سالگرہ نمبر تھا۔ سرورق میں کچھ تبدیلی لائیے۔ اس پر ہر ماہ کہانی دیجیے۔ میرا تو مشورہ ہے کہ پہلی کہانی پر سرورق بنوایا جائے۔ اس سے زبردست قسم کا اثر پڑے گا۔ اس بار ایک بہت عمدہ فرق دیکھنے کو ملا اس بار تو پروف کمال کا تھا۔ اس سے خوش گوار اثر پڑا عورت زاد کا شدت سے انتظار ہے۔ دستک میں اس بار کی گئی گفتگو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان عظیم کی عکاسی کر رہی تھی کہ یہود ونصاری مسلمانوں کے کبھی دوست نہیں بن سکتے کتنی بار ہمیں امریکا نے دھوکا دیا ہے، مگر ہم ہیں کہ ان کے ہی تلوے چاٹے جا رہے ہیں...... اللہ تعالی ہمیں ہدایت عطا فرمائے' سب سے پہلے میں لگائی دونوں حصے ایک ساتھ پڑھے۔ کمال کی کہانی تھی، لیکن سچی بات بتاؤں...... مجھے اس کا آخری صفحہ پسند آیا اور کہانی ہوا ہو گیا۔ آپ کا بھی شکریہ کہ ناصر ملک صاحب کی تحریر پڑھنے کو دی۔ اب ناصر ملک صاحب کو نئے افق میں قید کر ڈالیے...... میرا مشورہ مانیں، تو ان سے کوئی سلسلے وار ناول لکھوائیے...... آتش زاد جیسا...... قلندر ذات کا اختتام بہت سی تشنگی چھوڑ گیا۔ ناتمام عشق...... ایک بہت عمدہ اور زبردست کہانی تھی...... مجھے پتا ہے کہ یسین صدیق کی یہ پہلی کہانی ہے، اس میں کہیں اس پر اپنے استحقاق کا استعمال نہیں کیا۔ بہر حال امید ہے کہ یسین صدیق آیندہ احتیاط کریں گے۔ شاہدہ صدیقی کی دونوں کہانیاں بہت عمدہ تھیں...... رواں ترجمہ پڑھ کر یوں لگا کہ جیسے طبع زاد ہوں...... ایک مشورہ ہے کہ اصل ادیب کا نام بھی ساتھ ہی لکھ دیا کریں۔ اغوا برائے تاوان کہانی بہت عمدہ تھی، زریں قمر صاحبہ نے کیا زبردست ترجمہ کیا تھا۔ یہ کس ادیب کی تحریر ہے؟ ایک دکھ بھری کہانی...... مطالبہ ماننے کے باوجود بھی انھیں اپنا بیٹا زندہ نہ ملا۔ اس سے بڑا بھی کوئی صدمہ ہوگا۔ شکاری مکافات عمل کا درس دیتی ایک زبردست کہانی تھی کہ جو زنا کرتا ہے، وہ اپنے گھر کی طرف راستہ دیتا ہے۔ عاصم یہ بھول گیا تھا کہ آج وہ یہ سب کچھ دوسروں کی بہن بیٹیوں کے ساتھ کر رہا ہے تو کل کو اس کی بہن کے ساتھ بھی تو یہی سب کچھ ہوسکتا ہے۔ پھر جب ہوا، تو اس وقت پچھتاوے کے سوا اس کے پاس بچا ہی کیا تھا۔ اللہ تعالی سب کو ہدایت عطا ایک تھوڑی سی لغزش بھی انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ ایک سبق آموز کہانی...... شراب کو حرام قرار دینے کا مقصد بھی یہی تھا کہ انسان اس سے اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھتا ہے...... اسے اچھے برے کی تمیز بھی نہیں رہتی۔ نظم قدرت میں ستاروں کے بارے میں پڑھ پڑھ کر الجھ سے گئے۔ بہر حال ہوتا وہی ہے، جو کاتب تقدیر نے ہماری قسمت میں لکھ دیا۔ کشکول ایک عمدہ کہانی تھی۔ حکومت کو ایسے خرکار کیمپوں کے حوالے سے سخت کارروائی کرنی چاہیے۔ کیوں کہ یہ بھی ہمارے معاشرے کا ناسور ہی ہیں۔ بھیک مافیا تو اب ایک کاروبار کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اس سے آہنی ہاتھوں سے نبٹنے کی ضرورت ہے۔ راہ شناس کے اختتام نے چونکا کر رکھ دیا۔ میرے خیال میں تو سیلہ کا اقدام درست تھا۔ جب یہ سب کچھ ہونا ہی تھا، تو اخلاقی لحاظ سے کیوں نہ ہوتا۔ آگ جرم و سزا پر مبنی زبردست سی تحریر۔ حسد اور نفرت کی آگ کے شعلے جب بھڑکتے ہیں، تو سب کچھ جلا کر رکھ دیتے ہیں۔ فن پارے میں سبھی تحریریں بہت اچھی تھیں۔ پنو نے ہنسا ہنسا کر پیٹ میں درد کردیا۔ اجلے لوگ اکثر من کے کالے ہوتے ہیں۔ باقی بھی اچھی تحریریں تھیں۔ ذوق آگہی اور خوش بوئے سخن بہت اچھے سلسلے ہیں۔ ان میں بھی بہت کام کی چیزیں پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔ گفتگو میں ریاض حسین قمر کو انعامی خط کی مبارکباد۔ باقی سبھی خطوط عمدہ تھے۔ بااصول جن جن احباب کو پسند آئے، ان کا بے حد شکریہ! اب چلتے ہیں' کچھ تجاویز کی طرف...... ذرا آپ 2000 اور اس سے پہلے کے شمارے اٹھا کر دیکھیں، تو آج کے شمارے کے معیار میں بہت فرق دکھائی دے گا۔ ایسا کیوں ہے؟ اس طرف توجہ دیجیے۔ اگر آپ اس کا وہی سابقہ معیار واپس لوٹا دیں، تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ نئے افق کا مقابلہ پھر کوئی نہیں کرسکے گا۔ ناصر ملک صاحب سے لازمی کوئی سلسلے وار کہانی لکھوائیے۔ اس کے علاوہ کوئی زبردست سا انگریزی ناول

سلسلے وار شروع کریں...... جیمز ہیڈلے چیز یا اسٹینلے گارڈنر کا...... اس سے بھی بہت فرق پڑے گا۔ اس کام کے لیے میری خدمات حاضر ہیں۔ آپ کو ناول کا ترجمہ کر کے دے سکتا ہوں۔ جرم و سزا پر ہر ماہ تحریر لازمی دیا کریں۔ ہر ماہ ایک ہلکی پھلکی مزاحیہ تحریر کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی مہم جو اور شکاریات پر مبنی کہانیاں بھی شائع کریں...... اس بار کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ اگر کوئی بات اچھی نہ لگی ہو، تو دل سے معذرت خواہ ہوں۔

☆ صداقت صاحب جی آیا نوں، تراجم پر تقریباً تمام ہی مصنفین ہاتھ صاف کر چکے ہیں اس میں احتیاط کی بڑی ضرورت ہے۔ آپ پہلے کوئی مختصر سی کہانی ترجمہ کر کے ارسال کریں تاکہ آپ کے ترجمے کا انداز ہو سکے۔

عمر فاروق ارشد...... فورٹ عباس۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ سالگرہ نمبر اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ وقت پر موصول ہو گیا ٹائٹل حسب روایت تھا کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آ سکی وہ اٹھان جو چند ماہ قبل محسوس ہوئی تھی وہ غالباً گم گشتہ ہو کر رہ گئی ہے بہر حال دستک میں محترم قریشی صاحب نے میرے پسندیدہ موضوع پر سر بکھرے، بھارت کی اصلیت جس قدر بھی بے نقاب کی جائے وہ کم ہے خطوط کی محفل میں وارد ہوئے تو دل خوش ہو گیا کیونکہ سلسلے کو فراخدلی سے جگہ عنایت کی گئی تھی کاش کہ ہر بار اسی وسعت کا مظاہرہ کیا جائے۔ ریاض قمر بھائی، آپ اپنا خط پوسٹ کر دیتے چاہے لیٹ ہی پہنچتا اب بے چارہ فائل میں پڑا اپنی تقدیر پر نوحے لکھ رہا ہوگا۔ ریاض بٹ صاحب یاد کرنے کا شکریہ، تبصرے میں لیپا پوتی کم کیا کریں مولا خوش رکھے، صائمہ نور بہنا اگر میرے تبصرے میں تبصرہ نہیں تھا تو اور کیا پودینے کی چٹنی تھی؟ اللہ آپ کو خوش رکھے، دیگر ساتھیوں کے تبصرے بھی اپنی مثال آپ تھے کچھ بات ہو جائے کہانیوں کی سب سے پہلے تو میں یہ مطالبہ کروں گا کہ یہ جو آپ نے فن پاروں کے عنوان سے لکھاریوں کی نگارشات کو بیچ چوراہے پر ننگا کرنے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے براہ مہربانی اسے بند کریں۔ اچھی خاصی کہانیاں اس تجربے کی بھینٹ چڑھا دی جاتی ہیں جیسے خلیل جبار کی چنگی بھلی طویل کہانی کو لولا لنگڑا کر کے مختصر فن پاروں میں دھکیل دیا گیا۔ دراصل اس طرح وہ مزہ نہیں رہتا جو کہانی شائع ہونے کے بعد آنا چاہیے۔ میں سمجھ نہیں پا رہا اس تجربے کا مطلب کیا ہے۔ زریں قمر اس دفعہ اپنے کیریئر کے بہترین شاہکار کے ساتھ تشریف لائیں۔ بہت زبردست اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ قلندر ذات اختتام پذیر ہوا مگر امجد جاوید صاحب کے فلسفے کی کوئی سمجھ نہیں آئی۔ دیکھتے ہیں نئی کہانی میں کیا لے کر آتے ہیں، آخری صفحات پر ناصر ملک پوری شان سے براجمان نظر آئے۔ قلم کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا اللہ مزید ترقی دے، دیگر کہانیاں بھی عمدہ تھیں۔ اب ذرا خوشبوئے سخن کی بات ہو جائے۔ یہ سلسلہ قارئین کو ذہنی مریض بنانے میں بہت اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ کوئی سر پیر نہیں، کچھ لوگ بار بار شائع ہو رہے ہیں۔ پتا نہیں ان کا کلام سونے کے ورق پر لکھا ہوتا ہے یا پھر سلسلہ نسب کے معاملے میں یہ غالب اور اقبال سے تعلق رکھتے ہیں خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ جبکہ کچھ لوگوں کو کھڈے لائن لگا رکھا ہے۔ میرا معصوم سا دوست ظہور صائم لکھ لکھ کر نفسیاتی مریض بن گیا ہے مگر نئے افق میں اس کی شاعری ابھی تک نہیں چھپ سکی۔ جبکہ دیگر رسائل میں وہ کامیابی سے چل رہا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے۔ محترمہ نوشین صاحبہ سے گزارش کروں گا کہ آپ کوئی ترتیب لگائیں کہ اسی حساب سے سب شاعروں کو یکساں مواقع فراہم ہو سکیں۔ آپ کچھ بے چاروں کا کلام اپنی میز کی دراز میں رکھ کر بھول جاتی ہیں جبکہ کچھ صاحب زادوں کو بلا تعطل نمائندگی مل رہی ہے۔ اس کے علاوہ پندرہ پندرہ کلومیٹر لمبے انتخاب الگ سر درد ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے متعلق پہلے بھی گزارشات کر چکا ہوں، اگر یہی صورت حال رہی تو خاطر جمع رکھیں کہ عنقریب نئے افق کے صفحات پر لانگ مارچ کیا جائے گا اور قوی امکان ہے کہ محترمہ انچارج صاحبہ کے تخت اقتدار کے پائے اکھیڑ لیے جائیں، سابقہ انچارج عمر اسرار کو قربانی کا بکرا اسی لیے بنایا گیا تھا کہ اس سلسلے میں کچھ بہتری ہو سکے حالانکہ وہ بے چارہ کسی بھی قسم کی دہشت

گردی میں ملوث نہیں تھا میں سمجھتا ہوں کہ محترم قریشی صاحب کو از خود نوٹس لیتے ہوئے اس سارے معاملے کو دیکھنا چاہیے۔ خیر، مجموعی طور پر شمارہ عمدہ رہا خامیاں، کوتاہیاں تو ساتھ ساتھ چلتی ہیں لیکن بہتری کے لیے کوشش تو ہونی چاہیے، تمام ساتھیوں کو سلام۔

☆ پیارے عمر ارشد تنقید بھرے خط کا شکریہ۔ ہم نے کسی کہانی کو عریاں نہیں کیا بلکہ سب سے خوب صورت اور روایت سے ہٹ کر لکھی تحریروں کو فن پارے یعنی کلاسیکل تحریروں کو الگ باکس میں لگاتے ہیں۔ خوشبوئے سخن کے حوالے سے آپ کی شکایات نوشین تک پہنچائی جا رہی ہیں۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم! ماہ دسمبر کا سالگرہ نمبر خوب صورت سرورق لیے 20 نومبر کو بے قرار اور منتظر نگاہوں کے سامنے آیا اشتہارات سے مستفید ہونے کے بعد محترم مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک پڑھی۔ وہ ہندو کا اصل چہرہ دکھاتے نظر آئے اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں ہے کہ بھارت نے روز اول سے پاکستان کو دل سے تسلیم نہیں کیا وہ اس کے خلاف سازشیں کرتا رہا ہے اور اب بھی کر رہا ہے۔ خدا بزرگ و برتر سے دعا ہے کہ اے باری تعالیٰ ہمارے ملک پاکستان کی حفاظت فرما، آمین۔ اس کے بعد بڑھے اپنی محفل گفتگو کی طرف یہاں کافی رونق ہے۔ پہلا انعامی خط ہے ریاض حسین قمر کا بھائی واقعی آپ کا خط انعام کے قابل ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے لفظوں کے موتی پرو دیے گئے ہوں، ویری گڈ، آپ کے خیالات و احساسات اور پرچے کے متعلق تبصرہ قابل ستائش ہے۔ میری دونوں کہانیاں نیکی کا دیا اور حفظ ماتقدم کو پسندیدگی کی سند دینے کا شکریہ۔ صائمہ نور بہن آپ کا تبصرہ بھی تعریف کے قابل ہے میری کہانی آپ کو بھی پسند آئی جو آپ کی اعلیٰ ظرفی اور کہانی کے رموز و اسرار سمجھنے کی اعلیٰ ترین مثال ہے اس سے آگے مجید احمد جائی بھائی کا ایک طویل اور مدلل خط ہے آپ نے جو واقعہ لکھا ہے اپنا حق مانگنے پر سگی بھتیجی پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیے اور سڑک پر اس کے بچوں کو مارتے پیٹتے رہے کیا یہ واقعہ آپ کا آنکھوں دیکھا ہے یا......؟ آپ کو میری کہانی زبردست لگی بہت شکریہ مجھے خوشی ہوئی کہ آپ میری کہانیاں لفظ لفظ پڑھتے ہیں جس بات کی آپ نے وضاحت چاہی ہے اس کی بابت عرض ہے کہ بات لکڑی کی نہیں ہے، لکڑی سے کرسی کا ڈھانچہ بنتا ہے بات کرسی کی بنائی کی ہے جس دور کی میں کہانیاں لکھتا ہوں اس دور میں بانس سے بنائے گئے میٹریل سے کرسیاں بنی جاتی تھیں جو خوب صورتی اور مضبوطی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں۔ اسے کچھ لوگ بید بھی کہتے تھے امید ہے آپ اسی طرح میری کہانی باریک بینی سے پڑھتے رہیں گے اشفاق شاہین آپ کا بھی شکریہ، آپ کو میری پچھلے ماہ شائع ہونے والی کہانی نیکی کا دیا اچھی لگی ہم تو بھائی اس چیز کے قائل ہیں کہ اگر کوئی دکھ بھی دے اسے سکھ ہی دیا جائے۔ عمر فاروق ارشد بھائی ہر انسان کا اپنا خیال ہوتا ہے اپنے احساسات ہوتے ہیں وہ اپنے ظرف کے مطابق بات کرتا ہے آپ ٹھنڈے مزاج سے جواب دیا کریں۔ میرے خیال میں ایڈیٹر صاحب اور آپ کی وضاحت کے بعد اب یہ بحث ختم ہونی چاہیے محمد یاسر بھائی چلو آپ کسی بہانے سے آئے تو، اب یہ سلسلہ اگر جاری رہے تو اچھا ہے فلک شیر ملک بھائی آپ نے بھی خوب تبصرہ کیا ہے۔ میری کہانی آپ کو پسند آئی جس کے لیے یہ بندہ ناچیز مشکور و ممنون ہے۔ علی حسنین، گل مہر، بشیر احمد بھٹی، ممتاز احمد اور منشی محمد عزیز مٹے آپ کے خطوط بھی محفل کی جان تھے۔ اب بڑھتے ہیں باقی سلسلوں کی طرف۔ خوشبوئے سخن میں فریدہ خانم، عائشہ اعوان، آصف شہزاد، فلک شیر ملک، ریحانہ سعیدہ، جاوید احمد صدیقی اور ریاض حسین قمر کا انتخاب لاجواب ہے باقی انتخاب بھی ٹھیک تھا۔ ذوق آگہی کے کیا کہنے، ایک سے بڑھ کر ایک انتخاب تھا۔ کسی ایک کو زیادہ نمبر دینا زیادتی ہوگی۔ اس میں سب سے بڑھ کر ''سپاس گل'' کے انتخاب کی داد دینی پڑے گی۔ انہوں نے بڑا اچھا انتخاب منتخب کر کے شائع کرایا۔ صفحہ صفحہ بکھری کترنیں بھی پرچے کے حسن کو چار چاند لگا رہی تھیں۔ قلندر ذات کے

ہاں واقعات و سانحات کی صورت میں شائع کرنے کے لیے لکھا ہے تو میرے خیال میں ان کو ایسا ناول شروع سے ہی شائع نہ کرانا چاہیے تھا۔ یہ بات تسلیم لیکن یہ نئے افق کے قارئین کے ساتھ زیادتی ہے۔ یہ صرف میری ذاتی رائے ہے کیونکہ میں بڑی باقاعدگی سے ہر قسط پڑھتا رہا ہوں۔ اس بار ایک مصنفہ کی دو کہانیوں شائع ہوئیں یعنی شاہدہ صدیقی کی کلید اور کہانی کار اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ زریں قمر کی اغوا برائے تاوان پسند آئی۔ ناتمام عشق میں سکندر نے اپنی محبت کو پامال کیا۔ خیر انسان کی نفسیات عجیب ہے جس کو محمد یاسین صدیقی نے خوب اجاگر کیا ہے کہانی اچھی ہے عمر فاروق ارشد بھائی اس بار آپ نے کمال کر دیا۔ اتنی اچھی اور چبھتی ہوئی کہانی ویل ڈن، یہ کہانی ایک سبق ہے ان کے لیے جو شراب جیسا نشہ کرتے ہیں فن پاروں میں کے ایم خالد کی پینو، شاہد جمیل کی رفتار وقت اور جاوید احمد صدیقی کی جھٹکا اپنی مثال آپ ہیں۔ خلیل جبار کی چھتنار ذرا طویل تھی لیکن اچھی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اجازت والسلام۔

ریحانہ عامر...... بورے والا۔ برادر عزیز عمران احمد سلام مسنون ماہ دسمبر کا نئے افق سالگرہ نمبر طویل انتظار کے بعد مارکیٹ سے دستیاب ہوا۔ سرورق کی دوشیزہ نے سادگی و معصومیت بھری مشرقی اداؤں سے ٹائٹل کو منفرد بنا دیا۔ برادرم ایک عدد تازہ ترین افسانہ آج سے 3 ماہ قبل نئے افق کے لیے ارسال کیا تھا صد شکر کہ طویل عرصے بعد دسمبر کے شمارے میں شامل اشاعت بھی ہوا تو ہمیں کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی کیونکہ آپ نے دسمبر کا شمارہ گاؤں والے ایڈریس پر ارسال کر دیا جس کے موصول ہونے کی اطلاع دو ہفتوں بعد ملی آپ کے توسط سے شعبہ سرکولیشن سے گزارش ہے کہ میں مستقل طور پر اپنے شوہر کے ساتھ ہی ڈی آئی خان کینٹ میں سکونت پذیر ہوں براہ کرم آئندہ اعزازی کاپی و دیگر ڈاک نئے پتے پر ارسال کریں۔ نئے افق کی چالیسویں سالگرہ اور رائٹرز بہنوں کے لیے نئے آنچل ماہنامہ حجاب کی اولین اشاعت پر ڈھیروں مبارکباد دلی دعا ہے کہ نئے افق کی طرح حجاب بھی دور حاضر کے تمام پرچوں میں ممتاز مقام حاصل کر کے کامیابی کے تمام ریکارڈ توڑے آمین، انکل مشتاق احمد قریشی اپنے شاہکار قلم سے جہاں بھارتی سرکار کے سفاک عزائم سے پردہ اٹھا رہے ہیں وہاں ان کے الفاظ میں سطر بہ سطر مادر ملت سے محبت کی خوشبو بھی مہک رہی ہے۔ خطوط میں انعام کے حقدار ٹھہرے ہیں انکل ریاض حسین مبارکباد قبول لیے دیگر خطوط میں صائمہ نور، ممتاز احمد اور مہر گل کے خطوط پسند آئے۔ ڈیئر سسٹر مہر گل خوش آمدید بلا تاخیر آتی رہیے گا۔ ایمان افروز اسلامی سلسلہ اقرا پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ زریں قمر کی اغوا برائے تاوان سسپنس سے بھرپور خوب صورت کہانی تھی۔ شاہدہ صدیقی کا نام نئے افق کے صفحات پہ خوب صورت اضافہ ہے۔ انگریزی ادب سے کشید شدہ دونوں کہانیاں کلید اور کہانی کار پڑھ کر مزہ آ گیا۔ عشق ناتمام اور آگ بس کہانی برائے کہانی دونوں مصنفین سے گزارش ہے کہ منظر نگاری اور انداز بیان سے تحاریر میں قارئین کی دلچسپی کے لیے جان ڈالیے۔ قلندر ذات کے قبل از وقت اختتام نے کہانی کے سارے حسن کو بگاڑ دیا۔ منعم اصغر کی شکاری ہمارے معاشرے کی تلخ حقیقت کی ہلکی سی تصویر ہے۔ لغزش سبق آموز اچھی تحریر تھی نشے کی لعنت نے معاشرے میں ان گنت بگاڑ کو جنم دیا ہے نشہ جہاں ذہن کو مفلوج کرتا ہے وہاں رشتوں کا تقدس بھی پامال کر دیتا ہے۔ حسام بٹ کے قلم سے نظم قدرت پڑھی۔ خواتین و حضرات زمین و آسمان کی وسعتوں میں پوشیدہ جملہ علوم خداوند کی دسترس میں ہیں اپنے علاوہ اگر خدا واحد نے غائب کے خزانوں کی چابی کسی بشر کو عطا کی ہے تو وہ ذات ہے نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی ذات اقدس۔ علم نجوم کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا کہ اتنے فیصد درست ہوتا ہے محض فرسودہ ڈھکوسلا ہے۔ راہ شناس اچھی تحریر تھی۔ آگ کا عنوان کہانی کے کسی پلاٹ تھیم سے مطابقت نہیں رکھتا۔ مختصر کہانیوں میں اجلے لوگ سب سے متاثر کن تھی۔ شاعری میں ریحانہ سعیدہ، فریدہ خانم، عائشہ اعوان اچھا کلام لائے۔ اس کے ساتھ ہی اجازت، والسلام۔

غلام یاسین نونار...... چوک سرور شہید۔ محترم مدیر محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ 19 نومبر کی ایک چمکیلی صبح تھی چوک اعظم میں لیہ روڈ پر واقع نیوز ایجنسی پہ اپنے دوست نئے افق کو دیکھ کر مسرت سے کھل اٹھا۔ سرورق پر معصوم حسن نے مبہوت کر دیا۔ سرورق کی حسینہ پر بے حد پیار آیا اور اس سے بھی زیادہ ان ہاتھوں پر جن ہاتھوں نے اس خوب صورت سرورق کو پینٹ کیا اور ادارے پر بھی جس نے ان خوب صورت ہاتھوں والے فنکار کو قدر دی اور اپنے پاس اسے اپنے فن کو نکھارنے کا موقع دیا۔ ویسے تو ہر ڈائجسٹ کی پہچان الگ ہوتی ہے معیار بھی الگ ہوتا ہے نئے افق بھی ذرا جداگانہ مزاج لیے ہوئے ہے۔ گفتگو کا مطالعہ کرنا بھی باعث لطف ہے۔ اس لیے سب سے پہلے گفتگو سے ہی شمارے کا آغاز کیا۔ تمام خطوط محبت الفت اور چاشنی بھرے دل میں اثر کر گئے۔ فلک شیر ملک، مجید احمد جائی، منشی عزیز مئے جیسے ٹاپ تبصرہ نگار کو نئے افق کے حسین صفحات پر جلوہ افروز پا کر از حد تفاخر محسوس ہوا کہ میں ایسے ڈائجسٹ کا حصہ ہوں جس میں میرے فیورٹ تبصرہ نگار موجود ہیں اور اپنے قلم کے جوہر دکھا رہے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ اس خط کی وجہ بھی یہی ہے کہ اپنے فیورٹ تبصرہ نگاروں کو اس خط میں خراج تحسین پیش کروں۔ ان کا تبصرہ ان کے خوب صورت خیالات کا مجموعہ ہے اور ان کی سوچوں، خیالوں پر رشک محسوس کیا کہ عصر حاضر میں محبتوں بھری سوچ رکھنے والے لوگ بھی موجود ہیں ایک بات اور بھی بتا دوں اور اس بات کی مجھے تو بے حد خوشی ہوئی نہ جانے آپ کا ردعمل کیسا ہو، نئے افق میں ناصر ملک صاحب کی آمد خوش آئند اقدام ہے اور ان کی تحریر نامعتبر کے دوسرے حصے کے انتظار و تجسس سے مجبور جب حصول ڈائجسٹ کی خاطر تیس کلومیٹر سفر طے کر کے دوسرے شہر پہنچا تو نیوز ایجنسی پر ناصر ملک صاحب سے اچانک ملاقات ہوگئی وہ لمحات میرے لیے از حد مسرت آمیز تھے اور میں ان لمحات میں خود کو نہ جانے کیا سمجھ رہا تھا۔ ناصر ملک صاحب کی خوش اخلاقی و خوش گفتاری نے بے حد متاثر کیا اب بات کرتے ہیں ان کی کہانی پر تو نامعتبر نے بہت متاثر کیا۔ اینڈ پر جب پتا چلا کہ احمد دراصل احمد جمال شاہ ہے تو حیرت کا شدید جھٹکا لگا اور تادیر سنبل کے لیے افسوس زدہ بیٹھا رہا۔ میرا تو خیال تھا کہ سنبل اور احمد کی شادی ہو جائے گی مگر ناصر ملک صاحب نے اینڈ پر اس طرح کا منظر پیش کیا کہ میں ان کی ذہانت کا معترف ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایسا اینڈ جس نے چند لمحات مجھے سکتہ زدہ کر دیا وہ سنبل جس کے خاندان کے خلاف ساری رات بولتی رہی وہ اسے بچاتا رہا۔ کمال کا لکھا جناب ناصر صاحب نے اب مجھے ان کے نئے سلسلے کا شدت سے انتظار ہے۔ خلیل جبار نے فن پاروں میں بہت عمدہ تحریر لکھی موضوع پرانا مگر نئے انداز نے دلچسپی بھر دی اس ماہ کے نئے افق نے مجھے جہاں اتنی خوشیاں دیں وہیں ایک بہت بڑی خوشی بھی ملی میرے عزیز دوست محمد یاسین صدیقی کی کہانی ناتمام عشق کی اشاعت میرے لیے باعث مسرت بنی یہ ایک سچی کہانی تھی جسے صدیق صاحب کے قلم نے دلچسپ انداز میں بیان کیا۔ ایکشن، سسپنس، تحیر، ایڈونچر، محبت سب کچھ اس کہانی میں بدرجہ اتم موجود جو کسی کہانی کا خاصہ ہوتا ہے اسلوب اور انداز بیاں متاثر کن تھا الفاظ کا برمحل استعمال کہانی کی خوب صورتی میں باعث اضافہ تھا۔ ویلڈن یاسین صدیق بھائی قلندر ذات کی آخری قسط دھماکہ خیز تھی کہانی میں بہت کچھ ادھورا رہ گیا ہے۔ چلو جب کتابی شکل میں آئی تب پڑھیں گے مکمل۔ باقی کہانیوں میں شکاری نے بہت متاثر کیا اب اجازت زندگی رہی تو اگلے مہینے پھر حاضر ہوں گے، والسلام۔

اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی

اللہ

سدرۃ المنتہیٰ ایک بیری کا درخت ہے جو ساتویں آسمان کی آخری حد پر ہے۔ اس سے اوپر کوئی فرشتہ نہیں جا سکتا۔ یہ وہی مقام ہے جس کے لیے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔ ''جلتے ہیں پر جبرائیل کے جس مقام پر'' فرشتے اللہ کے تمام احکامات اسی مقام سے وصول کرتے ہیں۔

قربِ الٰہی کی منظر کشی آیاتِ مبارکہ میں اس طرح کی گئی ہے ''نہ نگاہ بہکی نہ حد سے بڑھی'' یعنی بارگاہِ الٰہی میں حاضری کے وقت اللہ کے محبوب رسول کریم ﷺ کی نگاہیں اس حد سے جو ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمادی تھی' سے تجاوز نہیں کیا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے وضاحت فرمادی کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔ انہوں نے مقررہ حد سے تجاوز کر کے ذاتِ الٰہی کے دیدار کی کوشش نہیں کی جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہِ طور پر اپنے رب سے ہم کلام ہوتے وقت اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

واقعہ معراج سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ عرشِ عظیم کہیں سدرۃ المنتہیٰ سے اوپر ہی واقع ہوگا جس پر وہ مالک الملک جلوہ افروز ہے جیسا کہ ذیل کی آیات میں ارشادِ الٰہی ہوا ہے۔

۱۔ ترجمہ:۔ پھر اپنے تخت پر جلوہ فرما ہوا۔ (الاعراف۔۵۴)

۲۔ ترجمہ:۔ میں نے اُسی پر بھروسہ کیا اور وہ بڑے عرش کا مالک ہے۔ (التوبہ۔۱۲۹)

۳۔ ترجمہ:۔ پھر وہ اپنے عرش پر جلوہ فرما ہوا۔ (یونس۔۳)

۴۔ ترجمہ:۔ اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بغیر (کسی) ستونوں کے بلند کر رکھا ہے کہ تم اسے دیکھ رہے ہو۔ پھر وہ عرش پر تشریف فرما ہے۔ (الرعد۔۲)

۵۔ ترجمہ:۔ پس اللہ تعالیٰ عرش کا رب پاک ہے ہر اس وصف سے جو یہ مشرک بیان کرتے ہیں۔ (الانبیاء۔۲۲)

۶۔ ترجمہ:۔ ان سے دریافت کیجئے کہ ساتوں آسمانوں اور بہت باعظمت عرش کا مالک کون ہے؟ (المومنون۔۸۶)

۷۔ ترجمہ:۔ پھر آپ ہی (کائنات کے تختِ سلطنت) ''عرش'' پر جلوہ افروز ہوا' وہ رحمٰن ہے اُس کی شان کسی جاننے والے سے پوچھو۔ (الفرقان۔۵۹)

۸۔ ترجمہ:۔ پھر عرش پر قائم ہوا' تمہارے لئے اس کے سوا کوئی مددگار اور سفارش کرنے والا نہیں ہے کیا پھر بھی تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ (السجدہ۔۴)

۹۔ ترجمہ:۔ وہ بلند درجات والا مالکِ عرش ہے۔ (المومن۔۱۵)

۱۰۔ ترجمہ:۔ پاک ہے آسمانوں اور زمین کا فرماں روا' عرش کا مالک' اُن ساری باتوں سے جو یہ لوگ (مشرکین) اس کی طرف منسوب (بیان) کرتے ہیں۔ (الزخرف۔۸۲)

۱۱۔ ترجمہ:۔ پھر عرش پر جلوہ فرما ہوا' اس کے علم میں ہے جو کچھ زمین میں جاتا ہے۔ (الحدید۔۴)

۱۲۔ ترجمہ:۔ فرشتے اُس کے (اللہ) اطراف و جوانب (چاروں اطراف) ہوں گے اور آٹھ فرشتے اس روز تیرے پروردگار کا عرش اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ (الحاقہ۔۱۷)

۱۳۔ ترجمہ:۔ عرش کا مالک ہے (جو بڑی) عظمت و بزرگی والا ہے۔ اور جو چاہے کر گزرنے والا ہے۔ (البروج۔۱۵۔۱۶)

یہ آیات متشابہات میں سے ہیں جن کے معنی متعین کرنا بہت مشکل ہے۔ نہ انسان یہ جان سکتا ہے کہ عرشِ عظیم کیا ہے؟ کیسا ہے اور کہاں ہے اور نہ ہی یہ سمجھ سکتا ہے کہ قیامت کے روز عرش کو اٹھانے والے اُن آٹھ فرشتوں کی کیا کیفیت ہوگی۔

عرشِ عظیم جس پر اللہ ذوالجلال قائم ہے۔ وہ کیا ہے؟ عرش کے معنی تخت یا چھت کے ہیں۔ اہلِ اسلام کا عقیدہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے جب سات آسمان بنائے جو ایک دوسرے کے اوپر نیچے واقع ہیں۔ ساتواں آسمان جو سب سے بلند ہے اس سے بلند تر عرش ہے' یہی مقام الٰہی اور ربِ کائنات کا مستقر ہے۔ بعض علمائے حق کے خیال میں عرش در حقیقت کوئی مادی جگہ نہیں ہے یہ الوہی بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و عظمت اور جاہ و جلال کا مظہر ہے' اس سے اللہ تعالیٰ کا بلند پایہ ہونا مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں ارشاد فرمایا ہے کہ لوگ عرش کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکتے (کیونکہ عرش انسانی فہم و ادراک سے بہت ہی بلند مقام ہے) عرش کی تکوین کا ذکر ساتوں آسمانوں کی تخلیق کے ساتھ کیا گیا ہے۔ انسان صرف اتنا ہی سمجھ سکتا ہے کہ فرش جس قدر نیچے ہے عرش اُسی قدر بلند تر ہے کہ اس کی رفعت اور وسعت کا قیاس انسانی فہم سے ماوریٰ ہے۔

ثم استویٰ علی العرش۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے تخت پر جلوہ افروز ہونے کی تفصیل کو سمجھنا انسان کے لئے مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق کے بعد کسی مقامِ خاص کو اپنی لامحدود سلطنتِ الٰہی کا مرکز قرار دیا ہو اور اپنی تجلیات کو وہاں مرتکز کر دیا ہو اور اس کا نام عرش ہو' جہاں سے سارے عالم پر وجد اور قوت کا فیضان ہو رہا ہو اور تدابیر امر فرمائی جا رہی ہوں' اور یہ بھی ممکن ہے کہ عرش سے مراد اقتدار فرماں روائی ہو' اور اس پر جلوہ فرما ہونے سے مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو تخلیق فرما کر اس کا نظام حیات' نظامِ پرورش و نگہداشت نافذ کر کے اس تمام کا نظامِ سلطنت و بادشاہی اپنے ہاتھ میں لیا ہو۔ استویٰ علی العرش کا تفصیلی مفہوم چاہے کچھ ہی ہو قرآن کریم میں اس کے ذکر کا مقصد یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ محض خالقِ کائنات ہی نہیں ہے بلکہ مدبرِ کائنات بھی ہے۔ وہ اس ساری کائنات زمین و آسمانوں کو پیدا کر کے ان سے بے تعلق ہو کر نہیں بیٹھ گیا۔ بلکہ عملاً وہی خالق و مالک سارے جہانوں کے جز و کل پر حکمرانی کر رہا ہے۔ نہ کسی چیز کو بھی بے مقصد بے کار پیدا کیا ہے نہ اسے یونہی چھوڑ دیا ہے۔ اپنی ہر ہر مخلوق کی وہ پوری پوری نگہداشت و پرورش بھی مسلسل کر رہا ہے۔ ذرہ ذرہ اس کا مطیع و فرماں بردار ہے۔

قرآنِ کریم خالق اور مخلوق کے باہمی رشتوں کو ایک اکیلے اللہ کی حکمرانی اور تمام مخلوقاتِ الٰہی جن میں اشرف المخلوقات انسان بھی شامل ہے کو ایک اللہ کی اطاعت فرماں برداری اور بندگی کرتے ہوئے دائمی اور ابدی حقیقت کو پیش کر رہا ہے تاکہ انسان ان کو سمجھے کہ اللہ تعالیٰ محض خالق و مالک ہی نہیں ہے بلکہ وہ آمر و حاکم بھی ہے۔ اس نے اپنی مخلوقات کو پیدا کر کے نہ تو دوسروں کے حوالے کیا ہے' نہ ہی اپنی مخلوق کو یا اس کے کسی حصے کو خود مختار بنا دیا ہو کہ وہ جس طرح چاہے خود زندگی گزارے' اپنے کام اپنی مرضی و اختیار سے کرتا رہے۔ بلکہ عملاً تمام کائنات کی تمام تدابیر اُس نے اپنے پاس رکھی ہیں چاہے وہ رات و دن کا ہونا ہو یا کسی خوردبینی جرثومے کی پیدائش' یہ سب اُس احکم الحاکمین کے کرنے اور چاہنے سے ہو رہا ہے کہ وہ جب چاہے اسے روک سکتا ہے اور جب چاہے اس سارے نظامِ کائنات کو تبدیل کر سکتا ہے۔ یہ سورج' چاند' ستارے خود کسی طاقت کے نہ مالک ہیں نہ اپنی مرضی سے اپنے کاموں میں کسی قسم کی تبدیلی لا سکتے ہیں بلکہ تمام مخلوقاتِ الٰہی اللہ کے ہاتھوں مسخر اور مجبور ہے' بس وہی کام کئے جا رہے ہیں جو اللہ چاہتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے اُس کی مخلوقات ویسے ہی کرتی ہیں۔

(جاری ہے)

تمہارے حسن کو اندیشۂ زوال نہیں

محمد یاسین صدیقی

ملک کے نامور ادیب ،شاعر،صحافی محترم ناصر ملک کا انٹرویو نئے افق ،آنچل ،حجاب آفیشل گروپ میں لیا گیا۔سوال ممبران نے کیے۔ بوجہ سب ممبران کا نام دینا ممکن نہیں لیکن ادارہ اس تحریر کے ذریعے ان سب سے اظہار تشکر کا اظہار کر رہا ہے۔

اس انٹرویو کو ترتیب ہمارے محترم لکھاری محمد یاسین صدیقی نے دیا ہے ادارہ ان کا بھی شکرگزار ہیں۔
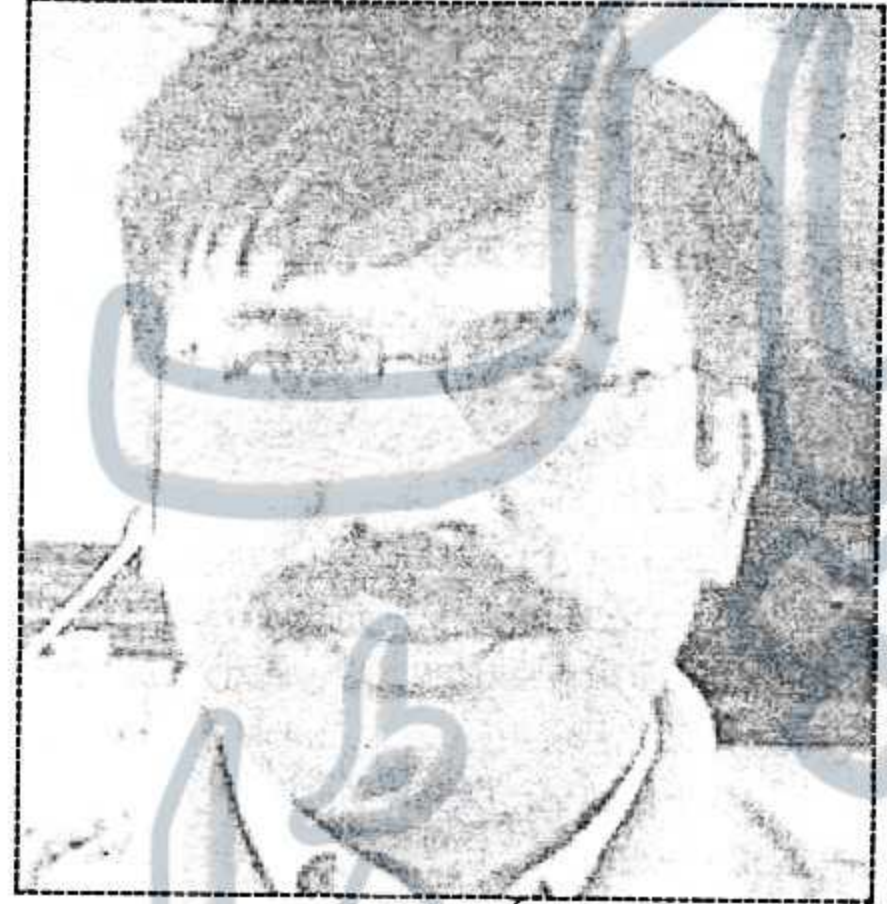
ناصر ملک ادبی حوالے سے ایک معتبر نام ہیں۔آپ اُردو سخن ڈاٹ کام کے بانی بھی ہیں۔لیہ سے اِن کا تعلق ہے۔اُن کے افسانے اور تحریریں نئے افق سمیت ملک کے تمام بڑے ڈائجسٹوں میں تواتر کے ساتھ شائع ہو کر لاکھوں قارئین تک پہنچتی رہتی ہیں۔ناصر ملک صاحب ملک کے ایک روشن خیال ادیب، معروف افسانہ نگار،تاریخ کے اَن تھک محقق،نام ور صحافی اور میٹھے لہجے کے شاعر ہیں۔وہ نوائے وقت ملتان میں مستقل کالم نویسی کر رہے ہیں ۔ ان کی اب تک سترہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں ''لایموت'' کے عنوان سے اللہ رب العزت کے ننانوے ۹۹ اسماء الحسنیٰ کو پیش نظر رکھ کر کہی گئی حمدوں کا دُنیائے ادب میں پہلا مجموعہ انہوں نے پیش کیا۔

نئے افق: اسلام علیکم محترم ناصر ملک صاحب سب سے پہلے تو آپ کا بیحد شکریہ ادا کرنا چاہوں گا،آپ نے وقت دیا۔بہت سے قاری آپ سے واقف ہیں،آپ کو جانتے ہیں۔پھر بھی آپ اپنا تعارف کروادیں۔کیا یہ آپ کا اصلی نام ہے؟تعلیمی قابلیت کیا ہے آپ کی؟

ناصر ملک: وعلیکم السلام،خوش رہیں۔میرا خاندانی نام ''خدا بخش ناصر ملک'' ہے جبکہ نام کا آخری آدھا حصہ قلمی نام ہے اور تعلیم ایم اے ہے۔

نئے افق: آپ کی تاریخ پیدائش اور شہر کون سا ہے؟زندگی

کا سب سے یادگار لمحہ؟شادی اور بچے کتنے ہیں اور بیویاں کتنی ہیں؟

ناصر ملک: میری تاریخ پیدائش 15 اپریل 1972ء ہے آبائی شہر سرگودھا۔تین بچے ہیں اور بیوی صرف ایک ہی ہے۔

نئے افق: آپ کا نام کس نے رکھا؟بہن بھائی کتنے ہیں؟ اور آپ کا کون سا نمبر ہے بہن بھائیوں میں؟گھر میں آپ کو کس نام سے پکارتے ہیں؟والدین حیات ہیں کیا؟والدین میں کس کے زیادہ قریب تھے یا ہیں؟

ناصر ملک: میرا نام میرے والد گرامی کے ''مرشد'' سید عادل شاہ (بھلروان) نے رکھا۔دو بہنیں اور ایک بھائی دوسرا نمبر ہے والدین حیات نہیں ہیں اور میں والد صاحب کے زیادہ قریب تھا۔

نئے افق: بڑے ہو کر کیا کرنا چاہتے ہو؟آپ سے بھی بچپن میں پوچھا جاتا ہوگا آپ کیا جواب دیا کرتے تھے۔

ناصر ملک: ڈاکٹر بننا چاہتا تھا۔اسی خواہش میں ایم ٹی (میڈیکل ٹیکنیشن) بنا۔جاب بھی کی اور جب ڈاکٹرز کی زندگی کو قریب سے دیکھا تو ہمیشہ کے لیے تائب ہوگیا۔

نئے افق: بچپن میں شرارتی تھے یا معصوم؟پھولوں میں کون سا پھول اچھا لگتا ہے؟

ناصر ملک: شرارتی تو نہیں، البتہ حاضر جواب تھا۔پھولوں میں موتیا پسند ہے۔

نئے افق: پاکستان میں کہاں کہاں گھومے ہیں؟کون سا شہر سب سے زیادہ پسند آیا؟پسند آنے کی وجہ بیان کریں؟

ناصر ملک: پاکستان کے بیشتر علاقے دیکھ چکا ہوں۔ڈیرہ غازیخان میرا پسندیدہ شہر،اس کے پسند آنے کی وجہ بہت پیچھے رہ گئی ہے۔

نئے افق: سیاست سے کتنی دلچسپی ہے؟آصف علی زرداری، نواز شریف،عمران خان،مولانا فضل الرحمٰن، الطاف حسین میں سے کس کو بطور سیاست دان پسند کرتے ہیں؟

ناصر ملک: سیاست سے گہری دلچسپی ہے۔میں پاکستان کی مروجہ جمہوریت کو پسند نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے مہروں کو یعنی سیاست دان کوئی بھی پسند نہیں جسے اپنا لیڈر کہہ سکوں۔میں پاکستان میں بادشاہت کے خواب دیکھتا ہوں۔

نئے افق: کیا میوزک اور مووی سے لگاؤ ہے۔اپنی پسندیدہ مووی اور گیت بتائیں؟

ناصر ملک: سلو ٹیمپو مووی اور میوزک پسند ہیں۔پسندیدہ فلمیں۔یاد رکھے گی دنیا'شہید اور گیتوں میں۔مینوں تیرے جیہا سوہنا،تیرے ہونٹوں کے دو گیت پیارے پیارے۔وغیرہ۔

نئے افق: کس ڈائجسٹ میں لکھ کے آپ کو سب سے زیادہ دلی اطمینان ہوا؟موجودہ ادب جو لکھا جا رہا ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟آپ کے خیال میں آج کا قاری کیا پڑھنا چاہتا ہے؟آپ کے نزدیک اس دور کے نامور افسانہ نگار کون کون سے ہیں؟

ناصر ملک: اتنے سوال ایک ساتھ (مسکراتے ہوئے) یوں تو جہاں بھی لکھا دل سے ہی لکھا اور دل مطمئن ہی رہا لیکن سب سے زیادہ ماہنامہ ''سب رنگ'' کراچی میں لکھ کر خوشی ہوئی۔موجودہ ادب سے مطمئن ہوں ہر دور کی اپنی ضروریات ہوتی ہیں آج کا ادب آج کی ضرورت ہے۔آج کا قاری آج کے مسائل اور ان کا حل پڑھنا چاہتا ہے۔بہت سے دوست بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔

نئے افق: کس موضوع پر لکھنا اچھا لگتا ہے؟

ناصر ملک: نئے موضوع پر لکھنا اچھا لگتا ہے۔

نئے افق: پاکستان میں رسائل کے زوال کے اسباب کیا ہیں؟کیا آج بھی سب رنگ جیسا ماہنامہ نکالا جا سکتا ہے؟

ناصر ملک: ڈائجسٹ زوال پذیر نہیں ہیں۔''سب رنگ'' ان دنوں شائع نہیں ہو رہا اس جیسا شاید ممکن نہیں ہے۔کوئی اور شکیل عادل زادہ نہیں ہے۔

نئے افق: کیا ڈائجسٹ انتظامیہ رائٹرز پر اثر انداز ہوتی ہے؟

ناصر ملک: پروفیشنل ''رائٹر'' پر انتظامیہ اثر انداز ہوتی ہے۔

نئے افق: آپ کے اپنے لکھے ناولز میں پسندیدہ ناول کون سا ہے؟عام طور پر نقاد ڈائجسٹ میں چھپنے والے ادب کو ادب شمار ہی نہیں کرتے۔آپ کی کتنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں؟

ناصر ملک: یہ پسندیدگی ایک طرح سے موسمی ہوتی ہے۔آخری اترن اپنی کتاب ''تھیلی'' کا دیباچہ اور جنت میرا پسندیدہ ناول ہے۔میری سترہ کتب شائع ہو چکی ہیں۔موجودہ ادب جو ڈائجسٹوں میں لکھا جا رہا ہے ادب میں شمار کیا جاتا ہے۔سعادت حسن منٹو،کرشن چندر،عصمت چغتائی وغیرہ کہاں لکھا کرتے تھے ؟وہ بھی تو ماہناموں میں ہی لکھتے تھے۔

نئے افق: اداس نسلیں،لوح ایام اور آزدوست،شہاب نامہ ، جانگلوس وغیرہ ایسے کلاسک اب نہیں لکھے جاتے وجہ کیا ہے اس کی؟

ناصر ملک: ایسے کلاسک اب نہیں پڑھے جاتے۔

نئے افق: محبت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے......؟ کبھی اس حادثے کا آپ کو سامنا کرنا پڑا؟

ناصر ملک: محبت انسان کے لیے اپنے باطن کو سدا شاد آباد رکھنے کے لیے ضروری ہے (کسی نہ کسی حد تک) نرگسیت ہر فنکار

کی شخصیت میں رچی بسی ہوتی ہے۔

نئے افق: محترم ناصر ملک صاحب! محبت آفاقی عمل ہے جو کبھی بھی کسی بھی وقت ہو جاتی ہے محبت کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ محبت میں جدائی اس کی شدت میں اضافہ کرتی ہے لیکن لمبی جدائی اسے ختم کر دیتی ہے، کیا یہ سچ ہے؟

ناصر ملک: محبت آفاقی نہیں، خالصتاً ارادی عمل ہے عدم رابطہ محبت کی شدت کو وقت کمزور بھی کرتا ہے اور شدید بھی۔

نئے افق: آتش زاد جیسا کام پھر آپ کے قلم سے کیوں نہیں نکلا؟

ناصر ملک: سب رنگ بند ہو گیا اس لیے۔

نئے افق: سنا ہے، آپ بہت اچھی شاعری کرتے ہے، شاعری کی کون سی صنف آپ کو پسند ہے؟

ناصر ملک: سنا تو میں نے بھی یہی ہے۔ شاعری میں "پنجابی نظم" میرا پسندیدہ میدان ہے۔

نئے افق: آغاز فن تحاریر میں آپ پر بھی تنقید کی گئی؟ آپ نے کیا اثر لیا؟

ناصر ملک: اگر میری تحریر پر تنقید ہوئی ہے تو وہ مجھ تک نہیں پہنچی ہے۔

نئے افق: آپ کے ناولز میں بے باکی کچھ کچھ موجود ہے کیا یہ آج کے دور کی ضرورت ہے؟

ناصر ملک: ہمارے معاشرے کی کہانیاں بے باکی مانگتی ہیں۔

نئے افق: کس ادیب یا شخصیت کو اپنا استاد و رہبر مانتے ہیں؟

ناصر ملک: زندگی کے مختلف مراحل میں ڈاکٹر خیال امروہوی، ظفر اقبال ظفر، رفیق احمد نقش، شکیل عادل زادہ، محسن نقوی جیسے عظیم لوگوں سے متاثر ہوا اور ان سے سیکھا بھی استاد و رہبر اپنے والد گرامی "ملک محمد بخش" کو مانتا ہوں۔

نئے افق: فارغ اوقات کیسے گزارتے ہیں؟ آپ کے مشاغل؟ آپ کی اچھی عادت؟ آپ کی بری عادات؟ غصہ کن باتوں پر آتا ہے؟ اور کن باتوں پر کمپرومائز نہیں کر سکتے ہیں؟

ناصر ملک: فارغ وقت کہاں جی ویسے ایسا وقت ملے تو بغیر نیند کے سو کر، یعنی خیالی پلاؤ پکا پکا کر، مشاغل بہت سے ہیں اور زندگی کے مختلف مرحلوں میں رہے۔ مصوری، پنسل اسکیچ، نقشہ سازی، کمپیوٹر ڈیزائننگ، قلم کاری، تاریخ پر ریسرچ، لوگوں پر مشاہداتی تحقیق، سیر و سیاحت، وغیرہ اچھی عادت ایک ہے کہ سچ بولنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بری بہت سی ہیں غصہ فرقہ وارانہ پوسٹوں پر آتا ہے اور سنی سنائی پر کامل یقین کرنے اور کرانے والوں پر عموماً ایڈیٹرز کی رائے سے مفاہمت نہیں ہوتی۔

نئے افق: کبھی ایسی صورت حال سے واسطہ پڑا کہ جس کو بہت مان، چاہ دی ہو اعتبار کیا ہو اس نے ہی آپ کے اعتبار کو ٹھیس پہنچائی ہو مان توڑا ہو یا کبھی آپ سے کوئی ایسی غلطی ہوئی جس پر آج بھی پچھتاتے ہوں کہ کاش ایسا نہ ہوا ہوتا؟

ناصر ملک: مجھے آج تک کسی نے دھوکا نہیں دیا اور نہ ہی میرا مان توڑا ہے غلطیاں کر کے گزر جاتا ہوں، پلٹ کر نہیں دیکھتا۔

نئے افق: آپ کا پسندیدہ ناول کون سا ہے؟ ناول پسند کرنے کی وجہ؟

ناصر ملک: گمراہ، جبار توقیر کا ناول پسند ہے اس کی وجہ اس کا اوائل میں پڑھنا، اس میں جبار توقیر کا بے ساختہ پن، زمینی حقائق پر داستاں طرازی، یہ وہ عوامل تھے جن کے سبب میں اس کہانی سے متاثر ہوا۔

نئے افق: آپ کب سے سوشل میڈیا پر ہیں اپ نے یہاں کیا کھویا کیا پایا؟ اس کے کچھ مثبت اور منفی پہلو پر روشنی ڈالیں؟ مستقبل میں سوشل میڈیا کے کردار کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟

ناصر ملک: شوشل میڈیا مضافاتی ادیبوں اور شاعروں کے لیے نعمت ثابت ہوا۔ یہاں میں نے بہت زیادہ عزت، دوستیاں اور محبتیں سمیٹی ہیں۔ کسی منفی پہلو سے ابھی واسطہ نہیں پڑا۔ مستقبل میں سوشل میڈیا کئی ایسے سلو موونگ میڈیاؤں کو نگل جائے گا جیسے "چنگ چی رکشا" بیڈفورڈ بسوں، تانگوں، ریڑھیوں اور ڈالوں کو نگل چکا ہے۔

نئے افق: آپ نے بچوں کے لیے کوئی ناول لکھا؟ نام بتائیں۔

ناصر ملک: بچوں کے لیے ابتدا میں کہانیاں تو لکھی تھیں، ناول نہیں لکھا۔

نئے افق: آپ کی تحریر میں محی الدین نواب صاحب کا عکس نظر آتا ہے کیا آپ ان سے متاثر ہیں۔

ناصر ملک: ایک دو کہانیوں کی حد تک مماثلت تھی جس پر میں نے قابو پالیا تھا اور میں ان کے انداز تحریر سے متاثر نہیں۔

نئے افق: زندگی میں کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟ اپنا پسندیدہ شعر؟

ناصر ملک: زندگی میں ویسے تو بہت سی کمیاں ہیں مگر لائق ذکر کوئی نہیں۔

میرا پسندیدہ شعر ہے

تمہارا حسن پرویا گیا ہے شعروں میں
تمہارے حسن کو اندیشہ زوال نہیں

نئے افق: اسلام کے بھولے ہوئے سبق اخوت بھائی چارے کو کس طرح پاکستان میں فروغ دیا جا سکتا ہے؟ اس کے رائٹر کیا خدمات ادا کر سکتے ہیں؟

ناصر ملک: بھائی چارے اور اخوت کو قانون پر عملدرآمد کرنے سے فروغ دیا جا سکتا ہے۔

نئے افق: اگر کوئی آپ سے کہتا ہے کہ پانچ روپے کا سوال ہے بابا تو آپ کا ردعمل کیا ہوتا ہے؟

ناصر ملک: میں ردعمل میں پانچ، دس روپے اسے دے دیتا ہوں اور اس کرید میں نہیں پڑتا کہ وہ مستحق ہے یا نہیں۔

نئے افق: آپ کو غصہ کس فرد پر آتا ہے؟ غصہ میں آپ کیا کرتے ہیں؟

ناصر ملک: جب مقابل بات سمجھنے کے بجائے ناراض ہونے کا ارادہ کیے بیٹھا ہو۔ خاموش ہو جاتا ہوں یا بہت زیادہ بولنے لگتا ہوں۔

نئے افق: ایک اچھی کہانی لکھنے کے لیے کن باتوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہوتا ہے؟

ناصر ملک: میری دانست میں اچھی کہانی کے اجزا یہ ہیں۔ اچھا پلاٹ' زمینی حقائق' زندہ کردار اور کرداروں کا ردعمل ان کے سماجی مقام کے عین مطابق اچھے اور برجستہ مکالمے۔

نئے افق: آپ کی شاعری کی کتنی کتب اب تک شائع ہوئی ہیں؟ ان کے نام اور سال بتائیں کب شائع ہوئیں اور کتنی ابھی زیر تکمیل ہیں؟

ناصر ملک: یہ سوچ لینا 1995' غبار ہجراں 2005' جان جگنو اور جزیرہ 2008' تریل 2008' ہتھیلی 2009' سامعہ 2014۔ راکھ 2015' لایموت 2015۔

نئے افق: سنا ہے آپ کی ایک کتاب انگلش زبان میں بھی شائع ہوئی ہے اس بارے میں کچھ بتانا پسند فرمائیں گے۔

ناصر ملک: میری پہلی کتاب انگلش میں شائع ہوئی۔ اس کا موضوع یادداشتیں تھیں۔ اس میں میرے ڈیرہ غازیخان میں گزرے دو سال، دوستوں کا احوال وغیرہ شامل تھا۔ یہ میرے نزدیک اہمیت کی حامل تھی یا میرے مذکورہ دوستوں کے لیے وگرنہ اس میں دلچسپی کی کوئی بات نہ تھی۔

نئے افق: تاریخی تحقیق پر مبنی ضخیم کتاب "انسائیکلوپیڈیا آف لیہ" اس کتاب کے حوالے سے آپ کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کو پزیرائی نہیں ملی جتنی ملنی چاہیے تھی۔ کیا محسوس کرتے ہیں محنت ضائع ہونے کا دکھ ہوا؟

ناصر ملک: اس پر بہت محنت کی اور جتنی محنت کی، اتنا ثمر بھی مل گیا۔

نئے افق: اسی طرح ایک میگزین آپ نے نکالا تھا "شاہکار" وہ بھی ناکامی کا شکار ہوا۔ ایک سال تک نکالنے کے بعد اسے بند کر دیا۔ دل پر کیا بیتی؟ کیا دوبارہ ایسا تجربہ کرنے کا سوچا آپ نے؟

ناصر ملک: ماہنامہ "شاہکار" نکالنا میرا اچھا فیصلہ تھا جو نہایت غلط وقت پر کیا گیا تھا۔ وہ ناکام نہیں ہوا تھا کیونکہ اس کی سرکولیشن پانچ سو سے متواتر بڑھ کر چھ ہزار ہو گئی تھی مگر میں اسے نا تجربہ کاری کے سبب مینیج نہیں کر سکا تھا۔ دوبارہ کوئی رسالہ ماہنامہ شائع کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔

نئے افق: خالصتاً ادبی ویب سائٹ "اردو سخن ڈاٹ کام" کا اجراء کا آپ نے کارنامہ سرانجام دیا۔ اس کا خیال کیسے آیا آپ کو؟

ناصر ملک: انٹرنیٹ کی فقید المثال کامیابی کو دیکھ کر۔ خیال آیا تھا اور میرا خیال ہے بہت اچھا خیال آیا تھا۔

نئے افق: ناول لکھنے سے معاوضہ بھی ملتا ہے آپ کو سب سے پہلے کس ناول یا کہانی پر معاوضہ ملا کب کس ادارے سے اور کتنا اس کے علاوہ سب سے زیادہ معاوضہ کس کہانی پر ملا؟

ناصر ملک: مجھے اپنی کہانی "عذاب آگہی" پر پہلا معاوضہ سب رنگ ڈائجسٹ کراچی سے ملا تھا اور 27 ہزار روپے ملا تھا اور سب سے زیادہ مسافر پر سسپنس سے۔

نئے افق: ڈگری کو تعلیم سمجھتے ہیں یا پھر انسان کی قابلیت کا معیار ہی اصل تعلیم؟

ناصر ملک: ڈگری تو ڈگری ہوتی ہے، اصلی ہو یا نقلی

نئے افق: گرم مزاج یا بدتمیز بندے کو کیا مشورہ دیں گے کہ کس طرح خود کو متلون مزاج بنائے؟

ناصر ملک: گرم مزاج بندے کو مشورہ دے کر مشورہ ضائع کرنا ہوتا ہے۔

نئے افق: لایموت ایک ایمان افروز تخلیق کا خیال کیسے آیا؟ لایموت لکھ کر آپ کے احساسات کیا ہیں؟ بلاشبہ یہ دنیا کا پہلا انوکھا اور منفرد کام ہے۔

ناصر ملک: خدا کے ہاں خالی ہاتھ نہ جایا جائے۔ بس یہی خیال تھا۔

زلف کا اسیر

ڈاکٹر ایم اے قریشی

عورت جب ماں کے روپ میں ڈھلتی ہے تو قدرت اس کی جون ہی بدل دیتی ہے' وہ خواہ کتنی بھی نرم و نازک ہو لیکن ماں بنتے ہی وہ شیرنی کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔

ممتا کے جذبے سے سرشار' ایک پیاسی ماں کی ہنگامہ خیزیاں' ایک پیارے سے بچے' ایک خوف ناک قاتل اور ایک محبت کرنے والے کے گرد گھومتی ہوئی طویل کہانی۔

سالوں تک یاد رکھا جانے والا ایک خوب صورت ناول۔

گری تھی جس پرکل بجلی وہ میرا ہی نشیمن تھا

اس سے پہلے بھی ایک بار میرے خرمن کو آگ لگی تھی اور تنکا تنکا جل کر خاکستر ہوگیا تھا۔ نہ جانے بے درد آسمان کو مجھ سے کیا بیر تھا؟ ادھر میری کتاب زیست کا پندرھواں باب کھلا اور ادھر میرے والدین کا باب زندگی اچانک بند ہوگیا۔ وہ کار کے حادثے میں ہلاک ہوگئے اور مجھ بدنصیب کو تنہا اور بے آسرا چھوڑ گئے۔ یہ حادثہ جانکاہ اتنا غیر متوقع تھا کہ مجھے سکتہ ہوگیا۔ ذہن یہ تسلیم کرنے پر آمادہ ہی نہ تھا کہ میرے سر سے سائبان ہٹ گیا ہے......!

......پھر میں اس شخص کی پناہ میں آگئی' جس نے والدین کے بعد میری سرپرستی قبول کی تھی۔ چار سال کی رفاقت اور دم سازی کے بعد اس نے میری رضا سے مجھے مانگ لیا اور میرے سر کا تاج بن گیا۔ میں گہر تھی' وہ صدف بن گیا' میں زمین تھی' وہ میرا آسمان بن گیا۔ ہر چند کہ ہمارے درمیان عمروں کا خاصا فرق تھا لیکن اس کی نکھری نکھری شخصیت شفقت اور جذبے کی سچائی نے اس فرق کو مٹادیا تھا۔ وہ ایک نہایت قابل' ذی شعور' انتہائی شفیق و مہربان اور عمدہ انسان تھا۔ مجھے اس کی پرخلوص ذات سے باپ کی شفقت بھی ملی' ماں کی ممتا بھی اور شوہر کا پیار بھی ملا۔ اس نے اس طرح میری دلجوئی کی تھی کہ میں اپنے سارے دکھ بھول کر اس کی محبت میں گم ہوگئی۔

اس سے میری شادی انیس سال کی عمر میں ہوئی تھی لیکن شادی کے تین سال بعد ہی وہ شدید علیل ہوگیا۔ میں نے اس کے علاج اور تیمارداری میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا لیکن مرض بڑھتا گیا' جوں جوں دوا کی اور پھر ایک روز یہ جلتا سورج' بجھتے بجھتے بجھ گیا۔ میں اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ یوں مجھ سے اپنا ناتا توڑ لے گا۔ اب میں تھی اور خزاں کی رت تھی' شیرازہ حیات منتشر ہوگیا تھا۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر گھنٹوں چاند کو تکا کرتی اور سوچتی کہ مجھ میں......اور اس میں کیا فرق ہے؟ میں زمین پر تنہا اور وہ آسمان پر تنہا......

زندگی بہت اداس اور بے قرار تھی۔ دل کا مے کدہ ویران تھا۔ میں نشان منزل کھو بیٹھی تھی' جینے کا کوئی واضح مقصد نظر نہیں آرہا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ میری خوش بختی ہے کہ میں مالی پریشانیوں سے بالکل آزاد ہوں اور میرا کوئی بچہ بھی نہیں ہے

......لیکن کوئی نہیں جانتا کہ مجھے بچے کی کتنی شدید آرزو تھی' وہ ہوتا تو شاید دل بہلنے کی کوئی صورت نکل آتی۔ زندہ رہنے کا کوئی مقصد ہوتا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں' کدھر جاؤں؟ کوئی راہ نہیں تھی۔

اسی دوران ایک لڑکی نے میری جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا نام کیتھی تھا' وہ لندن کے ایک روزنامے کی رپورٹر تھی۔ ہماری ملاقات ایک لفٹ میں ہوئی تھی۔ ہم بہت جلد ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ وہ ہوا کا ایک شریر جھونکا تھی' مجھ روتی ہوئی کو گدگدا گئی اور میں نے اپنی تمام اداسیوں کے باوجود ہنسنا سیکھ لیا۔ ایک روز اس نے مجھے فون کیا۔

''جینی!'' وہ پرجوش لہجے میں چیخی۔ ''تمہیں ایک خوشخبری سناؤں۔ مجھے ایک امریکی رسالے میں ملازمت مل گئی ہے۔''

''مبارک ہو۔'' میں نے صدق دل سے کہا۔

''میں اگست کے اواخر میں اپنی نئی ملازمت کا آغاز کروں گی۔'' وہ اسی جوش و خروش سے بولی۔ ''اور سنو! میرے پاس تمہاری اداسی دور کرنے کا ایک تیر بہدف نسخہ ہے' میں بھی امریکا روانہ ہونے سے پہلے تھوڑی سی تفریح کرنا چاہتی ہوں۔ ہم وینس چلیں گے۔ سچ بے حد لطف آئے گا۔ تم فکر مت کرو' سارا انتظام میں کروں گی۔''

❀......❀......❀

ہمیں اٹلی کے شہر وینس پہنچے ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا کہ امریکا سے کیتھی کو فوراً اپنا نیا عہدہ سنبھالنے کا ٹیلی گرام موصول ہوا اور وہ اپنا بوریا بستر سنبھالنے لگی۔

''جینی......'' اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ''مجھے کل ہی لندن روانہ ہونا ہوگا تاکہ وہاں سے امریکا پرواز کرسکوں۔ میں تم سے معذرت چاہتی ہوں۔ تم میری مجبوری کو سمجھ رہی ہو نا؟ لیکن میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تمہاری تفریح ادھوری رہ جائے۔ ہوٹل کا یہ کمرہ اگلے دو ہفتوں تک کے لیے بک ہے اور تم نے وینس کی اچھی طرح سیر بھی نہیں کی ہے۔ لہٰذا جی بھر کر سیر کرو۔''

دوسرے روز میں نے اسے الوداع کہا اور گائیڈ بک ہاتھ میں لے کر وینس کی خاک چھاننے لگی۔ بے شمار قابل دید مقامات کی سیر کرنے کے بعد ایک بار پھر تنہائی کا احساس مجھے ڈسنے لگا۔ اس وقت میں شہر کے سب سے بارونق چوک میں

واقع' ایک خوبصورت سے ریستوران کے باہر' سایہ دار چھتری کے نیچے بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ ہر شے بے حد نکھری نکھری نظر آرہی تھی' فضا میں مسحور کن موسیقی گونج رہی تھی۔ شاید یہ اس موسیقی ہی کا اثر تھا کہ میں خود کو بے حد آزردہ اور دل گرفتہ محسوس کرنے لگی تھی۔

میں نے دوسری میزوں کی جانب دیکھا۔ خوش فکرے لوگ دو دو' چار چار کی ٹولیوں میں بیٹھے' کھا پی رہے تھے' باتیں کررہے تھے' ہنس رہے تھے' قہقہے لگارہے تھے' ان کے چہروں پر زندگی کی رعنائیاں تھیں...... اور اس پورے شہر میں صرف ایک میری ذات تھی جو بالکل تنہا تھی' میرے لیے مزید وہاں بیٹھنا دوبھر ہوگیا۔ میں نے جلدی سے اپنا بل ادا کیا اور چھتری کے سائے سے نکل کر کڑی دھوپ میں آگئی۔

سڑکوں پر بے حد گہما گہمی تھی۔ خوش و خرم لوگوں کی ٹولیاں میرے قریب سے گزر رہی تھیں' ان کے قہقہے میرے کانوں کو بے حد ناگوار محسوس ہورہے تھے۔ میں جلد از جلد ان سب سے دور نکل جانا چاہتی تھی۔ میں تنہا تھی اور تنہا رہنا چاہتی تھی۔ مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ میں کدھر جارہی ہوں' بس اپنی دھن میں چلی جارہی تھی' کافی دیر تک چلتے رہنے کے بعد میں نے خود کو ایک پارک کے سامنے پایا اور میرے سینے سے سکون کی ایک طویل سانس خارج ہوگئی۔ مجھے کسی ایسے ہی گوشہ عافیت کی تلاش تھی' میں پارک میں داخل ہوکر ہرے بھرے درختوں کی قطاروں کے درمیان چہل قدمی کے انداز میں آگے بڑھتی ہوئی ایک ایسے گوشے میں جا پہنچی جس کے ایک طرف مکان یا فلیٹ واقع تھا۔ میرا جی سستانے کو چاہ رہا تھا۔ چنانچہ میں قریب ہی لکڑی کے ایک بینچ پر بیٹھ گئی۔ پارک بالکل سنسان پڑا تھا۔

یکایک کسی کے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔ ایک بچہ بے تحاشا میری جانب بھاگتا چلا آرہا تھا۔ وہ بے حد دبلا پتلا تھا۔ اس کے بال سیاہ تھے' جسم پر دھاری دار ٹی شرٹ اور نیکر تھی۔ پیروں میں کینوس کے جوتے تھے ناگاہ اس نے ٹھوکر کھائی اور گر پڑا۔ میں بے اختیار اس کی جانب لپکی لیکن وہ میرے پہنچنے سے قبل ہی جدوجہد کرکے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے' وہ زور زور سے ہانپ رہا تھا' مجھے اطالوی زبان سے تھوڑی بہت واقفیت تھی۔ میں اس کے قریب پہنچ کر اس زبان کے وہ الفاظ یاد کرنے لگی جو ایسے موقع پر بولے جانے چاہئیں لیکن گھبراہٹ کے عالم میں' میں ایک احمقانہ سوال کر بیٹھی۔

''کیا تمہیں چوٹ آئی؟'' حالانکہ میں دیکھ رہی تھی' کہ اس کے گھٹنے زخمی ہوگئے تھے اور ان سے خون رس رہا تھا۔

بچے نے جواب میں ایک سسکی لی' میں نے اپنا ایک بازو' اس کے کندھے کے گرد حمائل کردیا اور اسے لے کر بینچ کے پاس پہنچ گئی پھر اسے بینچ پر بٹھا کر اس کے زخموں کا معائنہ کرنے لگی۔ زخم گہرے نہیں تھے لیکن خون میں مٹی شامل ہوگئی تھی۔ میں نے اپنا رومال نکالا اور نرمی سے مٹی صاف کرنے لگی۔ لڑکے نے تکلیف سے جھرجھری لی۔

''معاف کرنا' میں تمہیں تکلیف پہنچانا نہیں چاہتی' بہتر ہے کہ تم گھر جاکر اپنے زخم اچھی طرح دھولو۔'' میں نے انگریزی میں کہا۔

''سگنورنیا! آپ انگریز ہیں؟'' لڑکے نے انگریزی میں پوچھا۔

''ہاں......'' میں نے حیرت اور مسرت کی ملی جلی کیفیت کے تحت اس کے دلکش اور معصوم چہرے کی جانب دیکھا۔ ''اس وقت میں تمہارے لیے صرف اتنا ہی کرسکتی تھی لیکن تم بہت دلیر بچے ہو' تم بہت زور سے گرے تھے' کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے لبوں پر ایک خفیف سی معصوم مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ میں نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ وہ غیر معمولی خوبصورت بچہ تھا۔ اس کے بال بے حد سیاہ' ریشم جیسے ملائم اور چمکیلے تھے' چہرہ بیضوی' آنکھیں بھوری اور خوب بڑی بڑی تھیں۔ ہونٹ تراشیدہ اور سرخ تھے۔ وہ سچ مچ قدرت کا ایک انمول شاہکار تھا۔ میں اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ وہ اپنے دل آویز ہونٹوں پر ایک نہایت دلکش مسکراہٹ بکھیرے اپنی بڑی بڑی روشن آنکھوں سے براہ راست میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

اچانک میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ میں اس کی محبت میں گرفتار ہوگئی ہوں۔ ''مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم انگریزی سمجھتے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ مجھے اطالوی زبان کے چند الفاظ ہی آتے ہیں۔ اب تم گھر جاؤ اور اپنی ممی سے کہو کہ تمہارے زخم صاف کرکے ان پر پٹی باندھ دیں۔''

میری بات سن کر وہ خاموش رہا۔ میں سمجھی کہ میری بات شاید اس کے پلے نہیں پڑی لہٰذا میں نے اپنا جملہ دہرایا۔ ”تم اب اپنی ممی کے پاس گھر چلے جاؤ۔“

”لیکن، سگنورنیا! وہ مر چکی ہیں۔“ اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

”اوہ! مجھے بے حد افسوس ہوا۔“ میں نے تاسف آمیز لہجے میں کہا۔ ”کوئی نہ کوئی تو تمہاری دیکھ بھال کرتا ہوگا؟“

وہ خاموش رہا۔

میں نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا...... پھر اس سے پوچھا ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”پیارو......“

”کتنا خوبصورت نام ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”اور تم کہاں رہتے ہو؟“

”سان انطونیو اسٹریٹ پر۔“

”کیا یہ یہاں سے قریب ہے؟“

”ہاں، سگنورنیا!“

میں اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”چلو، میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں، ٹھیک ہے؟“

ایک لمحے کے لیے وہ ہچکچایا پھر میری پیش کش قبول کر کے بینچ سے اتر آیا اور خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔

”کیا تمہیں چلنے میں تکلیف ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے دو چار قدم بڑھائے اور ہلکی سی جھرجھری لے کر مجھے مسکراتے ہوئے دیکھا۔ ”بہت تھوڑی سی تکلیف ہو رہی ہے......“ وہ بولا۔

”تم بہت باہمت بچے ہو۔“ میں نے حوصلہ دلایا۔ ”ہم آہستہ آہستہ چلیں گے اور جب تم آرام کرنا چاہو تو مجھے بتا دینا۔“

اس نے ہلکی سی سانس خارج کی اور میری رہنمائی میں اسی جانب چل پڑا جس طرف سے آیا تھا۔ میں نے اس کا ننھا سا نرم و ملائم ہاتھ تھام رکھا تھا...... اور میری دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ میں جانتی تھی کہ اسے الوداع کہنا میرے لیے کتنا مشکل ہوگا۔ ”میرا نام جینی ہے......“ میں نے اسے آگاہ کیا۔

”جینی!“ اس نے احتیاط سے میرا نام دہرایا۔

”بہت خوب......“ میں ہنس پڑی۔ ”کاش میں بھی اطالوی زبان سے اتنی ہی اچھی طرح واقف ہوتی جتنے تم انگریزی سے واقف ہو...... اور ہاں، تم نے اپنا کیا نام بتایا تھا پیارو...... صرف پیار......؟“

اس سے قبل کہ وہ جواب دیتا۔ دفعتاً ایک طرف سے ایک عورت نمودار ہوئی اور تیزی سے ہماری جانب لپکی۔ اس نے بچے کا نام لے کر پکارا اور دوسرے ہی لمحے بچے کی انگلیاں میری انگلیوں کے گرد جکڑ گئیں وہ یقیناً اس عورت کے ساتھ واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ بھرے بھرے چہرے اور مضبوط جسم کی مالک ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔ اس نے سیاہ بلاؤز اور اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ قریب پہنچتے ہی وہ بچے پر اطالوی زبان میں دھواں دھار برس پڑی اور اس کا ایک ہاتھ تھام کر جھٹکے کے ساتھ اسے مجھ سے جدا کر دیا۔

بچے نے اپنے زخمی گھٹنوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اطالوی زبان میں جواب دیا پھر میری موجودگی کی وضاحت کی۔ عورت اس تمام عرصے میں مجھے مشکوک نظروں سے گھورتی رہی تھی۔ مجھے اس کا اس طرح گھورنا بے حد عجیب لگا۔

پیارو کے خاموش ہونے پر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

”سگنورا! میں معذرت چاہتی ہوں۔ آپ کو زحمت ہوئی۔“ اس کی انگریزی کی صلاحیت اتنی ہی تھی جتنی میری اطالوی کی۔

”مجھے کوئی زحمت نہیں ہوئی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں اسے اس کے گھر واپس لے جا رہی تھی کیونکہ اس کے گھٹنے زخمی ہو گئے ہیں۔ انہیں صفائی اور مرہم پٹی کی ضرورت ہے اور......“

”بہت بہت شکریہ!“ وہ بولی اور پلٹ کر پیارو کو اپنے ساتھ گھسیٹ لیا۔ پھر اپنی زبان میں اسے ڈانٹنے لگی۔

”پیارو خدا حافظ!“ میں نے اطالوی زبان میں پکار کر کہا۔

پیارو نے مڑ کر میری جانب دیکھا اور اپنا ننھا سا ہاتھ لہرا کر مسکرا دیا۔ میں اپنی جگہ کھڑی انہیں تیز تیز قدموں سے جاتے دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک موڑ پر پہنچ کر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے ایک طویل سانس لی۔ میں متعجب ہو رہی تھی کہ وہ عورت کون تھی؟ کوئی بات میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی۔ اس عورت کے چہرے پر غصے کے علاوہ بھی کچھ تھا...... کیا خوف...... گھبراہٹ؟ کہیں وہ یہ تو نہیں سمجھ بیٹھی تھی کہ میں پیارو کو ورغلا کر اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں...... لیکن پیارو کے وضاحت کرنے کے باوجود اس کی آنکھوں سے

شک جھانک رہا تھا۔ آخر کیوں؟ میں پیارو کے بارے میں سوچنے لگی اور اس کا دلکش چہرہ میری نگاہوں میں تیرنے لگا۔ وہ میری جانب دیکھ کر کتنی معصومیت سے اپنا ہاتھ لہراتا ہوا مسکرایا تھا۔ اس کے ننھے سے ہاتھ کی نرمی اور حرارت میں اب بھی اپنے ہاتھ پر محسوس کر رہی تھی۔

اس رات مجھے مطلق نیند نہیں آئی۔ میں ساری رات بستر پر لیٹی بے چینی کے عالم میں کروٹیں بدلتی رہی۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ انہی کرب انگیز لمحات کے دوران میں نے فیصلہ کیا کہ میں جلد از جلد وینس کو خیر باد کہہ دوں گی لیکن لندن واپس نہیں جاؤں گی بلکہ کسی ایسے صحت افزا مقام کا رخ کروں گی جہاں سکون کی سانس لے سکوں۔

رات کے نہ جانے کس پہر میری آنکھ لگ گئی اور جب بیدار ہوئی تو میں دوسرا فیصلہ کر چکی تھی۔ اب میں وینس چھوڑنے سے پہلے پیارو سے ملنا چاہتی تھی۔ یہ خواہش اتنی شدید تھی کہ مجھے خود پر حیرت ہونے لگی۔ ہر چند کہ میں اس شہر میں قطعی اجنبی تھی اور اس کے گھر کے پتے سے بھی ناواقف تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح اسے ڈھونڈ نکالوں گی۔ میں نے اپنی گائیڈ بک نکال کر سان انطونیو اسٹریٹ تلاش کی اور پیارو کے لیے چند تحائف خریدنے کی غرض سے بازار کی جانب روانہ ہوگئی۔ کافی دیر تک مختلف دکانوں کی خاک چھاننے کے بعد میں نے اس کے لیے فر کا بنا ہوا ایک نہایت خوبصورت بندر، سرخ ٹی شرٹ، ایک بیلٹ اور مٹھائیوں کا ایک ڈبہ خریدا پھر سان انطونیو کی جانب چل پڑی۔

مجھے یقین تھا کہ پیارو یہ تحائف پا کر بہت خوش ہوگا۔ سان انطونیو پہنچ کر میں ایک جگہ کھڑی ہوگئی اور سوچنے لگی کہ شاید پیارو ان مکانوں میں سے کسی ایک میں سے بھاگتا ہوا برآمد ہو جائے...... چند لمحے تذبذب کے عالم میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے کے بعد میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی، سڑک کے دوسرے سرے پر پہنچ گئی اور پھر واپسی کا ارادہ کر رہی تھی کہ دفعتاً کسی مکان کا دروازہ ایک دھماکے سے بند ہوا۔ میں نے پلٹ کر آواز کی سمت دیکھا۔ ایک شخص، ایک مکان سے برآمد ہو کر مجھ سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اوسط قد اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک ایک اسمارٹ شخص تھا۔ اس کے سر پر ایک ہیٹ تھا جس کا گوشہ ایک جانب جھکا ہوا تھا۔ میں بے اختیار اس کے پیچھے لپکی۔

"معاف کیجیے گا۔" اس نے گردن گھما کر میری جانب دیکھا اور ایک سیکنڈ کی ہچکچاہٹ کے بعد تیز تیز قدم اٹھاتا، نکڑ پر مڑ کر میری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ میں نے پھر بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا اور جونہی اس مکان کے سامنے سے گزری، لاشعوری طور پر میری نگاہ اس مکان کی کھڑکی پر پڑی، وہاں مجھے اسی عورت کا چہرہ نظر آیا جو پیارو کو مجھ سے چھڑا کر لے گئی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی میرے رگ و پے میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے بڑھ کر مکان کے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحوں کے بعد دروازے میں جھری پیدا ہوئی اور اسی عورت نے جھانکا۔

"صبح بخیر سگنورا۔" میں نے گرمجوشی سے کہا۔

وہ مجھے اسی شک اور خوف کی ملی جلی کیفیت کے تحت گھور رہی تھی، جو مجھے ایک روز پہلے اس کی آنکھوں میں نظر آئی تھی۔ یکا یک اس نے بھاری آواز میں پوچھا۔ "تم کیا چاہتی ہو؟"

"معاف کرنا، میں......" میں ایک لمحے کے لیے ہچکچائی۔ "میں پیارو سے ملنا چاہتی ہوں۔ اس کے گھٹنوں کے زخم کیسے ہیں؟ میں اس کے لیے چند تحائف لے کر آئی ہوں۔ کیا میں اس سے مل سکتی ہوں؟" میں نے ایک ہی سانس میں اپنا مافی الضمیر بیان کر دیا۔

اس سے قبل کہ وہ جواب دیتی، میرے کانوں سے پیارو کی آواز ٹکرائی۔ "ماریا! باہر کون ہے؟" ارے جینی، یہ آپ ہیں؟"

وہ بھاگتا ہوا دروازے پر آ گیا۔

"ہیلو پیارو! تم کیسے ہو؟"

اچانک عورت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر کھینچ لیا۔ میں سمجھی، وہ دروازہ بند کر دے گی لیکن پیارو نے دروازے کے دونوں پٹ مضبوطی سے تھام لیے اور ساتھ ہی اس عورت کی منت سماجت کرنے لگا کہ وہ مجھے اندر آنے کی اجازت دے دے۔

عورت نے بے حد ناگواری سے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا اور دروازہ بند کرنے سے پہلے محتاط نظروں سے سڑک کے دونوں جانب دیکھا پھر جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔

وہ ایک مختصر سا نیم تاریک کمرہ تھا۔ کھڑکیوں کے شٹر آدھے گرے ہوئے تھے اور دیواروں پر بھورے رنگ کا میلا کچیلا کاغذ چڑھا ہوا تھا جس کی وجہ سے کمرے کی فضا میں ایک عجیب سی سوگواری رچی ہوئی تھی۔

"آپ کو دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔" پیارو نے ایک بھاری بھرکم کرسی گھسیٹتے ہوئے کہا۔ "تشریف رکھیں۔" اس کے چہرے سے مسرت چھلکی پڑ رہی تھی۔

"شکریہ......" میں نے کہا اور سوچنے لگی کہ اس بچے کے طور طریقے کتنے اچھے ہیں۔ "تمہارے گھٹنوں کا کیا حال ہے پیارو؟"

"خیریت پوچھنے کا شکریہ اب ٹھیک ہو چلے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

ماریا میرے سر پر کھڑی مجھے گھور رہی تھی اور مجھے اس کی بے چینی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ "مجھے امید ہے کہ تم برا نہیں مانو گی۔ میں پیارو کے لیے کچھ تحائف لے کر آئی ہوں۔"

"یہ انگریزی سے نابلد ہے۔" پیارو نے بتایا۔

"خیر، مجھے یقین ہے کہ تمہیں یہ تحائف پیش کرنے پر یہ ناراض نہیں ہوں گی۔" میں نے اپنے ساتھ لائے ہوئے پیکٹ میز پر رکھ دیے اور پیارو سے کہا۔ "انہیں کھولو۔"

پیارو نے بے تابی سے سارے پیکٹ کھول ڈالے اور اس کا معصوم سا چہرہ حیرت اور مسرت کی ملی جلی آماجگاہ بن گیا۔ اسے بندر سب سے زیادہ پسند آیا۔ وہ اسے اٹھا کر اس کے فر کے رخساروں سے اپنے ملائم رخسار رگڑنے لگا۔ میں نے ماریا کی جانب دیکھا مجھے توقع تھی کہ وہ بھی بچے کو خوش دیکھ کر میری طرح خوش ہو رہی ہوگی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"تم اسے کس نام سے پکارو گے؟" میں نے پیارو سے پوچھا۔

"امیکو......" اس نے چہکتے ہوئے جواب دیا۔

"یعنی دوست......" میں نے کہا۔ "اطالوی زبان میں دوست کو امیکو ہی کہتے ہیں نا؟"

"ہاں......امیکو کے معانی ہیں دوست۔" اس نے جواب دیا۔

میں چونک پڑی۔ اس کے لہجے کا تاثر عجیب تھا، کیا اس کا کوئی بھی دوست نہیں ہے؟ میں نے سوچا، ماریا جو ہماری گفتگو بے حد توجہ سے سن رہی تھی، اور ساتھ ہی سمجھنے کی بھی کوشش کر رہی تھی اچانک پوچھ بیٹھی۔ "تم نے یہ مکان کس طرح ڈھونڈ نکالا؟"

"پیارو نے مجھے اس سڑک کا نام بتایا تھا......لیکن مجھے گھر کا نمبر نہیں معلوم تھا، یہ میری خوش قسمتی تھی کہ سوئے اتفاق، میری نگاہ تم پر گئی، اور......"

"یہ آپ کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ رہی ہے۔" پیارو بیچ میں بول پڑا۔

ماریا کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوگئیں۔ "تم نے اسے تحائف کیوں دیے ہیں۔" اس نے پوچھا۔

"پیارو! اسے بتاؤ کہ کل ہم دونوں دوست بن گئے تھے۔" میں نے کہا۔ "اور میں یہاں سے جانے سے قبل تمہیں اپنی کوئی نشانی دینا چاہتی تھی تاکہ تم مجھے ہمیشہ یاد رکھ سکو۔"

"آپ یہاں سے چلی جائیں گی؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ "لیکن کیوں؟ آپ کہاں جائیں گی؟"

"میں ابھی کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

"آپ کب جائیں گی؟"

"شاید کل چلی جاؤں۔"

"نہیں، نہیں......خدا کے لیے مت جائیں۔" اس نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

اسی لمحے ماریا نے اس سے پوچھا کہ ہم آپس میں کیا گفتگو کر رہے ہیں۔ پیارو نے جلدی جلدی اسے اطالوی زبان میں سمجھایا اور دوبارہ میری منت سماجت کرنے لگا۔ "پلیز، آپ مت جائیں۔"

"میرا کل ہی یہاں سے جانا ضروری تو نہیں ہے۔" میں نے کہا تو اس کا چہرہ یکا یک دمک اٹھا۔ "میں سوچ رہی ہوں کہ اگر ہم کسی روز اکٹھے سیر و تفریح کے لیے چلیں تو کتنا لطف آئے گا۔ ہم کشتی یا موٹر بوٹ پر دریا کی سیر کریں گے۔" میں نے ماریا کی جانب دیکھ کر شائستگی سے پوچھا۔ "سگنورا! کیا میں کل پیارو کو سیر کرانے لے جا سکتی ہوں؟ فکر مت کرو، اس کا پورا پورا خیال رکھوں گی اور تم جس وقت بھی کہو، اسے گھر چھوڑ جاؤں گی۔"

وہ میری بات سمجھ سکی یا نہیں لیکن مفہوم ضرور سمجھ گئی۔

"نہیں" اس نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ قطعی ناممکن ہے۔"

پیارو، اطالوی زبان میں اس کی منت سماجت کرتا رہا لیکن اس کا سر مسلسل نفی میں ہل رہا تھا۔ بالآخر وہ خاموش ہوگیا۔ اس کا چہرہ اتر گیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کی خواہشیں

ما اسی طرح رد کردی جاتی ہیں۔ مجھے بے حد افسوس ہوا۔
ش میں ایسی کوئی خواہش کا اظہار ہی نہ کرتی جو اسکی مایوسی
نتج ہوئی۔ وہ عورت بے شک ایک ایسے بچے کو کسی اجنبی
ورت کے ساتھ باہر بھیجنے کی اجازت نہ دینے میں حق بجانب
ھی جو اس کی زیر نگرانی تھا...... یہ بچہ کس کا تھا اور اس نے اتنی
چھی انگریزی کہاں سے سیکھی تھی؟ مجھے تجسس ہونے لگا......
ں نے ماریا کی جانب دیکھا۔

"سگنورا! کیا میں پیارو سے ملنے دوبارہ آسکتی ہوں؟"
میری اور پیارو کی نگاہیں اس کے چہرے پر جم گئیں۔
"تم وینس کیوں آئی ہو؟" اس نے جواب دینے کی
بجائے الٹا سوال داغ دیا۔
"میں اپنی ایک سہیلی کے ساتھ تفریح کی غرض سے آئی
تھی...... لیکن اسے فوراً واپس جانا پڑ گیا اور میں تنہا رہ گئی۔" میں
نے بتایا۔

پیارو میرے قریب آ کھڑا ہوا تا کہ اگر میری کوئی بات
اس کی سمجھ میں نہ آئے تو وہ فوراً اس کا ترجمہ کردے۔ "یہاں
تمہارا کوئی اور دوست نہیں ہے؟" اس نے مشکوک لہجے میں
پوچھا۔
"نہیں...... کوئی نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔
"تمہارا شوہر کہاں ہے؟"
"مر چکا ہے۔"
وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگئی پھر پیارو سے مخاطب
ہو کر کچھ کہا۔ پیارو نے اس کا ترجمہ کر کے مجھے بتایا۔ "یہ کہہ رہی
ہے کہ آپ کل اس پارک میں کیوں موجود تھیں؟ وہ ایسی جگہ
نہیں ہے جہاں سیاح جائیں۔"
میں نے پیارو کو بتایا کہ میں چلتے چلتے تھک گئی تھی۔ اتفاق
سے وہ پارک نظر آ گیا لہٰذا کچھ دیر سستانے کی غرض سے وہاں
بیٹھ گئی تھی۔ اسی اثناء میں تم وہاں بھاگتے ہوئے آئے اور
گر پڑے۔"
"تم نے اس سے پوچھا تھا کہ یہ کہاں رہتا ہے؟" ماریہ
نے میری بات سن کر پوچھا۔
"ہاں، پوچھا تھا تا کہ اسے اس کے گھر چھوڑ آؤں، ہم چند
قدم ہی چلے تھے کہ تم آ گئی تھیں۔"
"اور تم نے ہمارا تعاقب کیا تھا؟"
"نہیں...... میں اپنے ہوٹل واپس چلی گئی تھی۔" میں نے
جواب دیا۔ مجھے اس کے سوالوں سے الجھن ہونے لگی تھی۔
"تمہارے ہوٹل کا کیا نام ہے؟"
"لارنیزی...... یہ سینٹ مارک اسکوائر کے قریب ہی
واقع ہے۔" اس تمام گفتگو کے دوران وہ مجھے مسلسل گھورتی رہی
تھی جیسے اس کی نگاہیں میرے دماغ میں گھس کر سچ اور جھوٹ کا
پتہ چلانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ "تم نے ایک ہی ملاقات
کے بعد بچے کو یہ تحفے کیوں دیے ہیں؟ تم کیا چاہتی ہو؟" اس
کا لہجہ تند تھا۔

ایک لمحے کے لیے میں ٹپٹا گئی۔ پیارو مزید میرے قریب
کھسک آیا...... اور میرا ہاتھ اپنے ننھے سے ہاتھ میں تھام لیا۔
"پیارو! اسے بتاؤ کہ میں ممتا کی ماری ہوں۔ میں نے ایک
بچے کا خواب دیکھا تھا، جو خواب ہی رہا۔ کل جب میں تمہارا زخم
صاف کر رہی تھی تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے تم میرے بیٹے
ہو۔ اسے بتاؤ کہ میرے دل میں تمہاری محبت کے سوا کچھ بھی
نہیں ہے۔"
پیارو کے ہاتھ کی گرفت میرے ہاتھ پر سخت ہوگئی اور وہ
ماریا کو میرے جذبات سے آگاہ کرنے لگا۔ ماریا کے چہرے
کے تناؤ میں پہلی بار کمی واقع ہوئی اور اس کے لب خفیف سے
مسکرائے۔
"میرے خیال میں تم ایک شفیق خاتون ہو۔" وہ بولی۔
"شکریہ......" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "کیا اب میں کل
آ کر پیارو سے مل سکتی ہوں۔"
"کل نہیں، پرسوں سہ پہر میں آسکتی ہو۔" اس نے جواب
دیا۔
"تمہارا بہت بہت شکریہ!" میرے لیے اپنی کیفیت پر
قابو پانا دشوار ہو رہا تھا۔
"تو اب آپ یہاں سے نہیں جائیں گی اور پرسوں ضرور
آئیں گی؟" پیارو نے مچل کر پوچھا۔
"ہاں...... میں وعدہ کرتی ہوں۔" میں نے اس کا رخسار
تھپ تھپایا۔
"پرسوں جب آپ آئیں گی تو میں آپ کی لائی ہوئی یہ
سرخ شرٹ پہنوں گا۔ اور امیکو بھی آپ کو دیکھ کر بہت خوش
ہوگا۔" وہ پرمسرت لہجے میں بولا اور پھر مجھ سے انگلینڈ اور لندن
کے بارے میں پوچھنے لگا۔ اب ماحول پہلے کی بہ نسبت خوشگوار
ہوگیا تھا۔ ماریا نے بظاہر میری موجودگی گوارہ کرلی تھی، اس نے

باوجود وہ بے چین اور گھبرائی گھبرائی سی لگ رہی تھی۔ جب بھی
باہر کسی راہ گیر کے قدموں کی آہٹ ابھرتی، وہ چوکنا ہو جاتی
تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ میرے وہاں سے جلد از جلد رخصت
ہو جانے کی منتظر تھی۔ چنانچہ جب میں جانے کے لیے اٹھ
کھڑی ہوئی تو اس نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی، جبکہ پیارو
مچل اٹھا۔
"پرسوں ضرور آؤں گی۔" میں نے جھک کر اس کے رخسار
کو بوسہ دیا۔ میرے اٹھتے ہی ماریا نے دروازے کے
دونوں پٹ ذرا سے کھول کر پہلے کی طرح محتاط نظروں سے
سڑک کا دائیں بائیں جائزہ لیا۔
"خدا حافظ...... سگنورا!" میں نے باہر قدم رکھتے ہوئے کہا
لیکن میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی دروازہ میرے عقب
میں بند ہو چکا تھا۔ مجھے کھڑکی میں، پیارو کا چہرہ نظر آیا لیکن
میرے ہاتھ لہرا کر الوداع کہنے سے پہلے ہی غائب ہوگیا۔
یقیناً ماریا نے اسے پیچھے گھسیٹ لیا تھا۔
میں اپنے ہوٹل کی سمت چل پڑی۔ میں مسلسل پیارو کے
بارے میں سوچ رہی تھی۔ مجھے اس کی ایک ایک بات یاد آ رہی
تھی۔ ساتھ ہی اس گھر کا پراسرار ماحول، ماریا کا شک اور خوف،
پیارو کو میرے ساتھ تفریح کے لیے بھیجنے سے انکار اور میرے
بارے میں اس کے سوالات...... یہ سب باتیں، میرے ذہن
میں شدت سے کھٹک رہی تھیں۔ پیارو کا اس عورت کو ماریا کہہ
کر مخاطب کرنا اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ اس کی رشتے دار نہیں
تھی اور مجھے یقین نہیں تھا...... مجھے یہ سب کچھ بے حد پراسرار
لگ رہا تھا اور اب میں اس راز کی تہ تک پہنچے بغیر اس شہر سے
جانا نہیں چاہتی تھی، اگر پیارو کسی خطرے میں گھرا ہوا ہے تو میں
اس کی ہر ممکن مدد کروں گی۔
میرا ذہن انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھا کہ میں راہ
بھٹک گئی۔ پہلے پہل تو مجھے پتہ نہیں چل سکا کہ میں کہاں
جا رہی ہوں...... پھر اچانک احساس ہوا کہ میں کوئی غلط موڑ
مڑ گئی ہوں۔ چنانچہ اندازے سے اپنے ہوٹل کی سمت کا تعین
کر کے، ایک ویران گلی میں مڑ گئی۔ یکا یک مجھے یوں محسوس
ہوا جیسے کوئی میرا پیچھا کر رہا ہو۔ چند قدم چلنے کے بعد میں نے
مڑ کر دیکھا لیکن مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔
میں وہ گلی عبور کر کے دوسری گلی میں داخل ہوگئی...... لیکن
احساس ایک بار پھر لوٹ آیا۔ حالانکہ یہ گلی بھی سنسان تھی۔

میں تیز تیز قدم اٹھاتی کسی پر رونق چوک تک پہنچنے کی کوشش
کرنے لگی...... اور پھر چند ہی منٹ بعد ایک بڑے چوک میں
نکل آئی۔ یہاں بے شمار کیفے واقع تھے۔ میں نے ایک چھتری
کے سائے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر کافی کا آرڈر دے
دیا اور سوچنے لگی کہ میں بھی کتنی احمق ہوں، خود اپنے ہی تصور
سے خوف زدہ ہوگئی تھی۔ بھلا کوئی میرا پیچھا کیوں کرنے
لگا...... کافی پی کر کچھ دیر سستانے کے بعد میں اپنے ہوٹل روانہ
ہوگئی۔

اسی روز میں، اپنے ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد
کافی پینے کی غرض سے چہل قدمی کرتی ہوئی ایک ایسے کیفے
میں پہنچ گئی جہاں اس سے پہلے میں نہیں گئی تھی۔
یہ کیفے لب دریا واقع تھا۔ میں کافی کا آرڈر دے کر دریا کی
لہروں پر ہچکولے کھاتی ہوئی کشتیوں کے منظر سے لطف اندوز
ہو رہی تھی کہ معاً کوئی میری میز کے قریب آ کھڑا ہوا۔ مجھے اس
وقت تک اس کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا جب تک اس نے
اطالوی زبان میں مجھے مخاطب نہیں کیا۔ میں نے چونک کر اس
کی جانب دیکھا۔ مجھے اس کے گھورنے کا انداز قطعی پسند نہیں
آیا۔
"میں اطالوی زبان نہ تو بول سکتی ہوں اور نہ سمجھ سکتی
ہوں۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔
"آہا! تو تم انگریز ہو۔" وہ چہک کر بولا۔ "کیا میں یہاں
بیٹھ سکتا ہوں؟" پھر وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر بیٹھ گیا۔
میں نے اس کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ "کیا میرا خیال
درست ہے کہ تم انگریز ہو؟" چند لمحے بعد اس نے پوچھا۔
"ہاں......" میں نے مختصر سا جواب دیا۔
"میں، تمہیں دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا، تمہاری زلفیں اس قدر
سنہری ہیں اور جلد اتنی بے داغ اور ملائم ہے کہ انگریز ہونے
کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتیں۔ تم بالکل انگلش گلاب معلوم ہوتی
ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟" وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا۔
"اتنی دیر میں ویٹر کافی لے آیا اور میں سوچنے لگی کہ اپنی
پیالی اٹھا کر کسی اور میز پر جا بیٹھوں لیکن میں خود کو تماشہ بنانے
کے خوف سے وہیں بیٹھی رہی۔ اس نے ویٹر کو شراب کا آرڈر دیا
پھر مجھ سے پوچھا۔ "سگنورا...... کیا تم شراب پیو گی؟"
"نہیں......" میں نے سرد مہری سے جواب دیا۔
"لیکن میں تنہا شغل کرنا پسند نہیں کرتا...... اور ایک حسین

وجیل لڑکی کا اتنی دلکش شام میں تنہا ہونا کتنے افسوس کی بات ہے۔ یہ حسین شام تو صرف محبت کرنے کے لیے ہے۔ کیا تم اپنے محبوب کا انتظار کر رہی ہو؟"

"نہیں......" میرا جی چاہا کہ گرم گرم کافی اس کے منہ پر اچھال دوں لیکن میں نے بڑی مشکل سے خود کو اس حرکت سے باز رکھا اور کافی کے گھونٹ جلدی جلدی حلق سے اتار کر ویٹر کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کرنے لگی تاکہ وہ بل لے آئے۔

"تمہارا کوئی محبوب نہیں ہے؟" وہ بولا۔ "لیکن یہ ماننے والی بات نہیں ہے...... کیا میں یہ کمی پوری کر سکتا ہوں؟" وہ میری جانب جھکا اور مجھے اس کی آنکھوں میں شیطانیت رقص کرتی ہوئی نظر آئی۔ میں اپنی جگہ شل ہو کر رہ گئی۔ "اب اتنی بھولی بھی مت بنو۔ سگنورا...... تمہارے یہ یاقوتی لب......"

میں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنا پرس اٹھالیا۔ اس نے میری کلائی تھام لی۔

"دیکھو، تم اس طرح مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتیں۔ میری گرفت بہت مضبوط ہے۔"

میں نے مدد کے لیے چیخنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اسی لمحے ایک تیز مردانہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "اس خاتون کی کلائی چھوڑ دو...... اور فوراً یہاں سے بھاگ جاؤ۔ سمجھ گئے؟"

اس شخص نے میری کلائی چھوڑ دی اور کھسیانے سے انداز میں دوسرے شخص سے صورت حال کی وضاحت کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے سنی ان سنی کر کے دوبارہ اسی سرد اور ٹھوس آواز میں کہا۔

"میں کہتا ہوں، خیریت چاہتے ہو تو فوراً یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

وہ شخص ایک لمحے کے لیے ہچکچایا...... پھر انتہائی ناگواری کے ساتھ کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا اور شانے اچکا کر وہاں سے چلا گیا۔

میں نے اپنے نجات دہندہ کی طرف دیکھا۔ "شش...... شکریہ! بہت بہت شکریہ۔" میں نے اپنے حواس بحال کرتے ہوئے کہا۔

"بھول جاؤ۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "خوش قسمتی سے میں نے اسے دست درازی کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔"

ویٹر جانے والے شخص کے آرڈر کی شراب اور دو گلاس لے کر آ گیا۔

"اس وقت تمہیں تھوڑی سی شراب کی ضرورت ہے۔" وہ بولا۔ "اس بھگوڑے کا آرڈر منسوخ کرنا کچھ مناسب نہیں۔"

میں ایک لمحے کے لیے ہچکچائی۔

وہ میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر بولا۔ "مجھے ابھی کچھ دیر یہاں ٹھہرنا چاہیے، ہو سکتا ہے وہ انہی اطراف میں موجود ہو۔ اس نے تمہیں خاصا پریشان کر دیا تھا۔" اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔

اب اندھیرا چھانے لگا تھا اور کیفے کی بتیاں جل اٹھی تھیں۔ میں نے روشنیوں کی چھاؤں میں اپنے نجات دہندہ کا بغور جائزہ لیا۔ وہ دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ اس کے سنہرے بالوں کی ایک لٹ پیشانی پر جھول رہی تھی۔ وہ انگریز معلوم ہوتا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے میری جانب دیکھا اور بولا۔ "میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں بالکل بے ضرر آدمی ہوں۔ میرا نام لیو کیری ہے۔"

"مجھے جینی لین کہتے ہیں۔" میں نے اپنا تعارف کرایا اور بیٹھ گئی

"خوبصورت نام ہے...... یہ لو۔" اس نے وہسکی کا گلاس میری جانب بڑھا دیا۔

میں نے گلاس اٹھالیا لیکن میرا ہاتھ کانپ گیا اور تھوڑی سی وہسکی چھلک گئی۔

"تم اب تک اپنی کیفیت پر قابو نہیں پا سکی ہو۔ تمہارے ساتھ واقعی زیادتی ہوئی ہے۔ اسے پی لو خود کو بہتر محسوس کرنے لگو گی کیا وہ بدمعاش کافی دیر سے تمہارے ساتھ بدتمیزی کر رہا تھا؟"

"نہیں......" میں نے جواب دیا۔ "اسے آئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔" میں نے شروع سے آخر تک تمام صورت حال اس کے گوش گزار کر دی۔

"ذلیل، بدمعاش...... اگر اس موقعے پر تمہارا شوہر"

"میرا شوہر مر چکا ہے۔"

"اوہ...... مجھے یہ سن کر بے حد افسوس ہوا۔ دراصل، تمہاری انگلی میں پڑی ہوئی یہ انگوٹھی دیکھ کر مجھے خیال آیا......"

"ہاں، ظاہر ہے۔" میں بول پڑی۔

"تم یقیناً یہاں تنہا نہیں آئی ہو گی؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں...... لیکن تنہا ہوں۔" میں نے جواب دیا اور ا

ساری بات بتا دی۔ "میں دراصل، آج ہی یہاں سے کہیں اور جانے کا پروگرام بنا رہی تھی اور کل روانہ ہوتی۔"

"لیکن پروگرام ملتوی کر دیا...... وہ کیوں؟"

میری نگاہوں میں پیارو کا چہرہ ابھر آیا۔ "تمہیں یہ بات کچھ عجیب سی لگے گی لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے محض ایک بچے کی خاطر یہاں رکنے کا فیصلہ کیا ہے۔" میں نے کہا اور اس سے پیارو کا غائبانہ تعارف کرانے لگی۔ پھر اچانک ہی خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔

"کیا ہوا......؟" کیری نے پوچھا۔

"بہت ممکن ہے یہ محض میرا وہمہ ہو۔" میں نے پرخیال انداز میں کہا۔ "جب وہ شخص، تمہاری دھمکی سن کر یہاں سے رخصت ہوا تو اس کی چال ہو بہو اس شخص سے مشابہ تھی جسے میں نے پیارو کے مکان سے نکلتے دیکھا تھا لیکن اس وقت مجھ پر اتنی بوکھلاہٹ طاری تھی کہ میں اس چیز پر غور نہیں کر سکی تھی۔"

"کس چیز پر غور نہیں کر سکی تھیں؟"

"یہی کہ پیارو کے مکان سے برآمد ہونے والا شخص یہی تھا۔ میں نے اسے آواز دے کر پیارو کے بارے میں پوچھنا چاہا تھا اور اس کے پیچھے لپکی بھی تھی لیکن یہ میری آواز سن کر رکا نہیں تھا بلکہ تیزی سے ایک موڑ پر گھوم کر غائب ہو گیا تھا...... اور اب میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ یہ وہی شخص تھا جو یہاں مجھ سے بدتمیزی سے پیش آیا تھا"

"ممکن ہے یہ محض اتفاق ہو۔" اس نے مشکوک لہجے میں کہا۔ "کیا تم نے ماریا سے اس شخص کے بارے میں پوچھا تھا؟"

"نہیں...... میری نگاہ میں اس کی بھلا کیا اہمیت ہو سکتی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"گویا تم اسے بھول چکی تھیں اور یہاں اس کی چال دیکھ کر تمہیں یاد آ گیا کہ یہ وہی شخص ہے۔"

"ممکن ہے یہ محض میرا واہمہ ہو۔" میں نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"بہر حال، پیارو کے بارے میں مزید بتاؤ۔"

"تمہیں اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

"میری عزیز خاتون، تم اپنی دلچسپی کی بات کرو، میں ہمہ تن گوش ہوں۔" وہ مسکرا کر بولا۔

میں ہنس پڑی۔ اس شخص کے ساتھ کتنی بے تکلفی سے گفتگو کی جا سکتی تھی۔ اس نے مجھے منتظر نگاہوں سے تکتے ہوئے اپنی پیشانی پر بکھری ہوئی لٹ کو ہاتھ سے ہٹایا لیکن وہ دوبارہ پیشانی پر آ گئی۔ اس وقفے میں مجھے اس کی پیشانی پر زخم کا ایک لمبا اور گہرا نشان نظر آیا۔

"میں اب بھی اس شخص کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔" میں نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ "پیارو کے مکان سے نکل کر جب میں اپنے ہوٹل روانہ ہوئی تھی تو مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے، میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن کوئی نظر نہیں آیا...... لیکن میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ کوئی میرا تعاقب کر رہا تھا۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ وہ شخص، تمہارے مکان میں داخل ہونے کے بعد، وہاں سے تمہارے نکلنے کا انتظار کرتا رہا تھا اور پھر اس نے ہوٹل تک تمہارا تعاقب کیا تھا...... پھر ہوٹل سے تمہارے نکلنے کا انتظار کرتا رہا اور تمہارا تعاقب کرتا ہوا یہاں آ گیا؟"

"اگر تم معاملے کو اس زاویے سے دیکھو گے تو یہ مضحکہ خیز معلوم ہو گا۔" میں نے کہا۔

"میں معذرت چاہتا ہوں...... لیکن اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو ان سب باتوں کو فراموش کرنے کی کوشش کرتا میرا خیال ہے، اب وہ دوبارہ تمہیں تنگ نہیں کرے گا۔ تم نے پیارو کو ڈھونڈ نکالا، یہی بڑی بات ہے۔ تمہاری زبان سے اس کے بارے میں سن کر، اس سے ملنے کا خواہش مند ہو گیا ہوں اور اگر تم اس کے بارے میں بہت زیادہ سوچنے لگیں تو عجب نہیں کہ میں اس سے حسد کرنے لگوں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جب تم اس سے اپنی خواہش کے مطابق مل چکی ہو تو وینس میں مزید ٹھہرنے کی کیا وجہ ہے؟"

"میں اس سے دوبارہ ملنا چاہتی ہوں۔"

"اوہ...... کب؟"

"پرسوں......" میں نے جواب دیا۔ "میں اسے سیر و تفریح کی غرض سے باہر لے جانا چاہتی تھی لیکن ماریا نے انکار کر دیا۔"

"کیا اسے یہ شک ہو گیا تھا کہ تم اسے اغوا کر لو گی؟"

"نہیں......" میں نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ "میں ایسا نہیں سمجھتی لیکن اس نے مجھ سے کئی سوالات کیے تھے۔ مثلاً میں کون ہوں، یہاں کیوں آئی ہوں، کہاں مقیم ہوں وغیرہ......

میں نے بڑی مشکل سے اس کے شکوک وشبہات رفع کیے اوراس نے مجھے دوبارہ پیارو سے ملنے کی اجازت دے دی لیکن اب بھی مجھے یقین ہے کہ وہ کسی سے حددرجہ خائف ہے۔''

''یہ سب کچھ بہت عجیب ہے۔'' اس نے رائے زنی کی پھر موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ''وینس محبت کرنے والوں کے لیے ایک عمدہ شہر ہے۔ ہنی مون کے لیے اس سے بہتر جگہ کوئی اور نہیں ہوسکتی۔''

''کیا تم شادی شدہ نہیں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''اب تک کوئی دل کو بھائی ہی نہیں...... میں اپنے خوابوں کی شہزادی کا انتظار کررہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔''

''اب میں جانا چاہتی ہوں۔'' میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''تمہارے اس عمدہ سلوک کا بہت بہت شکریہ۔''

''کیا تم مجھے اپنے ساتھ ہوٹل تک چلنے کی اجازت دے کر شکریے کا موقع نہیں دوگی؟'' اس نے شوخی سے کہا۔

''تمہاری مرضی......'' میں نے جواب دیا۔ پھر ہم چہل قدمی کے انداز میں ہوٹل کی جانب روانہ ہوگئے۔

''تم بہت خاموش ہو۔'' کچھ دور چلنے کے بعد اس نے کہا۔ ''میرے خیال میں پیارو کے بارے میں سوچ رہی ہو...... کیا تم ایک بار پھر اس سے ملنے کا ارادہ رکھتی ہو؟''

''ہاں...... بے شک۔''

''اور اس کے بارے میں سب کچھ معلوم کرنا چاہتی ہو؟''

''ہاں...... اگر ممکن ہوسکا تو۔'' میں نے کہا۔

''لیکن کیوں؟ تمہیں اس سے کیا ملے گا؟ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ تم اسے دل وجان سے چاہنے لگی ہو لیکن اگر وہ کسی خطرے میں ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ تم' اس کے لیے کچھ کرسکوگی۔ عقل مندی کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس کے معاملات سے خود کو دور رکھو۔''

''کیوں؟ میں ایسا کیوں کروں؟'' میں نے برہمی سے پوچھا۔

''طیش میں آنے کی ضرورت نہیں نیک خاتون' میں تم دونوں ہی کے فائدے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ تم نے ماریا کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے' اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دے گی اور نہ تم' اسے اس بات پر مجبور کرسکتی ہو' بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ برہم ہوجائے گی اور اپنا سارا غصہ پارو پر اتارے گی۔''

''میں صرف اس امر کی یقین دہانی چاہتی ہوں کہ اس کے خوف کا تعلق پیارو کی ذات سے نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوا تو میں کم ازکم پیارو کی مدد تو کرسکوں گی۔''

''اور اگر تم ایسا نہ کرسکیں تو؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔

چند لمحوں بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔ ''اب تم اس معاملے کو پیارو کے نکتہ نگاہ سے دیکھو...... تم اچانک اس کی زندگی میں کسی مہربان دیوی کی طرح داخل ہوئیں' اس پر اپنی محبت' خلوص اور شفقت کی بوچھاڑ کردی۔ اب اگر تم اچانک اس کی زندگی سے نکل جاؤ گی تو خود ہی سوچو کہ اس کے معصوم دل پر کیا گزرے گی۔''

''تمہاری باتیں عقل کی کسوٹی پر پوری اترتی ہیں۔'' میں نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ ''لیکن مجھے پیارو کے معاملے میں عقل کی پاسبانی ہرگز گوارا نہیں۔ میں نے اس سے پرسوں ملنے کا وعدہ کیا ہے اور اپنا یہ وعدہ ہر قیمت پر نباہوں گی۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس سے نہیں روک سکتی۔ اس کے بعد جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔'' میں نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔

''بہت ضدی ہو۔'' وہ مسکرایا۔ ''لیکن میں تمہاری اس وعدہ نبھانے والی خوبی کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میری نگاہ میں ایسی لڑکیوں کا خاص مقام ہے...... کیا تم مجھ سے بھی ایک وعدہ کروگی؟''

''اس کا انحصار سوال کی نوعیت پر ہے۔'' میں نے محتاط لہجے میں کہا۔

''صرف یہی کہ میری باتوں پر ٹھنڈے دماغ سے غور کرنا۔''

''بہتر ہے لیکن میں اپنا ارادہ نہیں بدل سکتی۔'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ کل تم بالکل فارغ ہو کیوں نہ ہم فراغت کے یہ لمحے اکٹھے گزاریں۔ دیکھو' انکار مت کرنا۔ پلیز! ہم لنچ ایک ساتھ کھائیں گے پھر اس کے بعد سیر وتفریح کریں گے۔ ٹھیک ہے؟''

اس کی یہ پیشکش کافی پرکشش تھی۔ وہ بھی کچھ کم پرکشش نہیں تھا۔ ''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ مجھے کل کا دن کسی نہ کسی طرح گزارنا ہی تھا۔ اگر میں اس کی پیش کش ٹھکرا دیتی تو اس کا متبادل نہیں تھا۔

''بہت بہت شکریہ......'' وہ خوش ہوکر بولا۔ ''میں بھی تم سے ایک وعدہ کرتا ہوں اگر تم یہ محسوس کرو کہ تمہارے پیارو کو کسی بھی قسم کی مدد کی ضرورت ہے تو میری خدمات حاضر ہیں۔ میں ہر طرح سے تم سے تعاون کروں گا۔ میرا قیام اس شہر میں ابھی کچھ عرصے رہے گا۔''

❁......❁......❁

''کیا تم نے میری بات پر غور کیا تھا؟'' اگلے روز لنچ کے دوران میں اس نے مجھ سے پوچھا۔

''ہاں...... اور میں اب بھی اس سے اپنے وعدے کے مطابق ملنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔''

''اور میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ تم ایک غلطی کررہی ہو لیکن میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ مبادا تمہاری رفاقت سے ہاتھ دھونے پڑجائیں اور میں وینس میں قیام تک ایسا نہیں چاہتا۔''

''تم کب تک یہاں قیام کروگے؟'' میں نے پوچھا۔

''اوہ...... تعطیل کے دوران' میں کبھی منصوبہ بندی نہیں کرتا...... جب جی چاہتا ہے' جہاں جی چاہتا ہے پہنچ جاتا ہوں۔'' پھر وہ میری آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔ ''فی الحال' میں وینس میں رہوں گا۔''

کھانا بے حد لذیذ تھا اور کیری کی رفاقت نے اس کا مزہ دوبالا کردیا تھا۔ وہ نہ صرف ایک اچھا ساتھی بلکہ ایک اچھا سامع بھی تھا۔ کھانے کے دوران' اس کے اصرار پر' میں نے اپنی داستان حیات اس کے گوش گزار کردی۔ وہ میرے جذبات واحساسات سے بے حد متاثر نظر آنے لگا۔

''اب میں سمجھا پیارو کے سلسلے میں تمہارے جذبات اتنے شدید کیوں ہیں۔'' اس نے میرے خاموش ہونے پر تفہیمی انداز میں سر ہلا کر کہا۔

''میرا خیال ہے کہ میں نے تمہیں اپنے بارے میں ضرورت سے زیادہ ہی بتا دیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''خیر' کوئی بات نہیں' اب تمہاری باری ہے۔''

''میں' دنیا کا ناکارہ ترین آدمی ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''صرف مصیبت میں گھری ہوئی لڑکیوں کی مدد کرتا ہوں۔''

''لیکن یہ کل وقتی نہیں بلکہ جز وقتی کام ہے۔'' میں نے

ہنس کر کہا۔
"اگر میں تمہیں اپنے پیشے کے بارے میں بتادوں تو تمہیں مایوسی ہوگی۔" وہ بولا۔
"اگر تمہارے بال لمبے نہ ہوتے تو میں تمہیں فوجی سمجھتی۔"
"تو اب ذرا خود کو سنبھالو...... میں ایک اسکول ماسٹر ہوں۔"
"اسکول ماسٹر......" میں نے اسے حیرت سے گھورا۔ "کہاں؟ کس اسکول میں پڑھاتے ہو؟"
"میں جانتا تھا تمہیں مایوسی ہوگی' اسی لیے میں بتانا نہیں چاہ رہا تھا۔" اس نے کہا۔ "شمالی انگلستان کے ایک چھوٹے سے اسکول میں پڑھاتا ہوں۔"
"مجھے مایوسی نہیں بلکہ حیرت ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔
لنچ سے فارغ ہوکر' ہم کافی دیر تک دریا کی سیر کی اور خوب لطف اندوز ہوئے...... پھر دھوپ کی تمازت سے میرے سر میں درد ہونے لگا اور کیری مجھے ہوٹل تک چھوڑ کر واپس چلا گیا لیکن جانے سے قبل' اگلے روز صبح گیارہ بجے آنے کا وعدہ کرگیا۔ اس رات میں گھوڑے بیچ کر سوئی۔ نیند اتنی گہری تھی کہ کسی کے زور زور سے دستک دینے پر بھی نیم بیداری کی کیفیت میں آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ اب سر میں درد تو نہیں تھا لیکن سر بھاری ضرور تھا۔
"کون ہے؟" میں نے خمار آلود آواز میں پوچھا۔
"سگنورا! ایک عورت آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" باہر سے جواب آیا۔ "اس کا نام ماریا ہے۔"
"ماریا......" میرے ذہن پر چھائی ہوئی غنودگی ایک دم صاف ہوگئی۔ "اچھا ٹھہرو...... ہاں' اسے بھیج دو۔" میں نے بستر سے اتر کر جسم پر گاؤن ڈال لیا...... تھوڑی دیر بعد دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ میں نے بڑھ کر دروازہ کھولا ہی تھا کہ وہ تیزی سے مجھے دھکیلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوگئی۔ اس کے سر پر اسکارف بندھا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کا چہرہ تقریباً چھپ گیا تھا۔ اس نے دروازہ جلدی سے اپنے عقب میں بند کردیا۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔
"سگنورا! میں اسی وقت تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"
میرے ہوش اڑ گئے۔ خدا خیر کرے میں سمجھ گئی کہ پیارو کو کچھ ہوگیا ہے۔ "کیا بات ہے؟ پیارو تو خیریت سے ہے؟ کیا وہ بیمار ہے؟" میں ایک دم بوکھلا گئی۔ "کیا اسے چوٹ آئی ہے؟"
جواب میں اس نے مجھ پر اطالوی الفاظ کی بارش کردی۔ میری سمجھ میں خاک نہیں آرہا تھا۔
"انگریزی بولو' تمہارا ایک لفظ بھی میرے پلے نہیں پڑ رہا ہے۔" میں نے وحشت آمیز لہجے میں کہا۔
وہ یکایک خاموش ہوکر بے بسی سے مجھے گھورنے لگی اور اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔
"کیا تم مجھے پیارو کے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔ "کیا پیارو کو کچھ ہوگیا ہے؟"
"وہ خیریت سے ہے۔" اس نے جواب دیا اور اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ "لیکن کل اسے جانا پڑے گا۔"
"جانا پڑے گا...... کہاں جانا پڑے گا؟"
اچانک اس نے بڑھ کر میرے دونوں ہاتھ تھام لیے اور آنسو اس کے گالوں پر بہہ نکلے۔ "سگنورا......" وہ ملتجیانہ لہجے میں تقریباً چیخ پڑی۔ "تم اسے لے جاؤ' تم اسے چاہتی ہو نا...... اس کی مدد کرو۔"
میں اس کی باتوں کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرنے لگی' میرے سر میں ایک بار پھر درد شروع ہوگیا تھا۔ جی چاہا کہ دیواروں سے اپنا سر پھوڑ لوں۔
"سگنورا!" وہ سسکی لے کر بولی۔ "اس کی مدد کرو...... پلیز...... پلیز اسے لے جاؤ۔"
ایک لمحے کے لیے مجھے خیال گزرا کہ وہ چاہتی ہے' میں پیارو کو گود لے لوں اور اسے اپنے ساتھ لندن لے جاؤں...... میرے دل میں مسرت کی کلیاں چٹخنے لگیں۔ "اب یہ رونا دھونا بند کرو۔" میں نے بظاہر جھنجلا کر کہا۔ "تم چاہتی ہو کہ میں پیارو کی مدد کروں...... ٹھیک ہے' میں اس کی مدد کروں گی لیکن تمہیں بتانا پڑے گا کہ تم ایسا کیوں چاہتی ہو؟ کیا وہ خطرے میں ہے؟"
"ہاں' ہاں...... زبردست خطرہ۔" وہ زور زور سے سر ہلا کر بولی۔ "تم اسے لے جاؤ۔ اس کی حفاظت کرو۔"
"کیا تم چاہتی ہو کہ وہ میرے ساتھ ہوٹل میں رہے۔"
"نہیں' وینس محفوظ جگہ نہیں ہے۔ تم اسے تربول لے جاؤ۔"

"تربول......" میں نے حیرت سے کہا۔ "یہ کہاں ہے؟"
اس نے اطالوی اور انگریزی کا ملغوبہ بنا کر بڑی مشکل سے سمجھایا کہ تربول' گارڈا جھیل کے کنارے آباد' ایک گاؤں ہے...... میں پیارو کو وہیں لے جاؤں۔ وہاں ایک ولا ہے' میں اس میں قیام کروں...... اور اس کا انتظار کروں۔"
"تم کب ہمارے پاس آؤ گی؟" میں نے پوچھا۔
"میں نہیں جانتی لیکن جلدی...... تم کل اسے لے جاؤ گی۔ اسے ہر طرح محفوظ رکھو گی۔" اس نے ایک بار پھر میرے ہاتھ تھام لیے' تب مجھے محسوس ہوا کہ وہ کانپ رہی تھی۔ اس کا رواں رواں التجا کررہا تھا۔
میں اتنا تو سمجھ پائی تھی کہ پیارو کسی خطرے سے دوچار ہے۔ لیکن وہ خطرہ کس نوعیت کا تھا' اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ مجھے ایک ایسے بچے کے ساتھ جس سے میں صرف دوبار ملی تھی' اٹلی کے ایک دور دراز اور اجنبی مقام تک سفر کرنے کا خیال بڑا عجیب سا محسوس ہورہا تھا...... لیکن پیارو خطرے میں تھا اور مجھے اسے ایک محفوظ مقام تک لے جانا تھا۔
"تم ایسا ہی کرنا جیسا میں کہہ رہی ہوں۔" ماریا نے التجا کی۔
"ٹھیک ہے۔" میں نے جواب دیا۔
اس نے میرے ہاتھوں پر بوسوں کی بارش کردی اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "سگنورا! تمہارا ہزار ہزار بار شکریہ۔"
میں نے آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑالیا۔ میرے ذہن میں بہت سے سوالات کلبلا رہے تھے جو میں اس سے پوچھنا چاہ رہی تھی۔ اچانک اس نے اپنی جیب سے ایک چابی نکال کر میری طرف بڑھادی۔ "یہ لو...... اسے رکھ لو۔"
"کیا یہ اسی ولا کی چابی ہے؟"
"ہاں......"
"کل تم پیارو کو خود لے کر آؤ گی یا میں جا کر لے آؤں؟" میں نے پوچھا۔
"نہیں' یہ مناسب نہیں۔ وہ تمہیں صبح پونٹ ریالٹو میں ملے گا...... اتنے بجے۔" اس نے دونوں ہاتھ آگے کرکے' سات انگلیاں میرے سامنے کردیں۔
"بہتر ہے' میں صبح سات بجے وہاں پہنچ جاؤں گی۔"
"بہت بہت شکریہ' سگنورا! اب میں چلتی ہوں۔"
وہ جونہی دروازے کی جانب بڑھی' میں تیزی سے اس کے اور دروازے کے درمیان حائل ہوگئی۔ "نہیں......" میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "اگر تم چاہتی ہو کہ میں' پیارو کی مدد کروں تو تمہیں اس کی وجہ بتانی پڑے گی اور ساتھ ہی یہ بھی کہ وہ کون ہے اور اس کا پورا نام کیا ہے۔"
میں تو سمجھی تھی کہ وہ انکار کردے گی لیکن چند لمحوں کی ہچکچاہٹ کے بعد وہ بولی۔ "اس کا پورا نام پیارو فیلینی ہے۔"
"اور اس کے ماں باپ......؟" میں نے پوچھا۔
"اس کی ماں مر چکی ہے۔"
"اور اس کا باپ......؟"
"پلیز سگنورا...... مجھے اب جانے دیں۔"
"ہرگز نہیں...... پہلے بتاؤ' اس کا باپ کہاں ہے؟"
اس کے چہرے پر پھر ہچکچاہٹ کے آثار پیدا ہوگئے۔ چند لمحے وہ میری آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر سرگوشیانہ انداز میں بولی۔ "وہ جیل میں ہے...... بہت لمبی سزا...... برا آدمی...... وہ آئے گا' پیارو کو لے جائے گا...... پیارو تباہ و برباد...... تم اسے لے جاؤ...... محفوظ رکھو۔"
اب میں سمجھی کہ وہ پیارو کے باپ سے خوف زدہ رہتی تھی۔ شاید اس کی سزا پوری ہوچکی تھی اور وہ جیل سے رہا ہوکر آگیا تھا یا آنے والا تھا۔ ظاہر ہے' وہ پیارو کو اس سے چھین کر لے جاتا اور اسے جرائم کی راہ پر ڈال دیتا یا کسی قسم کا نقصان پہنچاتا...... لیکن یہ بھید اب بھی نہیں کھلا تھا کہ اس نے کتنا سنگین جرم کیا تھا۔ یقیناً وہ شخص شقی القلب ہی رہا ہوگا جبھی ماریا' اس سے اس قدر خوفزدہ رہتی تھی...... وہ یہاں آکر پیارو کا نہ جانے کیا حشر کرتا' مجھے اس خیال ہی سے وحشت ہونے لگی۔
"ٹھیک ہے...... میں اپنے وعدے کے مطابق پیارو کو لے جاؤں گی۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم' پولیس کو ضرور اس بات سے آگاہ کردینا۔"
"نہیں' نہیں...... پولیس نہیں۔" وہ دوبارہ بید مجنوں کی مانند کانپنے لگی۔ "تم بھی کسی کو مت بتانا کہ تم' تربول جارہی ہو' وعدہ کرو...... کہ تم کسی کو نہیں بتاؤ گی۔"
"بہتر ہے...... میں وعدہ کرتی ہوں۔" میں نے کہا۔
وہ کافی دیر تک میری آنکھوں میں جھانکتی رہی جیسے یقین کرنا چاہتی ہو کہ میں اپنا وعدہ نباہوں گی یا نہیں...... پھر وہ تیزی سے میرے قریب سے گزر کر' دروازے سے نکل گئی۔
اس کے رخصت ہونے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں نے

کتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے۔

میں نے اپنے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے تاکہ یکسوئی سے اس معاملے پر غور کرسکوں۔ پیارو کا باپ ایک خطرناک مجرم تھا اور وہ آکر ماریا سے اپنے بیٹے کو چھین کر لے جانا چاہتا تھا' ماریا کو یہ خوف دامن گیر تھا کہ وہ پیارو کو نقصان پہنچائے گا چنانچہ اس نے مجھ سے پیارو کی جان بچانے کی درخواست کی تھی...... لیکن وہ خود اسے تربول کیوں نہیں لے جاتی؟ اگر وہ اس سے واقعی اتنی دہشت زدہ تھی تو پیارو کو لے کر غائب ہوجانے سے بہتر اور کیا بات ہوسکتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ پولیس سے تحفظ طلب کرسکتی تھی لیکن اس نے ایسا کرنے سے انکار کردیا تھا۔

اگر میں اس کی باتوں سے پریشان نہ ہوگئی ہوتی اور ہمارے درمیان زبان کا فرق حائل نہ ہوتا تو میں اس سے ضرور پوچھتی کہ کیا پیارو کو میرے ساتھ بھیجنے کے بعد وہ اپنے گھر میں فیلینی کا انتظار کرے گی اور جب وہ آئے گا تو اسے پیارو کے گم ہوجانے کی کوئی فرضی کہانی سنائے گی یا بتادے گی کہ اسے کون اور کہاں لے گیا ہے؟

میں نے ہوٹل کا بل ادا کیا اور تربول کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بعد اپنا سامان باندھنے لگی۔ ایک لمحے کے لیے سوچا کہ کیری کے نام کوئی تحریری پیغام چھوڑ جاؤں...... لیکن اگر وہ پیغام' کیری کے دھوکے میں کسی غلط آدمی کے ہاتھ لگ گیا تو؟ یہ سوچتے ہی میں خوف زدہ ہوگئی۔ میرا خیال تھا کہ ماریا' پیارو کو اس مقام پر چھوڑنے آئے گی تو اس سے باقی معلومات حاصل کرلوں گی...... لیکن دوسری صبح جب میں وہاں پہنچی تو پیارو کو تنہا کھڑا پایا...... وہ بے حد پرسکون نظر آرہا تھا۔ مجھے ماریا پر بے حد غصہ آیا۔ میں تیزی سے پیارو کی جانب لپکی۔

"ہیلو پیارو کیا ماریا تمہارے ساتھ نہیں آئی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں......" اس نے جواب دیا۔ "اس نے کہا تھا کہ میں یہاں آپ کا انتظار کروں' آپ آئیں گی۔" اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

"کیا اس نے تمہیں بتادیا تھا کہ ہم دونوں ایک نئے سفر پر روانہ ہورہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں......اور میں بے حد خوش ہوں۔" وہ پرمسرت لہجے میں بولا۔ پھر اس نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ماریا نے یہ مجھے آپ کے حوالے کرنے کی ہدایت کی تھی...... میرے اخراجات ہیں اس میں۔"

"ٹھیک ہے' میں اسے حفاظت سے اپنے پاس رکھوں گی......" میں نے سوچا' جب وہ تربول آئے گی تو یہ رقم اسے واپس کردوں گی۔

❀......❀......❀
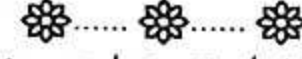
ہمارا سفر خاصا طویل تھا۔ پہلے ہم نے بذریعہ ٹرین 'ویرونا' تک سفر کیا اور وہاں سے بذریعہ آبی بس' تربول روانہ ہوئے۔ دوران سفر مجھے' پیارو کے حالات جاننے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ میں نے اس سے پوچھا۔ "تم نے اتنی اچھی انگریزی کہاں سے سیکھی؟"

"میں تو شروع سے انگریزی ہی میں گفتگو کرتا آرہا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"تمہیں انگریزی کس نے سکھائی؟"

"میری ممی نے۔ وہ' آپ ہی کی طرح انگریز تھیں۔" اس نے بتایا۔

میری سانس سینے میں رک گئی۔ "کیا......؟" میں حیرت سے اسے گھورنے لگی۔ "ان کی موت کے وقت تمہاری عمر کیا تھی؟" میں نے پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔ "مجھے یاد نہیں لیکن اس ستمبر میں' میں آٹھ سال کا ہوجاؤں گا۔ ماریا' مجھے انگریزی کی کتابیں لاکر دیتی رہتی تھی اور میں نہایت بڑے شوق سے ان کا مطالعہ کرتا تھا۔ میرا ایک انگریز دوست تھا' ٹام...... لیکن وہ کہیں اور چلا گیا' نہ جانے وہ لوگ مجھے کیوں چھوڑ جاتے ہیں جو مجھے پسند ہوتے ہیں۔" اس کے لہجے میں اداسی پھیل گئی۔

"اوہ' میرے چاند......" میں نے شدت جذبات سے اس کا ننھا سا ہاتھ تھام لیا۔

"آپ بھی مجھے چھوڑ کر چلی جائیں گی؟" اس نے آزردگی سے پوچھا۔

"مم......میں......میں......" میں گھبرا گئی۔

"خدا کے لیے آپ میرے پاس رہیں۔" اس نے بے حد ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

"میں جب تک رہ سکی رہوں گی۔"

"نہیں آپ وعدہ کریں کہ ہمیشہ میرے پاس رہیں گی۔"

"پیارو......" میں اس کے اصرار پر بوکھلا گئی۔ "کوئی بھی ایسا وعدہ نہیں کرسکتا' میں نے تم سے کہا تو ہے کہ جب تک رہ سکی رہوں گی۔"

اس نے مایوسی سے ایک ہلکی سی سانس لی اور اپنا ہاتھ آہستگی سے مجھ سے چھڑا لیا۔ "لیکن اسے ہمیشہ رہنا تو نہیں کہتے۔ آپ بھی اوروں کی طرح مجھے چھوڑ جائیں گی۔"

"اچھا' اب جانے کی باتیں چھوڑو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "ابھی تو ہم نے اپنے نئے سفر کا آغاز کیا ہے...... ارے' وہ دیکھو۔" میں نے دو آدمیوں کی جانب اشارہ کیا' جو پانی پر اسکیٹنگ کرتے ہوئے بہت تیزی سے ہماری آبی بس کے قریب سے گزرے تھے۔

"بالکل' پاپا کی طرح۔"

"کیا تمہارے پاپا بھی اسکیٹنگ کرتے تھے؟" میں نے پوچھا۔

اس کے چہرے پر حیرت اور الجھن کے آثار پھیل گئے۔ "مجھے یاد نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے سوچا' اب اسے ذہن پر مزید زور دینے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ماریا نے تم سے تربول آنے کے لیے کہا تھا؟"

"میں نہیں چاہتا کہ وہ آئے۔" اس نے ناپسندیدگی سے کہا۔ "وہ ایک بار پھر مجھے گھر میں قید کردے گی۔ آپ تو ایسا نہیں کریں گی نا؟"

"نہیں ڈارلنگ' ہم خوب سیر و تفریح کریں گے۔" میں نے اسے یقین دلایا اور اس نے اطمینان کی ایک طویل سانس لی۔

آبی بس' ہمیں گھاٹ پر بنے ہوئے پلیٹ فارم پر اتار کر چلی گئی۔ گھاٹ کے اطراف میں بے شمار کیفے واقع تھے اور ہمیں بھوک بھی لگ رہی تھی۔ چنانچہ ہم سامان اٹھا کر ایک کیفے میں جاپہنچے' کھانا کھایا اور کیفے کے قریب ہی واقع ایک گیراج سے کار کرائے پر حاصل کرکے ولا کی جانب روانہ ہوگئے۔ ہماری کار تنگ اور پرپیچ راستوں پر تیزی سے گامزن تھی۔ تھوڑی دیر بعد' ڈرائیور نے ایک موڑ کاٹا اور کار بائیں جانب روک دی۔ ہماری منزل آگئی تھی' میں کار سے باہر آگئی۔

میری نگاہوں کے سامنے' بے شمار رنگ برنگ پھولوں اور خودرو جھاڑیوں میں گھرا ہوا ایک دو منزلہ مکان تھا اور ہرچند کہ آبادی سے بالکل الگ تھلگ' ایک ویران اور سنسان مقام پر واقع تھا لیکن اس سے وہ ویرانی اور اداسی ہویدا نہیں تھی جس کی مجھے توقع تھی۔ میں نے سامان اتار کر ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور پھر پیارو کو اتار لیا۔

"دیکھو' کتنی پیاری جگہ ہے۔" میں نے کہا لیکن اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہ ہو۔ وہ یک ٹک مکان کو گھورے جارہا تھا۔ اس کے چہرے سے الجھن اور پریشانی آشکار تھی۔ اس کی اس کیفیت نے مجھے نروس کردیا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا' اسے لے کر واپس اپنے ہوٹل چلی جاؤں لیکن پھر خیال آیا کہ یہی وہ مکان ہے جو اس بچے کو تحفظ فراہم کرے گا...... چنانچہ میں نے اپنی کیفیت پر قابو پاکر مسکراتے ہوئے کہا۔ "آؤ' اندر چلیں۔"

میں چاہتی تھی کہ وہ ہنسے' مسکرائے' مسرت کا اظہار کرے۔ جلدی سے دروازہ کھولنے پر اصرار کرے لیکن وہ خلاف توقع اپنی جگہ گم صم کھڑا تھا۔ بالآخر میں نے بڑھ کر دروازہ کھولا اور ہم کمرے میں داخل ہوگئے۔ کمرہ بالکل تاریک تھا۔ اس کی ساری کھڑکیاں بند تھیں۔ دروازہ کھلنے پر کمرے میں روشنی در آئی اور نیم تاریک کمرہ بھوتوں کا مسکن معلوم ہونے لگا۔ یکایک دروازے کی زنجیر' ہوا کی چھیڑ خانی سے بج اٹھی اور میں بے اختیار اچھل پڑی۔

"اوہ' خدایا......" دوسرے ہی لمحے میری ہنسی چھوٹ گئی۔ "میں بھی کتنی احمق ہوں۔"

مجھے توقع تھی کہ میری اس حرکت پر پیارو بے اختیار ہنس پڑے گا لیکن اس کی کیفیت میں سرمو فرق نہیں آیا۔

"آؤ' کھڑکیاں کھول دیں تاکہ روشنی اور تازہ ہوا کا گزر ہوسکے۔" میں نے کہا اور بڑھ کر کھڑکیاں کھولنے لگی۔ کمرے کا فرنیچر بے حد گرد آلود ہورہا تھا۔ میں نے ایک کشن اٹھالیا اور اس سے مخاطب ہوئی۔ "میری کچھ مدد تو کرو۔" لیکن اس نے جیسے میری آواز سنی ہی نہیں۔ وہ بدستور دہلیز پر کھڑا اپنے دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھایا۔ "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

وہ اپنے خیالات سے چونک کر میری طرف متوجہ ہوا۔

ہاں میں ٹھیک ہوں۔"

"میرا خیال ہے تم پر سفر کی تکان غالب ہے حالانکہ تم آبی ں میں بھی سوئے تھے۔ اب اگر تھوڑی دیر کے لیے مزید وجاؤ تو تمہاری طبیعت ہشاش بشاش ہوجائے گی۔ آؤ بستر لاش کرتے ہیں۔" میں نے کہا اور چند لمحے توقف کے بعد وبارہ گویا ہوئی۔ "فکر مت کرو۔ ماریا بہت جلد یہاں آجائے گی۔ میرے خیال میں اسے یہ مکان بے حد پسند آئے گا۔"

"وہ کیوں آئے گی؟ یہ اس کا گھر نہیں ہے۔" پیارو نے ناگواری سے کہا۔

مکان میں تین بیڈ رومز اور ایک باتھ روم تھا۔ بالائی منزل پر دو مختصر سے بیڈ رومز ایک دوسرے سے ملحق تھے اور کپڑوں کی ایک الماری تھی۔

"پیارو! یہ بیڈ روم تمہارے لیے بہت عمدہ رہے گا۔ کیا تم یہاں سونا پسند کروگے؟"

اس مرتبہ بھی اس نے مجھے نظر انداز کردیا لیکن میرے کمرے سے نکلنے سے قبل وہ یکا یک بھاگتا ہوا الماری تک گیا اور اس کی ایک دراز کھول کر اسے گھورنے لگا۔ جب میں اس کے بستر کے لیے ریشمی چادر لے کر لوٹی تو وہ کھڑکی کے پاس کھڑا باہر کے مناظر دیکھ رہا تھا۔ میری آہٹ پا کر وہ گھوما تو اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ "میں جانتی ہوں کہ ابھی یہ جگہ تمہیں غیر مانوس لگ رہی ہوگی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن دیکھو تو' یہ کتنا پیارا گھر ہے' کل ہم بازار جائیں گے اور میں تمہیں ڈھیر ساری چیزیں خرید کردوں گی...... پھر تم' ان سے اپنی یہ بڑی سی شاندار الماری بھر لینا۔" پھر میں نے اس کا بستر ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ "میں اس سے ملحق کمرے میں سوؤں گی...... اب دیکھو' یہ بستر کتنا آرام دہ ہوگیا ہے۔"

میں نے اپنا سامان بیڈ روم میں پہنچایا اور پھر اس کی چیزیں لے کر اس کے کمرے میں گئی۔ وہ لباس تبدیل کیے بغیر' بستر پر بیٹھا...... الماری کو خاموشی سے گھور رہا تھا۔ "یہ دیکھو' میں تمہارے امیکو کو بھی لے آئی ہوں۔" میں نے بندر' اس کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے اسے خاموشی سے تھام لیا...... میں چند لمحے' بے بسی سے اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔ "اگر تم لباس تبدیل کرنا نہیں چاہتے تو صرف جوتے اتار کر لیٹ جاؤ۔"

میں نے اس کے جوتے اتارے اور وہ فرمانبرداری سے بستر پر دراز ہوگیا۔ میں نے جھک کر اسے بوسہ دیا۔ "خوب اطمینان سے سونا۔ میں برابر والے کمرے میں ہوں۔ اگر میری ضرورت محسوس ہو تو آواز دے لینا۔" میں نے کہا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے میں نے اسے دیکھا تو وہ چھت کو گھور رہا تھا۔

اس کے اس ناقابل فہم اور عجیب رویے نے مجھے خاصا فکرمند کردیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی بات اسے پریشان کررہی ہے۔ میں نے اپنی طرف سے تو کوشش کی تھی کہ اس کی الجھن دور کردوں لیکن نہ جانے اس کے ننھے سے دماغ میں کیا تھا۔

اپنا سامان کھولتے ہوئے' اچانک مجھے اس مکان کے مالک کے بارے میں جاننے کی خواہش ہوئی اور میں سامان ویسے ہی چھوڑ کر دبے پاؤں چلتی ہوئی دوسرے کمرے میں پہنچ گئی۔ یہ بڑا بیڈ روم تھا اور اس میں...... دو مسہریاں پہلو بہ پہلو بچھی ہوئی تھیں۔ میں نے بڑھ کر کپڑوں کی الماری کھولی اور اس کی تلاشی لینے لگی۔ سارے خانے بالکل خالی پڑے تھے۔ ابھی میں مایوس ہو کر واپسی کا ارادہ کر رہی تھی کہ میری نگاہ' دو درازوں پر پڑی۔ میں نے ایک دراز کھینچ کر خانے سے نکال لی۔ اس میں کچھ کاغذات بڑی نفاست اور قرینے سے رکھے ہوئے تھے لیکن امتداد زمانہ نے انہیں زردی مائل کردیا تھا۔ میں دراز کو اس کے خانے میں واپس رکھ رہی تھی کہ کوئی شے اس میں سے نکل کر گر پڑی۔ میں نے اسے اٹھا کر دیکھا۔ وہ ایک رنگین تصویر تھی' تصویر میں ایک مرد' ایک عورت اور اس کا بچہ نظر آرہا تھا۔ عورت حسین اور کم عمر معلوم ہوتی تھی۔ اس کا چہرہ بچے پر جھکا ہوا تھا جس کے باعث اس کی زلفوں نے اس کے چہرے کے ایک رخ کو چھپا دیا تھا لیکن مرد کا چہرہ بالکل واضح تھا۔ وہ بھی بچے کو دیکھ رہا تھا اور اس کے لبوں پر بڑی نرم مسکراہٹ رقص کررہی تھی۔ وہ دراز قامت شخص تھا اور اس کے بال بھی اپنی بیوی کے بالوں کی طرح سیاہ تھے۔ وہ نہ جانے کیوں مجھے صورت آشنا معلوم ہوا۔ حالانکہ مجھے یقین تھا کہ میں اس سے کبھی نہیں ملی تھی لیکن پھر بھی یہ احساس ہوتا تھا کہ اس سے مل چکی ہوں۔ مجھے اس کی مسکراہٹ مانوس سی لگ رہی تھی۔ میں کچھ دیر تک اس تصویر کو دیکھتی رہی پھر اسے پلٹ کر دیکھا اس کی پشت پر لکھا تھا۔ "کارلو' پیارو اور میں...... اولپز ولا۔"

یکا یک میرے عقب میں کسی کے قدموں کی چاپ ابھری...... میں چونک کر تیزی سے مڑی۔ گھبراہٹ میں تصویر میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ پیارو تھا۔ "اوہ' پیارو' میں تو سمجھی تھی تم سوگئے ہو۔" میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

وہ ایک لمحے کے لیے سہما سہما سا نظر آیا لیکن جب میں مسکرائی تو وہ میرے قریب آگیا اور جھک کر تصویر اٹھالی اور اسے دیر تک گھورتے رہنے کے بعد بول پڑا۔ "دیکھیے' یہ میری ممی ہیں۔"

"اوہ...... بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور تب مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ وہ مرد مجھے صورت آشنا کیوں معلوم ہورہا تھا۔ وہ دراصل پیارو کا جوان عکس تھا۔ میرے ذہن میں یکا یک ہلچل سی مچ گئی...... کیا یہ حسین و جمیل شخص مجرم ہوسکتا ہے؟ اس میں مجرموں جیسی کوئی بات نہیں تھی۔ کہیں یہ اندھے قانون کی بھینٹ تو نہیں چڑھ گیا۔ ورنہ اتنے عرصے سے جیل میں کیوں سڑ رہا ہے؟ اور ماریا کو یہ خوف کیوں دامن گیر ہے کہ وہ' پیارو کو نقصان پہنچائے گا؟

میں نے پیارو کو اپنے پہلو میں کھینچ کر اس کے گرد اپنا بازو حمائل کردیا۔ "اور تصویر میں جو بچہ نظر آرہا ہے' وہ تم ہو۔" میں نے کہا۔ "تمہیں یقیناً یاد نہیں ہوگا کہ یہ تصویر کب کھینچی گئی تھی۔"

"مجھے یاد ہے۔" اس نے انتہائی پرجوش لہجے میں جواب دیا۔ "جب ہم یہاں آئے تھے تو اس وقت مجھے کچھ یاد نہیں آرہا تھا لیکن اس گھر کے در و دیوار مجھے مانوس سے لگ رہے تھے۔ اس وقت سے اپنے کمرے میں یہی سوچتا رہا تھا لیکن کافی غور کرنے کے باوجود مجھے کچھ یاد نہیں آرہا تھا لیکن اب مجھے سب کچھ یاد آگیا ہے۔"

اب مجھ پر اس کے عجیب و غریب رویے کا راز کھلا۔ یہ گھر اس کا تھا...... یہاں اس نے اپنے والدین کے ساتھ نہ جانے کتنا عرصہ گزارا تھا۔ اس کا باپ کارلو فیلینی اس گھر کا مالک تھا۔ تو پھر ماریا نے اس بچے کو میرے ساتھ یہاں کیوں بھیجا تھا؟ کیا اس لیے کہ کارلو جیل سے رہا ہوتے ہی یہاں کا رخ کرلے۔ پیارو بڑے غور سے تصویر کا جائزہ لے رہا تھا۔

اچانک وہ پوچھ بیٹھا۔ "یہ کون ہیں؟ میرے پپا؟"

وہ اپنے ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا...... پھر یکا یک بول پڑا۔ "وہ بہت لحیم شحیم تھے۔ مجھے ہوا میں بہت اونچا اچھالتے تھے اور تھام لیتے تھے۔ مما بہت ڈرتی تھیں لیکن میں ہنستا رہتا تھا۔"

"تم نے انہیں آخری دفعہ کب دیکھا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے یاد نہیں۔" اس نے ایک سرد آہ بھری۔ "بہت عرصے پہلے مما مجھے لے کر وینس چلی گئی تھیں۔"

"اچھا تو صرف تمہاری ممی اور تم وینس گئے تھے۔ وہاں تم دونوں کس کے ساتھ رہتے تھے' ماریا کے ساتھ؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "ماریا تو اس وقت آئی تھی جب مما بیمار پڑی تھیں۔"

"کیا تمہاری مما' تمہارے پپا کے بارے میں کچھ بتاتی تھیں؟"

بچے کا معصوم چہرہ یکا یک مرجھا گیا۔ وہ بے حد مغموم نظر آنے لگا۔

"وہ کہتی تھیں کہ پپا مر گئے ہیں اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی تھیں۔ لہٰذا میں ان سے پپا کے بارے میں نہیں پوچھتا تھا۔ اور پھر ایک روز وہ بھی مر گئیں۔ پھر ماریا نے مجھ سے کہا کہ اب مجھے اس کے ہاں چل کر رہنا پڑے گا لیکن مجھے اس کے ہاں رہنا پسند نہیں تھا۔ اس کا مکان بہت تاریک تھا اور پھر وہاں مما بھی نہیں تھیں۔ ماریا' مجھے انگریزی کی کتابیں لا کر دیا کرتی تھی' مجھے یاد ہے' مما اور پپا بھی انگریزی میں گفتگو کیا کرتے تھے۔" اس کے معصوم چہرے پر اداسی پھیلی ہوئی تھی۔

"ماریا کا سلوک تمہارے ساتھ کیسا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"مما جیسا نہیں تھا۔" وہ خفیف سا مسکرایا۔ "اور آپ جیسا بھی نہیں تھا لیکن وہ مجھے مارتی نہیں تھی...... وہ مجھے گھر سے نکلنے نہیں دیتی تھی اور یہ مجھے پسند نہیں تھا۔"

"کیا تم کبھی گھر سے نہیں نکلے تھے؟"

"ایک روز' ماریا کے ہاں ایک مرد آیا تھا۔ اس کے بعد' ماریا نے مجھے کبھی گھر سے نہیں نکلنے دیا تھا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"زیادہ عرصے کی بات نہیں ہے۔"

"وہ کون تھا؟"

"میں نہیں جانتا' ماریا نے مجھ سے کہا تھا کہ اس کے رخصت ہونے تک میں بالائی منزل پر رہوں۔ لہٰذا میں اسے نہیں دیکھ سکا لیکن جب وہ رخصت ہوا تو میں نے کھڑکی سے

اسے جاتے دیکھا تھا۔“
”کیا تمہیں یاد ہے کہ وہ دیکھنے میں کیسا لگتا تھا؟“ میں نے پوچھا۔
”میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔“ اس نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔ ”کیونکہ اس کا ہیٹ اس کے چہرے پر جھکا ہوا تھا لیکن وہ چھوٹے قد کا چوڑا چکلا آدمی تھا اور یوں چلتا تھا۔“ اس نے ہنس کر اس کی چال کی نقل کی۔
میرا دل یکبارگی اچھلا۔ وہ اسی شخص کی نقل کر رہا تھا جسے میں نے ماریا کے گھر سے برآمد ہوتے دیکھا تھا اور پھر جو مجھ سے کیفے میں ٹکرایا تھا۔ ”میرے خیال میں میں بھی اسے دیکھ چکی ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ اس روز ماریا کے ہاں گیا تھا جس روز میں تم سے ملنے گئی تھی، ہے نا؟“
”ہاں لیکن وہ اس سے پہلے بھی ایک بار آ چکا تھا۔ اسی کے بعد ماریا نے مجھے باہر نکلنے سے منع کر دیا تھا۔“
”لیکن تم سے تو میری ملاقات گھر کے باہر ہوئی تھی۔“
”میں وہاں سے فرار ہو رہا تھا۔“
”تم فرار ہو رہے تھے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”لیکن کہاں؟“
اس نے بے پروائی سے اپنے نحیف کندھے اچکائے۔ ”میں نہیں جانتا، ماریا مجھ سے بے حد خفا تھی۔ وہ کہتی تھی کہ اگر میں، اس کے کہنے کے مطابق عمل نہیں کروں گا تو میرے ساتھ کوئی بہت ہی خراب حادثہ پیش آ جائے گا۔“
میرے ذہن میں آہستہ آہستہ ایک تصویر سی ابھرتی چلی گئی۔ لیکن ابھی یہ تصویر دھندلی تھی اور اس کے بعض حصے اوجھل تھے، میں نے پیارو سے مزید سوالات کیے اور اس کی روشنی میں جو خاکہ کھینچا، وہ کچھ یوں تھا کہ وہ تقریباً تین سال کا ہوگا کہ جب اس کی ماں، اسے لے کر وینس چلی گئی تھی اور یہ نقل مکانی، اس کے باپ کی گرفتاری کے بعد ہی ہوئی ہوگی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے باپ سے کوئی اتنا بھیانک جرم سرزد ہوا تھا کہ اس کی ماں نے اسے مردہ تصور کر لیا تھا۔ اسی غم نے سے بیمار ڈال دیا اور وہ گھل گھل کر آخر موت کے منہ میں جا پہنچی تھی اور یہ بچہ بے سہارا ہونے کے بعد ماریا کی پناہ میں آ گیا تھا...... اس کا باپ ایک مجرم تھا اور مجھے یقین تھا کہ اس کا رابطہ اس پستہ قامت شخص سے تھا لیکن اس شخص کے، ماریا کے ہاں پہنچنے کے بعد، ماریا نے پیارو کو گھر سے نکلنے سے کیوں منع کر دیا تھا؟ اور اس پستہ قامت شخص نے کیفے تک میرا تعاقب کیوں کیا تھا؟ اس کا تعاقب یقیناً بے مقصد نہیں تھا...... لیکن اگر وہ مجھے پیارو سے دور رہنے کی دھمکی دینا چاہتا تھا تو پھر اس نے مجھ سے ایسا سلوک کیوں کیا تھا کہ میں اس کی کوئی بات سنے بغیر وہاں سے بھاگ نکلوں؟
برخلاف اس کے، ماریا کا رویہ قابل فہم تھا۔ شروع شروع میں شاید اسے یہ شک گزرا تھا کہ میں بھی کارلو سے تعلق رکھتی ہوں جبھی اس نے مجھ سے نجی سوالات کیے تھے لیکن جب وہ میری طرف سے مطمئن ہوگئی تو اس کے ذہن میں خیال رینگنے لگا کہ میں پیارو کو اس کے باپ کے ہاتھوں سے بچا سکتی ہوں۔ دوسرے روز یقیناً کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہوگا کہ اسے بچے کی جان خطرے میں محسوس ہوئی ہوگی۔ لہٰذا وہ بھاگی بھاگی میرے پاس آئی۔ یہ سب باتیں قابل فہم تھیں لیکن صرف ایک بات ایسی تھی جو مجھے مخمصے میں ڈال رہی تھی۔ اس نے مجھے پیارو کے ساتھ خاص طور پر اس ولا میں کیوں بھیجا تھا جبکہ میں پیارو کو لے کر اٹلی کے کسی بھی ایسے دور دراز مقام پر جا سکتی تھی جہاں کارلو کے پہنچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے یہ گوارا نہ تھا کہ ماریا آ کر پیارو کو مجھ سے چھین کر لے جائے۔ مجھے شدت سے اس کا انتظار تھا۔ میں چاہتی تھی کہ اس کے آتے ہی ہم یہاں سے فوری طور پر کہیں نکل جائیں، جہاں کارلو کے بہ آسانی پہنچنے کا امکان نہ ہو۔
پیارو اپنے بندر امیکو کو سینے سے لپٹا کر سو گیا۔ میں نے بھی اپنے کمرے کی راہ لی اور سارے کپڑے دوبارہ سوٹ کیس میں رکھ دیے تاکہ ماریا کے آتے ہی ہم یہاں سے رخصت ہو سکیں۔
اگلی صبح ناشتے کے بعد، میں پیارو کو لے کر گاؤں کی جانب نکل کھڑی ہوئی۔ دن بے حد روشن تھا۔ میں نے بازار سے پیارو کے لیے کچھ کپڑے اور کھلونے خریدے پھر پکانے کے لیے سبزیاں خرید کر، گھومتی پھرتی جھیل کی سمت نکل گئی۔ وہاں چند بچے کھیل رہے تھے۔ میں ایک عورت کے پاس بیٹھ گئی، جو اخبار کے مطالعے میں مصروف تھی۔ پیارو پہلے تو جھجکا پھر ان بچوں کے ساتھ کھیلنے لگا اور میں اس عورت سے گفتگو کرنے لگی۔
”میں وینس میں رہتی ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”اور محض تفریح کی غرض سے تربول آئی ہوں۔“

”وینس بے حد خوبصورت شہر ہے۔“ میں نے خیال آرائی کی۔
”ہاں واقعی......“ اس نے اتفاق کیا پھر ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ”لیکن اتنے حسین شہر میں بھی ایسے گھناؤنے جرم ہوتے ہیں۔“ اس نے اخبار کا ایک صفحہ کھول کر ایک سرخی کی جانب اشارہ کیا اور بولی۔ ”جہاں یہ بدنصیب عورت قتل کی گئی ہے۔ اسی کے آس پاس میری بہن رہتی ہے۔“ اس نے اخبار میری جانب بڑھا دیا۔
”مم...... میں اطالوی نہیں پڑھ سکتی۔“ میں نے ہکلا کر کہا۔
وہ مجھے اس خبر کا ترجمہ سنانے لگی۔ اور میری رگوں میں خون کی بجائے پگھلی ہوئی برف دوڑنے لگی۔ میرا جسم سرد ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر کھیلتے ہوئے بچوں کی آوازیں مجھے جھیل کے اس پار سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ میرے کانوں میں عورت کی آواز گونج رہی تھی جو یہ بتا رہی تھی کہ سیان انطونیو اسٹریٹ پر ماریا نامی ایک خاتون کو چاقو گھونپ کر قتل کر دیا گیا ہے۔
یکایک میں اچھل کر اٹھ کھڑی ہوئی اور چیخ کر پیارو کو آواز دی۔ عورت نے حیرت سے مجھے دیکھا اور کچھ کہا لیکن میں نے ٹوکری اٹھائی اور پیارو کا ہاتھ تھام کر تیزی سے ولا کی جانب روانہ ہوگئی۔ میرے قدم اتنی تیزی سے اٹھ رہے تھے کہ پیارو کو میرا ساتھ دینے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ ایک موقعے پر وہ تقریباً گر پڑا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اسے اٹھایا، لیکن اپنی رفتار میں کمی نہیں آنے دی۔
”آپ، مجھ سے ناراض ہوگئی ہیں؟“ اس نے دکھ سے پوچھا۔ ”لیکن میں نے تو ایسی کوئی حرکت نہیں کی ہے۔“
مجھے اپنے سخت رویے کا احساس ہوا تو میں یکلخت رک گئی۔ ”نہیں، پیارو، میں تم سے ہرگز ناراض نہیں ہوں لیکن ہمیں جلد از جلد ولا پہنچنا ہے۔“ میرا دماغ بری طرح گردش کر رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے...... ماریا قتل کر دی گئی تھی۔ اخبار نے قاتل کا نام شائع نہیں کیا تھا لیکن میں جانتی تھی کہ قاتل، کارلو کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا...... وہ یقیناً اپنے بیٹے کی تلاش میں اس کے گھر گیا ہوگا اور جب اس نے اسے نہیں پایا ہوگا تو عالم طیش میں ماریا کو قتل کر دیا ہوگا...... لیکن کیا ماریا نے مرنے سے قبل اسے بتا دیا ہوگا کہ پیارو کو کہاں لے جایا گیا ہے؟
اب مجھے اس بچے کو کسی ایسی جگہ لے جانا تھا جہاں اس کے پہنچنے کے بارے میں اس کا باپ سوچ بھی نہ سکے...... اس کے بعد میں پولیس کے پاس جاؤں گی اور اول تا آخر سارا ماجرا ان کے گوش گزار کر دوں گی اور بتاؤں گی کہ میرے پاس یہ یقین کرنے کی ٹھوس وجہ ہے کہ کارلو ہی ماریا کا قاتل ہے۔ میں نے سوچا۔
ہم ولا کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اچانک مجھے اپنے عقب میں کسی کار کے انجن کی آواز سنائی دی۔ ”میں آپ سے پہلے ولا پہنچ جاؤں گا۔“ پیارو نے کہا اور مجھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر تیزی سے مکان کی جانب دوڑا۔ میرے ہاتھ میں وزنی ٹوکری تھی لہٰذا میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ یہی وہ موقع تھا کہ کار کی آواز نے مجھے رک کر مڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر کارلو ہوگا۔ پیارو بھی کچھ فاصلے پر رک گیا تھا۔ میں نے چاہا کہ چیخ کر اسے کہیں چھپنے کی ہدایت کر دوں، کار کی ونڈ اسکرین سورج کی تیز روشنی میں چمک رہی تھی۔ لہٰذا مجھے ڈرائیور کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کار میرے قریب آ کر رک گئی اور ڈرائیور دروازہ کھول کر اتر آیا۔ وہ کیری تھا۔
”اوہ، کیری، یہ تم ہو۔“ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ میرے قدم لڑکھڑا گئے۔ اس نے جلدی سے مجھے تھام لیا۔ اس کی آمد کسی معجزے سے کم نہ تھی۔
”جینی...... کیا بات ہے؟“
”مم...... میں سمجھی...... میں سمجھی کہ......“
”ٹھیک ہے...... اس وقت بات کرنے کی کوشش مت کرو۔ تم مجھے مل گئیں، یہی سب سے اہم ہے۔ آؤ کار میں بیٹھو۔“
اس نے مجھے کار میں بٹھایا اور ڈرائیونگ کر کے وہاں پہنچا جہاں پیارو کھڑا ہمیں گھور رہا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ ”یہ پیارو ہے۔“ میں نے کیری سے کہا۔
”میں سمجھ گیا تھا کہ یہی پیارو ہوگا۔“ کیری نے خوش دلی سے کہا۔ ”ہیلو، پیارو۔“
پیارو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اسے کار میں بیٹھنے کی دعوت دی...... لیکن اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ”آپ جائیں میں پیدل پہنچ جاؤں گا۔“
کار آگے بڑھ گئی۔ میں نے دیکھا وہ سر جھکائے چھوٹے

چھوٹے قدم اٹھاتا چلا آرہا تھا۔
"اوہ کیری تم نہیں جانتے کہ خلاف توقع تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے کتنا سکون محسوس ہورہا ہے۔ اب تم ہمیں یہاں سے نکالنے میں ہماری مدد کرسکتے ہو۔ کروگے نا؟ سامان باندھنے میں صرف چند منٹ لگیں گے۔" میں نے کہا۔
مکان کے قریب پہنچ کر اس نے کار روک دی۔ میں کار سے اتر کر تیزی سے مکان کی جانب بڑھی۔ "تمہارا کیا مطلب ہے؟" وہ میرے پیچھے پیچھے آتا ہوا بولا۔ "ہم کہاں جائیں گے اور کیوں جائیں گے؟"
"یہ وضاحت کا موقع نہیں ہے۔" میں جلدی سے بولی۔ "وہ کسی وقت بھی یہاں آسکتا ہے۔"
"کون......؟"
"پیارو کا باپ کارلو فیلینی۔"
"ایک منٹ...... تمہاری ایک بات بھی میرے پلے نہیں پڑی ہے۔ اگر تم پیارو کے باپ سے خائف ہو تو فکر نہ کرو۔ میں یہاں ہر قسم کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے موجود ہوں۔ مجھے تفصیل سے بتاؤ...... تمہاری اس پریشانی کا سبب کیا ہے؟"
میں نے پیارو کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلا دیا۔ جو کمرے میں داخل ہورہا تھا۔ کیری میرا اشارہ سمجھ گیا اور موضوع بدلتے ہوئے بولا۔
"اس وقت مجھے شدید بھوک لگ رہی ہے تمہاری ٹوکری میں خورد ونوش کی چیزیں ہیں اور میری کار میں وہسکی کی دو بوتلیں پڑی ہوئی ہیں' پیارو! کیا تم وہ بوتلیں' کار میں سے نکال لاؤ گے؟"
پیارو کے چہرے پر منفی تاثرات پھیل گئے لیکن وہ بادل نخواستہ مڑا اور کمرے سے نکل گیا۔ "سب سے پہلے ہم شکر سیر ہوکر کھانا کھائیں گے پھر تم لڑکے کو کھیلنے کے لیے بھیج دینا' اس دوران میں ہم تبادلہ خیال کرلیں گے۔ اب تم پریشان ہونا چھوڑ دو۔"
"میں نہیں جانتی کہ تم کیسے اور کیوں یہاں پہنچ گئے؟" میں نے کہا۔ "لیکن تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے بے حد مسرت ہورہی ہے۔" اسی وقت پیارو بوتلوں سمیت کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے کے تاثرات کچھ اتنے عجیب سے تھے کہ میں پریشان ہوگئی...... اور اس کی جانب بڑھتی ہوئی کیری سے مخاطب ہوئی۔ "میں لنچ تیار کرتی ہوں۔ تم ٹوکری میں سے سبزیاں نکالو......"
لنچ کے دوران' کیری ادھر ادھر کی دلچسپ باتیں کرتا رہا۔ پیارو بمشکل کچھ کھا رہا تھا اور کیری کے سوالوں کے جواب صرف ہوں' ہاں میں دے رہا تھا۔ آخر میں نے کہا۔ "اگر تم مزید کھانا نہیں چاہتے تو بالائی منزل پر چلے جاؤ اور اپنے نئے کھلونوں سے کھیلو۔"
وہ فوراً اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔ "اس کا رویہ خلاف معمول ہے۔" میں نے کیری کو آگاہ کیا۔ "کوئی بات اسے پریشان کررہی ہے' کہیں اس نے میرے منہ سے اپنے باپ کا ذکر تو نہیں سن لیا؟ میں شروع ہی سے بے حد محتاط ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ اسے اس بات کا ہلکا سا احساس بھی ہوجائے کہ اس کی جان خطرے میں ہے۔"
"کیا مطلب......؟" وہ چونک پڑا۔
میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے ہر لمحہ' کسی دوسری کار کے پہنچنے کا دھڑکا لگا ہوا تھا لیکن کیری کی موجودگی مجھے تحفظ کا احساس دلا رہی تھی۔ "مجھے شروع سے ساری بات بتاؤ۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔" کیری نے کہا۔
میں نے اس سے جدا ہونے سے لے کر' ماریا کے قتل ہونے تک کے تمام واقعات گوش گزار کردیے۔ میرے خاموش ہونے پر اس نے ایک گہری سانس لی۔ "تمہاری حواس باختگی اور سراسیمگی کی وجہ میری سمجھ میں آگئی ہے۔ تم واقعی قابل معافی ہو۔" وہ مسکرایا۔
"قابل معافی......؟"
"ہاں...... اگلے روز میں تمہارے ہوٹل گیا تو معلوم ہوا کہ تم وہاں سے جاچکی ہو۔ مجھے بڑا اچنبھا ہوا کیونکہ مجھے یقین نہیں تھا کہ تم' میرے نام کوئی پیغام چھوڑے بغیر کہیں چلی جاؤ گی...... پھر مجھے تمہاری باتیں یاد آئیں' تم نے بتایا تھا کہ تم پیارو کے بارے میں بے حد فکر مند ہو اور ایک شخص نے کیفے تک تمہارا تعاقب بھی کیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ تمہارے ساتھ غیر متوقع طور پر کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آگیا ہے۔ ورنہ ہوٹل سے اچانک یوں رخصت ہوجانا کیا معنی رکھتا ہے۔ جبکہ میں نے تم سے کہا تھا کہ اگر تمہیں میری مدد کی ضرورت پیش آئے تو میں ہر طرح سے تمہاری مدد کروں گا۔ یقین کرو میں پریشان ہوگیا۔ پھر جب میں نے استقبالیہ کلرک سے استفسار کیا تو اس نے

بتایا کہ تم اس سے تربول کے راستوں کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔

''ہاں...... لیکن تم یہاں کیسے پہنچے؟''

''تربول پہنچ کر' میں نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا انہوں نے سنہری زلفوں والی ایک حسین انگریز خاتون کو دیکھا ہے جس کے ساتھ ایک اطالوی بچہ ہے۔ میرا قیاس تھا کہ پیارو تمہارے ساتھ ہوگا۔''

''پھر گیراج کے مالک نے تمہاری رہنمائی کی ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں......'' اس نے جواب دیا۔

''کیری! اب ہمیں ہر حالت میں یہاں سے نکلنا ہے کیا تم' ہماری مدد کرو گے؟''

''کہہ نہیں سکتا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا تم ہماری مدد نہیں کرو گے؟''

''میں بے شک تمہاری مدد کروں گا۔ یہاں میری موجودگی کا سبب یہی ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ منہ اٹھا کر جدھر سینگ سمائے بھاگ نکلنا کوئی عقل مندی ہوگی۔ تم' پیارو کو لے کر اس ملک سے نہیں نکل سکتیں' کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''میں جانتی ہوں لیکن ہمارے سامنے سارا ملک پڑا ہے...... ہم کسی بھی ایسی جگہ پناہ لے سکتے ہیں جہاں اس کا باپ نہ پہنچ سکے۔'' میں نے کہا۔

''اور اس کے بعد کیا ہوگا؟ تمہاری تمام رقم خرچ ہو جائے گی اور تمہیں ہر لمحے یہ دھڑکا لگا رہے گا کہ اس کا باپ اب آیا۔''

''میں ملازمت کرلوں گی۔'' میں نے اپنے عزم کا اظہار کیا۔

''کیا تمہیں ورک پرمٹ مل سکے گا اور کیا تم جانتی ہو کہ اٹلی میں ملازمین کو کتنی تنخواہ ملتی ہے؟ میری عزیز خاتون! تم بہت پیاری ہو اور ہر پہلو سے مثالی ہو لیکن......''

''جب پریشان ہونے کا وقت آئے گا تو پریشان ہولوں گی۔'' میں نے ضدی لہجے میں کہا۔ ''اس وقت ہمیں صرف سوچنا ہے۔''

''ہمیں نہیں...... صرف تمہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ذرا اس وقت کا تصور کرو کہ تم بالکل قلاش ہو چکی ہو اور ملازمت ملنے کی امید دم توڑ چکی ہے...... پھر کیا ہوگا؟ تم بے شک انگلستان جا سکتی ہو...... لیکن پیارو کا کیا بنے گا؟''

''میں کسی نہ کسی طرح' کچھ نہ کچھ کرلوں گی۔''

''میں' تمہاری ہمت اور خوش فہمی کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' وہ سر ہلا کر بولا۔ ''اور یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ اس وقت تم سنجیدگی کا ثبوت نہیں دے رہی ہو۔ میں نہیں جانتا کہ نیت ہزار اچھی ہونے کے باوجود' کسی اطالوی بچے کو لے کر کہیں غائب ہو جانے کے سلسلے میں اٹلی کا قانون کیا کہتا ہے۔''

''خدا کے لیے وقت ضائع مت کرو۔'' میں نے مضطرب ہو کر کہا۔ ''میں جانتی ہوں کہ تم ہوش مندانہ باتیں کر رہے ہو لیکن اس وقت میں...... ہوش مندی کا ثبوت دینا نہیں چاہتی۔ صرف پیارو کو لے کر یہاں سے کہیں روانہ ہو جانا چاہتی ہوں۔ اگر تم ہمیں یہاں سے نکال لے جانے پر رضامند نہیں ہو تو......''

''جو کہ ظاہر ہے۔'' وہ درمیان میں بول پڑا۔

میں نے اسے غصیلی نظروں سے گھورا لیکن اس نے میری ان نگاہوں کی پروا نہیں کی اور اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ''کم از کم اس وقت میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میرے خیال میں ہمیں فی الحال ایک منصوبہ تشکیل دینا چاہیے میری بات ذرا غور سے سنو۔''

میں نے احتجاج کرنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے منع کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ماریا قتل ہو چکی ہے اور پولیس قاتل کی تلاش میں ہے۔ وہ مقتولہ کے پڑوسیوں سے پوچھ گچھ کر کے یہ معلوم کرلیتی ہے کہ مقتولہ کے ساتھ ایک لڑکا رہا کرتا تھا جس کا نام پیارو فیلینی تھا اور وہ پراسرار انداز میں لاپتہ ہو گیا ہے...... اس کا باپ کون ہے؟ کارلو فیلینی' جو ابھی جیل سے رہا ہوا ہے' وہ اس کی پوری زندگی کھنگالیں گے پھر اس کی تصویر لے کر دوبارہ مقتولہ کے محلے میں پہنچ جائیں گے اور ایک ایک فرد سے پوچھیں گے کہ کیا انہوں نے اس شخص کو اس علاقے میں دیکھا تھا' کیا ماریا نے کبھی کسی سے اس کا تذکرہ کیا تھا؟ کیا وہ اس بات سے خوف زدہ تھی کہ لڑکے کا باپ آ کر' لڑکے کو لے جائے گا؟ اس کے بعد وہ تفتیش کی راہ متعین کر کے اس امر کا سراغ لگائیں گے کہ کارلو فیلینی' اس کے گھر گیا تھا لیکن اسے وہاں اپنا بچہ نہیں ملا...... اور جب ماریا نے اس کے بارے میں کچھ بتانے سے انکار کر دیا تو اس نے اشتعال میں آ کر اسے قتل کر دیا۔ میں نہیں جانتا کہ اطالوی پولیس کی تفتیش کا طریقہ کار کیا ہے لیکن اس سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہوگا جیسا کہ میں بتا رہا ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ بہرکیف پولیس' اس کے ریکارڈ سے اس کا پتہ نوٹ کرلے گی۔ فیلینی جانتا ہے کہ پولیس اس کی تلاش میں ہے لہٰذا جب تک یہ معاملہ دب نہیں جاتا' وہ کبھی ایسی جگہ کا رخ نہیں کرے گا جہاں پولیس پہلے ہی مرحلے میں چھاپہ مار کر اسے گرفتار کرلے۔ لہٰذا اگر پولیس کسی بھی لمحے یہاں چھاپہ مار بیٹھی تو مجھے کوئی تعجب نہیں ہوگا۔''

''لیکن فرض کرو' فیلینی پر جنون سوار ہے اور وہ کسی بھی بات کی پروا کیے بغیر پیارو کو ڈھونڈ نکالنا چاہتا ہے تو کیا اس صورت میں وہ' پولیس کے پہنچنے سے پہلے ہی یہاں نہیں پہنچ جائے گا؟''

''اگر وہ یہاں پہنچ گیا......'' کیری نے مسکرا کر کہا...... ''تو کیا میں یہاں تم دونوں کی حفاظت کے لیے موجود نہیں ہوں۔ تمہیں اس سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے صرف پیارو کی طرف سے تھوڑی سی پریشانی لاحق ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اگر پولیس آ گئی...... تو صورت حال خاصی نازک اور پیچیدہ ہو جائے گی۔ تمہارے پاس کہنے کے لیے صرف یہی ہے کہ ماریا نے اسے یہاں لانے کے لیے تم سے درخواست کی تھی اور وہ مر چکی ہے۔ پولیس کے لیے یہ تعین کرنا دشوار ہو جائے گا کہ تم اسے لے کر اس گھر میں کیوں آئیں؟ خیر' پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے خیال میں پولیس پہلے قاتل کی تلاش میں سارے وینس کی خاک چھانے گی اور اس عرصے میں ہمیں سوچنے کا موقع مل جائے گا۔''

''تمہارا شکریہ......''

''میں ایک بات نہایت دیانت داری سے صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں۔'' وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''تم ناراض تو نہیں ہوگی؟''

''نہیں...... ہرگز نہیں۔''

''میں صرف تمہاری وجہ سے خود کو اس معاملے میں ملوث کر رہا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پیارو بہت پیارا لڑکا ہے لیکن تمہاری بات کچھ اور ہے۔ تم میرے لیے بہت کچھ ہو۔ تم سوچو گی کہ میں بھی کتنا جذباتی انسان ہوں کہ دو ہی ملاقاتوں میں حدیث دل بیان کرنے بیٹھ گیا۔ لیکن حقیقت آخر حقیقت ہی ہے۔ تمہیں یاد ہے' اس شام' میں نے تم سے کیفے میں کہا تھا کہ کوئی نہ کوئی حسینہ کبھی نہ کبھی میری زندگی میں ضرور داخل ہوگی اور میں اسے پہچان جاؤں گا کہ وہی میری منزل ہے...... تو میں اسے پہچان گیا ہوں۔ اس کا نام جینی ہے۔''

''اوہ' کیری! میں تمہاری شکر گزار ہوں کہ تم نے......''

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں جانم!'' وہ بیچ ہی میں بول پڑا۔ ''میں صرف اپنے جذبات تم تک پہنچانا چاہتا تھا تاکہ تمہیں مجھ پر اعتبار آ جائے۔ تم مجھ پر مکمل بھروسہ کر سکتی ہو۔''

''میں' تم پر بھروسہ کرتی ہوں۔''

''شکریہ' اب تم فیلینی کی گرفتاری تک یہیں رہو۔ پولیس بہت جلد اسے گرفتار کرلے گی۔ اس کی گرفتاری کے بعد تم منظر عام پر آ کر اپنی کہانی سنا دینا۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''اگر اس نے ماریا کی رہائش گاہ پر اپنی انگلیوں کے نشانات نہیں چھوڑے ہوں گے تو پولیس کے پاس' اس کے خلاف سوائے اس کے اور کوئی ثبوت نہیں ہوگا کہ وہ پیارو کا باپ ہے اور یہی وہ موقع ہوگا' جب تم پولیس کو حلفیہ بیان دے سکو گی کہ مقتولہ ماریا' اس سے بے حد خائف رہتی تھی۔ کیونکہ اس نے اسے دھمکی دی تھی کہ جیل سے رہا ہو کر وہ اسے اور پیارو کو قتل کر دے گا۔ اب چونکہ وہ جیل سے رہا ہونے والا تھا لہٰذا ماریا نے تم سے بچے کی جان بچانے کی درخواست کی تھی۔ تمہارا یہ بیان پولیس کے لیے کافی اہمیت کا حامل ہوگا۔''

''لیکن میں ایسا کوئی حلفیہ بیان نہیں دے سکتی۔''

''لیکن تم نے خود مجھ سے کہا تھا کہ......''

''میں نے تم سے وہی کہا تھا جو ماریا نے مجھ سے کہا تھا۔''

''بات تو وہی ہوئی۔''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ماریا بے شک دہشت زدہ تھی اور اس نے کہا تھا کہ اگر پیارو نے وینس نہیں چھوڑا تو اس کی زندگی کو زبردست خطرہ لاحق رہے گا لیکن یہ اس نے ہرگز نہیں کہا تھا کہ اس کے باپ نے کسی قسم کی دھمکی دی تھی۔ یہ محض میرا قیاس تھا اور دنیا کی کوئی عدالت کسی کے قیاس کی بنیاد پر کسی کے خلاف فیصلے نہیں سنایا کرتی۔''

''تمہاری باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔'' اس نے اکتا کر کہا۔ ''کیا تم یہ نہیں سمجھتیں کہ قانون کو تمہارے بیان کی کتنی

شدید ضرورت ہے۔ اور تمہاری گواہی مجرم فیلینی کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوگی۔ کیا تم ماریا کے قاتل کو آزاد گھومتے دیکھنا چاہتی ہو؟ کیا تم چاہتی ہو کہ وہ پیارو کو ڈھونڈ نکالے؟''

''نہیں...... میں ماریا کے قاتل کو پھانسی پر لٹکتا ہوا دیکھنا چاہتی ہوں۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''اور کیا تم نہیں جانتیں کہ فیلینی ہی ماریا کا قاتل ہے؟''

''ہاں......'' میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہارا کہنا بجا ہے لیکن میری نگاہ میں وہ شخص بھی ہے جس نے کیفے تک میرا تعاقب کیا تھا۔ وہ ماریا کے گھر بھی گیا تھا اور پیارو نے بھی اسے دیکھا تھا۔''

''اچھا...... اس نے تم سے اس کے بارے میں کیا کہا تھا؟''

''اس نے اس کی شکل تو نہیں دیکھی تھی لیکن جو حلیہ بیان کیا تھا وہ ہو بہو اسی کا تھا۔''

''میرے خیال میں تم اب بھی کسی غلط فہمی کا شکار ہو۔''

''ایک اور بات نے بھی مجھے الجھن میں مبتلا کر رکھا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر ماریا کو یقین تھا کہ پیارو کا باپ اسے نقصان پہنچانا چاہتا ہے تو اس نے لڑکے کو میرے ساتھ یہاں کیوں بھیجا؟ کیا اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ جیل سے رہا ہوتے ہی اپنے گھر کا رخ کرے گا؟''

''کیا اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ بھی جلد از جلد یہاں پہنچے گی؟ ہوسکتا ہے اس نے عارضی طور پر اسی ٹھکانے کو واحد محفوظ ترین مقام تصور کیا ہو اور سوچا ہو کہ فیلینی کے یہاں پہنچنے سے قبل ہی وہ خود یہاں پہنچ جائے گی اور پھر فوری طور پر یہاں سے کہیں اور روانہ ہوجائے گی۔''

''اگر یہی بات تھی تو اس نے مجھ سے مدد کی درخواست کیوں کی؟ وہ خود پیارو کو لے کر کہیں بھی غائب ہوسکتی تھی۔''

''ممکن ہے اس کے لیے اسے ایک یا دو دن کی مہلت درکار ہو۔''

میں اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ باہر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی لیکن میرے ذہن میں شور برپا تھا۔ ''مجھے شدت سے یہ احساس ہو رہا ہے کہ درمیان سے کوئی کڑی غائب ہے۔ کاش! میں جان سکتی کہ وہ کون سی کڑی ہے۔'' میں نے کہا۔

کیری اٹھ کر میرے قریب آگیا اور نہایت شائستگی سے بولا۔ ''پریشان ہونا چھوڑ دو۔ صرف یہ ذہن نشین کرلو کہ میں تمہاری حفاظت کے لیے یہاں موجود ہوں۔ میرے کہنے کے مطابق عمل کرو۔ سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔''

''میں اب پیارو کے پاس جا رہی ہوں۔'' میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا اور بالائی منزل کی سیڑھیاں طے کرتی ہوئی پیارو کے کمرے میں پہنچ گئی۔ وہ اپنے بستر پر آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ میں جلدی سے اس پر جھک گئی۔

''پیارو! کیا تم سو رہے ہو؟''

اس نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ آنکھیں سختی سے بھینچ لیں۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے میرا ہاتھ ایک جھٹکے سے دور کردیا اور کروٹ بدل کر چیخا۔ ''چلی جاؤ' یہاں سے چلی جاؤ۔''

میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ ''کیا بات ہے پیارو؟''

اس بار بھی اس نے جواب نہیں دیا۔ اس کا رویہ میرے لیے ناقابل فہم تھا۔ میں کچھ دیر تک تذبذب کی کیفیت میں اسے دیکھتی رہی' میں اسے اس عالم میں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی لیکن وہ اتنی شدت سے مجھے رد کر رہا تھا کہ میرا اب وہاں ٹھہرنا بے کار تھا۔ ''ٹھیک ہے پیارو! میں بعد میں آؤں گی' اگر تمہیں میری ضرورت محسوس ہو تو بلا لینا۔ میں نچلی منزل میں ہوں۔''

میں نے واپس جا کر' کیری کو اس کے رویے سے آگاہ کیا...... تو وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ ''وہ مجھ سے حسد کرنے لگا ہے۔'' اس نے کہا۔

میں اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ ''کیری' میں صرف ایک بات جانتی ہوں کہ ہم جتنی جلدی یہاں سے روانہ ہوجائیں' اتنا ہی بہتر ہے۔ میں ہرگز نہیں چاہتی کہ پولیس' اس کی موجودگی میں یہاں چھاپہ مارے اور نہ ہی یہ چاہتی ہوں کہ وہ ان لوگوں کی زبانی یہ سنے کہ وہ لوگ' اس کے باپ کو ڈھونڈ رہے ہیں۔''

''ایک نہ ایک روز تو اسے معلوم ہو ہی جائے گا۔''

''ہاں' شاید...... لیکن اس وقت جب وہ باشعور اور جوان ہوجائے گا۔ ابھی وہ بالکل معصوم بچہ ہے۔ اس کے ذہن پر بہت برے اثرات مرتب ہوں گے' میں گاؤں کے کسی ہوٹل میں کمرے بک کرانے جا رہی ہوں۔ جب تک یہ سارے معاملات اپنے انجام کو نہیں پہنچ جاتے' اسے پولیس کے تحفظ کی ضرورت ہے۔''

''گویا تم ان کے پاس جا کر انہیں فیلینی کے بارے میں آگاہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ خوب...... بالآخر تم' میرے ہی خطوط پر سوچنے پر مجبور ہوگئیں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں ان سے یہ نہیں کہوں گی کہ وہ ماریا کا قاتل ہے' صرف یہ کہوں گی کہ ماریا نے کہا تھا' پیارو کو کسی جانب سے زبردست خطرہ لاحق ہے اور یہ کہ شاید کسی نے اسے قتل کردیا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے ایک طویل سانس لی۔ ''اگر تم یہی کہنا چاہتی ہو تو یہی سہی...... لیکن تمہاری راہ میں چند رکاوٹیں حائل ہیں...... پہلی بات تو یہ کہ اس موسم میں تمہیں کسی بھی ہوٹل میں شاید ہی کوئی کمرہ مل سکے۔ دوسرے یہ کہ کیا تم جانتی ہو کہ قریب ترین پولیس اسٹیشن کہاں واقع ہے؟''

''نہیں...... لیکن......''

''میں بھی نہیں جانتا اور مجھے یقین ہے کہ تربول میں کوئی پولیس اسٹیشن سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اگر ہے تو میں تمہیں بتا دوں کہ تم وہاں پہنچتے ہی زبردست مشکلات میں گھر جاؤ گی' تمہیں حراست میں لے لیا جائے گا۔''

''کیا خرافات بک رہے ہو؟''

''میں خرافات نہیں بک رہا ہوں' بلکہ انتہائی سنجیدگی سے حقیقت تمہارے گوش گزار کر رہا ہوں۔ دیکھو' جینی ذرا اس معاملے پر غور کرو' ایک عورت قتل کردی گئی اور ایک بچہ لاپتہ ہوگیا ہے۔ اگر تم انہیں ماریا کی کہانی سناؤ گی کہ اس نے تم سے بچے کو یہاں لانے کی درخواست کی تھی تو وہ یہ ضرور جاننا چاہیں گے کہ تم پیارو سے کس طرح ملیں؟ یقیناً فیلینی نے تمہیں اس کے پاس بھیجا ہوگا اور اسے یہاں ولا میں لانے کی ہدایت کی ہوگی۔''

''گویا وہ مجھے فیلینی کی آلہ کار تصور کریں گے؟ اگر ایسی ہی بات ہو تو وہ یہ ضرور سوچیں گے کہ میں ان کے پاس کیسے آئی؟''

''دہشت زدہ ہو کر۔'' اس نے جواب دیا۔ ''پہلے پہل تمہیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ تم قتل میں ملوث ہوجاؤ گی' لیکن جب ایسا ہوگیا تو اب تم خود کو ان کے سامنے پیش کرکے اپنی معصومیت اور بے گناہی کا ناٹک رچا رہی ہو۔ وہ تم سے یہ ضرور پوچھیں گے کہ تم نے وینس میں ہی انہیں ان سب باتوں سے مطلع کیوں نہیں کیا یا ماریا کے قتل کے بعد بھی خاموشی کیوں اختیار کیے رکھی؟''

''لیکن انہیں میری باتوں پر یقین کرنا پڑے گا۔'' میں نے زور دے کر کہا۔ تاہم مجھے اپنی آواز کھوکھلی محسوس ہوئی۔ ''کیری! تم بھی میری خاطر یہ حلفیہ بیان دے سکتے ہو کہ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں' سچ ہے اور تم سارے واقعات سے اچھی طرح آگاہ ہو۔''

''جینی! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تمہاری خاطر جہنم میں بھی جا سکتا ہوں لیکن میرے بیان سے معاملہ زیادہ پیچیدہ اور سنگین ہوجائے گا۔ ذرا سوچو' پولیس ہمارے بارے میں کیا رائے قائم کرے گی۔''

اس کی باتوں میں اتنی سچائی تھی کہ مجھ پر مایوسی طاری ہوگئی۔ یہ تصور اپنی جگہ کس قدر مضحکہ خیز تھا کہ ماریا کے قتل میں پولیس مجھے مشکوک قرار دیتی لیکن جب میں نے سنجیدگی سے غور کیا تو احساس ہوا کہ یہ مضحکہ خیز نہیں ہے بلکہ پولیس ایسا سوچنے میں حق بجانب ہوگی۔ اس کے باوجود میں نے اس سے بحث کرتے ہوئے کہا۔ ''اس سے قبل تم مجھے پولیس کے پاس جانے کا مشورہ دے رہے تھے' اور اب ان سے دور رہنے کا مشورہ دے رہے ہو۔''

''میں' تم سے یہ کہہ رہا تھا کہ تمہیں ان کے پاس جا کر فیلینی کے خلاف یہ گواہی دینی چاہیے کہ اسی نے ماریا کو قتل کیا ہے۔ اس وقت تمہارے پاس پیارو کے لیے پولیس سے تحفظ کی درخواست کرنے کے مقابلے میں' یہ رپورٹ کرنے کی زیادہ ٹھوس وجہ ہے۔ خدا کے لیے عقل کے ناخن لو اور میرے مشورے پر عمل کرو۔''

''نہیں......'' میں نے جواب دیا۔ ''میں ایسی کوئی گواہی نہیں دوں گی جس کے بارے میں مجھے علم نہ ہو کہ یہ سچ ہے لیکن تمہارا یہ کہنا درست ہے کہ پولیس سے تحفظ کی درخواست کرکے ممکن ہے میں پیارو کے لیے نئی مشکلات کھڑی کردوں' اگر وہ مجھ سے جدا کردیا گیا تو......'' میں نے قدرے توقف سے کہا۔ ''میں کسی قیمت پر ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ کیری! خدا کے لیے ہمیں یہاں سے کہیں اور لے چلو' کسی ایسی جگہ جہاں ہم چھپ سکیں۔ اب میں مزید اسے یہاں نہیں رہنے دوں گی۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا اور انگلیوں سے میز کی سطح کو بجانے لگا۔ پھر چند لمحوں بعد لب کشائی کی۔ ''ٹھیک ہے میں جا کر اطراف کا جائزہ لیتا ہوں' بہت ممکن ہے' کوئی پناہ گاہ ڈھونڈ

نکالنے میں کامیاب ہوجاؤں۔"

"تمہارا بہت بہت شکریہ۔"

"میرے جانے کے بعد ساری کھڑکیاں بند اور دروازہ مقفل کردینا۔ اگر کوئی آئے تو ہلکی سی آہٹ بھی پیدا مت کرنا' میں جلد از جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا اور تین بار دستک دوں گا۔" اس نے کہا اور روانہ ہوگیا۔

اس کی کار کی آواز معدوم ہوتے ہی میں نے کھڑکیوں کے شٹر گرادیے اور دروازہ مقفل کرکے' بالائی منزل پر چلی گئی۔ وہاں بھی کھڑکیوں کے شٹر بند کرنے کے بعد اپنا سامان باندھنے لگی۔ اس سے فارغ ہوکر میں پیارو کے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور دروازے کو نہایت آہستگی سے کھولا کہ مبادا وہ سورہا ہو' دوسرے ہی لمحے میری نگاہ اس کے بستر پر پڑی' بستر خالی تھا۔ وہ کمرے میں بھی نہیں تھا۔ "پیارو......" میں نے آہستہ سے آواز دی...... وہ یقیناً وہیں کہیں موجود تھا۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر کہیں چھپ گیا تھا۔ میں نے بستر کے نیچے جھانکا پھر الماری کے خانے کھول کر دیکھا...... وہ وہاں نہیں تھا۔

"پیارو! پیارو تم کہاں ہو؟ میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔" میں نے بآواز بلند کہا...... لیکن وہ ہوتا تو جواب دیتا۔ میں پاگلوں کی طرح اسے ایک ایک کمرے میں تلاش کرنے لگی...... پھر سارا مکان چھان مارا' لیکن وہ کہیں نہیں تھا۔ میرے رگ وپے میں زبردست سنسنی پھیل گئی۔ دماغ ماؤف ہونے لگا۔ وہ کہاں چلا گیا تھا۔ مجھے سب سے پہلے کیری کو ڈھونڈنے کا خیال آیا...... اگر اس کے باپ نے اسے اغوا کرلیا تھا تو کیری ہی اس سلسلے میں کچھ کرسکتا تھا' میں دروازہ کھول کر نکلی اور بے تحاشا گاؤں کی سمت بھاگنے لگی۔

میں نے بندرگاہ کا رخ کیا وہاں دو موٹر بوٹس لنگر انداز تھیں۔ میں نے ایک موٹر بوٹ کی جانب دیکھا' دوسرے ہی لمحے میری نگاہ ایک شخص پر پڑی اور میرا دل یکبارگی اتنی شدت سے اچھلا گویا سینے کی دیوار توڑ کر نکل جائے گا۔

اس موٹر بوٹ کے اسٹیئرنگ وہیل پر وہی پستہ قامت موجود تھا جو ماریا کے گھر سے برآمد ہوا تھا اور جس نے کیفے میں مجھ سے بدسلوکی کی تھی۔ اس وقت اس کے سر پر ہیٹ نہیں تھا لیکن اس کا نصف چہرہ سیاہ چشمے کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ بلاشبہ یہ وہی شخص تھا۔ وہ اتر کر اپنی موٹر بوٹ باندھنے لگا۔

اسی اثناء میں میرے قریب کھڑے ہوئے شخص نے اسے آواز دی۔ اس نے مڑ کر ہماری جانب دیکھا اور میرا خون خشک ہوگیا۔ میں نے جلدی سے رخ پھیر لیا۔ کیا اس نے مجھے دیکھ لیا؟ کیا پہچان لیا......؟ میں تیزی سے ولا کی جانب روانہ ہوگئی۔ میرے پیر بری طرح کانپ رہے تھے۔ مجھ سے زیادہ تیز نہیں چلا جارہا تھا۔ لگتا تھا' چکرا کر گر پڑوں گی لیکن اس طرح بھاگنے کی کیا ضرورت تھی؟...... وہ میرا تعاقب کیے بغیر ہی ولا تک پہنچ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ فیلینی کا آدمی تھا اور ولا سے اچھی طرح واقف تھا۔

میں گرتی پڑتی واپس ولا پہنچی' میری سانس دھونکنی کی مانند چل رہی تھی اور دل گویا کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ دروازہ اسی طرح کھلا ہوا تھا جس طرح میں چھوڑ کر گئی تھی۔ میں نے سہارے کے لیے اس کا ایک پٹ تھام لیا...... میری ہتھیلی پسینے سے تر ہورہی تھی۔

"پیارو......" میں نے ایک بار پھر اسے آواز دی...... لیکن میری آواز کسی خزاں رسیدہ پتے کی مانند خشک تھی' کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں؟ کدھر جاؤں؟ اسے کہاں ڈھونڈوں؟ نہ جانے کتنے لمحے مایوسی کے عالم میں گزر گئے...... پھر دھیرے دھیرے میرے ذہن نے کام کرنا شروع کردیا...... اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں واپس آنے لگیں۔ اب یہ تو صاف عیاں تھا کہ وہ شخص فیلینی کا ساتھی ہے اور پیارو کو اغوا کرنے کے سلسلے میں اس کی مدد کرنے آیا تھا...... لیکن اگر فیلینی نے اپنے بیٹے کو اغوا کرلیا تھا تو ان لوگوں کے تربول میں رکنے کا کیا جواز تھا؟ وہ اسے اغوا کرتے ہی یہاں سے فرار کیوں نہیں ہوگئے؟

میں مکان کے پھاٹک سے نکل کر سڑک کے وسط میں کھڑی ہوگئی تو یہ احساس ڈسنے لگا کہ کارلو میری نگرانی کررہا ہے۔ میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اچانک میری نگاہ سڑک کے کنارے' پھولوں کے کنج میں ایک بھوری سی چیز پر پڑی۔ میں نے بڑھ کر اسے اٹھالیا۔ وہ پیارو کا بندر امیکو تھا۔ اس کی ایک آنکھ ڈھیلی ہوگئی تھی...... ایک کان اکھڑ گیا تھا اور ناک پچکی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کسی نے غصے کے عالم میں اس کی یہ درگت بنائی ہے...... اور وہ پیارو کے سوا اور کون ہوسکتا تھا؟ اس نے اپنا سارا غصہ مجھ پر اتارنے کی بجائے اپنے بندر پر اتار دیا تھا اور وہ یہاں سے جاتے ہوئے اسے یہاں پھینک

گیا تھا جس کا مطلب تھا کہ پیارو کو کسی نے اغوا نہیں کیا بلکہ وہ اپنی مرضی سے کہیں چلا گیا تھا۔

میں دائیں بائیں دیکھتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ کچھ فاصلے پر مجھے اس کی بیلٹ پڑی ہوئی ملی...... کچھ اور آگے بڑھی تو ایک جگہ وہ خود جھاڑیوں میں بیٹھا نظر آگیا۔ وہ اپنے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے رو رہا تھا۔ میں بے تابانہ اس کی طرف بڑھی اور اس کے قریب بیٹھ گئی۔ "ارے تم' یہاں چھپے بیٹھے ہو اور میں تمہیں کہاں کہاں تلاش کرتی پھر رہی ہوں۔" میں نے کہا۔

اس نے زور کی سسکی لی۔ میں نے اپنا بازو اس کی گردن کے گرد حمائل کردیا۔ "دیکھو تو' تمہارے امیکو کی کیا حالت ہو رہی ہے...... خیر کوئی بات نہیں' ہم دونوں مل کر اسے ٹھیک کرلیں گے' اور تم نے اپنی بیلٹ بھی پھینک دی تھی۔ لیکن مجھے مل گئی' اسے باندھ کر تم کتنے اسمارٹ لگتے ہو۔"

اس نے ایک بار پھر زور سے سسکی لی۔

"میرے چاند! تم گھر سے بھاگے کیوں؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

"میں سمجھا' آپ مجھے چھوڑ کر چلی جائیں گی۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ "اب آپ مجھے نہیں چاہتیں۔"

"اوہ ڈارلنگ' میں تمہیں اپنی جان سے زیادہ چاہتی ہوں اور چاہتی رہوں گی۔"

"آپ اس آدمی کے ساتھ چلی جائیں گی۔"

"لیکن تمہارے بغیر نہیں جاؤں گی' یہ میرا وعدہ ہے' تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تمہیں چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔"

"آپ اسے مجھ سے زیادہ چاہتی ہیں۔"

"نہیں...... ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میں اسے صرف پسند کرتی ہوں۔ لیکن تم سے محبت کرتی ہوں۔"

"آپ مجھ سے بات نہیں کرتیں' میں سیڑھیوں پر کھڑا رہتا ہوں اور آپ اس سے باتیں کرتی رہتی ہیں۔"

"ہم دونوں کچھ اہم گفتگو کررہے تھے' وہ ایک مہربان شخص ہے' لیکن یقین کرو' میں تمہیں دنیا کی ہر شے سے زیادہ چاہتی ہوں۔ کیا تمہیں اب یقین آگیا؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اس کا معصوم سا دلکش چہرہ اپنی ہتھیلی کی کٹوری میں تھام لیا۔ "پیارو! میری جان...... یقین کرو میں تم سے بے انتہا محبت کرتی ہوں' تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتی۔"

اس نے زور سے سسکی لی اور مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں نرمی سے اس کی پشت سہلانے لگی...... پھر اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "وعدہ کرو اب تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔"

"نہیں......" اس نے جواب دیا۔ "کیا وہ آدمی چلا گیا۔"

"کون......؟ اچھا وہ کیری؟"

"ہاں' میں اسے بالکل پسند نہیں کرتا' میں چاہتا ہوں کہ وہ یہاں سے چلا جائے۔"

"لیکن یہ اچھی بات نہیں ہے پیارو' وہ تمہیں پسند کرتا ہے اور ہماری مدد کرنے آیا ہے۔"

"ہمیں اس کی مدد کی ضرورت نہیں' جب وہ یہاں نہیں آیا تھا تو کتنا اچھا لگتا تھا وہ آپ کو مجھ سے چھڑا کر لے جانا چاہتا ہے۔"

"نہیں...... وہ ایسا نہیں کرسکتا' وہ تو ہمارے لیے کوئی دوسری جگہ ڈھونڈنے گیا ہے' ہم سب ساتھ چلیں گے۔"

"کیوں......؟ یہ جگہ تو بہت اچھی ہے۔"

"شش......" اچانک میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میری سماعت سے شاخوں کے ٹوٹنے اور پتوں کے چرمرانے کی آوازیں ٹکرائی تھیں۔ پھر کسی کے قدموں کی چاپ' ہمارے قریب آنے لگی۔ شدت خوف سے میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا...... تھوڑی دیر قبل ہی مجھے اپنی نگرانی کا احساس ہوا تھا اور اب وہ نادیدہ ہستی میرا تعاقب کرتی ہوئی یہاں تک پہنچ گئی تھی۔ ہم دونوں ایک طرح سے چوہے دان میں پھنس گئے تھے۔ میں نے پیارو کو تحفظ دینے کے خیال سے اپنی بانہوں میں چھپالیا۔

دوسرے ہی لمحے' شاخیں ایک طرف ہٹیں' خوف کے تحت میرا منہ بے اختیار کھل گیا اور آنکھیں پھیل گئیں۔ آنے والا کیری تھا۔ "خدا کی پناہ! میں تم دونوں کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے پریشان ہوگیا۔" اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ "تم دونوں یہاں کیا کررہے ہو؟"

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن خوف کے بعد گہرے احساس طمانیت سے میری آواز نہ نکل سکی۔

"میں نے تم سے ولا کے اندر رہنے کی سختی سے تاکید کی تھی لیکن جب واپس آیا تو تم دونوں ہی غائب تھے اور ولا کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ میرا تو خون خشک ہوگیا تھا۔"

’’مم...... میں معذرت چاہتی ہوں‘ میں بعد میں اس کی وضاحت کردوں گی۔‘‘
’’خاک وضاحت کروگی۔‘‘ وہ تند لہجے میں بولا۔’’اب اٹھو بھی پہلے ہی خاصا وقت ضائع کرچکی ہو۔ ہمیں فوراً یہاں سے روانہ ہوجانا چاہیے۔‘‘
’’کیا تم نے کوئی جگہ ڈھونڈلی؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’ہاں......اور ہم یہاں سے جتنی جلد نکل سکیں‘ بہتر ہے۔‘‘ وہ ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ہم دونوں اس کے پیچھے لپکے۔
’’کیا ہمیں براستہ تربول وہاں پہنچنا پڑے گا؟‘‘
’’ہاں‘ کیوں......؟‘‘ اس نے پلٹ کر مجھ پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی پھر تیز لہجے میں بولا۔’’آخر ماجرا کیا ہے‘ تم تربول جانا کیوں نہیں چاہتیں......؟‘‘
’’میں نے کچھ دیر قبل اسے دیکھا تھا۔‘‘
’’کسے؟ فیلینی کو؟‘‘ اس نے حیرت سے پوچھا۔
’’نہیں......اس کیفے والے کو......تھوڑی دیر قبل‘ میں نے اسے بندرگاہ پر دیکھا تھا۔‘‘
’’لیکن تم وہاں تو نہیں گئی تھیں۔‘‘
’’گئی تھی۔‘‘
’’کیوں......؟ جبکہ میں نے تمہیں ولا ہی میں ٹھہرنے کی ہدایت کی تھی۔ تم اس کے علاوہ اور کیا کیا حماقتیں کرتی رہی ہو؟‘‘ اس کا لہجہ پرسکون تھا لیکن چہرے پر غصے کے تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔
پیارو بھی اس کے غصے کو بھانپ گیا‘ لہٰذا جلدی سے بول پڑا۔’’یہ مجھے ڈھونڈتی ہوئی یہاں آئی تھیں کیونکہ میں بھاگ گیا تھا۔‘‘
’’کیا کہا...... بھاگ گئے تھے؟ تمہی سارے فساد کی جڑ ہو۔‘‘
’’کیری‘ خدا کے لیے اس معاملے کو یہیں دفن کردو۔ تمہیں اس پر خفا نہیں ہونا چاہیے۔‘‘ میں نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔
وہ چند لمحے پیچ وتاب کھاتا رہا پھر اپنی کیفیت پر قابو پا کر گھٹنوں کے بل پیارو کے سامنے بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ‘ اس کے کندھے پر رکھ دیے۔’’پیارو!‘‘ اس کا لہجہ خلاف توقف بے حد نرم تھا۔’’میں تم سے اپنے رویے کی معافی چاہتا ہوں۔ میرے غصے کا سبب یہ تھا کہ میں‘ تم دونوں کو وہاں نہ پا کر بے حد پریشان اور خوف زدہ ہوگیا تھا۔ اب تمہیں معلوم ہوجانا چاہیے کہ تمہاری زندگی سخت خطرے میں ہے اور......‘‘
’’نہیں......‘‘ میں احتجاجاً بیچ میں ہی چیخ پڑی۔
’’جینی......اس بچے کو سب کچھ بتا دینا ہی بہتر ہے تاکہ یہ دوبارہ بھاگنے کی کوشش نہ کرے......اور جیسا اس سے کہا جائے......ویسا ہی کرے۔‘‘
پیارو کی نگاہیں‘ کیری کے چہرے پر جم گئیں اور چہرے کی رنگت سفید پڑگئی۔’’کیا جینی کو بھی خطرہ لاحق ہے؟‘‘ اس نے پوچھا۔
’’ہاں......‘‘ کیری نے جواب دیا۔’’اگر تم دونوں نے میری ہدایت پر عمل نہیں کیا تو دونوں ہی کی زندگی کو خطرہ لاحق ہوجائے گا۔ ایک بہت ہی برا آدمی تم دونوں کو پکڑ کرلے جانا چاہتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تم اس ولا میں موجود ہو‘ جبھی میں تم دونوں کو ایک ایسی جگہ لے جارہا ہوں جہاں وہ تمہیں ڈھونڈ نہ سکے۔‘‘ اس نے اٹھ کر پیارو کے کندھے تھپتھپائے۔ اور بولا۔
’’اب تم اچھے اور سمجھدار بچے ہونے کا ثبوت دو اور تم دونوں سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔‘‘
ہم ولا کے قریب پہنچے ہی تھے کہ مجھ پر گھبراہٹ اور خوف طاری ہونے لگا۔ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔’’کیری! کہیں وہ لوگ اندر موجود نہ ہوں۔‘‘
’’نہیں......‘‘ اس نے گہرے اعتماد سے جواب دیا..
’’لیکن اس کیفے والے شخص کی موجودگی نے ایک نئی الجھن کھڑی کردی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم جلد از جلد وہاں پہنچ جائیں لیکن اب بہتر ہوگا کہ شام کی تاریکی پھیلنے سے پہلے بندرگاہ کا رخ نہ کریں۔‘‘

❁......❁......❁

کار میں سامان رکھنے کے دوران‘ وہ ہمیں اس نئی جگہ کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے بولا۔’’وہ کاٹیج قریب ہی ایک چھوٹے سے ویران جزیرے پر واقع ہے۔ میں نے وہ کاٹیج‘ کرائے پر حاصل کیا ہے۔ وہ جزیرہ نجی ملکیت ہے اور وہاں عام لوگوں کا داخلہ ممنوع ہے۔‘‘
’’ہم وہاں کس طرح پہنچیں گے؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’یہ سب میں پہلے ہی طے کرچکا ہوں۔ میں نے ایک موٹر بوٹ بھی کرائے پر حاصل کرلی ہے لیکن ہمیں تاریکی پھیلنے تک انتظار کرنا پڑے گا۔ اس دوران میں ہم صرف ڈرائیو

کریں گے۔‘‘
ہم کار میں سوار ہوگئے اور اس نے اسٹیئرنگ وہیل سنبھال لیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچ گئے۔ کیری نے کار ایک کیفے کے سامنے روک کر کہا۔’’اب پروگرام تبدیل ہوجانے کی وجہ سے مجھے واپس تربول جاکر موٹر بوٹ کو رات نو بجے روانگی کے لیے تیار رکھنا پڑے گا۔ یہاں تم دونوں محفوظ ہوگے۔ میرے خیال میں سامنے والے کیفے میں جاکر کھانا کھالو میں تیاری مکمل کرکے واپس آؤں گا اور تم دونوں کو لے جاؤں گا۔ بہتر ہوگا کہ خوراک کے چند سربمہر ڈبے بھی خریدلو۔‘‘ پھر وہ ہمیں اتار کر رخصت ہوگیا۔
ہمیں کیفے میں بیٹھے ہوئے آدھ گھنٹہ گزرا تھا کہ دفعتاً کسی گزرتی ہوئی کار کے ٹائر بری طرح چیخ اٹھے۔ میں نے چونک کر کار کی جانب دیکھا‘ ایک چھوٹی سی بچی اس کار کے نیچے آتے آتے رہ گئی تھی۔ ڈرائیور نے بروقت فل بریک لگائے تھے۔ اور لڑکی کی ماں کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔ ڈرائیور پر نظر پڑتے ہی بے اختیار میرا منہ کھل گیا‘ لیکن چیخ حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔
اس کار کا ڈرائیور‘ کارلو فیلینی کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ لڑکی کی ماں‘ اس سے اپنی بیٹی کی غلطی کی معافی مانگ رہی تھی۔ اور اس کے بچ جانے پر اس کا شکریہ ادا کررہی تھی۔ میں اپنی جگہ منجمد‘ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے فیلینی کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے دیکھا‘ قید وبند کی زندگی نے اس میں تھوڑی سی تبدیلی کردی تھی۔ وہ اپنی تصویر سے قدرے مختلف نظر آرہا تھا۔ اس کے سیاہ بالوں میں تھوڑی سی سفیدی جھلک رہی تھی۔ وہ دبلا اور معمر نظر آرہا تھا‘ لیکن میں پہلی نگاہ ہی میں اسے پہچان گئی تھی۔
اس نے دوبارہ کار اسٹارٹ کرنے سے پہلے میری جانب دیکھا......کم از کم مجھے یہی محسوس ہوا۔ ہماری نظریں ملیں اور اس لمحے میرا یقین ایک بار پھر متزلزل ہوگیا کہ یہ شخص قاتل ہوسکتا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے‘ میں یہ سوچ کر دہشت زدہ ہوگئی کہ کہیں اس نے پیارو کو تو نہیں دیکھ لیا؟ لیکن کار آگے بڑھ گئی......لیکن جب اسے معلوم ہوگا کہ ہم فرار ہوگئے ہیں تو اس کا ردعمل کیا ہوگا؟ خوف ایک بار پھر میرے دل میں پنجے گاڑنے لگا‘ مجھے یقین تھا کہ ماریا کو قتل کرنے سے پہلے‘ اس نے اس سے حقیقت اگلوالی ہوگی۔ اس خیال کے آتے ہی مجھے اپنی دھڑکنیں رکتی ہوئی محسوس ہوئیں......اور حلق میں خوف ایک گولے کی مانند پھنس گیا۔
خدا خدا کرکے‘ کیری واپس آیا‘ میں تیزی سے اٹھ کر اس کے قریب پہنچ گئی اور سرگوشی میں کہا۔’’میں نے فیلینی کو دیکھا ہے‘ وہ ادھر سے کار ڈرائیو کرتا ہوا گزرا ہے۔‘‘
’’کیا اس نے پیارو کو دیکھ لیا؟‘‘ کیری نے جلدی سے پوچھا۔
’’نہیں......لیکن وہ یقیناً ولا کی طرف گیا ہے......آؤ پیارو !جلدی سے کار میں بیٹھ جاؤ۔‘‘
’’میں نے سارا سامان اس کاٹیج میں پہنچا دیا ہے اور اب کوئی ہمیں دیکھ کر مشکوک نہیں ہوگا بلکہ یہی سوچے گا کہ کوئی فیملی‘ چاندنی رات میں جھیل کی سیر کو نکلی ہے۔‘‘ اس نے کہا۔
تھوڑی دیر میں ہم بندرگاہ پہنچ گئے۔ موٹر بوٹ اپنی جگہ موجود تھی۔ ہر طرف روشنیاں ہی روشنیاں تھیں۔ ہم موٹر بوٹ میں سوار ہوگئے۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور موٹر بوٹ جھیل کی پرسکون سطح پر تیزی سے پھسلنے لگی۔ تقریباً بیس منٹ بعد جب بندرگاہ کی روشنیاں نظروں سے اوجھل ہوگئیں تو اس نے اچانک انجن بند کردیا اور موٹر بوٹ کے ساحل سے لگتے ہی چھلانگ مار کر اتر گیا۔ ہم دونوں نے اس کی تقلید کی۔
وہاں ہر سو گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے جیب سے ٹارچ نکالی اور ہم اس کی باریک روشنی میں‘ درختوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک مختصر سے کاٹیج تک پہنچ گئے۔ اس نے دروازہ کھول‘ اور ماچس کی تیلی کی مدد سے ایک لیمپ روشن کیا جو چھت میں آویزاں تھا۔ میں نے لیمپ کی روشنی میں کاٹیج کا جائزہ لیا۔ یہاں ضرورت کا ہر سامان تو نہیں تھا لیکن پھر بھی غنیمت تھا۔
’’اس کے عقب میں میٹھے پانی کا ایک چشمہ ہے۔‘‘ کیری نے آگاہ کیا۔’’پینے کا پانی وہاں سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ میں نے گاؤں میں اپنے لیے ایک کمرہ کرائے پر حاصل کرلیا ہے وہیں عارضی سکونت اختیار کروں گا۔‘‘
’’اور کشتی......‘‘
’’ظاہر ہے‘ اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور جب کل آؤں گا تو تمہیں یہ خوش خبری سناؤں گا کہ ایک مخصوص آدمی کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ اس وقت تک تم دونوں دنیا والوں کی نگاہوں سے بچ کر رہو۔ اب میں چلا‘ خدا حافظ‘ شب بخیر۔‘‘ اس نے کہا اور مڑ کر کاٹیج سے نکل گیا۔

کیری کے رخصت ہونے کے بعد میں نے پیارو کو اس کے بستر پر سلا دیا۔ اب میرے پاس سوچنے کے سوا اور کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔ اچانک مجھے اس لفافے کا خیال آ گیا جو ماریا نے پیارو کے ہاتھ مجھے بھجوایا تھا اور میں اسے اپنے بیگ میں ڈال کر بھول گئی تھی۔ میں وہ رقم' ماریا کی آمد پر اسے واپس کر دینا چاہتی تھی لیکن اب وہ رقم کیسے واپس کی جائے؟ کسی خیال کے تحت' میں نے بیگ میں سے وہ لفافہ نکالا۔ اس پر جلی حروف میں میرا نام تحریر تھا۔ میں نے اسے چاک کر کے رقم نکال لی۔ یہ دس ہزار لیرا تھے جو ایک کاغذ میں لپٹے ہوئے تھے۔ میں نے کاغذ کھولا' وہ ایک خط تھا' اس کی پیشانی پر بھی میرا نام تحریر تھا اور مضمون کے آخر میں ماریا کے دستخط تھے۔ خط اطالوی زبان میں تھا اور مجھے اطالوی زبان کی بہت کم شد بد تھی۔ میں نے لیمپ کی لو تیز کی اور اپنے سامان میں سے پاکٹ ڈکشنری نکال لی جو میں نے وینس میں خریدی تھی۔ اس کی مدد سے' میں خط کا مضمون کسی حد تک سمجھ سکتی تھی۔ میں نے خط کے اہم اہم اور مشکل الفاظ' اس کی پشت پر لکھے اور پھر ڈکشنری میں ان کے معنی تلاش کرنے لگی۔ یہ کام ہر چند کہ بے حد صبر آزما تھا' لیکن میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی...... ماریا کا پورا خط کچھ یوں تھا!

"میں نے پیارو کو یہ خط اور رقم آپ کے حوالے کرنے کی ہدایت کی ہے۔ آپ اسے اپنے وعدے کے مطابق اولیز وولا لے جائیں اور میری آمد کا انتظار کریں...... اگر میں تربول نہ پہنچ سکوں...... تو آپ پیارو کے باپ کارلو کا انتظار کیجیے گا...... میرے خیال میں وہ جلد ہی وہاں پہنچ جائے گا...... اس وقت تک آپ کو بے حد محتاط رہنا پڑے گا۔ پیارو کو دو آدمیوں کی جانب سے سخت خطرہ ہے۔ آپ خصوصی طور پر ان دونوں کی طرف سے ہر وقت چوکس اور ہوشیار رہیے گا۔ ان میں سے ایک اطالوی اور دوسرا انگریز ہے جو کہ انتہائی خطرناک شخص ہے۔ وہ بھورے بالوں والا ایک دراز قامت شخص ہے اور اس کی پیشانی پر زخم کا ایک گہرا نشان ہے' پیارو کو ان دونوں سے بچائیں......"

"فقط ماریا......!"

میں سن ہو کر رہ گئی۔ الفاظ میری نگاہوں میں دھندلانے لگے۔ اور ان کی جگہ کیری کی واضح تصویر ابھرتی چلی گئی۔ مجھے یاد آیا کہ اس نے اس شام کیفے میں میرے سامنے ایک مرتبہ اپنی پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کو ہاتھ سے پیچھے ہٹایا تھا اور میں نے اس کی پیشانی پر زخم کا ایک گہرا نشان دیکھا تھا۔

❀ ...... ❀ ...... ❀
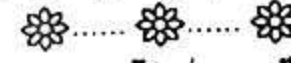
یہ سب کچھ کس قدر ناقابل یقین تھا۔ ایسے ہی جیسے دن کے بارہ بجے سورج غروب ہو جائے یا آدھی رات میں طلوع ہو جائے۔ میں اپنی جگہ بالکل شل ہو کر رہ گئی تھی۔ لگتا تھا' ذرا سی حرکت کی تو ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاؤں گی۔ اب سب کچھ میری سمجھ میں آنے لگا تھا۔ ماریا نے دو آدمیوں کی نشاندہی کی تھی۔ دوسرا شخص یقینی طور پر وہی پستہ قامت اطالوی تھا لیکن کیری نے تو مجھے اس کے ہاتھوں سے بچایا تھا اور اس وقت وہ دونوں ایک دوسرے سے واقف بھی نہیں تھے۔ تو کیا وہ کوئی دوسرا شخص ہے جس کی پیشانی پر زخم کا نشان ہے؟ میں نے سوچا لیکن دوسرے ہی لمحے میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ وہ کشتی جس پر کیری ہمیں یہاں لایا تھا' وہی تھی جس سے میں نے اس پستہ قامت کو بندرگاہ پر اترتے دیکھا تھا۔ اس کا رنگ کتھئی تھا اور اس پر سفید دھاریاں پڑی ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی پہلو میں جلی حروف میں "اسماء الله" لکھا تھا۔ اس وقت میں نے اس نام پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی لیکن مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ میں نے یہ نام کسی موٹر بوٹ پر لکھا دیکھا ہے اب مجھے یاد آیا کہ یہ وہی کشتی تھی۔ اس میں کسی شک و شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور وہ دو خطرناک افراد یہی تھے' ماریا نے جن سے بچنے کی تلقین کی تھی۔ اب میں نے کیفے والے واقعے کا تجزیہ کرنا شروع کیا۔ مجھے ماریا کے گھر جاتے ہوئے دیکھ لیا گیا تھا اور پھر ہوٹل تک تعاقب کرنے کے بعد کیری کو اس کی رپورٹ دے دی گئی تھی۔ چنانچہ کیری کے لیے میرے بارے میں یہ تحقیق کرنا ازبس ضروری ہو گیا تھا کہ میں کون ہوں؟ اور ماریا کے ہاں کیوں گئی تھی؟ اگر کیری براہ راست مجھ سے مل کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا تو یقیناً میں اسے کچھ نہ بتاتی چنانچہ اس نے ایک ناٹک رچایا اور نجات دہندہ کے روپ میں سامنے آ کر میری ہمدردی حاصل کی' مجھے اپنا زیر بار احسان کیا اور وہ سب کچھ معلوم کر لیا جو معلوم کرنا چاہتا تھا' پھر یہ پرکھنے کے بعد کہ میں ایک انتہائی احمق قسم کی جذباتی عورت ہوں اور اگر پیارو سے دور رکھی گئی تو اس کی راہ کی رکاوٹ نہیں بنوں گی۔ اس نے مجھے اس سے دور رہنے کی تلقین کی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے مجھ سے کس طرح بحث کی تھی اور یہ قائل کرنے کی

کوشش کرتا رہا تھا کہ اگر میں پیارو سے دوبارہ ملی تو ہوسکتا ہے اسے نقصان پہنچے لیکن وہ مجھے قائل کرنے میں ناکام رہا تھا اور چونکہ میں اس کے دوسرے روز پیارو سے ملنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی چنانچہ اس نے مجھے سیر و تفریح کی دعوت دی تھی تاکہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک بار پھر مجھے پیارو سے دور رہنے کی تلقین کر سکے اور اپنی محبت کے جال میں پھانس کر میرا اعتماد حاصل کر سکے' لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر وہ پیارو کو اغوا کرنا چاہتا تھا تو اس پر پہلے ہی عمل درآمد کیوں نہ کیا لیکن اگر وہ اسے اغوا نہیں کرنا چاہتا تھا تو ماریا مجھ سے مدد کی درخواست کرنے کیوں آئی تھی؟ وہ یقیناً اس کے پروگرام سے آگاہ ہو گئی تھی۔ اور چاہتی تھی کہ میں پیارو کو اغوا کیے جانے سے پہلے ہی وینس سے نکال کر لے جاؤں لیکن وہ پولیس کے پاس کیوں نہیں گئی؟ میرے پاس ابھی اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

کیری کے ولا پہنچنے پر میں نے جس والہانہ انداز سے اس کا استقبال کیا تھا اور جس طرح اظہار تشکر کیا تھا' اس پر وہ اپنے دل میں کس بری طرح ہنسا ہوگا اور پھر اس نے کتنی خوبصورتی سے مجھے اپنی ہدایات پر عمل کرنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن وہ ایک بات پر مجھے مجبور نہیں کر سکا تھا وہ مجھے پیارو کے باپ کیلینی کو ماریا کا قاتل تسلیم کرنے اور پولیس کے پاس جا کر اس کے خلاف بیان دینے پر مجبور کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں نے اس کی بات نہ مان کر کتنی دانش مندی کا ثبوت دیا تھا۔ ماریا کو کیلینی نے نہیں بلکہ خود کیری نے قتل کیا تھا اور اس کے پاس یہ یقین کرنے کی ٹھوس وجہ تھی کہ پولیس کیلینی پر قتل کا شبہ کرے گی اور اس شبہے کی تصدیق کے لیے اسے صرف میری گواہی کی ضرورت پیش آئے گی مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ماریا کب قتل ہوئی تھی؟ میرے وینس میں قیام کے دوران یا وہاں سے رخصت ہونے کے بعد؟ میرا ذاتی خیال یہ تھا کہ میرے وینس چھوڑنے اور کیری کے دوسرے روز حسب وعدہ میرے ہوٹل پہنچنے کے دوران اسے قتل کیا گیا تھا۔ وہ اسے قتل کرنے کے بعد میرے پاس آ کر مجھے یہ دہشت ناک خبر سنانا چاہتا تھا کہ ماریا قتل کر دی گئی ہے اور اس کے علم کے مطابق پیارو کو اس کا کوئی رشتہ دار کہیں لے کر چلا گیا ہے۔ جہاں وہ سکون اور اطمینان سے رہے گا۔ اس کے بعد ظاہر ہے میں اپنی جگہ خاموش ہو کر بیٹھ جاتی' لیکن جب وہ ہوٹل آیا تو اسے یہ معلوم ہوا کہ میں ہوٹل چھوڑ کر جا چکی ہوں اور بقول اس کے' اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں پیارو کو اپنے ہمراہ لے گئی ہوں لیکن یہ زیادہ قرین قیاس تھا کہ وہ سرے سے ہوٹل گیا ہی نہیں تھا' اس نے ماریا کو قتل کرنے سے پہلے ساری بات اگلوالی تھی۔ ہاں بے شک یہی بات درست تھی' اس نے استقبالیہ کلرک سے کچھ نہیں پوچھا تھا' اس کی ضرورت ہی نہیں تھی اور جب میں نے اس سے پوچھا تھا کہ کیا گیراج کے مالک نے اس کی رہنمائی کی تھی؟ تو اس نے جواب دیا تھا کہ "ہاں" جو کہ سفید جھوٹ تھا۔ یہ جھوٹ اس کے چہرے پر تحریر تھا۔ لیکن اس وقت میں چونکہ اس سے بے حد متاثر تھی چنانچہ وہ تحریر پڑھنے سے قاصر رہی تھی۔ وہ ماریا کا قاتل تھا اور اب مجھے یہ سوچتے ہوئے اپنے آپ سے نفرت ہو رہی تھی کہ میں اس سفاک قاتل سے کس طرح ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی تھی۔ کس طرح اس کی ہر بات تسلیم کرتی رہی تھی لیکن وہ پیارو سے کیا چاہتا تھا؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنا قبل از وقت تھا۔ اس وقت سب سے اہم کام یہ تھا کہ صبح میں اس کے لوٹنے سے پہلے یہاں سے پیارو کے ہمراہ فرار ہو جاؤں نہ جانے یہ جزیرہ کس کا تھا اور اس نے کس طرح اس کا کھوج لگا کر یہ کاٹیج کرائے پر حاصل کیا تھا کیا جزیرے کے مالک کے کسی وقت یہاں پہنچنے کی کوئی توقع کی جا سکتی تھی؟ میں اس کشتی کا تصور کرنے لگی جس کے ذریعے ہمیں یہاں لایا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میری ذہن کی کڑی اس کے مالک سے جا ملی۔ اسی پستہ قامت اطالوی سے جو اس موٹر بوٹ کا مالک تھا' کچھ عجب نہیں کہ وہی اس جزیرے کا مالک ہو۔

صبح سویرے اٹھ کر میں نے کافی بنانے کے لیے کیتلی میں پانی رکھ کر چولہا جلایا اور پیارو کو جگا دیا۔ "جا کر پہلے چشمے پر غسل کر لو اور پھر جلدی سے کپڑے پہن لو۔ اس دوران میں ناشتہ تیار کرتی ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ نکل گیا۔ میں نے ناشتہ تیار کیا اور پھر ناشتہ تیار کرنے کے دوران کم سے کم لفظوں میں اسے صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہم یہاں سے نکل کر ساحل پر کھڑے ہو جائیں گے اور جونہی کوئی کشتی نظر آئے گی مدد کے لیے پکاریں گے۔"

"لیکن وہ آدمی بہت ناراض ہوگا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر ہم نے اس کے کہنے کے مطابق عمل نہ کیا تو ہم دونوں کی جان

خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"ہاں...... لیکن اس کا کہنا غلط تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "میں اب اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔"

"اب وہ آپ کو اچھا نہیں لگتا؟"

"نہیں۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔" وہ بے حد پرجوش لہجے میں بولا۔ "اب اگر وہ یہاں آیا تو میں کہہ دوں گا کہ یہاں سے چلے جاؤ' آپ بھی کہہ دیجیے گا۔"

"ہمیں اس کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی نکل جانا ہے۔" میں نے کہا۔

"تب پھر ہمیں جلدی کرنی چاہیے۔" وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور میرا ایک سوٹ کیس اٹھا کر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے بقیہ سامان اٹھایا اور اس کے پیچھے کاٹیج سے نکل گئی۔ ہم اسی جگہ پہنچ کر کھڑے ہو گئے جہاں پچھلی رات اترے تھے' میری نگاہیں جھیل کی پرسکون سطح پر مرکوز تھیں اور دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔

"کشتی...... کشتی......" پیارو یکایک انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے چیخا لیکن وہ اتنی دور تھی کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا تاہم' ہم دونوں چیخ چیخ کر ہاتھ لہرانے لگے۔

پیارو اس کے انجن کی آواز سننے کی کوشش میں پانی کے کنارے بھاگنے لگا۔ وہ ساتھ ہی چیختا بھی جا رہا تھا۔ میں بھی دوبارہ اس کی آواز سے آواز ملا کر چیخنے لگی۔ موٹر بوٹ کچھ دیر ہم سے لاتعلق رہی پھر اس کے انجن کی آواز ہماری سماعت سے ٹکرانے لگی۔

"وہ آ رہی ہے...... آ رہی ہے......" پیارو بے حد جوش وخروش سے چیخا۔ "آپ بھی پکاریں۔"

وہ واقعی آ رہی تھی اور جب آ گئی تو میں نے سوچا اے کاش نہ آئی ہوتی۔ یہ وہی "اسماء اللہ" موٹر بوٹ تھی اور اس میں کیری سوار تھا۔

"پیارو!" میں دہشت زدہ ہو کر تقریباً چیخ پڑی اور مجھے اپنے دل کی دھڑکن رکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

پیارو بھی اسے پہچان گیا تھا' اس نے میرا بازو کھینچ کر سرگوشی کی۔ "یہ تو وہی ہے۔"

لیکن میں اپنی جگہ بالکل بے بس تھی' کیری کشتی سے اچھل کر ہمارے قریب آ گیا۔ اس نے نہ صرف ہمارے چیخنے کی آواز سن لی تھیں بلکہ وہ سامان بھی دیکھ لیا تھا جو قریب ہی رکھا تھا۔ "یہاں کیا ہو رہا ہے؟" اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے مسکرا کر پوچھا لیکن اس کی آنکھیں بے حد چوکنی تھیں۔

"ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے۔" میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی ہوئی بول پڑی۔ "کیری' ہم مزید ایک منٹ بھی اس بھیانک جزیرے میں نہیں ٹھہر سکتے' یہاں اتنے کیڑے مکوڑے ہیں کہ میں ساری رات پلک تک نہیں جھپکا سکی۔" میرے انداز سے بوکھلاہٹ ہویدا تھی۔ "خدا کا شکر ہے کہ تم اتنے سویرے آ گئے...... کک...... کیا تم روانگی سے پہلے کافی پیو گے؟"

"کافی؟ خیال تو برا نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "اگلی مرتبہ آؤں گا تو کیڑے مار دوا لیتا آؤں گا۔" اس کے ساتھ ہی وہ میرے سوٹ کیس اٹھا کر کاٹیج کی طرف بڑھ گیا۔ "بقیہ سامان تم دونوں لیتے آؤ۔"

"جلدی۔" پیارو نے سرگوشی کی۔ "ہم جلدی سے کشتی پر سوار ہو جائیں۔"

اسی لمحے کیری ہماری جانب بڑا اور رک کر ہمارا انتظار کرنے لگا۔ "تم دونوں حد سے زیادہ نافرمان واقع ہوئے ہو۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "کیا میں نے تم لوگوں کو سب کی نگاہ سے بچنے کی ہدایت نہیں کی تھی؟ مجھے حیرت ہے کہ ان احمقانہ حرکتوں کی وجہ کیا ہے؟"

کاٹیج پہنچ کر میں کافی کا مگ' باسکٹ سے نکال کر میز پر رکھ رہی تھی کہ اس نے یکایک تند لہجے میں پوچھا۔ "ہاں' اب بتاؤ تم یہاں سے اتنی عجلت میں کیوں جا رہی تھیں؟"

"میں تمہیں بتا چکی ہوں۔"

"کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہاری طوطا مینا کی کہانی پر یقین کر لوں گی' سچ سچ بتاؤ میرے جانے کے بعد کیا ہوا تھا؟"

"کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ آخر تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"یہی کہ تم بہت بڑی جھوٹی ہو۔" اس نے تیز لہجے میں کہا۔ "تم نے جان بوجھ کر وہی کیا جس سے میں نے منع کیا تھا اور یہ بالکل واضح طور پر نظر آ رہا ہے کہ تم کسی شے سے خوفزدہ ہو' جب سے میں یہاں پہنچا ہوں تمہاری اس کیفیت کو نوٹ کر رہا ہوں۔"

"تمہیں سچ مچ وہم ہونے لگا ہے۔" میں اپنی کیفیت چھپاتی ہوئی بول پڑی۔ "یہ صحیح ہے کہ جھیل کے کنارے کھڑا ہونا حماقت تھی لیکن اس کا ایک فیصد بھی امکان نہیں تھا کہ فیلینی ہمیں دیکھ لیتا؟"

"نہیں' جبھی میں تمہیں یہاں لے کر آیا ہوں۔"

"اچھا میں کافی بناتی ہوں۔ پیارو چشمے سے پانی لے آئے گا۔"

"اس کی کوئی جلدی نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "کافی پینے کے لیے سارا دن پڑا ہے۔"

"اوہ مجھے ایک بات یاد آئی......" مجھے تربول جا کر چند چیک کیش کرانے ہیں۔ آخر اس کاٹیج کا کرایہ بھی تو ادا کرنا ہے اور اس وقت میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔" میں نے کہا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ رضامند ہو گیا۔

"بہتر ہے لیکن کیا کشتی سنبھال لوگی؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں ہاں بے شک سنبھال لوں گی۔" میں جلدی سے بول پڑی۔

"پھر ٹھیک ہے' جہاں جانا چاہو جا سکتی ہو' میں اور پیارو یہاں تمہارا انتظار کریں گے۔"

"میں اسے اپنے ہمراہ لے جانا چاہتی ہوں۔" یہ لطف اندوز ہو گا۔"

"عزیز خاتون کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ پولیس اب تک فیلینی کو گرفتار نہیں کر سکی ہے۔ کیا تم کوئی خطرہ مول لینا چاہتی ہو؟"

"کیوں نہ ہم سب مل کر چلیں؟" میں نے بوکھلا کر تجویز پیش کی۔

وہ مجھے گھورتے ہوئے معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگا۔ "تم صبح سے بوکھلائی بوکھلائی سی لگ رہی ہو۔ آخر اس کی وجہ؟"

"رات بھر نیند نہ ہو تو صبح میری کیفیت ایسی ہی ہوتی ہے 'اوہ! یہ رہا کافی کا پانی۔"

میں نے کیتلی میں پانی ڈال کر چولہے پر چڑھا دیا۔ میں بھی کتنی احمق تھی سمجھ رہی تھی کہ وہ مجھے پیارو کے ساتھ اس جزیرے سے نکلنے کی اجازت دے دے گا۔ اب وہ میری جانب سے پہلے سے زیادہ مشکوک ہو گیا تھا اور اس کے شک کی تصدیق یوں ہو گئی تھی کہ میں پیارو کو اس کے پاس چھوڑ کر جانے پر رضامند نہیں تھی۔ میرا دماغ چکرا رہا تھا اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چوہے بلی کا یہ کھیل کب تک جاری رہے گا۔ میری جانب سے مایوس ہو کر وہ پیارو سے استفسار کرنے لگا تھا۔ میری پشت ان کی جانب تھی۔ پیارو نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے دوبارہ سختی سے پوچھا اور میرے خیال میں اسے پکڑنے کی کوشش کی۔ پیارو اس سے بچ کر بھاگا۔ راہ میں پڑا ہوا باسکٹ اس کی ٹھوکر سے الٹ گیا اور اس کی ساری چیزیں فرش پر بکھر گئیں۔ کیری جھک کر چیزوں کو اٹھانے لگا اور جب سیدھا ہوا تو اس کے ہاتھ میں ماریا کا خط تھا۔

"یہ...... یہ...... ذاتی خط ہے۔" میں نے خط کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے متوحش لہجے میں کہا۔ "پلیز' مجھے دے دو۔"

لیکن اس کی نگاہیں خط کی پشت پر لکھے ہوئے اطالوی الفاظ اور اس کے انگریزی ترجمے پر پھسلنے لگی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے اس نے خط کھول لیا۔

"پیارو!" میں بے اختیار چیخی اور اسے لے کر باہر کی سمت بھاگی لیکن فرار کی یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ ہم نے بمشکل بیس گز کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ اس نے ہمیں آ لیا اور پیارو کا دوسرا بازو تھام کر اپنی جانب کھینچنا شروع کر دیا۔ اس کھینچا تانی میں وہ گر پڑا اور تب کیری نے مجھے شانوں سے پکڑ کر اپنی جانب گھما دیا۔ "اب بتاؤ' مجھ سے کیوں بھاگ رہی تھیں؟" اس کا لہجہ بے حد کاٹ دار تھا۔

"تم وہی شخص ہو جس کی پیشانی پر زخم کا نشان ہے۔" میں بوکھلا کر چیخ اٹھی۔

"کیا تم اس بکواس پر یقین رکھتی ہو۔"

"ہاں' میں تمہارے بارے میں سب کچھ جان گئی ہوں۔ بجز اس کے کہ تم پیارو سے کیا چاہتے ہو؟"

وہ مسکرایا لیکن اس کی مسکراہٹ اس قدر سفاک اور زہر آلود تھی کہ میں لرز اٹھی۔ "تم یہ کبھی نہیں جان سکو گی۔ برسبیل تذکرہ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ خط کب سے تمہارے پاس تھا؟" اس نے پوچھا۔

جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میری حالت اس پرندے کی سی تھی جس کے پر کتر دیے گئے ہوں۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔" وہ میری بات سن کر بولا۔ "اس عورت نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔ وہ واقعی ایک انتہائی احمق عورت تھی۔"

”تت......تم......تم...... نے اسے قتل کیا تھا؟“ میں ہکلائی۔

”میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ وہ ایک احمق اور نافرمان عورت تھی اور میں ایسی عورتوں کو قطعی پسند نہیں کرتا۔ تم بھی حماقتیں کرتی آئی ہو احمق اور نافرمان عورت......“

میرا دل سوکھے پتے کی مانند کانپنے لگا۔ میں اسے دہشت آمیز نظروں سے گھورتی چلی گئی۔ یوں محسوس ہوا گویا میں سزائے موت سن رہی ہوں۔

وہ اس سرد اور سفاک مسکراہٹ کے ساتھ دوبارہ گویا ہوا۔

”خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ابھی میں نے تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے لیکن میں تمہیں اس قابل نہیں چھوڑوں گا کہ تم میری راہ میں حائل ہو سکو۔ کیا تم اپنے ننھے کو خدا حافظ نہیں کہو گی؟“

اچانک یہ بھیانک حقیقت آشکار ہوئی کہ وہ مجھے نہیں بلکہ پیارو کو ٹھکانے لگانا چاہتا ہے اور میرے رگ و پے میں زبردست سنسنی پھیل گئی۔ ”نہیں، نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ میں دہشت آمیز لہجے میں چیخ پڑی۔ ”ہرگز نہیں...... پلیز اسے نقصان مت پہنچاؤ پلیز...... میں تمہاری ہر بات پر عمل کروں گی۔ کسی سے بھی کچھ نہیں کہوں گی۔ پیارو بھی اپنی زبان بند رکھے گا۔ ہم تمہاری ہدایت پر بے چوں و چرا عمل کریں گے۔ خدا کے لیے اسے مجھ سے دور مت کرو۔ خدا کے لیے ایسا مت کرو۔“ میں بری طرح گھبرا گئی اور اس کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے مچلی۔

”تم ایک بار پھر حماقت کا ثبوت دے رہی ہو۔“ وہ سرد لہجے میں بولا۔ ”اور مجھے مشتعل کر رہی ہو۔ تم سے یہ کس نے کہا ہے کہ میں پیارو کو نقصان پہنچاؤں گا، ہم دونوں محض ایک نئے سفر پر روانہ ہوں گے اور بس......“

”تو پھر مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو پلیز...... میں قسم کھاتی ہوں کہ......!“

”میں تمہاری قسم پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ بہتر یہی ہے کہ تم آئندہ پیارو کو کبھی نہ دیکھ سکو۔“ وہ بولا۔

میں ایک موہوم سی امید کے تحت جھیل کی جانب منہ کر کے مدد کے لیے چیخی اور ساتھ ہی اپنا بازو اس کی گرفت سے آزاد کرانے کی جدوجہد کرنے لگی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے میرے رخسار پر ایک بھرپور طمانچہ جڑ دیا اور پیارو میرے پیروں سے چمٹ کر ہسٹریائی انداز میں رونے لگا۔

”خاموش!“ وہ دہاڑا۔ ”کھڑے ہو جاؤ۔“

لیکن جب پیارو خاموش نہیں ہوا تو وہ چیخا۔ ”پیارو! اگر تم نے میری بات نہ مانی تو میں جینی کو ایذا پہنچاؤں گا۔ کیا تم یہ پسند کرو گے؟ اب خاموشی سے اٹھ کر اس درخت کے پاس کھڑے ہو جاؤ۔“ اس نے ایک درخت کی جانب اشارہ کیا۔

وہ معصوم خوفزدہ ہو گیا اور قہراً و جبراً پیروں پر کھڑا ہو کر اس درخت کے پاس جا کھڑا ہوا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس درندے نے گہری طمانیت سے کہا۔ ”اب اگر تم نے شور مچایا، یا اپنی جگہ سے جنبش کی تو جینی کا بہت برا حشر ہوگا، سمجھ گئے؟ میری واپسی تک اسی طرح کھڑے رہو۔“

”جاندٔ یہ جیسا کہتا ہے ویسا ہی کرو۔“ میں نے گلوگیر لہجے میں پیارو کو مخاطب کیا۔ ”میں...... میں تمہیں دوبارہ کسی نہ کسی طرح ڈھونڈ نکالوں گی۔“

کیری مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا کاٹج میں لے گیا اور میرے ہاتھ پیر باندھ کر مجھے کاؤچ پر دھکیل دیا پھر میرے منہ پر رومال باندھ کر غرایا۔ ”اب خاموشی سے اپنی موت کا انتظار کرو۔ یہاں کسی کے آنے اور تمہیں آزاد کرانے کا دور دور تک کوئی امکان نہیں ہے۔“

اس کے فوراً بعد میں نے کاٹج کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی پھر اس کے قدموں کی آہٹ لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی ہوئی خاموشی کی قبر میں دفن ہو گئی۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو آزاد کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن بندشیں سخت تھیں۔ مجھے ناکامی ہوئی۔ میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا رہی تھی جو کہ...... لحظہ بہ لحظہ گہری ہوتی جا رہی تھی پھر نہ جانے کب اور کیسے میں ہوش سے بیگانہ ہو گئی۔

ہوش میں آئی تو خود کو اسی طرح بندھا پایا۔ نہ جانے میں کتنی دیر بے ہوش رہی تھی۔ سر اب بھی چکرا رہا تھا اور کاٹج کی دیواریں جھولے جھولتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے سر کو دو تین بار زور زور سے جھٹکا اور متلاشی نگاہوں سے کاٹج کا جائزہ لینے لگی۔ اچانک میری نگاہ ایک طرف رکھے ہوئے کوکر پر پڑی جس کا ایک کونہ کسی چاقو کی مانند تیز تھا میں بدقت تمام اٹھ بیٹھی اور پھر کسی چڑیا کی مانند پھدک پھدک کر بڑی مشکلوں سے کوکر تک پہنچی اور اپنی پشت اس کی جانب کر کے

گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ہاتھ کی بندشوں کو اس کے تیز دھار کونے سے رگڑنے لگی۔ یہ بے حد صبر آزما اور محنت طلب کام تھا لیکن میری کوشش بار آور ہوئی۔ بندشیں کٹ گئیں اور میرے ہاتھ آزاد ہو گئے۔ میں نے تیزی سے منہ پر بندھا ہوا رومال کھولا اور پھر پیروں کو بندش سے آزاد کر دیا۔ پیاس کی شدت سے حلق میں کانٹے پڑ گئے اور ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ سامنے ہی پانی کی بالٹی دھری تھی۔ میں بے تابی سے بالٹی پر جھک گئی اور کسی جانور کی مانند اپنی پیاس بجھانے لگی۔ پانی پی کر جان میں جان آئی، میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ کیری اور پیارو کو وہاں سے رخصت ہوئے گھنٹوں ہو گئے تھے۔ لیکن ابھی سویرا تھا اور جھیل پر کشتیوں کی موجودگی کا امکان تھا۔ میں انہیں مدد کے لیے پکار سکتی تھی۔ میں نے سرعت سے اپنا بیگ اٹھایا اور اسی لمحے میری سماعت سے کسی موٹر بوٹ کے انجن کی آواز ٹکرائی جو تیزی سے قریب آتی جا رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کا رخ اس جزیرے کی جانب تھا اور وہ اسماء اللہ کے سوا اور کون ہو سکتی تھی۔ میں تیزی سے نکل کر کاٹج کے عقب میں پہنچ گئی۔ موٹر بوٹ کی آواز دم توڑ چکی تھی۔ جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ کیری ساحل پر پہنچ چکا تھا۔ اس کے فوراً بعد میں نے کاٹج کی جانب بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے بے حد سرعت اور خاموشی سے اپنی جگہ سے حرکت کی اور ساحل کی جانب لپکی۔ ساحل اور کاٹج کے درمیان اتنے درخت تھے کہ فوراً موٹر بوٹ تک پہنچنا دشوار تھا۔ تاہم میں گرتی پڑتی، لرزتی کانپتی اور ہانپتی ہوئی موٹر بوٹ تک پہنچ گئی اور ابھی اس پر اپنا پہلا ہی قدم رکھا تھا کہ کسی نے عقب سے میرا بازو پکڑ لیا۔ میں تیزی سے مڑی اور اپنی جگہ شل ہو گئی۔

”میرا بیٹا کہاں ہے؟“ کارلو فیلینی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرایا۔

❀......❀......❀

میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن میرے منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ اس نے اپنا سوال دہرایا۔ مجھے اس کی آواز جھیل کے اس پار سے آتی ہوئی محسوس ہوئی اور نگاہوں میں اس کا چہرہ دھندلانے لگا۔ میں نے دوبارہ کچھ کہنے کی سعی کی لیکن اس بار بھی منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ میرے گھٹنے بے حد نحیف ہوتے جا رہے تھے اور پھر تاریکیوں نے ہر طرف سے یلغار کر دی۔

آنکھ کھلی تو میں کاٹج کے اسی کاؤچ پر دراز تھی اور کارلو میرے سر پر کھڑا تھا۔

”میرا بیٹا کہاں ہے؟“ اس نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔ اس کا لہجہ بے حد سرد تھا۔

میں تھوڑی سی جدوجہد کے بعد اٹھ بیٹھی۔ مجھے نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔ اس نے مگ میں پانی بھر کر میری جانب بڑھایا۔ ”پیو۔“ اس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ اس نے اپنا وہی سوال ایک بار پھر دہرایا۔ ”میرا بیٹا کہاں ہے؟“

”وہ علی الصباح واپس آ کر اسے لے گیا۔“ میں نے نحیف لہجے میں آگاہ کیا۔ ”اس نے مجھے یہاں باندھ دیا اور اسے لے گیا۔“

”کہاں...... کہاں لے گیا؟“

”میں نہیں جانتی؟“

”مجھ سے جھوٹ مت بولو۔“ وہ غرایا۔

میں سہم کر اس سے دور ہٹ گئی۔ ”میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔ میں واقعی نہیں جانتی کہ وہ پیارو کو کہاں لے گیا ہے۔ کاش میں جان سکتی۔ اس شخص کا نام کیری ہے۔“

”کیری...... ہاں میں اسے جانتا ہوں اور تمہارے بارے میں بھی جانتا ہوں کہ تم کون ہو اور کیا ہو۔ لہٰذا مجھ سے جھوٹ بولنے کی کوشش مت کرو۔“

”لیکن میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔ کیری مجھے اور پیارو کو پچھلی رات یہاں لے کر آیا تھا اور آج صبح واپس آ کر مجھے باندھ کر پیارو کو اپنے ساتھ کہیں لے گیا۔“

”کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمہارے اس بیان پر یقین کر لوں گا۔ جب کہ میں نے تمہیں اپنی کشتی پر فرار ہوتے ہوئے پکڑا ہے۔“ وہ زہر خند سے بولا۔

”میں نے کسی نہ کسی طرح خود کو آزاد کر لیا تھا۔ یہ دیکھو......“ میں نے اپنی کلائیاں اس کی نگاہوں کے سامنے کر دی جس پر رسی کے نشانات پڑے ہوئے تھے۔

اس نے میری کلائیوں پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور معنی خیز انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ”اس نے تمہیں کیوں باندھا تھا؟“

”کیونکہ وہ اس بات سے واقف ہو چکا تھا کہ میں اس کے بارے میں سب کچھ جان چکی ہوں۔“

''اس کے باوجود تم اس کے ساتھ چلی آئیں۔''

''ہم گزشتہ رات اس کے ساتھ آئے تھے لیکن اس وقت تک میں سمجھ رہی تھی کہ وہ ہمارا ہمدرد ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو کیا پچھلی رات کسی نے آ کر تمہیں اس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا؟'' وہ تمسخر آمیز لہجے میں بولا۔

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا اور اسے ماریا کے خط کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

''وہ خط کہاں ہے؟'' اس نے استفہام کیا۔

''میں...... میں نہیں جانتی' جب میں پیارو کو لے کر بھاگی تھی تو خط کیری کے ہاتھ میں تھا۔'' میں نے کہا۔

''کیا واقعی؟'' اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

''تمہیں میری باتوں پر یقین کیوں نہیں آ رہا ہے؟ آخر کیوں؟'' یہ سچ ہے کہ میں نے کیری پر اعتماد کر کے غلطی کی تھی وہ ایک بھیانک غلطی تھی لیکن میں نے پیارو کا ہر طرح سے خیال رکھا تھا۔'' میں چیخ اٹھی۔

''اور پھر تم نے کیری کو اسے لے جانے دیا۔''

''میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟'' میں یکبارگی چیخ اٹھی۔

''ہاں تم بتا چکی ہو۔'' اس نے اتفاق کیا۔ ''تمہاری کہانی کا ایک حصہ حقیقت پر مبنی ہے لیکن یہ جاننے کے بعد کہ تم کون ہو؟ اور تم نے کیا' کیا ہے' میرے دل میں تمہارے لیے نفرت اور انتقام کے سوا کچھ نہیں ہے' اب اٹھو' جب تک میرا بیٹا مجھے مل نہیں جاتا تم میرے پاس رہو گی اور اس کے بعد......'' اس نے جملہ قصداً ادھورا چھوڑ دیا اور پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتا ہوا بولا۔ ''اگر میرے بیٹے کو کسی قسم کا بھی نقصان پہنچا ہوگا تو میں تمہیں کسی قیمت پر معاف نہیں کروں گا۔''

میں اپنی بنیادوں سے لرز گئی۔ پھر خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرتی ہوئی بول پڑی۔ ''میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔ جب تمہارا بیٹا مل جائے گا تو تمہیں میری باتوں پر یقین آ جائے گا۔''

اس کے ساتھ ہی ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اس نے سامان اٹھایا اور ہم کشتی میں سوار ہو گئے۔ اس نے موٹر بوٹ اسٹارٹ کر دی اور کشتی تربول کی جانب روانہ ہو گئی۔ وہ بالکل خاموش تھا اور اس کی یہ خاموشی مجھے کسی بہت بڑے خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ آخر کار میں پھٹ پڑی۔ ''تم میری باتوں پر یقین کیوں نہیں کرتے؟'' تم ایسا کیوں سمجھ رہے ہو کہ میں پیارو کی بھلائی کے سوا کچھ اور سوچ سکتی ہوں؟''

''کیا تم مجھے اتنا احمق سمجھتی ہو کہ میں ایک ایسی عورت پر یقین کر لوں گا جو میرے بیٹے کو صرف کیری کے حوالے کرنے یہاں لائی تھی۔''

''آخر وہ پیارو سے کیا چاہتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تم مجھ سے پوچھ رہی ہو؟'' اس نے تیکھے لہجے میں الٹا سوال داغ دیا۔

''ہاں میں تم سے پوچھ رہی ہوں۔''

اس نے مختصر سا زہر آلود قہقہہ لگایا۔ ''تم اس سے یہ معلوم کیے بغیر اس کی ہر بات ماننے کو تیار ہو گئی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے تمہاری حرص اور اس کی جانب سے رقم کی ادائیگی کے وعدے نے تمہیں اس سے کچھ پوچھنے سے باز رکھا۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو' میں مطلق نہیں سمجھی۔ میرے پاس جو تھوڑی بہت رقم تھی وہ ماریا نے پیارو کے ہاتھ بھیجی تھی۔''

''تم نے ماریا سے نہیں پوچھا کہ پیارو کو کس نے دھمکی دی تھی؟''

''میں نے بے شک پوچھا تھا لیکن وہ انگریزی بہت کم جانتی تھی اور پھر بے حد خوفزدہ بھی تھی۔ اس وقت میں نہیں جانتی تھی کہ وہ کس سے خوف زدہ تھی لیکن پچھلی رات اس راز سے پردہ اٹھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ تم سے خوف زدہ تھی اور میں ایسا سوچنے میں حق بجانب تھی کیونکہ تم جیل میں تھے۔''

''تمہیں یہ بات کس نے بتائی تھی؟ کیری نے؟''

''نہیں' ماریا نے بتائی تھی۔ کیری کو میں نے ہی بتائی تھی ورنہ وہ تمہارے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ میرا مطلب ہے' میں یہی سمجھتی آئی تھی کہ وہ تمہارے وجود یا عدم وجود سے قطعی لاعلم ہے لیکن اب میں جان گئی کہ وہ تمہیں اچھی طرح جانتا تھا' میرا دماغ ان معاملات میں بری طرح الجھ گیا ہے۔''

''ہاں واقعی یہ بے حد الجھن میں ڈالنے والی بات ہے' خاص کر اس وقت جب تمہیں یہ معلوم ہوا کہ کیری اپنا کام نکال کر چلتا بنا ہے' اور اب تم اس کے کسی کام کی نہیں رہ گئیں۔''

''لیکن میں یہ ہرگز نہیں جانتی تھی کہ وہ مجھے استعمال کر رہا ہے۔'' میں نے احتجاج کیا۔ ''میں نے جو کچھ بھی کیا اپنے لیے نہیں پیارو کی بھلائی کے لیے کیا۔ اسے تحفظ عطا کرنے کے خیال سے کیا اگر میں کیری کی شریک کار ہوتی تو کیا ماریا اپنے خط میں اس دشمن کی نشاندہی کرتی؟''

''آہا...... وہ خط...... ایک ایسا خط جو تم نے پچھلی رات پڑھا اور پھر جو غائب ہو گیا۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں ماریا پر یقین کر لوں گا جس نے کیری کے حکم پر پیارو کو اپنے پاس رکھنے کی ہدایت کی تھی؟''

''پھر اس نے مجھ سے پیارو کو وینس سے باہر لے جانے کی درخواست کیوں کی تھی؟ اور پھر وہ قتل کیوں کر دی گئی؟''

''تو تم یہ بھی جانتی ہو؟''

''ہاں۔''

''تمہیں کس نے بتایا؟ کیری نے؟''

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا اور بتایا کہ اخبار میں خبر پڑھی تھی اور جب کیری کے ولا پہنچنے پر یہ خبر سنائی تھی تو وہ بھی چونک اٹھا تھا۔

''اور تم دونوں کے خیال میں اس جرم کا ارتکاب کس نے کیا تھا؟''

''تم نے۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو پھر تم پولیس کے پاس کیوں نہیں گئیں۔''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''کیری بضد تھا کہ میں پولیس کے پاس جا کر تمہارے خلاف یہ گواہی دوں کہ قتل تم نے کیا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے وہ ساری بات اس کے گوش گزار کر دی اور آخر میں بولی۔ ''میں کس طرح کسی کے خلاف گواہی دے سکتی تھی جب کہ مجھے حقیقت کا علم ہی نہیں تھا۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''کیری نے مجھ سے کہا کہ بہتر ہے میں پولیس کے پاس نہ جاؤں ورنہ وہ مجھے حراست میں لے کر پیارو کو مجھ سے جدا کر دیں گے۔''

''لہٰذا تم دوبارہ اس کی فرمانبرداری کرنے لگیں؟''

''وجہ یہ تھی کہ مجھے اس پر اعتماد تھا۔'' میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھ سے ایک بہت ہی بھیانک غلطی سرزد ہوئی تھی اور اب میں اس کے ازالے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ مجھے پیارو سے بے انتہا محبت ہے حالانکہ مجھے اس سے ملے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہو رہا ہے لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ میرے جسم کا ایک حصہ ہے۔ وہ بھی مجھے بے حد چاہتا ہے۔ تم یقین کرو یا نہ کرو مجھے اس کی کوئی پروا نہیں لیکن یہ حقیقت ہے۔''

اس کا چہرہ تاثرات سے یکسر عاری تھا۔ ''پیارو مل جائے اس کے بعد ہی پتہ چلے گا کہ تمہاری باتوں میں کتنی سچائی ہے؟''

''اور وہ ضرور ملے گا۔'' میں نے اپنے الفاظ پر زور دے کر کہا۔ پھر اسے اپنے اور پیارو کی ملاقات کی تفصیل سے آگاہ کرنے لگی۔ وہ خاموشی سے موٹر بوٹ چلاتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ہم بندرگاہ پر پہنچ گئے' کچھ ہی فاصلے پر اس کی کار کھڑی تھی۔ اس نے کار میں سامان رکھا اور اسٹیئرنگ وہیل سنبھال لیا۔ میں اس کی بغلی نشست پر بیٹھ گئی اور کار ولا کی جانب گامزن ہو گئی۔

میری چھٹی حس مجھے خطرے کا احساس دلا رہی تھی اور جوں جوں ولا قریب آتا جا رہا تھا' توں توں میرے خوف میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ یکایک میں نے دروازے کا ہینڈل تھام لیا اور چھلانگ لگانے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگی لیکن وہ میرا ارادہ بھانپ گیا اور قبل اس کے کہ میں دروازہ کھول کر چھلانگ لگاتی' اس نے ہاتھ بڑھا کر میری کلائی تھام لی۔

''ڈرو نہیں!'' وہ بولا۔ اس کا لہجہ خلاف توقع بے حد نرم اور شائستہ تھا۔

میں نے گردن موڑ کر اسے حیرت سے دیکھا۔ ہماری نگاہیں ملیں' اب ان نگاہوں میں نفرت کی چنگاریاں نہیں تھیں بلکہ خلوص اور اپنائیت کی ٹھنڈک تھی۔ ''اب تمہیں مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے اسی ملائمت سے کہا۔

''تمہارا مطلب ہے......'' میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن کیا؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اسے بالآخر میری باتوں پر یقین آ گیا تھا لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''میرا مطلب ہے تمہارے لہجے کی سچائی نے مجھے قائل کر دیا ہے۔ میں تم سے اپنے رویے کی معافی چاہتا ہوں۔ مجھے یقین آ گیا ہے کہ تم پیارو سے واقعی محبت کرتی ہو۔''

ہم ولا پہنچ گئے تھے۔ اس نے کار پھاٹک سے گزاری اور کھڑی کر دی۔ ''اب تم کیا کرو گے؟'' میں نے پوچھا۔

جواب میں اس نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور میرے حوالے کر کے کہا۔ ''اسے پڑھو۔''

میں نے کاغذ کی تہ کھولی۔ یہ ایک خط تھا' میں نے پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا۔ ''کارلو یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم اس جیتی جاگتی قبر سے زندہ سلامت نکل آئے ہو اگر تم نہ آتے تو

ہر شخص کے حق میں بہتر ہوتا۔ پیارو تمہیں بھول چکا ہے وہ تمہارے بغیر بھی آرام اور سکون سے رہتا ہے۔ اب میں اسے تم سے سودے بازی کے لیے استعمال کر رہا ہوں، ہم جانتے ہیں کہ ہمیں ایک دوسرے سے کیا چاہیے لہٰذا براہ راست مبادلہ اس امر کو آسان بنادے گا۔ تم ان اہم کاغذات پر دستخط کردو جب تم انہیں میرے حوالے کروگے تو تمہارا بیٹا تمہیں مل جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ تم ولا پہنچنے والے ہو لہٰذا میں یہ پیغام چھوڑ کر جا رہا ہوں اگر تمہیں اپنا بیٹا عزیز ہے تو میری اگلی ہدایات کا انتظار کرو۔ کاغذات تیار رکھو اور پولیس سے دور رہو۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے اگر تم نے دانشمندی کا ثبوت دیا تو یہ اچھی بات ہوگی اور اگر نہیں تو...... پھر یہ گلہ نہ کرنا کہ میں نے تمہیں خبردار نہیں کیا تھا۔ تمہاری حماقت کی سزا پیارو کو بھگتنی پڑے گی۔"

"اب تم کیا کروگے؟" میں نے گھبراہٹ آمیز لہجے میں دوبارہ پوچھا۔

"انتظار! اس کے سوا کر ہی کیا سکتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

وہ غیر معمولی سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ اسے اپنے بیٹے کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ "شاید وہ جلد ہی تم سے رابطہ قائم کرے اگر تم کاغذات تیار......!" میں نے کہنا چاہا لیکن وہ کار سے اتر کر جلدی سے مکان کے اندر چلا گیا۔ میں اس کے پیچھے لپکی۔ وہ متلاشی نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

"میں سمجھتا تھا کہ ممکن ہے وہ دوسرا پیغام یہاں چھوڑ گیا ہو لیکن یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔" میں نے کہا "تم بے حد تھکے ہوئے ہو تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤ میں کھانا تیار کرتی ہوں۔"

وہ کٹے ہوئے درخت کی مانند کرسی پر گر پڑا۔ میں نے باسکٹ سے خورد و نوش کی چیزیں نکالیں اور کچن کی جانب بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد کھانا طشت میں سجا کر دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ طشت میرے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ کافی بھوکا تھا۔ کھانا کھا کر اس نے میرا شکریہ ادا کیا، میں اس کے لیے کافی بنا لائی اور پوچھا۔ "تم پیارو کی تلاش میں اس جزیرے تک پہنچ گئے تھے؟"

"میں کیری کے حوالے سے اس شخص کو جانتا ہوں جو اس جزیرے کا مالک ہے اور تمہارے بارے میں مجھے صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ تم پیارو سے کیسے ملی تھیں لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ کیری کے چکر میں کیسے پڑ گئیں۔ مجھے شروع سے ساری بات بتاؤ۔"

میں نے شروع سے آخر تک سارا واقعہ اس کے گوش گزار کردیا۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا پھر دھیمے لہجے میں گویا ہوا۔ "اب میں تمہیں اپنی داستان سناتا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"میں ایک صحافی ہوں۔ آج سے پانچ سال قبل میرے اخبار نے مجھے جنگی اطلاعات کے حصول کے لیے ویتنام بھیجا تھا۔ کچھ زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ مجھے ویتنامیوں نے گرفتار کرلیا۔ مجھ سے یہ حماقت ہوئی کہ میں نے ان کی قید سے فرار ہونے کی کوشش کی اور دوبارہ گرفتار ہوگیا۔ اس مرتبہ انہوں نے غیر معینہ مدت کے لیے قید تنہائی میں ڈال دیا۔ مجھے اپنی بیوی اور بیٹے کی فکر کھائے جا رہی تھی لیکن میں بالکل بے بس تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ میں دوبارہ ان کی شکل دیکھ سکوں گا۔ اس کے باوجود ان سے ملنے کی آس مجھے زندہ رکھے ہوئے تھی۔ اس تمام عرصے میں مجھے گھر سے ایک بھی خط موصول نہیں ہوا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری بیوی اور بچہ کس حال میں ہے۔ آج سے چند ہفتے قبل مجھے رہا کرکے، دیگر زخمی قیدیوں کے ساتھ ایک ویران و بیابان علاقے میں پہنچا دیا گیا تاکہ امریکی ہمیں دیکھیں تو وہاں سے لے جائیں، مجھے امریکیوں کو اپنی شناخت کرانے میں کئی دن لگ گئے۔ اس وقت تک ہماری حالت انتہائی ناگفتہ بہ ہو چکی تھی۔ ہمیں چند دنوں کے لیے ایک اسپتال میں رکھا گیا۔ وہاں سے میں نے وینس میں مقیم، اپنی بیوی کو...... اپنی خیریت کا ٹیلی گرام ارسال کیا۔ میری بیوی لینیٹ نے کہا تھا کہ وہ میری واپسی تک وہاں قیام کرے گی۔ اس کے فوراً بعد میں وینس پہنچا لیکن یہ جان کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ میری بیوی مر چکی ہے۔ اب اس فلیٹ میں جہاں وہ مقیم تھی...... دوسرے کرائے دار قیام پذیر تھے۔ میں نے ان سے اپنے ٹیلی گرام کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہاں کوئی ٹیلی گرام پہنچا ہی نہ تھا۔ انہیں صرف اتنا علم تھا کہ پہلے جو خاتون کرائے دار تھی، اس کا انتقال ہوگیا ہے...... لیکن بچہ کہاں ہے، اس کا انہیں کوئی علم

نہیں تھا۔ میں نے اپنی بیوی کے ڈاکٹر سے رابطہ قائم کیا تو اس نے بتایا کہ ایک عورت لینیٹ کی تیمارداری کے لیے آتی تھی۔ لینیٹ نے بچہ اسی کے حوالے کردیا تھا اور تاکید کی تھی کہ میری واپسی تک اس کا خیال رکھے۔ ڈاکٹر کو اس عورت کا نام یاد نہیں تھا اور نہ ہی جانتا تھا کہ اس عورت کی رہائش کہاں ہے۔ میں نے اس عورت کی تلاش میں شہر کا کونہ کونہ چھان مارا، لیکن اس کا پتہ نہ چل سکا۔ پھر اچانک ایک رات مجھے کسی کا فون موصول ہوا، اس نامعلوم شخص نے مجھے بتایا کہ اگر میں اگلی صبح دس بجے سان انطونیو اسٹریٹ کے فلاں نمبر مکان میں رہائش پذیر ماریا نامی خاتون کے پاس جاؤں تو میرا بیٹا، میرے حوالے کردیا جائے گا۔ میں نے اس مکان پر پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا...... لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے دروازے پر دباؤ ڈالا تو وہ کھل گیا۔ میں کمرے میں داخل ہوگیا۔ وہاں ماریا کی لاش پڑی تھی۔ میں نے اسی وقت پولیس کو مطلع کیا، پولیس آئی اور مجھے بغرض تفتیش اپنے ساتھ لے گئی۔ انہیں مجھ پر شبہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ میں اپنے بیٹے کو ڈھونڈ رہا ہوں لیکن وہ اس پراسرار ٹیلی فون کال پر یقین کرنے کو ہرگز تیار نہیں تھے پھر انہیں جائے واردات سے ماریا کے ہاتھ کا تحریر کردہ ایک پیغام ملا۔ اس پیغام میں اس نے مجھے اپنی موت کا ذمے دار قرار دیا تھا۔"

"کیری......" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ "اس نے ماریا کو وہ پیغام تحریر کرنے پر مجبور کیا ہوگا۔ جبھی اسے کامل یقین تھا کہ پولیس، تمہیں مجرم گردانے گی۔"

"ہاں......" اس نے جواب دیا۔

"پھر پولیس نے تمہیں کیسے چھوڑ دیا؟"

"اس موقعے پر ایک پڑوسن سامنے آئی اور اس نے گواہی دی کہ میرے اس مکان پر وارد ہونے سے دو گھنٹے قبل، اس نے کسی کی دہشت زدہ چیخ سنی تھی اور اس نے کھڑکی سے ایک دبلے پتلے اور طویل قامت شخص کو فرار ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد مجھے اس پراسرار شخص کی جانب سے دوسرا فون موصول ہوا۔ اس نے بتایا کہ پیارو تربول میں ہے۔"

"کیا وہ پراسرار شخص کیری تھا؟"

"نہیں...... لیکن اس نے مجھے آگاہ کیا کہ ایک انگریز لڑکی جینی، پیارو کو اپنے ساتھ لے گئی ہے اور اگر میں اسے زندہ دیکھنا چاہتا ہوں تو اپنے ولا پہنچوں۔"

"اب میں سمجھی۔" میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلا کر کہا۔ "جبھی تم یہ یقین کرنے پر مجبور ہوگئے تھے کہ میں کیری کی شریک کار ہوں۔ کیا تم جانتے تھے کہ پیارو کی گمشدگی میں کیری کا ہاتھ ہے۔"

"اس سوال کے جواب کے لیے تمہیں میرے ماضی کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھنی پڑے گی۔ لینیٹ سے میری ملاقات اٹلی میں ہوئی تھی اور ہم پہلی ہی ملاقات میں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوگئے تھے۔ پھر ہم نے انگلستان میں شادی کرلی تھی۔ لینیٹ کا باپ میجر آرنلڈ شروع شروع میں اس شادی کے خلاف تھا، اس نے ایک بیوہ سے شادی کرلی تھی کیونکہ لینیٹ کی ماں، اس کے بچپن میں مر گئی تھی۔ اس بیوہ کا پہلے شوہر سے ایک بچہ تھا، وہ عمر میں لینیٹ سے بڑا تھا۔ اب تم سمجھ گئی ہوگی کہ وہ بچہ کون تھا؟"

میں سانس روک کر اسے گھورنے لگی...... پھر بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ "کیری۔"

"ہاں......" اس نے جواب دیا۔ "بچپن میں وہ بے پناہ حسین ہوا کرتا تھا اور اپنی ماں کو انگلیوں پر نچایا کرتا تھا۔ شادی کے کچھ ہی عرصے بعد اس کی ماں ایک حادثے میں ہلاک ہوگئی۔ میجر آرنلڈ نے اس بچے کو اپنی اولاد جیسی شفقت دی اور لینیٹ تو اس کی پوجا کرتی تھی۔ حالانکہ وہ چور اور اچکا تھا۔ اسے چوری کے الزام میں دو اسکولوں سے خارج کردیا گیا تھا۔ لیکن دنیا کی کوئی طاقت اس کے بارے میں لینیٹ کی رائے تبدیل نہیں کرسکی۔ آخرکار وہ ایک بڑی ڈکیتی کے جرم میں گرفتار ہوکر جیل پہنچ گیا...... اور جب وہ جیل سے رہا ہوا تو لینیٹ نے مجھ سے التجا کی کہ میں اسے اپنے ہاں رہنے کی اجازت دے دوں...... میں بادل نخواستہ رضامند ہوگیا اور پھر یہاں اس کی ملاقات فیبری سے ہوئی۔ وہی اس جزیرے کا مالک ہے لیکن واپس انگلستان پہنچتے ہی وہ ایک بار پھر ڈکیتی کے جرم میں گرفتار ہوکر جیل پہنچ گیا۔ لینیٹ یہ خبر سنتے ہی اس سے ملنے انگلستان روانہ ہوگئی۔ وہاں اس نے یقیناً اسے اپنے باپ کی وصیت سے آگاہ کیا ہوگا جو کچھ ہی عرصے قبل مرا تھا اور پیارو کو اپنی ساری جائیداد اور دولت کا وارث بنا گیا تھا لیکن شرط یہی تھی کہ وہ ساری دولت پیارو کو اس کی آٹھویں سالگرہ پر ملے گی اور اس موقعے پر لینیٹ اس کی وراثت کی قانونی سرپرست قرار پائے گی۔"

"وہ اگلے ماہ آٹھ سال کا ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ پھر ایک لمحہ توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔ "وینس میں مجھے اپنا جو سامان ملا تھا' اس میں کیری کے وہ خطوط بھی شامل تھے جو اس نے جیل کی کوٹھڑی سے لینیتے کو تحریر کیے' انہی خطوط کی روشنی میں مجھ پر یہ بات کھلی کہ اس نے فیبری سے رابطہ قائم کر کے' اسے وینس جا کر صورت حال کا جائزہ لینے کی ہدایت کی تھی۔ فیبری وینس پہنچا اور اس نے لینیتے کو بے حد علیل پایا۔ ماریا' اس کی تیمارداری کر رہی تھی۔ وہ بلا کا دھوکے باز اور جعل ساز ہے۔ اس نے کسی بہانے لینیتے کی تحریر حاصل کی اور ایک جعلی وصیت نامہ تیار کیا جس کی رو سے لینیتے نے کیری کو پیارو کی آٹھویں سالگرہ کے موقعے پر اس کی وراثت کا واحد سرپرست قرار دیا تھا۔ اس جعلی وصیت نامے پر بطور گواہ ماریا اور فیبری کے دستخط ہیں اور اسے جعلی ثابت کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ کیری چند ہی ہفتے قبل جیل سے رہا ہوا ہے۔ اسکی عدم موجودگی میں ماریا کو پیارو کی سخت نگرانی کا فرض سونپا گیا تھا' اور فیبری کو ماریا پر نگاہ رکھنے کی ہدایات کی گئی تھیں تاکہ وہ ایسی کوئی حرکت نہ کرے جس کی اسے ہدایت نہیں کی گئی ہے۔ لینیتے کی طرح کیری کو اس بات کا یقین نہیں تھا کہ میں ویتنام میں مارا گیا ہوں' لہٰذا جیل سے رہا ہوتے ہی وہ وینس پہنچ گیا تاکہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لے اور پیارو کی آٹھویں سالگرہ کے موقع پر اس کا سرپرست ہونے کا دعویٰ کر دے۔"

"لیکن اب تو تم واپس آ گئے ہو۔"

"میرے خیال میں ماریا یا تو اس بات سے خوفزدہ ہو گئی تھی کہ کہیں وہ ان سرگرمیوں میں ملوث نہ ہو جائے یا پھر اس کے ضمیر کی خلش نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ اس کے جو بھی احساسات رہے ہوں' کیری سمجھ گیا کہ اب پیارو کو مزید اس کے پاس رکھنا خطرناک ہوگا......" اس نے کہا۔

"تو گویا جب میں' پیارو سے ملنے گئی تھی تو فیبری' ماریا سے یہ کہنے کے لیے گیا تھا کہ اب پیارو کو وہاں سے کہیں اور لے جایا جائے گا؟"

"ہاں......"

"اور وہ خوف زدہ ہو گئی تھی کہ وہ لوگ نہ جانے پیارو کا کیا حشر کریں۔ چنانچہ وہ مدد کے لیے میرے پاس بھاگی آئی تھی لیکن اس نے تم سے رابطہ قائم کیوں نہیں کیا؟" میں نے پوچھا۔

"خوف کے باعث۔" اس نے جواب دیا۔ "اسے ا... تھی کہ میں بالآخر تربول آؤں گا۔ اور یہاں تم دونوں کو ... پاؤں گا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ کیری نے اس کے منہ سے حقیق... اگلوانے کے لیے اس کا کیا حشر کیا ہوگا اور مرنے سے پہلے ا... پر کیسی قیامت گزری ہوگی۔ ممکن ہے' اس نے سوچا ہو کہ ... اس طرح جان بچ جائے گی لیکن کیری پہلے ہی اسے قتل کر... کا فیصلہ کر چکا تھا۔"

"اس کا یہ منصوبہ تھا کہ قتل کا الزام تم پر آئے لیکن ... بذریعہ ٹیلی فون تمہیں یہ اطلاع کیوں دی گئی کہ میں پیارو ... تربول لے آئی ہوں؟"

"وہ چاہتا تھا کہ اگر پولیس مجھے قتل کے الزام میں گرف... کرنے میں ناکام ہو جائے تو میں کوئی ایسی حرکت کر بیٹھوں ک... میری گرفتاری ناگزیر ہو جائے۔ تم پہلے ہی اس معاملے م... ملوث ہو چکی تھیں لہٰذا اس کا ارادہ تمہیں بطور چارہ استعما... کرنے کا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مجھ پر جنونی کیفیت طاری ہو... اور جب میں تمہیں اپنے بیٹے کے ساتھ پاؤں گا تو تمہیں... ٹھکانے لگا دوں گا۔ پھر پولیس کے لیے مجھے دہرے قتل ک... الزام میں گرفتار کرنا آسان ہو جائے گا۔ اب تمہیں دیکھنے ا... سمجھنے کے بعد' میں اپنے پچھلے خیالات پر بے انتہا نادم ہو... اور تم سے معافی چاہتا ہوں۔"

"اب تم ان کاغذات کے سلسلے میں کون سا قدم اٹھا... کا ارادہ رکھتے ہو؟ کیا لینیتے کی وصیت تمہارے پاس ہے؟"

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں عدالت کا دروازہ کھ... کھٹاؤں گا ممکن ہے میں مقدمہ جیت جاؤں اور وہ وصیت... جعلی ثابت ہو جائے۔ لیکن اس میں وقت لگے گا اور کیری... بات جانتا ہے لیکن وہ انتظار نہیں کر سکتا۔ جبھی وہ پیارو ک... بدلے ان کاغذات کی سودے بازی کرنا چاہتا ہے۔ اسے ا... کاغذات پر میرے دستخط کی ضرورت ہے۔ اگر میں تنہا ہو... شاید سوچ سوچ کر پاگل ہو جاتا لیکن تمہاری موجودگی... میری آس بندھائی ہے۔ میں تم سے گفتگو کر سکتا ہوں' ا... معاملے کے ہر پہلو پر بحث کر سکتا ہوں۔ میں نے تمہیں سب... کچھ بتا کر اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے لیکن کاش میں ا... جزیرے پر چند گھنٹے قبل پہنچتا' پھر شاید صورت حال مختلف... ہوتی۔"

"تمہیں امید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔" میں نے اسے دلاسہ دیا۔

وہ کھڑا ہو کر جھومنے لگا۔ "تم آخری مرتبہ کب سوئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"یوں محسوس ہوتا ہے گویا سو سال سے پلک نہیں جھپکی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"پھر سو جاؤ' اگر کوئی آیا تو میں تمہیں جگا دوں گی۔" میں نے کہا۔

وہ دوبارہ کرسی پر ڈھیر ہو گیا اور اپنی آنکھیں موند لیں۔ میں کچھ دیر تک خاموشی سے اسے تکتی رہی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔ میں خاموشی سے اٹھ کر دبے پاؤں دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ مجھے کسی قسم کی بھی کوئی آہٹ محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن میری چھٹی حس نے یکایک مجھے کسی انجانے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ میں نے بے حد احتیاط اور خاموشی سے دروازہ کھولا اور چپکے سے باہر نکل گئی۔ اب مجھے پہلے سے زیادہ شدت سے کسی گڑبڑ کا احساس ہونے لگا تھا اور میرے دل کی دھڑکن بے ربط ہو گئی تھی۔ میں نے چوکنے انداز میں ادھر ادھر دیکھا اور پھر سیدھی پھاٹک کی جانب بڑھی۔ ابھی پھاٹک سے گزر کر سڑک پر پہنچی ہی تھی کہ اچانک ٹھٹک گئی اور تب ہی میں سمجھی کہ کس شے نے میرے اندر وہ انجانی سی تحریک پیدا کی تھی۔ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر کسی مرد کا ہیولا تھا جو چاندنی میں واضح نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک ہٹا کٹا پستہ قامت شخص تھا اور یوں آگے بڑھ رہا تھا گویا چاندنی رات میں چہل قدمی کا لطف اٹھا رہا ہو۔ وہ فیبری تھا۔

❀......❀......❀

اس میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا بلکہ میں محض جبلی طور پر اس کا تعاقب کرنے لگی تھی۔ اگر مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال آتا کہ میں کیا کر رہی ہوں تو فوراً واپس جا کر کارلو کو جگا دیتی لیکن یہ جبلی خواہش اتنی شدید تھی کہ میں بلا ارادہ اس کے پیچھے لگ گئی۔ فیبری دوسرے موڑ سے مڑ گیا اور جب میں بہ صد احتیاط وہاں تک پہنچی تو اسے ایک کار کے قریب کھڑے پایا۔ اس نے اپنی کار جان بوجھ کر اتنے فاصلے پر کھڑی کی تھی تاکہ اس کے انجن کا شور ہمیں خبردار نہ کر دے۔ مجھے یہ اندازہ کرنے میں قطعی دشواری نہیں ہوئی کہ وہ کیری کا دوسرا پیغام چھوڑنے آیا تھا۔ اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس نے مزید کچھ دیر تک چہل قدمی کرنے کے بعد میری جانب پشت کر کے' کار کی باڈی سے ٹیک لگا کر ایک سگریٹ سلگا لیا اور ہلکے ہلکے کش لگا کر ہر کش سے لطف اندوز ہونے لگا۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور بے احد احتیاط سے کار کی جانب رینگنے لگی۔ اور اس کے قریب پہنچنے کے بعد جھک کر پچھلی نشست کے دروازے پر طبع آزمائی کی۔ دروازہ محض میری کلائی کی ہلکی سی جنبش سے کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر بآہستگی کھل گیا۔ میں خاموشی سے اندر رینگ کر فرش پر گٹھڑی کی مانند بیٹھ گئی اور ابھی دروازہ بند ہی کیا تھا کہ فیبری نے سگریٹ ایک جانب اچھال دیا اور اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے کار تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد کار اچانک پختہ سڑک سے اتر کر کسی کچے اور ناہموار راستے پر گامزن ہو گئی۔ فیبری نے اس کی رفتار کم کر دی اور وہ اچھلتی کودتی آگے بڑھنے لگی۔ میرا دل اچانک شدت خوف سے بری طرح دھڑکنے لگا۔ میں اس راستے سے ناواقف تھی۔ نہ جانے اس کی منزل کہاں تھی لیکن مجھے اس بات کا یقین تھا کہ میں جہاں بھی جا رہی ہوں' وہاں پیارو یقیناً موجود ہوگا' تاہم اس بات سے بے خبر تھی کہ وہاں پہنچنے کے بعد کیا پیش آئے گا؟

اچانک کار نے ایک دوسرا موڑ کاٹا اور پھر تقریباً پندرہ منٹ کے بعد کسی جگہ رک گئی۔ میری سانس بھی یکایک سینے میں گھٹ گئی۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگنے لگی۔ فیبری نے اتر کر دروازہ اپنے عقب میں بند کر دیا اور میں اس کے قدموں کی آواز کو دور ہوتے ہوئے سننے لگی۔ پھر میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور ذرا سا سر ابھار کر کھڑکی سے باہر جھانکا' کار' جنگل کے وسط میں کھڑی تھی اور کچھ ہی فاصلے پر ایک کاٹیج نظر آ رہا تھا۔ اس کی نچلی منزل کی ایک شکستہ کھڑکی سے موم شمع کی روشنی باہر آ رہی تھی۔ میں کار سے اتر کر کاٹیج کی جانب بڑھنے لگی اور اس روشن کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ پھر اندر جھانکا' کمرے میں کیری ایک پلنگ پر دراز تھا اور فیبری ایک میز کے پاس کھڑا وہسکی پی رہا تھا۔ پیارو کا وہاں نام و نشان تک نہ تھا۔ میں گھوم کر کاٹیج کے عقب میں پہنچی۔ یہاں دو کھڑکیاں تھیں لیکن دونوں بند تھیں۔ میں نے ایک پر دباؤ ڈالا...... تب مجھے معلوم ہوا کہ اس کے قبضے کتنے زنگ آلود ہو چکے ہیں۔ میں

اس پر طبع آزمائی کرنے لگی اور ذرا سی محنت سے کھڑکی کھل گئی۔ میں نے کمرے میں جھانکا۔ کمرہ بالکل خالی تھا' میں کمرے میں کود گئی اور اس کے ایک دروازے سے باہر قدم رکھا تو خود کو ایک تنگ سی راہداری میں پایا۔ اس کے اطراف ایک دروازہ تھا اور دوسری طرف سیڑھی تھی۔ میں خاموشی سے سیڑھیاں طے کر کے بالائی منزل پر پہنچی۔ یہاں بھی دو دروازے تھے۔ میں نے ایک پر دباؤ ڈالا' وہ کھل گیا۔ یہ ایک نیم تاریک کمرہ تھا۔ میں نے اس کا جائزہ لیا اور دفعتاً میری نگاہ کمرے کے ایک گوشے میں رکھی ہوئی گٹھری نما شے پر پڑی۔ میں تیزی سے آگے بڑھی اور اس کے قریب پہنچ کر سرگوشی کی۔ ''پیارو۔''

وہ بری طرح چونک اٹھا۔ میں نے دیکھا' وہ رو رہا تھا اور اس کے ہاتھ پیر رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور جلدی جلدی اس کی بندشیں کھول کر اسے آزاد کر دیا۔ اس کا لباس پھٹ کر جسم پر چیتھڑوں کی شکل میں جھول رہا تھا۔ سر پر خاک پڑی تھی۔ چہرہ کسی باسی پھول کی مانند مرجھایا ہوا تھا۔ آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں۔ رخسار آنسوؤں سے چمک رہے تھے اور وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ میں اسے لے کر اسی خاموشی سے نکل آئی جس خاموشی سے داخل ہوئی تھی۔ کار کے قریب پہنچ کر میں نے پیارو کو جلدی سے کار کے اندر دھکیلا اور خود اسٹیئرنگ سنبھال کر انجن اسٹارٹ کر دیا۔ فیبری کار کی چابی اگنیشن میں چھوڑ گیا تھا لیکن کار جونہی آگے بڑھی۔ میرے کانوں سے کسی کی چیخ و پکار کی آواز ٹکرائی' میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ کاٹج سے دو مرد نکل کر بھاگے چلے آ رہے تھے۔ میں نے گھبرا کر سامنے دیکھا تو ہیڈ لائٹس سے' عین راستے پر ایک بہت بڑا درخت گرا ہوا نظر آیا۔ شاید میں راہ سے بھٹک گئی تھی اور اب آگے بڑھنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ درخت نے راہ بالکل مسدود کر رکھی تھی اور اتنی گنجائش بھی نہیں تھی کہ میں کار کو ادھر یا ادھر موڑ کر نکل سکتی۔ میں نے فل بریک لگائے اور بے بسی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ذہن اس نئی افتاد سے بالکل مفلوج ہو کر رہ گیا تھا' اچانک میں نے دروازہ کھولا اور پیارو کو تھام کر جنگل میں بھاگنے لگی۔ اس اثنا میں میرے کانوں سے کیری کی آواز ٹکرائی جو فیبری کو پکار رہا تھا۔ پھر ان کے قدموں کی دھمک ہمارے قریب آنے لگی۔ وہ ہمارا پیچھا کر رہے تھے۔ مجھے سمت کا کوئی اندازہ نہیں تھا' ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا کہ بھاگتے رہو' کہیں نہ کہیں تو جنگل ختم ہو گا اور سڑک یقیناً زیادہ دور نہیں ہو گی۔ یکایک مجھے ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل گر پڑی۔ پیارو مجھے اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ ان دونوں کے قدموں کی آواز لحہ بہ لحہ قریب تر آتی جا رہی تھی۔ پھر میں نے پیارو کی دہشت زدہ چیخ سنی۔ اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے بھی طویل چیخ نکل گئی۔ پھر دفعتاً جنگل کی خاموش فضا گولیوں کی سماعت شکن آواز سے تھرا اٹھی۔ یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلیں اور پھر میں نے اچانک اپنا بازو کسی کی گرفت میں پایا۔ کوئی مجھے قدموں پر کھڑا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ساتھ ہی ایک مردانہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''پیارو دوڑو۔'' اور ہم دوبارہ دوڑنے لگے کچھ دیر تک دوڑتے رہنے کے بعد جنگل ختم ہو گیا اور سڑک نظر آنے لگی' سڑک پر ایک جگہ ایک کار کھڑی تھی۔ میں اور پیارو جلدی سے کار میں سوار ہو گئے اور پھر شاید میں بے ہوش ہو گئی۔

❀......❀......❀

آنکھ کھلی تو کارلو کو اپنے کمرے کی دہلیز پر کھڑا پایا۔ وہ تیزی سے میرے قریب آیا۔ ''اب تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

میں اپنا جسم سمیٹ کر اٹھ بیٹھی۔ ''جسم کے عضلات اکڑ گئے ہیں لیکن پہلے کی بہ نسبت بہتر محسوس کر رہی ہوں۔'' میں نے جواب دیا پھر یکایک چونک کر پوچھا۔ ''پیارو کہاں ہے؟''

''وہ اپنے بستر پر آرام سے سو رہا ہے۔ ابھی میں اس کے پاس سے آ رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ پھر مسکرا کر کہا۔ ''اس نے تھکن کے باعث مجھ سے زیادہ گفتگو نہیں کی لیکن مجھے بھولا نہیں ہے۔''

''وہ تمہیں بھول بھی نہیں سکتا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اب وہ ہر طرح سے محفوظ ہے نا؟''

''ہاں' تم دونوں ہی اب ہر طرح سے محفوظ ہو۔'' اس نے تبسم بکھیر کر جواب دیا اور ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ ''اور اس کا سہرا تمہارے سر بندھتا ہے۔ اے کاش' میں اپنا سینہ چیر کر تمہیں دکھا سکتا کہ میرے دل میں تمہاری کتنی قدر ہے؟'' اس نے گہری اپنائیت سے کہا۔

''اور کیری اور فیبری کا کیا بنا؟'' میں گھبرا کر جلدی سے پوچھ بیٹھی۔ ''جنگل میں کیا ہوا تھا؟ میں نے گولیاں چلنے کی آواز سنی تھی۔''

''گھبراؤ مت' میں نے انہیں ہلاک نہیں کیا ہے بلکہ صرف ان کی ٹانگوں کو نشانہ بنایا تھا۔''

''لیکن تم وہاں پہنچے کیسے؟ میں تو اسے معجزہ ہی کہوں گی۔''

''میں تمہارے یہاں سے نکلتے ہی بیدار ہو گیا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ تم کیوں چلی گئیں۔ لہٰذا میں تمہیں ڈھونڈنے باہر نکلا۔ اچانک میری سماعت سے کسی کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز ٹکرائی۔ میں بے شک یہ نہیں جانتا تھا کہ تم اس کار میں موجود ہو گی...... لیکن یہ ضرور سمجھ گیا کہ کیری اور فیبری دوسری ہدایات پہنچانے آیا ہے پھر مجھے اپنی کار کی ونڈ اسکرین پر ایک کاغذ چپکا ہوا نظر آیا لیکن میں اسے پڑھنے کے لیے رکا نہیں بلکہ اس میں سوار ہو کر اس دوسری کار کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ وہ کار کچھ دیر تو میری نظر میں رہی پھر اچانک مڑ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں ایک گھنٹے تک اس کی تلاش میں بھٹکتا پھرا' پھر جنگل کا رخ کیا۔ سویرا ہو چلا تھا اور ابھی وہاں پہنچا ہی تھا کہ مجھے تمہاری چیخ سنائی دی' میں کار سے اتر کر بے تحاشا آواز کی سمت دوڑا...... اور تم مجھے نظر آ گئیں۔ میرے پاس ریوالور موجود تھا' کیری اور فیبری تعاقب کرتے ہوئے دونوں تم تک پہنچ گئے تھے لہٰذا مجھے ان کی ٹانگوں کو نشانہ بنانا پڑا۔''

''وہ خدایا' اگر تمہیں ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو نہ جانے ہمارا کیا حشر ہوتا؟'' میں نے خوف سے جھرجھری لے کر کہا۔

اس نے میرا ہاتھ بے حد نرمی سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ''اب پچھلی باتوں کو بالکل بھول جاؤ' جو ہونا تھا ہو گیا لیکن جب میں یہ سوچتا ہوں کہ تم نے میرے بیٹے کے ساتھ کتنا عمدہ سلوک کیا ہے اور اس پر کتنی محبت اور شفقت نچھاور کی ہے تو میرا دل جذبہ تشکر سے لبریز ہو جاتا ہے۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جن سے میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کر سکوں۔ تم بہت ہی پیاری اور بے حد دلیر خاتون ہو۔''

''بس اب زیادہ تعریف مت کرو' میں نہانے جا رہی ہوں۔'' میں اٹھتی ہوئی بولی۔

''پیارو کہہ رہا ہے کہ تم نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ اسے کبھی چھوڑ کر نہیں جاؤ گی۔'' وہ شوخی سے مسکراتا ہوا بولا۔

''میں نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ ناممکن ہے۔''

''لیکن اسے تمہاری ضرورت ہے۔'' وہ متانت سے بولا۔ ''کیا تم اس کی یہ خواہش ٹھکرا دو گی؟''

''اف خدایا یہ...... یہ...... مجھے افسوس ہے یہ ممکن نہیں۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔'' میں نے بے بسی سے جواب دیا۔

''اوہ۔'' وہ اچانک بے حد اداس ہو گیا۔ ''تم یقیناً انگلستان واپس جانا چاہتی ہو گی' جہاں زندگی کی رعنائیاں ہیں' تمہارے عزیز و اقارب ہیں' سب کچھ ہے شاید میں تم سے یہاں رکنے کی درخواست کر کے خود غرضی کا ثبوت دے رہا تھا لیکن ...... لیکن محبت کبھی خود غرض نہیں ہوتی۔'' اس نے میرا ہاتھ دھیرے سے چھوڑ دیا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر اس کی جانب دیکھا اس کی حسین آنکھوں میں اداسی گھلی ہوئی تھی۔ میں تیزی سے مڑی اور سیڑھیاں طے کرتی ہوئی بالائی منزل پر پہنچ گئی۔ پیارو اپنے بستر پر سو رہا تھا۔ اس کی جانب دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا گویا کوئی فرشتہ سو رہا ہو۔ اسے چھوڑ کر جانے کا خیال آیا ہی تھا کہ دل میں ایک ہوک سی اٹھی اور آنکھیں بھر آئیں۔ کیا میں اپنے ہاتھوں سے اپنی محبت کا گلا گھونٹ سکتی ہوں؟ میں نے خود سے سوال کیا۔ کیا میں اس سے دور رہ سکتی ہوں؟ کیا یہ ممکن ہے؟ یکایک میرے ذہن میں آہٹ سی ہوئی۔ میں نے چونک کر گردن گھمائی۔ کارلو مجھ سے چند ہی قدم کے فاصلے پر کھڑا مجھے اداس نظروں سے دیکھ رہا تھا...... پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا میرے قریب آ کھڑا ہوا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''کارلو...... میں اب یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔'' میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور اس کے شانے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔ میری پلکوں پر خواب اتر آئے تھے۔

اصل قاتل

خلیل جبار

بھوک پیٹ کی ہو یا بدن کی' جب حد سے بڑھ جائے تو انسان عقل و خرد سے بیگانہ ہو جاتا ہے. نفسانی بھوک اس کے ذہن و دل کو اس طرح جکڑ لیتی ہے کہ وہ رشتوں ناتوں سے جان چھڑا کر بس اپنے نفس کا غلام بن کر رہ جاتا ہے.

ایک معصوم لڑکے کا قیضہ' وہ ایک شادی شدہ عورت کی بھوک کا شکار بن گیا تھا.

کورٹ رپورٹر کی ڈائری کا ایک ورق.

دیکھنے میں وہ لڑکا زیادہ عمر کا نہیں لگ رہا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے دوست کے باپ کا قاتل تھا۔ پولیس ابھی ابھی اسے کورٹ لے کر آئی تھی۔ مجھے جب اس کی گرفتاری اور کورٹ میں ریمانڈ کے لیے پیش کیے جانے کی خبر ملی تھی میں فوری طور پر سول کورٹ پہنچ گیا تھا۔ اسے دیکھ کر بالکل بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ کسی انسان کا قاتل ہو سکتا ہے۔ پولیس نے اگر اسے گرفتار کیا ہے تو ضرور کسی ٹھوس ثبوت کی بنیاد پر ہی ایسا کیا ہوگا۔ اس لڑکے کا ہم عمر ہی لڑکا دور کھڑا اسے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ ابھی اس پر حملہ کر دیتا۔ میں اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ مجھے اپنے اتنا قریب دیکھ کر وہ چونکا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا۔ میرے تعارف کرانے پر جیسے وہ پھٹ پڑا۔

''اس مردود کے خلاف تم کھل کر اپنے اخبار میں لکھنا۔''

''تم بے فکر رہو میں ضرور اس کے خلاف لکھوں گا' لیکن پہلے تم مجھے اپنا تعارف کراؤ اور یہ بتاؤ کہ اس نے قتل جیسا اقدام کیوں کیا ہے؟ ابھی تو اس کے پڑھنے لکھنے کے دن ہیں۔''

''خلیل جبار بھائی تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے اس کے پڑھنے لکھنے کے دن ہیں۔ ارسلان انٹر کا طالب علم ہے پرائمری سے ہی میرا کلاس فیلو چلا آ رہا ہے' اس کا ہمارے گھر میں آنا جانا رہتا تھا۔ میرے والدین نے بھی ہم دونوں میں کوئی فرق محسوس نہیں کیا۔ ہمارے گھر میں اس کی حیثیت فیملی ممبر کی سی تھی۔ اس کے باوجود ارسلان نے میرے والد ضمیر احمد کو قتل کر دیا۔ سمجھ میں نہیں آتا اس نے ایسا کیوں کیا؟ ہمیں ارسلان پر بالکل بھی شک نہیں تھا کہ وہ میرے والد صاحب کو قتل کر دے گا۔ لیکن نا جانے کیوں پولیس کا شک ارسلان پر ہی جا رہا تھا۔ میری امی نے بھی پولیس کو سمجھایا تھا کہ ارسلان ایسا نہیں ہے پھر بھی پولیس نے یہ بات نہیں مانی اور پولیس نے اسے گرفتار کر کے سارا راز اگلوالیا ہے کہ وہی میرے والد صاحب کا قاتل ہے۔''

''ارسلان نے قتل کی کیا وجہ بتائی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے زیادہ تفصیل کا علم نہیں ہے' پولیس نے مجھے یہی بتایا ہے کہ اس نے قتل کا اعتراف کر لیا ہے۔ مزید تفصیلات معلوم کرنے کے لیے ریمانڈ حاصل کرنے اسے کورٹ لے کر آئی ہے۔''

''ٹھیک ہے' میں خود اس سے بات کرتا ہوں۔'' میں نے ارسلان کو عدالت سے باہر آتا دیکھ کر کہا۔

اے ایس آئی جمال مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ ''مجھے پتا تھا اخبار والوں کے لیے ارسلان کی گرفتاری کی خبر انتہائی اہم ہوگی۔ ویسے تو ہم نے اس سے سب کچھ اگلوا لیا ہے لیکن مزید تفصیلات جاننے کے لیے ارسلان کا تین دن کا ریمانڈ حاصل کر لیا ہے۔''

''تفصیلات کون بتائے گا؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ملزم ارسلان موجود ہے خود اس سے بات چیت کرو تاکہ کل اخبارات میں قتل سے متعلق زبردست خبر شائع ہو۔''

''ٹھیک ہے میں خود اس سے پوچھ لیتا ہوں'' میں نے نوٹ بک کھولتے ہوئے کہا۔

''ارسلان بالکل ٹھیک ٹھاک باتیں بتانا ورنہ تم جانتے ہی ہو پولیس والوں کو۔'' یہ کہتے ہوئے اے ایس آئی جمال
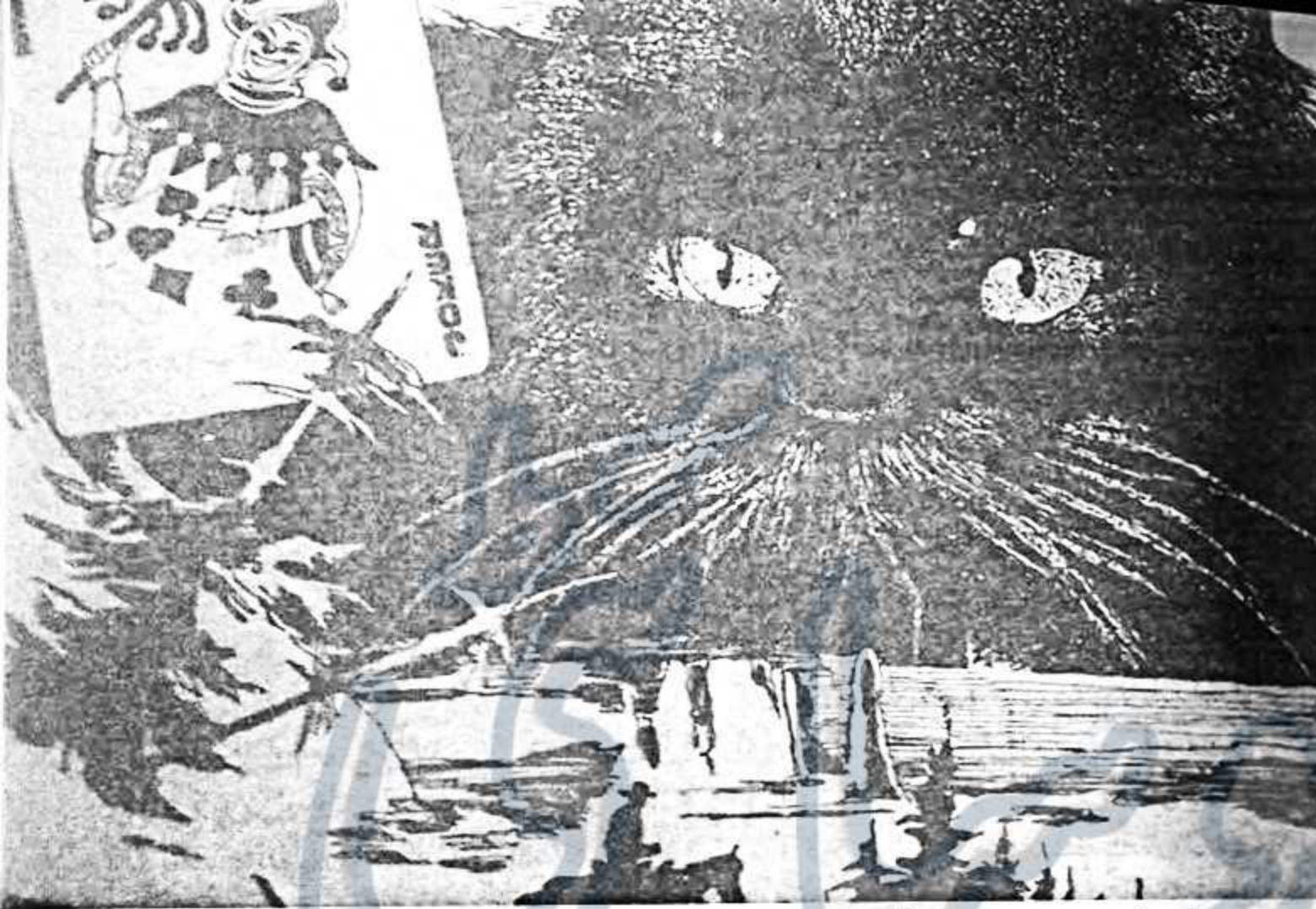
نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔ ارسلان نے گھبرا کر اپنی نظریں نیچے جھکا لیں۔

''ارسلان کیا یہ درست ہے کہ تمہارا مقتول کے گھر آنا جانا تھا وہ تمہیں اپنے بیٹے کی طرح سمجھتا تھا۔ پھر بھی تم نے اسے قتل کر دیا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس سوال کا جواب بہت طویل ہو جائے گا' کیا اتنا کافی نہیں ہوگا کہ ضمیر انکل کا قاتل ہوں اور قتل کا اقرار کر لیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ارسلان نے ایک نظر مجھے اور ایک نظر اے ایس آئی جمال کو دیکھا۔

''زیادہ ہوشیار مت بن' ہمیں سب خبر ہے' اس قتل میں کوئی اور بھی ملوث ہے اور تم ایسا جواب دے کر اس شخصیت کو بچانا چاہ رہے ہو' یاد رکھو ہم نے تمہارا تین دن کا ریمانڈ لے لیا ہے اور ہم پوری تفصیل جانے بغیر تمہیں آسانی سے نہیں چھوڑیں گے۔'' اے ایس آئی جمال نے اپنا لہجہ سخت بناتے ہوئے کہا۔

اس کی دھمکی کام دکھا گئی اور ارسلان سب کچھ بتانے پر تیار ہو گیا۔

''میں جو کچھ بتاؤں گا وہ سب اخبار میں چھاپ دو گے۔'' ارسلان نے میری طرف دیکھا۔

''ان کا کام اخبار میں سب کچھ چھاپنا ہے تم زیادہ ہوشیاری مت دکھاؤ اور صاف صاف سب کچھ انہیں بتاؤ۔'' اے ایس آئی جمال غصے سے بولا۔

ارسلان سہم گیا اور بولا۔

''ٹھیک ہے میں سب کچھ صاف صاف بتا دوں گا کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا۔''

''ہاں یہ ہوئی نا بات۔'' اے ایس آئی جمال مسکرا دیا۔

''میرا بچپن ہی سے ضمیر صاحب کے گھر میں آنا جانا تھا۔ اس کی وجہ شاکر تھا' شاکر اور میرا ساتھ پرائمری سے تھا۔ ہم دونوں ساتھ پڑھتے ہوئے انٹر تک پہنچے ہیں۔ ضمیر صاحب اپنی بیوی زینب النساء سے عمر میں خاصے بڑے تھے جس کا وہ اظہار اکثر اپنی بات چیت میں کرتی رہتی تھیں۔ میں نے اکثر انہیں اپنی سہیلیوں سے کہتے سنا تھا کہ میرے والدین نے میرے ساتھ بہت ظلم کیا ہے۔ مجھے ایک بڑی عمر کے آدمی کے پلے باندھ دیا ہے۔ میرے

دل میں کیا کیا ارمان تھے‘ وہ سب خاک میں مل گئے ہیں۔ میں جب میٹرک میں آیا آنٹی زیب النساء کی مجھ پر مہربانیاں بڑھنے لگی تھیں۔ وہ گھر میں جو اچھا کھانا پکاتی تھیں مجھے ضرور کھلاتی تھیں‘ میں خود بھی حیران تھا کہ یہ سب میرے لیے کیوں ہے‘ میں جب شاکر کی غیر موجودگی میں گھر جاتا آنٹی مجھے بٹھالیتیں اور باتیں کرنے لگتیں۔ ایک دن میں جب شاکر سے ملنے گیا وہ گھر پر نہیں تھا‘ شاکر کسی کام سے بازار گیا ہوا تھا۔ آنٹی مجھے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھیں۔ مجھے چائے پیش کرکے میرے نزدیک ہی صوفے پر بیٹھ گئیں۔ وہ مجھے بڑی حسرت اور پیاسی نگاہوں سے دیکھنے لگیں‘ ان کے اس طرح دیکھنے سے مجھے شرم آنے لگی تھی۔ میں نے جیسے تیسے جلدی جلدی چائے کا کپ خالی کیا اور ان سے اجازت مانگی‘ مگر آنٹی نے بڑے پیار سے میرا ہاتھ پکڑلیا۔

’’بڑے عرصے بعد یہ موقع ملا ہے کہ تم سے اپنے دل کی بات کروں۔‘‘ وہ بولیں۔

’’مجھ سے اور دل کی بات؟‘‘ میں چونکا۔

’’ہاں تم سے۔ تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔‘‘

’’ظاہر ہے میں شاکر کا دوست ہوں اس لیے اچھا ہی لگوں گا۔‘‘ میں نے بھولے پن سے کہا۔

’’میری بچپن سے خواہش تھی کہ مجھے ایسا شوہر ملے جو خوبصورت اور میرا ہم عمر ہو مگر بدقسمتی سے میری یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ میرے والدین نے ضمیر احمد کی دولت سے متاثر ہوکر اس کے پلے باندھ دیا اور یہ بھی نہ سوچا کہ وہ عمر میں دوگنا ہے۔ میرے سارے ارمان پر پانی پھر گیا‘ میں نے بے دلی سے ضمیر احمد کو قبول کیا۔

’’آنٹی یہ سب مقدر کے فیصلے ہوتے ہیں۔ انسان جو سوچتا ہے ایسا بہت کم ہی ہوتا ہے۔‘‘

’’ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر میں کیا کروں اب میرا ضمیر احمد کے ساتھ نبھا نہیں ہوسکتا۔‘‘

’’وہ کیوں؟‘‘ میں بری طرح چونکا۔

’’اس لیے کہ ضمیر احمد اب میری خواہشات پوری کرنے سے قاصر ہے۔‘‘ یہ کہتے ہوئے آنٹی نے نظریں جھکالیں۔

’’آنٹی آپ کے پاس اتنی دولت ہے پھر یہ کیا بات کررہی ہیں۔‘‘

’’پگلے ہر خواہش دولت سے نہیں حاصل ہوتی‘ میں جس خواہش کی بات کررہی ہوں وہ جسمانی خواہش ہے میرے جذبات جوان ہیں اور ضمیر احمد کے جذبات سرد پڑتے جارہے ہیں اوپر سے شوگر کے مرض نے انہیں بالکل ہی ناکارہ بنادیا ہے۔ بس یہی نقصان ہوتا ہے بڑی عمر کے آدمی سے شادی کرنے کا۔‘‘

ان کی بات اب میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھیں‘ وہ خاصی دیر مجھ سے باتیں کرتی رہیں۔ میں صرف ہوں ہاں کرتا رہا‘ شاکر کے بازار سے لوٹ آنے پر وہ کمرے میں چلی گئیں۔

گھر آ کر بھی میں آنٹی سے متعلق ہی سوچتا رہا کہ یہ سب باتیں وہ مجھ سے کیوں کررہی تھیں‘ ان کے نصیب میں جو لکھا تھا وہ ہوچکا تھا۔ اسے مٹا دینا کسی کے مقدر میں نہیں تھا۔ بہرحال مجھے آنٹی کی باتیں سن کر دکھ اور افسوس بھی ہورہا تھا کہ ان کے لالچی والدین نے دولت کی خاطر اپنی بیٹی کے ارمانوں کا گلا گھونٹ کر اچھا نہیں کیا۔

آنٹی کی مہربانیاں مجھ پر بڑھنے سے میں محتاط ہوگیا اور میں کوشش کرتا کہ جب شاکر گھر پر ہو جبھی میں جاؤں۔ نہ جانے کیوں مجھے اکیلے میں آنٹی سے ملتے ہوئے خوف سا محسوس ہونے لگا تھا۔ اس کے برعکس وہ مجھے دیکھ کر کھل اٹھتی تھیں گھر کا سودا سلف شاکر ہی لاتا تھا‘ اس لیے آنٹی کو تنہائی میں مجھ سے بات چیت کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ کئی بار انکل نے مجھے آنٹی کے نزدیک بیٹھے ہوئے دیکھ لیا‘ پہلی دفعہ‘ دوسری بار تو انہوں نے محسوس نہیں کیا مگر پھر وہ مجھے شک بھری نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ ان کے اس طرح دیکھنے سے ڈر جاتا تھا۔ ان کے پولیس سے تعلقات بہت اچھے تھے‘ اور جن لوگوں کے پولیس سے تعلقات اچھے ہوں ان سے ڈرنا ہی چاہیے۔

ایک دن میں کالج سے شاکر کے ساتھ اس کے گھر پہنچا۔ آنٹی نے شاکر کو کسی کام سے باہر بھیج دیا جب وہ میرے نزدیک صوفے پر آ کر بیٹھیں میں نے محسوس کیا کہ ان کی آنکھیں سوجھی ہوئی تھیں۔

’’آنٹی کیا ہوا تمہاری آنکھیں کیوں سوجھی ہوئی ہیں؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’تمہارے انکل بہت شکی ہوگئے ہیں۔ وہ بات بات پر

شک کرنے لگے ہیں۔ فلاں کیوں آیا تھا‘ فلاں سے تم ہنس ہنس کر کیوں بات کررہی تھیں۔ رات بھی ان سے اس بات پر جھگڑا ہوگیا میں نے بھی جو دل میں آئی انہیں سنادی اور صاف صاف کہہ دیا کہ دوسروں پر شک کرنے کی بجائے اپنا علاج کرواؤ بس میرا یہ کہنا تھا کہ وہ چراغ پا ہوگئے اور مجھ پر ہاتھ اٹھالیا اور روئی کی طرح مجھے دھنک کر رکھ دیا۔‘‘

’’انکل کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔‘‘ میں نے کہا۔

اسی وقت اچانک انکل گھر میں داخل ہوئے ان کا یہ وقت گھر آنے کا نہیں تھا۔ وہ مجھے آنٹی کے پاس بیٹھا دیکھ کر چونکے مگر بولے کچھ نہیں‘ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ آنٹی ان کے آنے پر اٹھ گئیں۔ میں بھی خاموشی سے گھر چلا آیا۔

دوسرے دن شام کے وقت میں گھر کے کام سے بازار گیا‘ ابھی میں ایک دکان پر سودا لینے کو کھڑا ہی ہوا تھا کہ مجھے کسی نے گدی سے پکڑ کر پیچھے کی طرف کھینچا‘ میں لڑکھڑایا‘ وہ پولیس والا تھا۔ اس نے مجھے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا اور موبائل میں ڈال دیا۔

’’مجھے کیوں پکڑ رہے ہو‘ میرا قصور کیا ہے؟‘‘ میں نے احتجاج کیا۔

’’بیٹے یہ تجھے تھانے چل کر ہی پتا چلے گا۔‘‘ پولیس کانسٹیبل نے میرے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں موبائل سے اتر کر بھاگ جانا چاہتا تا مگر موبائل میں بیٹھی پولیس نے مجھے بری طرح سے دبوچ لیا۔ میں کوشش کے باوجود ان سے چھٹکارا نہیں پاسکا۔

پولیس نے مجھے تھانے میں لاک اپ کردیا۔ میں حیران و پریشان پولیس کو دیکھ رہا تھا کہ میرا کوئی قصور نہ ہونے پر بھی لاک اپ کردیا گیا تھا۔ میں اپنے گھر پر بات کرکے انہیں موجودہ صورت حال سے آگاہ کرنا چاہتا تھا مگر وہ کسی صورت میری گھر والوں سے بات کرانے کے موڈ میں نہیں تھے۔ میرا موبائل بھی انہوں نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ماؤف ہوگئی تھی۔ میری گمشدگی پر والدین الگ پریشان ہورہے ہوں گے۔ میری ان سے بات چیت ہوجانے پر وہ میری رہائی کے لیے کچھ کرسکتے تھے۔ رات گئے ایس ایچ او عبدالغفار اور اے ایس آئی منظور احمد آئے‘ ایس ایچ او نے مجھے اے

ایس آئی منظور کے حوالے کردیا۔ وہ مجھے ایک علیحدہ کمرے میں لے گیا۔ اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور دو پولیس کانسٹیبل کی مدد سے پٹائی شروع کردی کبھی ڈنڈے اور کبھی بیلٹ کا استعمال کرتے ہوئے میری چیخیں نکال دیں' میں درد کی شدت سے روتے ہوئے بار' بار ان سے اپنا قصور معلوم کررہا تھا کہ مجھے کیوں اتنا پیٹا جارہا ہے' لیکن وہ کسی صورت میرا قصور بتانے کو تیار نہ تھے۔ میں کوئی عادی مجرم نہ تھا کہ جو اتنی اذیت برداشت کرجاتا' میں بے ہوش ہوگیا۔ جب ہوش آیا رات خاصی بیت چکی تھی۔ صبح ہونے کو تھی۔ میں لاک اپ میں تھا۔ تھانے میں دو سپاہی موجود تھے۔ باقی عملہ جاچکا تھا۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ دونوں سپاہی زیر لب مسکرا دیے۔

''پ......پ......پانی......'' میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

ایک سپاہی نے مجھے پانی پلایا' پانی پی کر مجھ میں کچھ جان آئی' میں نے درد بھری آواز سے ان سپاہیوں سے بھی یہی سوال کیا کہ مجھے کس جرم میں تھانے لاکر تشدد کیا جارہا ہے' مگر اس سوال کا جواب ان کے پاس بھی نہیں تھا۔ اس لیے وہ خاموش ہی رہے۔ ایک سپاہی کو مجھ پر ذرا ترس آیا اور وہ میرے پاس آتے ہوئے بولا۔

''ہمیں بھی یہ معلوم نہیں کہ تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے' مگر جس طرح تم پر رات کو تشدد ہوا ہے اس سے لگتا ہے کوئی خاص چکر ہے۔''

''انہیں غلط فہمی ہوئی ہے میں کسی چکر میں نہیں ہوں' میں تو صرف ایک طالب علم ہوں۔'' میں نے ہمدردی پا کر کہا۔

''تم ہمیں کسی شریف گھرانے کے لڑکے لگتے ہو' مگر ہم بے بس ہیں تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکتے' ہاں ایس ایچ او صاحب تمہارے لیے بہت کچھ کرسکتے ہیں' بشرطیکہ انہیں تم پر ترس آجائے وہ بڑے خدا ترس انسان ہیں۔'' دوسرے سپاہی نے کہا۔

تین دن مزید مجھ پر اور بھاری گزرے کیونکہ ایس ایچ او صاحب تین دن کی چھٹی پر چلے گئے تھے۔ میں اب اے ایس آئی منظور کے رحم وکرم پر تھا۔ وہ میری کوئی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ رات کو آتا اور مجھ پر بری طرح تشدد کرتا اور بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ کر چلا جاتا۔ چوتھے روز جب ایس ایچ او تھانے آیا میری جسمانی حالت بہت خراب ہوچکی تھی۔ مجھ میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ میں آسانی سے چل پھر سکوں' مجھے سہارا لے کر چلنا پڑ رہا تھا۔ ایس ایچ او نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا' میں انہیں دیکھ کر پھٹ پڑا۔

''ایس ایچ او صاحب آخر میرا قصور کیا ہے جو مجھے اس طرح مجرموں کی طرح پیٹا جارہا ہے۔ اور مجھے میرا قصور بھی نہیں بتایا جارہا ہے۔''

''تمہارا جرم کیا ہے؟ اور ہم کیوں تم پر تشدد کررہے ہیں' یہ تو ہمیں بھی معلوم نہیں ہے مگر ہم ایسا کرنے پر مجبور ہیں۔''

''کیا!'' میں بے اختیار چونکا۔

''ہاں بیٹے میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں' ہمیں اوپر سے یہی ہدایت ملی ہے کہ تم پر تشدد کرکے سمجھایا جائے کہ آئندہ تم ضمیر صاحب کے گھر نہیں جاؤ گے۔''

''مجھے کون سا ان کے گھر جانے کا شوق ہے اگر مجھے تشدد کے بغیر بھی کہہ دیتے تو میں ان کے گھر نہیں جاتا۔'' میں نے کہا۔

''ضمیر صاحب کے تعلقات کا تمہیں اندازہ نہیں ہے اگر ہم تمہیں تشدد کیے بغیر سمجھا دیتے تو ہماری کم بختی آجاتی کہ ہم نے اوپر سے آئے ہوئے احکامات کی تعمیل کیوں نہیں کی۔ تم ان کاغذوں پر دستخط کردو۔'' ایس ایچ او نے کچھ کاغذ میرے آگے کیے۔

''یہ کاغذ کیسے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ کاغذی کارروائی ہے ہم کسی بھی شہری کو بلاوجہ تھانے میں قید نہیں کرسکتے اس لیے ان کاغذوں میں ہم نے لکھا ہے کہ تمہیں ایک ڈکیتی کے مقدمے میں تفتیش کے لیے بلایا تھا' تفتیش کیے جانے پر تم بے گناہ نکلے' اس لیے تمہیں چھوڑا جارہا ہے۔''

تھانے سے رہائی کا سن کر میں نے ان کاغذات پر خوشی خوشی دستخط کردیے۔

میرے تھانے سے نکلنے پر ایس ایچ او نے مجھے سختی سے کہا کہ میں اب ضمیر انکل کے دروازے کے پاس سے بھی نہیں گزروں ورنہ میں پھر سے مصیبت میں گرفتار ہوجاؤں گا' میں انہیں یہ یقین دہانی کرا کے کہ ادھر کا رخ نہیں کروں گا' گھر چلا آیا۔ گھر والے میری پراسرار گمشدگی پر پہلے ہی پریشان تھے' وہ میری یہ حالت دیکھ کر اور پریشان ہوگئے۔ میں نے انہیں پوری تفصیل بتانے کی بجائے یہ بتا کر مطمئن

کردیا کہ پولیس نے مجھے ایک مقدمے میں تفتیش کی غرض سے گرفتار کیا تھا مگر میں وہ نہیں تھا' جو انہیں مطلوب تھا اس لیے چھوڑ دیا۔

میں نے ضمیر انکل کے گھر تو دور کی بات ان کی گلی سے ہی گزرنا چھوڑ دیا تھا۔ شاکر کو بھی میں نے ضمیر انکل کے بارے میں بتادیا کہ انہوں نے میرے ساتھ تھانے میں کیا سلوک کیا ہے' مگر اس نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ مجھے اس بات کی پروا بھی نہیں تھی کہ اسے میری بات کا یقین آیا' وہ میری گرفتاری کو اور ہی رنگ دے رہا تھا' میں جب ضمیر انکل کے گھر دو' تین ہفتے تک نہیں گیا تو زیب النسا آنٹی کو تشویش ہوئی۔ ایک دن سرراہ مجھے دیکھ کر وہ بے اختیار میری طرف بڑھیں۔ انہیں اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھ کر میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ ضمیر انکل کا کوئی بھی جاننے والا مجھے نظر نہیں آیا' تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

''ارسلان جب سے مجھے پتا چلا ہے کہ ضمیر نے تمہیں تھانے میں بند کرا کے بری طرح سے تشدد کیا ہے مجھے بہت افسوس ہوا کہ یہ اچھا نہیں ہوا۔ اس نے ناحق تم پر یہ ظلم کیا ہے۔'' وہ بولیں۔

''بس جو ہوا ہے اس کو میں نے بھلا دیا ہے۔'' میں نے نظریں نیچی کیے کہا۔

''آؤ گھر چلتے ہیں۔''

''نہیں آنٹی مجھے پولیس نے سختی سے منع کیا ہے کہ میں انکل ضمیر کے گھر نہیں جاؤں گا' ورنہ مجھ پر اس سے زیادہ تشدد ہوگا۔'' میں نے ڈرتے ہوئے کہا۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ضمیر اس حد تک گر جائے گا تمہارا قصور بھی کچھ نہیں ہے پھر بھی اتنا تشدد کرایا۔''

''آنٹی جو ہونا تھا وہ ہوگیا پرانی باتوں کو دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔''

''ہاں پرانی باتوں کو دہرانے کا فائدہ نہیں لیکن اس کا مداوا ہوسکتا ہے۔''

''مداوا!'' میں چونکا۔

''ہاں مداوا آؤ میرے ساتھ۔'' آنٹی زیب النسا نے کہا۔

''لیکن کہاں۔'' میں نے کہا۔

آنٹی میرا ہاتھ پکڑ کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے لے گئیں میں نے لاکھ کوشش کی کہ ان سے اپنا ہاتھ چھڑا لوں لیکن کامیاب اس لیے نہیں ہوسکا کہ میرا ہاتھ انہوں نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ میں زور زبردستی سے ہاتھ چھڑا کر تماشا بننا نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گئیں' میں سخت گھبرایا ہوا تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں ضمیر انکل نہ آجائیں۔

''ارسلان پرسکون ہوکر بیٹھ جاؤ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے ضمیر کو اسلام آباد میں کام تھا اس لیے وہ شاکر کو بھی اپنے ساتھ لے کر چلا گیا کہ اس بہانے وہ بھی اسلام آباد گھوم پھر لے گا۔ کیونکہ وہ کئی بار اسلام آباد جانے کی فرمائش کرچکا ہے۔ وہ ایک ہفتے سے پہلے نہیں آئیں گے۔'' آنٹی زیب النساء نے بتایا۔

وہ مجھے ڈرائنگ روم کے بجائے اپنے کمرے میں لے گئیں۔ میں ان کا کمرہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ انہوں نے مجھے اپنے بیڈ پر بٹھایا اور میرے لیے چائے بنانے کچن میں چلی گئیں۔ آنٹی کو پتا تھا کہ مجھے چائے بہت پسند ہے' یہ جان کر بھی کہ انکل ضمیر اسلام آباد گئے ہوئے ہیں پھر بھی مجھ پر گھبراہٹ طاری تھی اور میرا ذہن اس بات میں بھی اٹکا ہوا تھا کہ آنٹی نے جو مداوا کی بات کی ہے وہ کیا ہے۔ اگر آنٹی نے مجھے کچھ رقم دینے کی پیشکش کی تو میں ہرگز قبول نہیں کروں گا۔ تھانے میں جو میری پٹائی ہوئی ہے اس میں رقم لینے سے کوئی کمی آجائے گی ہرگز نہیں۔ میں پیسے لینے سے صاف انکار کردوں گا۔ آنٹی میرے لیے چائے بنا کر لے آئیں ان کے ہاتھوں میں چائے کا کپ دیکھ کر میں پوچھ ہی بیٹھا۔

''آنٹی کیا آج ماسی نہیں آئی ہے جو آپ نے یہ تکلف کیا۔''

''ماسی کو میں نے ایک ہفتے کی چھٹی دے دی ہے۔'' آنٹی نے بتایا۔ ''ضمیر اور شاکر کے اسلام آباد جانے پر گھر میں کوئی کام ہی نہیں اس لیے میں نے اسے چھٹی دے دی ہے تاکہ ہماری اور تمہاری ملاقات کا کوئی گواہ بھی نہ رہے جو ضمیر کے سامنے مخبری کرسکے۔'' آنٹی زیب النساء نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

چائے وہ بہت اچھی بنا کر لائی تھیں۔ اس لیے چائے پیتے ہی جی خوش ہوگیا۔ میں تعریف بھری نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

''چائے کیسی تھی؟''

''بہت اچھی چائے تھی' پی کر دل خوش ہوگیا ہے۔''
میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''میں سوچ ہی رہی تھی کہ تم سے کس طرح رابطہ کروں۔''
''ماسی کو میرے گھر کا پتا ہے اس سے معلوم کرلیتیں۔''
''ضمیر نے جب سے تمہاری پولیس کے ہاتھوں پٹائی کرائی ہے میں نہیں چاہتی کہ ہماری ملاقاتوں کا کوئی اور گواہ بنے۔ اس لیے میں خود تم سے رابطہ کرنا چاہ رہی تھی۔ صبح ہی میں نے تمہارا موبائل نمبر شاکر کی ڈائری سے نوٹ کیا تھا اور سوچا تھا کہ گھر کا سودا سلف لاکر تم کو بلاؤں گی مگر اتفاق دیکھو کہ میری بازار میں ہی تم سے ملاقات ہوگئی کال کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔'' آنٹی ہنس دیں۔
''آنٹی دل سے دل کو راحت ہوتی ہے میں بھی یہ سوچ رہا تھا کہ تم سے ملاقات کرکے انکل ضمیر کے مظالم کے بارے میں بتاؤں اور وہ زخم دکھاؤں جو پولیس نے میرے جسم پر لگائے ہیں مگر ہمت نہیں کرسکا کیونکہ پولیس نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے دوبارہ اس گھر کا رخ کیا تو مجھ پر جو تشدد ہوا ہے اس سے کہیں زیادہ تشدد ہوگا۔''
''ضمیر بہت سنگدل ہے پولیس نے تم سے بالکل ٹھیک کہا ہے۔'' آنٹی کی آنکھیں اشک بار ہوگئیں۔
ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میرا دل بھی بھر آیا۔
''آنٹی جو ہوا اسے میں بھلا چکا ہوں' آپ یوں رنجیدہ نہ ہوں۔'' میں نے کہا۔
''تم پر جو ظلم ہوا وہ میری وجہ سے ہوا ہے اور میں ہی اس کا مداوا کروں گی۔ تم مجھے اپنے وہ زخم دکھاؤ جو پولیس نے تشدد کرکے لگائے ہیں۔'' آنٹی نے کہا۔
میں ان کی ہمدردی پاکر انہیں زخم دکھانے پر تیار ہوگیا' میں نے اپنی قمیص اتار دی میرے پورے جسم پر تشدد کے نشانات موجود تھے۔ آنٹی نے آگے بڑھ کر میرے ایک زخم پر تشدد کے نشان پر اپنے تپتے ہونٹ رکھ دیے۔ زخم پر ان کے ہونٹ لگتے ہی مجھے ایک فرحت کا احساس ہوا۔ پھر وہ رکیں نہیں میرے ہر زخم پر آنٹی نے اپنے ہونٹ رکھ دیے ان کے اس عمل سے میرے پورے جسم پر ایک فرحت کا احساس ہورہا تھا پھر مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ میں کہاں ہوں' مجھ پر مدہوشی طاری تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ اس دن میں ایک نئی لذت سے آشنا ہوا تھا جس کا میرے تصور میں بھی نہیں تھا' آنٹی زیب النساء نے مداوا کردیا تھا اور اب میری سمجھ میں اچھی طرح سے مداوے کا مفہوم آگیا تھا۔ میں جب رات اپنے گھر سویا' خود کو بہت ہی مسرور محسوس کررہا تھا۔ سونے سے قبل گھر میں بات بے بات میرے منہ سے قہقہے نکل رہے تھے' گھر والے بھی یہ بات محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے تھے۔
دوسرے دن میں کالج جانے کے لیے گھر سے نکلا تھا مگر میرے قدم مجھے شاکر کے گھر لے گئے۔ حالانکہ آنٹی نے مجھے کالج کے بعد گھر آنے کو کہا تھا۔ صبح کے وقت مجھے دیکھ کر آنٹی کھل اٹھیں اور مجھے بھی نہ جانے کیوں ان پر بے اختیار پیار آرہا تھا۔ ہم دونوں کا پورا دن موج مستی میں گزرا' رات ہونے پر بھی میرا دل گھر جانے کو نہیں کررہا تھا۔ مگر جانا بھی ضروری تھا ورنہ گھر والے فکرمند ہوجاتے۔ رات جب بیڈ پر سویا خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا۔
پورا ہفتہ آنٹی نے مداوا کرتے ہوئے گزارا دیا تھا' مگر میرا جسم ایک نئی لذت سے آشنا ہوا تھا' اب میرا دل یہ چاہ رہا تھا کہ ہر روز ایسے ہی گزرے مگر یہ کس طرح ممکن تھا۔ انکل ضمیر گھر آچکے تھے' ایک دن گزرا' دوسرا دن گزرا' تیسرا دن گزرا' آنٹی سے ملاقات نہ ہوسکی یہ دن مجھے پہاڑ کی مانند لگ رہے تھے۔ مجھے خود پر حیرت ہورہی تھی کہ یہ مجھے کیا ہوگیا ہے' میں کیوں آنٹی سے ملاقات کرنا چاہ رہا ہوں' جہاں تک آنٹی نے مداوے کی بات کی تھی وہ بھرپور طریقے سے مداوا کرچکی تھیں۔ میری توقع سے بھی بڑھ کر یہ چوتھے دن کی بات ہے کہ میں بیڈ پر پڑا کروٹیں بدل رہا تھا' میری کیفیت ایسی ہورہی تھی جیسے نشئی کو نشہ نہ ملنے پر ہوتی ہے' میں بار بار اپنے پاؤں بیڈ پر مار رہا تھا۔ میرے دل میں بار بار یہی بات آرہی تھی کہ کسی طرح سے آنٹی کے گھر پہنچ جاؤں مگر وہاں پہنچ کر خود کو مصیبت میں بھی ڈالنا نہیں چاہ رہا تھا۔ میرے موبائل پر کال آنے پر میں چونکا۔ موبائل کی اسکرین پر جو نمبر آرہا تھا' وہ میرے لیے نیا تھا پھر بھی میں نے کال اٹینڈ کرلی۔
''ارسلان کیسے ہو؟'' آنٹی زیب النساء نے پوچھا۔
''آنٹی یہ کس نمبر سے بات کررہی ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''یہ میرا ہی نمبر ہے' میرے موبائل میں دو سم لگی ہوئی ہیں' پہلی سم میں بیلنس نہیں تھا اس لیے دوسری سم سے بات کررہی ہوں۔'' آنٹی نے بتایا۔
''آنٹی سچ پوچھو تو اس وقت میرا دل بہت چاہ رہا تھا آپ سے ملاقات کرنے کو مگر کیا کروں انکل ضمیر نے بے بس اور مجبور کردیا ہے' میں چاہنے کے باوجود ملاقات نہیں کرسکتا۔''
''تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے میں نے اس کا حل نکال لیا ہے' میری سہیلی بینش کے گھر کے نیچے کا ایک کمرے کا مکان خالی ہے وہ میں نے اس سے کرائے پر حاصل کرلیا ہے' تم مجھ سے وہاں آسانی سے ملاقات کرسکتے ہو۔'' آنٹی نے بتایا۔
''ٹھیک ہے وہ جگہ مجھے دکھا دینا میں وہاں ملاقات کرلیا کروں گا۔'' میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔
''تم فوراً باہر نکل آؤ' میں تمہاری گلی کے نکڑ پر کھڑی ہوں۔''
''ٹھیک ہے۔ میں آرہا ہوں۔'' میں خوش ہوتے ہوئے بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا۔
آنٹی زیب النساء واقعی گلی کے نکڑ پر کھڑی تھیں وہ مجھے رکشے میں بٹھا کر اپنی سہیلی بینش آنٹی کے گھر لے گئیں' ان سے میری ملاقات بھی کرادی۔ وہ مجھے دیکھ کر بے اختیار مسکرادیں۔
''ارسلان بیٹے اس گھر کو تم اپنا ہی گھر سمجھو' بے فکر ہوکر آجایا کرو' کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' بینش آنٹی نے کہا۔
بینش آنٹی بیوہ تھیں' ان کا گھر تین فلور پر مشتمل تھا۔ ایک فلور میں وہ رہتی تھیں جبکہ دو فلور کرائے پر دیے تھے۔ شوہر کی پینشن اور کرائے کی مد میں آنے والی رقم سے ان کا ٹھیک ٹھاک گزارا ہورہا تھا۔ نیچے کا فلور خالی ہونے پر آنٹی کو مجھ سے ملاقاتیں کرنے کے لیے الگ سے مکان کی ضرورت تھی وہ ضرورت پوری ہوگئی تھی۔ اس مکان کے تالے کی ایک چابی مجھے اور دوسری چابی آنٹی کے پاس آگئی تھی۔
میں کالج سے آنے پر سیدھا گھر جاتا اور کھانا کھا کر اسٹڈی کے نام پر اپنے ایک فرضی دوست نقمان کا کہہ کر اس مکان پر چلا آتا۔ آنٹی زیب النساء بھی گھر کا سودا سلف لینے کے بہانے سے چلی آتی تھیں۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے موبائل پر بات چیت کرنے سے گریز کررہے تھے۔ موبائل پر ہماری بات چیت کرنے سے پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ آنٹی زیب النساء کی قربت پر میں بہت خوش تھا۔ دن بہت اچھے گزر رہے تھے۔ ابھی ہمیں ملاقاتیں کرتے ہوئے مشکل سے تین ماہ ہوئے تھے کہ ایک دن آنٹی زیب النساء سخت گھبرائی ہوئی آئیں اور آتے ہی مجھ سے بولیں۔
''ارسلان تم کسی بھی طرح آج اور ابھی یہ شہر چھوڑ کر نکل جاؤ' تمہاری جان کو خطرہ ہے۔''
''لل...... لیکن...... آپ...... کو...... کیسے پتا چلا؟''
''ضمیر کو ہماری ملاقاتوں کا کسی طرح سے علم ہوگیا ہے۔ وہ موبائل پر کسی کو کہہ رہے تھے کہ تمہیں اٹھالیا جائے اور پولیس مقابلہ ظاہر کرکے ہلاک کردیا جائے۔''
''پھر تو وہ آپ کو بھی......''
''میری فکر چھوڑو' میں بڑی مشکل سے گھر سے نکل کر آئی ہوں۔ یہ کچھ رقم ہے سفر میں تمہارے کام آئے گی۔'' آنٹی نے مجھے رقم دیتے ہوئے کہا۔
اتنی رقم کبھی میرے ہاتھوں میں نہیں آئی تھی' یہ موقع آنٹی سے بحث ومباحثے کا نہیں تھا۔ مجھے فوری شہر چھوڑنا تھا۔ ورنہ ذرا سی تاخیر مجھے مشکل میں ڈال سکتی تھی۔ میرے ذہن میں فوری طور پر سرگودھا کا خیال آیا' وہاں میری خالہ رہتی تھیں۔ راستے میں گھر والوں کو فرضی کہانی سنا کر میرے خلاف کچھ منشیات فروش پیچھے پڑ گئے ہیں اور وہ مجھے جان سے مار دینا چاہتے ہیں اس لیے سرگودھا جارہا ہوں' پولیس مجھے گرفتار کرکے پہلے ہی تشدد کا نشانہ بنا چکی تھی اس لیے گھر والوں نے میرے سرگودھا جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔
سرگودھا پہنچ کر میرے ذہن کو سکون ملا تھا۔ میں خوش بھی تھا کہ اچھا ہوا کہ بروقت اطلاع مل گئی اور میں سرگودھا چلا آیا۔ آنٹی زیب النساء کے فون آنے پر میں نے تسلی دے دی تھی کہ وہ فکر نہ کریں میں سرگودھا میں بالکل خیریت سے ہوں اس پر آنٹی نے پھر بھی مجھے محتاط رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ خالہ اور میرے کزن اچانک سرگودھا آنے پر حیرت زدہ بھی تھے اور خوش بھی تھے کہاں وہ مجھے بلا بلا کر

تھک گئے تھے اور کہاں میں اچانک بغیر کسی اطلاع کے وہاں پہنچ گیا تھا۔

مجھے سرگودھا آئے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا' ایک دن میں خالہ کے گھر سے باہر گھومنے نکل گیا۔ یہ محض اتفاق ہی تھا کہ میرا موبائل گھر پر ہی رہ گیا۔ جب گھر پہنچا تو دیکھا کہ خالہ' خالو سمیت سبھی پریشان تھے' مجھے دیکھتے ہی خالو نے پوچھا۔

''پولیس تمہارا پوچھنے آئی تھی۔ کیا مسئلہ ہے وہ کیوں تمہارا پوچھ رہی ہے۔''

پولیس کا سن کر میرے جسم میں خوف کی ایک لہر آ کر نکل گئی۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''میں نے یہاں ایسا کچھ کیا ہی نہیں جو پولیس مجھے پکڑے۔''

''پولیس والوں سے ہم نے پوچھا تھا کہ وہ ارسلان کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں' جس پر انہوں نے بتایا کہ حیدرآباد کی پولیس کسی مقدمے میں ارسلان کو گرفتار کرنے کے لیے آئی ہے۔ ان کے پاس اجازت نامہ بھی ہے اس لیے مقامی پولیس کو ان کی مدد کرنا پڑے گی۔''

''حیدرآباد کی پولیس کو کیسے پتہ چلا ہے کہ میں یہاں ہوں۔'' میں نے خوف زدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''ارسلان بیٹے یہ موبائل ایسی چیز ہے اگر یہ بند نہ ہو تو آسانی سے بندے کو تلاش کرلیا جاتا ہے۔'' خالو نے کہا۔

مجھے غلطی کا اب احساس ہونے لگا تھا' واقعی مجھ سے غلطی ہوئی تھی۔ سرگودھا پہنچنے سے پہلے ہی موبائل کو آف کردینا چاہیے تھا۔ مجھے پریشان دیکھ کر خالہ بولیں۔ ''اب کیا ہوگا؟''

''آسان حل یہی ہے کہ میں ارسلان کو اپنے دوست رفاقت کے پاس لاہور بھیج دوں مگر ارسلان کو اپنا موبائل آف رکھنا پڑے گا ورنہ پولیس وہاں بھی پہنچ جائے گی۔'' خالو نے کہا۔

مجھے اسی وقت لاہور کے لیے روانہ ہونا پڑ گیا میں نے موبائل کو آف کرکے اس کی سم کو بھی نکال کر الگ سے رکھ لیا۔

خالو کے دوست رفاقت انکل بہت اچھے انسان تھے وہ میرا ہر طرح سے خیال رکھ رہے تھے۔ حیدرآباد پولیس مجھے گرفتار کیے بغیر ہی لوٹ گئی تھی' آنٹی زیب النساء سے میں نے پی سی او سے بات کرکے تازہ صورت حال جاننا چاہی تو وہ بولیں۔

''ارسلان فی الحال مجھ سے رابطہ نہیں کرنا۔ ضمیر سخت غصے کی حالت میں ہے میری تین بار پٹائی کر چکا ہے' وہ ہر حالت میں تمہیں تلاش کرکے ہلاک کرادینا چاہتا ہے۔ اس نے تمہاری گرفتاری کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا ہے۔''

''ٹھیک ہے آنٹی جیسا تم کہو گی' میں ویسا ہی کروں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے کال بند کردی۔

مجھے انکل رفاقت کے گھر رہتے ہوئے ایک ماہ سے زائد عرصہ ہوگیا تھا۔ ان کے خلوص میں کسی طرح کمی نہیں آئی تھی۔ لاہور میں مسلسل رہنے سے میری تعلیم بری طرح سے متاثر ہو رہی تھی۔ کئی بار آنٹی زیب النساء کے منع کرنے پر بھی میں نے انکل ضمیر کے بارے میں معلومات حاصل کی ہر بار نئی بات سننے کو مل رہی تھی کہ ان کا غصہ کم نہیں ہوا ہے بلکہ اس کی شدت میں اضافہ ہو رہا ہے' وہ بات بے بات آنٹی سے لڑتے رہتے ہیں۔ وہ ہر صورت میں مجھے گرفتار کرانا چاہتے تھے مسلسل ناکامی پر وہ چڑچڑے ہوگئے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں' گھر والوں سمیت آنٹی بہت یاد آ رہی تھیں۔ دل چاہتا تھا کہ میرے پر لگ جائیں اور میں ان سے روزانہ ملاقات کرکے لاہور آ جایا کروں۔ ایسا ممکن نہیں تھا اور پھر ایک دن میں آنٹی سے ملاقات کرنے کو ایسا بے چین ہوا کہ انکل رفاقت کو بتائے بغیر ہی حیدرآباد چلا آیا اور آنٹی سے ملاقات کی خواہش ظاہر کردی۔ آنٹی نے میری اس حرکت پر مجھے خوب ڈانٹا اور واپس لاہور چلے جانے کو کہا مگر میرے اصرار پر وہ بھی مجبور ہو کر ریلوے اسٹیشن چلی آئیں۔ ہم دونوں نے خوب ایک دوسرے کو دیکھا اور باتیں کیں پھر اچانک میری نظر ریلوے کے دوسرے پلیٹ فارم پر پڑی میں دھک سے رہ گیا۔ وہ آنٹی کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں تک پہنچے تھے وہ مجھے رنگے ہاتھوں گرفتار کرنا چاہتے تھے اس لیے وہ موبائل پر کسی سے باتیں بھی کر رہے تھے اور ہم دونوں پر نظر بھی رکھے ہوئے تھے۔

''آنٹی وہ دیکھو انکل ضمیر کھڑے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''میں تمہیں اسی لیے منع کر رہی تھی کہ حیدرآباد نہیں آنا' وہ تمہاری جان کا دشمن بنا ہوا ہے مگر تمہاری ضد نے ہم

دونوں کو بری طرح سے پھنسوا دیا ہے۔'' وہ بولیں۔

''اب کیا کریں؟'' میں نے پوچھا۔

''فی الحال تم اسٹیشن سے فرار ہونے کی کرو' پھر جیسے ہی موقع ملے لاہور چلے جانا۔'' آنٹی زیب النساء نے کہا۔

مجھے آنٹی کا یہ مشورہ اچھا لگا۔ اس وقت میرے حق میں یہی بہتر تھا پولیس آنے کی صورت میں میرا گرفتار ہو جانا یقینی تھا' میں ایک دم اٹھا اور تیزی سے بھاگ پڑا۔ انکل ضمیر نے مجھے بھاگتا ہوا دیکھ لیا' وہ بھی مجھے پکڑنے کو دوڑے' وہ مجھ سے تیز دوڑ نہیں سکتے تھے پھر بھی غصے کی حالت میں میرے پیچھے دوڑے چلے آ رہے تھے۔ میں پٹڑی پر بھاگ رہا تھا' اس لیے ایک پٹڑی سے ٹکرا کر گر پڑا۔ انکل ضمیر کو میرے نزدیک آنے کا موقع مل گیا۔ انہیں اپنے قریب آتا دیکھ کر میرے اوسان خطا ہوگئے۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ گرفتاری کی صورت میں میرا پولیس مقابلے میں دکھا کر قتل کیا جانا یقینی تھا۔ گرفتاری اور اپنے قتل کیے جانے کے خوف سے میں بروقت انتہائی قدم اٹھانے کو تیار ہوگیا جو میں اس وقت کرسکتا تھا۔ میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں' اپنے قریب ہی ایک بھاری پتھر پڑا دکھائی دیا۔ وہ میں نے اٹھالیا۔ انکل ضمیر میرے نزدیک جیسے ہی آئے میں نے وہ پتھر ان کے سر پر دے مارا۔ ان کا سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا اس وقت میرے دماغ پر جنون سوار تھا' میں پھر رکا نہیں کئی بار وہ پتھر اٹھا کر ان کے سر پر مارا وہ جب بالکل ساکت ہوگئے اس وقت مجھے ہوش آیا' کہ میں نے یہ کیا کر ڈالا' ایک انسانی جان لے لی۔ دور کھڑے لوگ یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ جیسے ہی انہوں نے ہمارے نزدیک آنے کو قدم بڑھائے میں نے دوڑ لگادی۔ میں ان کی پہنچ سے دور ہوتا چلا گیا پولیس میری تلاش میں تھی اور اب میں قاتل بھی بن گیا تھا۔ اس لیے میرا روپوش ہونا ضروری تھا۔ اس لیے میں نے روپوش ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ پولیس مجھے گرفتار کرنے کی بھرپور کوشش کرے گی ایسے میں سفر کرنے کی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے حیدرآباد میں ہی چھپنے کا فیصلہ کرلیا۔ میرے رشتے کے چچا کا ایک کاروں کا گیراج تھا۔ اس کے اوپر دو کمرے بنے ہوئے تھے وہاں چھپ جانے پر میں لوگوں کی نظروں میں نہیں آسکتا تھا اور گھر والے بھی مطمئن رہتے۔ میں نے

اپنی دانشمندی میں بہت اچھا فیصلہ کیا تھا۔امی اور ابو چوری چھپے مجھ سے ملنے آ گئے۔امی میرے گلے لگ کر رو پڑیں۔

''ارسلان بیٹے میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تمہارے ساتھ کیا ہو رہا ہے وہ کون لوگ ہیں جو تمہارے پیچھے پڑ گئے ہیں جس کے سبب تم ان سے چھپتے پھر رہے ہو؟'' ابو نے پوچھا۔

''میں خود نہیں جانتا کہ وہ کون لوگ ہیں اور کیوں میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں۔'' میں نے صاف جھوٹ بولا۔

''پھر بھی بیٹے تھوڑا بہت تو تمہیں ان کے بارے میں علم ہو گا۔''

''میں کچھ بھی نہیں جانتا جب پولیس نے مجھ پر تھانے میں لے جا کر تشدد کیا تھا اس وقت بھی میں نے پولیس سے پوچھا تھا کہ تم مجھے کیوں مار رہے ہو' اس پر پولیس نے بتایا کہ انہیں اوپر سے ہدایت ہے کہ مجھ پر بری طرح تشدد کیا جائے اور مجھے تشدد کا نشانہ بنا کر چھوڑ دیا اور چھوڑتے ہوئے یہ بھی بتایا تھا کہ اگر اب مجھے گرفتار کیا گیا تو جان سے مار دیا جائے گا اور اب پولیس مجھے دوبارہ گرفتار کرنا چاہ رہی ہے' جو خطرے کی بات ہے۔''

''میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے تم فکر نہ کرو میں اپنے ذرائع استعمال کر کے عدالت کے ذریعے تمہاری پولیس سے جان چھڑاؤں گا۔''

''خدا کے لیے ایسی غلطی نہیں کرنا۔'' میں گھبرا گیا۔

''وہ کیوں؟''

''پولیس کو میری تلاش ہے وہ ہر حالت میں مجھے گرفتار کرنا چاہتی ہے' ناکامی کی صورت میں وہ کھلے مقام پر موقع ملتے ہی پولیس مقابلہ ظاہر کر کے ہلاک کر دے گی۔''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تم پولیس کے سامنے کیوں نہیں آنا چاہ رہے ہو۔ لوگ پولیس سے تحفظ حاصل کرنے کے لیے عدالتوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔''

''تم ابھی کچھ نہیں کرنا ارسلان بیٹا جو کہہ رہا ہے' وہی کرو گے۔'' امی گھبرا گئیں۔

میری بات سن کر ابو پریشان ہو گئے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ وہ عدالت کی خدمات حاصل کر کے روپوشی سے نجات دلانا چاہتے تھے لیکن میں نہیں چاہ رہا تھا ایسا ہو' میری روپوشی ختم ہونے پر میرا سارا راز فاش ہو سکتا تھا' اس لیے میں وقتی طور پر انکل ضمیر کے قتل کے مقدمے کی فائل کے دب جانے کا انتظار کر رہا تھا۔

ابھی ان کا قتل ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ پولیس بھی تازہ دم تھی' وہ مجھے تشدد کر کے اگلوا لیتی کہ قتل میں نے ہی کیا ہے۔ پولیس کے تھک جانے پر ممکن تھا کہ میں اس قتل کے مقدمے سے بچ نکلتا' مجھے قتل کرتے ہوئے شاکر نے نہیں دیکھا تھا۔ صرف آنٹی ہی اس قتل کے بارے میں جانتی تھیں۔ انہیں ہر صورت میں میری سپورٹ کرنی تھی۔

ابھی میرا پکڑا جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ پولیس مجھ پر تشدد کر کے قتل کا اعتراف کرا سکتی تھی۔ اس لیے میں فی الحال روپوش رہنے میں اپنی عافیت سمجھ رہا تھا۔ ابو اور امی کو میری ضد کے آگے ہتھیار ڈالنا پڑ گئے' وہ مجھے کسی بھی صورت میں کھونا نہیں چاہتے تھے۔ وہ مجھے وقفے وقفے سے دیکھنے آتے رہتے تھے اور یہ بتاتے بھی رہتے تھے کہ پولیس روزانہ میرا پوچھنے آتی رہتی ہے' اس کا خیال ہے کہ میں گھر میں ہی چھپا ہوا ہوں' اپنا شک دور کرنے کو وہ گھر کی تلاشی بھی لے چکی ہے پھر بھی مطمئن نہیں ہے۔ وہ کسی قتل کے مقدمے میں مجھ سے کچھ پوچھ گچھ کرنا چاہتی ہے۔

انکل ضمیر کے ہاتھ بڑے لمبے تھے۔ اس لیے پولیس کو اپنی کارروائی دکھانے کے لیے کچھ نہ کچھ کر کے دکھانا تھا۔ واقعہ تازہ تھا' ایسے میں میرا گرفتار ہو جانا خود کو مصیبت میں گرفتار کرا دینے کے مترادف تھا۔

اسے میری کمبختی کہہ لیں کہ چند دن گزرنے پر مجھے آنٹی کی یاد شدت سے آنے لگی تھی اور ایک روز خود سے مجبور ہو کر آنٹی سے رابطہ کر لیا۔ آنٹی میرے موبائل پر رابطہ کرنے پر خوف زدہ ہو گئیں اور ڈانٹتے ہوئے بولیں۔

''پولیس تمہاری تلاش میں ہے اور تم خود پولیس کو موقع فراہم کر رہے ہو کہ وہ تمہیں گرفتار کر لے۔''

''میں کیا کروں' مجھے نا جانے کیا ہو گیا ہے' آپ سے جدائی برداشت نہیں ہوتی۔''

''گرفتاری سے بچنے کے لیے تمہیں کڑوا گھونٹ پینا پڑے گا' کیونکہ جب ایک دوسرے کا آپس میں جسمانی تعلق ہو جائے پھر ان دونوں کا جدا ہونا بہت مشکل ہو جاتا ہے' جو حالت تمہاری ہے وہی میری بھی ہے' مگر مجبوراً میں تمہاری جدائی برداشت کر رہی ہوں اور میری کوشش ہے

کہ پولیس کا ذہن تمہاری طرف سے ہٹ جائے اس طرح یہ قتل کا مقدمہ سرد خانے کی نذر ہو جائے گا پھر تم مجھ سے کھل کر مل سکو گے۔'' وہ بولیں۔

''ٹھیک ہے میں رابطہ نہیں کروں گا مگر ایک بار مجھ سے مل کر چلی جاؤ۔'' میں نے کہا۔

''تم بچوں کی طرح ضد نہیں کرو اور موقع کی نزاکت کو سمجھو۔'' وہ غصے سے بولیں۔

''ٹھیک ہے اگر مجھ سے ملنے نہیں آ رہی ہو تو پھر ٹھیک ہے میں خود کو پولیس کے حوالے کر دیتا ہوں' پھر تو مجھ سے ملنے جیل میں آؤ گی نا۔'' میں نے دھمکی دی۔

میری دھمکی کام کر گئی اور آنٹی زیب النساء مجھ سے ملنے آ گئی' انہیں اپنے قریب دیکھ کر اتنا سکون ملا تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مشکل سے چالیس سال کی تھیں مگر اس عمر میں بھی وہ جوان لگتی تھیں۔ میں نے کبھی ان کو اتنے غور سے نہیں دیکھا جتنا جسمانی تعلق ہونے کے بعد دیکھنے لگا تھا۔ ان کا چہرہ دیکھتے ہی مجھ میں نا جانے کیا ہو جاتا تھا' دل چاہتا ہی نہیں تھا کہ وہ مجھ سے دور ہوں۔ ہر وقت انہیں اپنی بانہوں میں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ جب بیڈ پر ہوتی تھیں تو خود پر کنٹرول کرنے سے قاصر رہتا تھا۔ آنٹی کی حوصلہ افزائی نے ہی مجھے اتنا بے باک بنا دیا تھا۔ ورنہ میں کہاں اور وہ کہاں' وہ تھپڑ لگا دیں تو میں سر جھکا دوں۔

ورکشاپ کے اوپر بنے ہوئے کمرے میں ہمیں ڈسٹرب کرنے والا کوئی نہیں تھا' اس لیے یہاں بھی میں کھل کر زندگی کو انجوائے کرنے لگا تھا۔ اب میں ہر دوسرے' تیسرے دن آنٹی کو پولیس کے ہاتھوں گرفتاری دینے کی دھمکی دے کر بلانے لگا تھا۔ اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ پولیس مجھے گرفتار کرے کیونکہ میری گرفتاری ان کی گرفتاری کا پروانہ بن جاتی' پولیس تشدد سے مجھ سے قتل کا اعتراف کرا لیتی۔ آنٹی بہت احتیاط برت رہی تھیں مجھ سے ملنے میں مگر وہ اس بات سے بے خبر تھیں کہ پولیس کے سامنے میری بے جا وکالت نے انہیں پولیس کی نظروں میں مشکوک بنا دیا تھا اور سادہ وردی میں پولیس اہلکار ان کی جاسوسی پر لگا دیے تھے' جو ان کے باہر نکلنے پر پیچھا کرتے تھے کہ وہ کہاں کہاں اور کس کس سے ملتی ہیں اور اگر میں کہیں چھپا ہوا ہوں تو وہ بھی نہ کبھی یا وقفے وقفے سے مجھ سے ملاقات ضرور کریں گی۔ پولیس کو مجھے گرفتار کرنے کا یہی حل زیادہ آسان لگا تھا۔ پولیس اہلکار سادہ وردی میں ہوتے تھے اس لیے انہیں یہ خبر ہی نہیں تھی کہ پولیس ان کی جاسوسی کر رہی ہے۔ وہ اپنے طور پر بہت احتیاط کر کے میرے پاس آتی تھیں۔ ورکشاپ پر آنٹی کے آنے پر پولیس چونکی اور انہوں نے خاموشی سے میرا سراغ لگا لیا اور ایک دن جب آنٹی مجھ سے مل کر جا رہی تھیں وہ کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ گئیں ابھی انہیں گئے مشکل سے دس منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ پولیس کمرے میں آ گئی اور مجھے گرفتار کر لیا۔''

''کیا تمہیں اپنے کیے پر پشیمانی ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''جو کچھ بھی ہوا وہ میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔ جذبات کی رو میں بہہ کر کیا انکل ضمیر کو قتل کرنا بھی میرے ارادے میں شامل نہیں تھا۔ وہ بھی اچانک غیر ارادی طور پر ہوا کیونکہ وہ میری جان لینے کے درپے تھے اور ہر انسان اپنی جان بچانے کو ہر وہ عمل کر گزرتا ہے جو اسے نہیں کرنا چاہیے۔ جرم پھر جرم ہوتا ہے چاہے جان بوجھ کر ہو یا انجانے میں' اس کی سزا انسان کو ملتی ہے اور مل کر رہتی ہے' مجھ سے جو جرم ہوا ہے اس کی سزا بہر حال کورٹ سے ملے گی کورٹ کبھی کسی مجرم کو نہیں چھوڑتی۔'' ارسلان نے یہ کہتے ہوئے اپنی نظریں نیچی کر لیں۔

میری خبر مکمل ہو چکی تھی' اس لیے میں نے نوٹ بک بند کر لی' پولیس ارسلان کو لے گئی اور میں اسے جاتا دیکھ کر سوچوں میں گم تھا کہ ارسلان کی یہ عمر تعلیم حاصل کرنے کی تھی اس عمر میں وہ ایک شخص کا قاتل بن گیا تھا۔ وہ قتل کرنا نہیں چاہتا تھا مگر واقعات در واقعات ایسے رونما ہوئے کہ بلاآخر اس کے ہاتھوں قتل ہو ہی گا۔ اس کا تعلیمی کیریئر ختم ہو گیا تھا۔ جب وہ عدالت سے سزا ہونے پر جیل جائے گا اور پھر جب اس کی سزا پوری ہو چکی ہو گی تو اس پر ایک داغ لگ چکا ہو گا جیل سے سزا یافتہ ہونے کا۔

حقدار

آفتاب محمود

خوب صورت طرہ دار حسینائیں اپنے طور پر خود کو انتہائی چالاک اور شاطر سمجھتی ہیں ان کے خیال میں ہر مرد ان کی اداؤں سے بے وقوف بن سکتا ہے' لیکن کبھی کبھار اس کا الٹ بھی ہوجاتا ہے۔ ایک چالباز عورت کا فسانہ' وہ جیتی ہوئی بازی ہار گئی تھی۔

وہ شکستہ دلی کے عالم میں بڑی بے دلی سے قدم اٹھاتا ہوا ایونیوا یف کی جانب جارہا تھا۔ چاروں طرف سے شوروغل سنائی دے رہا تھا اور سنہرا سورج برمنگھم کی سیاہ فام بستی پر بھی اسی طرح اپنی برکتیں نچھاور کررہا تھا جیسے سفید فاموں کی بستی پر...... درخت ہلکی ہوا کے اشاروں پر ناچ رہے تھے اور سوئمنگ پول میں نہانے والے کالے بچوں کی پر جوش اور مسرت بھری چیخیں ماحول میں موسیقی گھول رہی تھیں مگر وہ...... جوزف...... بہت اداس تھا آج اسے مکانوں کے صحن سے عورتوں کی نقرئی چیخ پکار بھی اچھی لگ رہی تھی جو آپس میں زور زور سے باتیں کررہی تھیں۔

اس کی اداسی کا سبب صرف یہ تھا کہ اس نے تربوز کی جو فصل خریدی تھی اس میں زیادہ فائدہ نہیں ہوا تھا اور بیشتر تربوز سڑنے کے باعث اب نقصان کا یقینی اندیشہ جنم لینے لگا تھا کاروبار میں نقصان کا خیال آتے ہی جوزف نے اپنے گال پر خود ہی تھپڑ لگائے اور قسمت کو کوسنے لگا جو مہربان ہوتے ہوئے اچانک بے وفائی کرنے لگی تھی۔ بات صرف ساڑھے سات سو ڈالر کے نقصان کی نہیں مسئلہ یہ بھی تھا کہ اس کی شہرت خاک میں مل گئی تھی اور لوگ سمجھ گئے تھے کہ جوزف کی جیب میں اب ایک ٹکا بھی نہیں۔ وہ انہیں خیالات میں غلطاں چلتا رہا اور اسی رو میں بہنے کی وجہ سے وہ اس لمبی رودسٹر کو نہیں دیکھ سکا جو اس کے عقب سے نکل کر اس کے سامنے موڑ پر رک گئی تھی اگر وہ اس کار کو پہلے دیکھ لیتا تو یقینا راستہ بدل دیتا لیکن کار پر نظر اسی وقت پڑی جب ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے ٹام نے اسے آواز دی اور تبھی جوزف کو یہ احساس ہوا کہ اس کا دشمن نمبر ایک چمکتی ہوئی کار سے اسے پکار رہا ہے۔

جوزف نے پرغرور ٹام اور اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی میگی کو بغور دیکھا میگی کا حسن اس کے دل کی گہرائیوں تک میں دکھ اور درد کی لہر دوڑا گیا لیکن اس نے اس نئے جوڑے پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ حسد کی آگ میں پھنک رہا ہے تاہم اس کا دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ ٹام کی موٹی گردن پر قصائی کی چھری پھیر دے ٹام کا بھاری بھرکم جسم ڈرائیونگ سیٹ پر بہت نمایاں نظر آرہا تھا جبکہ میگی کے چہرے کا رخ اس کی طرف تھا اس کے چہرے پر پتلے پتلے سرخ ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

''صبح بخیر جوزف۔'' ٹام نے اپنے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے آج تم بہت سست نظر آرہے ہو۔''

''میں اور سست۔'' جوزف نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''میں تو بالکل ٹھیک ہوں لیکن تم ایسا لگتا ہے جیسے تمہیں بناتے وقت فرشتوں نے کوئی پرزہ لگانے میں تساہل برت دیا تھا۔''

''آہ، جوزف ان احمقانہ تبصروں سے میں کبھی متاثر نہیں ہوا، میری بیوی سے ملو میگی۔''

''میں ان سے پہلے بھی مل چکا ہوں ٹام حقیقت پوچھو تو میں ان سے شادی کرنے کے چکر میں پھنس گیا تھا لیکن پھر مجھے عقل نے سہارا دیا اور میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں زیادہ خوب صورت لڑکی کا مستحق ہوں۔''

''جوزف۔'' میگی کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہوگیا۔ تم نے اپنا منہ کبھی آئینے میں دیکھا ہے میں تو مر کر بھی تم سے شادی نہ کرتی۔''

''اہو۔'' جوزف ہنسنے لگا۔

''تمہیں وہ رات یاد ہے جب تم دریا کے کنارے چاند

کو مجھ سے حقیر قرار دے رہی تھیں۔''

''بکواس مت کرو جوزف۔'' ٹام کے لٹکے ہوئے گال غصے سے ہلنے لگے۔

''اور پھر میں نے تمہاری بیوی سے اس باعث بھی شادی نہیں کی کہ اسے سجانے بنانے میں میری آمدنی کا نصف حصہ ضرور نکل جایا کرتا۔''

میگی نے نفرت سے دوسری طرف منہ پھیر لیا ٹام کی آنکھیں سرخ ہوگئیں اور جوزف ان دونوں کو پریشان کرکے دل ہی دل میں خوش ہونے لگا میگی کے منہ پھیرنے سے ظاہر تھا کہ وہ جوزف پر چوٹ کرنا چاہتی تھی ان کی اب گنجائش نہیں رہی اور یہ کہ وہ شکر کرچکی ہے۔

''تمہیں میری کار پسند آئی؟'' ٹام نے بھی موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

''کار؟'' اس نے چمکتی ہوئی قیمتی گاڑی کو بغور دیکھا اس کی کالی آنکھوں میں شوخی کی چمک پیدا ہونے لگی۔

''کیا برف کا کاروبار کرنے کا ارادہ ہے۔''

''نہیں یہ کار میں نے اس لیے خریدی ہے کہ تمہیں ساتھ ہنی مون کے لیے لے جاسکوں۔'' ٹام نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

''زیادہ اچھی گاڑی نہیں ہے۔''

''مجھے فکر بھی نہیں میں نے کار دیکھی اور خرید لی۔'' ٹام نے پرغرور لہجے میں کہا۔

''ہم دونوں کو کار اچھی لگ گئی اور بس ساڑھے سات سو ڈالر کی خریداری تم نے میگی کو منگنی توڑنے کے عوض جرمانے میں اتنی ہی رقم دی تھی نا؟''

جوزف کا دل جل کر کباب ہوگیا یہ حقیقت تھی کہ تربوز کے کاروبار میں خسارے کے بعد اسے ساڑھے سات سو ڈالر کی رقم جرمانے میں بھی ادا کرنی پڑی تھی اور بقول ٹام یہ شاندار گاڑی اسی رقم سے خریدی گئی تھی۔

''ویسے یہ کتنی عجیب بات ہے کہ تمہاری رقم سے کار خریدی گئی اور میں اس پر سواری گانٹھ رہا ہوں کیوں جوزف؟''

''کوئی زیادہ عجیب بات بھی نہیں۔''

''فکر مت کرو، میں تمہیں اپنے ہنی مون پر ساتھ لے

بھی اپنے ساڑھے سات سوڈالر سے لطف
جاؤں گا تاکہ تم
اٹھاسکو۔"
"تم جھو نے ہو ٹام۔" جونز کی آنکھیں ایک بار پھر
شرارت سے چمکنے لگیں۔
"تم نے یہ کار ساڑھے سات سو ڈالر میں نہیں
خریدی۔
"میں سچ کہہ رہا ہوں۔"
"کس سے خریدی؟"
"ایک ایسے شخص کو جس کو تم نہیں جانتے۔"
"کیا وہ یہ شہر میں رہتا ہے۔"
"نہیں...... اور وہ سیاہ فام بھی نہیں ہے۔"
"تب پھر اس نے کار تمہیں کس طرح دے دی۔"
"وہ آج یہاں آیا تھا۔ اسے رقم کی سخت ضرورت تھی
کسی نے اسے بتایا کہ ٹام کار خریدنا چاہتا ہے تاکہ اپنی
حسین بیوی اور جونز کی سابق منگیتر کو ہنی مون کے لیے لے
جائے یوں یہ کار میری ہوگئی۔"
"اب وہ شخص کہاں ہے۔"
"وہ تو چلا بھی گیا پتا نہیں کہاں گیا لیکن اس سے کوئی
فرق نہیں پڑتا، کار تو میری ہے۔"
"ہوں" جونز نے ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔
"میں شرط بدل سکتا ہوں کہ اس سودے میں کوئی نہ کوئی
گڑبڑ ضروری ہے۔ کوئی بھی ایماندار آدمی ساڑھے سات
سوڈالر میں اتنی اچھی کار فروخت نہیں کرسکتا میرا خیال ہے
کہ تم جلد ہی اس خواہش کا احساس کروگے یہ کار کبھی نہ
خریدنے...... !"
"جو چاہو کہو جونز، میں برا نہیں مانوں گا کیونکہ آج میرا
موڈ بہت اچھا ہے چلو تمہیں کار میں تفریح کرادوں۔"
"نہیں شکریہ...... میں کسی سیکنڈ ہینڈ کار میں بیٹھنا پسند
نہیں کرسکتا۔"
کار ایک ہچکولے سے آگے بڑھ گئی اور جونز ایک طرف
لڑھک کررہ گیا۔
"ٹھیک ہے ٹام اب مصیبت تمہارا گھر دیکھ لے گی تم
دونوں نے مجھے کنگال بنا کر اپنے حق میں کانٹے ہی بوئے
ہیں۔"
وہ دیر تک سوچتا رہا کہ ٹام کی خوب صورت کار، میری
ہے اور صرف مجھے اس پر سواری کا حق ہے میں نے
ساڑھے سات سوڈالر دن رات کام کرکے جمع کیے تھے
تاکہ تباہ کاروبار کو اپنے پیروں پر کھڑا کرسکوں کیونکہ ٹام
نے خباثت سے کام لیتے ہوئے مجھے میرے حق سے محروم
کردیا لہٰذا میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب
تک انصاف حاصل نہ کرلوں۔"

جہاں تک میگی کا تعلق تھا تو جونز کے دل میں اس کے لیے کوئی کدورت نہیں تھی۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ میگی کو بھی ایک سبق مل جائے اس نے جونز سے بے وفائی کرتے ہوئے منگنی کے فوراً بعد ٹام سے ساز باز کرلی تھی۔ اس نے سارے وعدے جونز سے کیے تھے لیکن وہ صرف اور صرف ٹام سے مخلص تھی۔

جونز قدرے بہتر موڈ میں سوک سینٹر کی طرف چلنے لگا لیکن جب بعض لوگوں نے اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلائے تو اس کا موڈ پھر خراب ہوگیا وہ لوگ یقیناً یہ کہہ رہے تھے کہ جونز، تم قلاش ہوچکے ہو، چلتے چلتے اس کی نظر کاستور کے گیراج پر پڑی اور پھر وہ گیراج میں داخل ہوگیا جہاں کاستور دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ جونز کو معلوم تھا کہ گیراج کا مالک ٹام کا بہت گہرا دوست ہے اور کاستور بھی جانتا تھا کہ ٹام اور میگی جونز کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔

"کیا حال ہے جونز؟" اس نے پوچھا۔
"بہت برا...... بہت خراب۔"
"کیا مطلب؟"
"ٹام مجھ سے بڑی زیادتی کررہا ہے میگی نے مجھ سے جو رقم وصول کی ہے وہ ہاٹ بوائلنگ اسپرنگس میں ہنی مون پر خرچ کی جائے گی کاستور۔"
"اوہ...... وہ تو بہت مہنگی جگہ ہے۔"
"اور اس نے ایک کار بھی خرید لی ہے۔" اس انکشاف پر کاستور کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
"میں نے ان دونوں کو ایک بڑی کار میں دیکھا ہے ابھی کچھ ہی دیر پہلے ویسے مجھے اس بات پر شبہ ہے کہ کار ٹام ہی کی ہے۔"
"میں سمجھا نہیں۔"
"سنو، وہ کہتا ہے اس نے روڈسٹر ساڑھے سات سو ڈالر میں خریدی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اتنی اچھی کار

صرف ساڑھے سات سوڈالر میں نہیں بک سکتی، میں سمجھتا ہوں کہ کسی نے اسے چوری کی کار دے دی ہے۔"
"شش۔" کاستور نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے گھبرا کر کہا۔
"وہ چوری کی کار ہرگز نہیں خرید سکتا۔"
"کیسے نہیں خرید سکتا، اس کی عقل بھی اسی کی طرح موٹی ہے اور میگی...... وہ تو انتہائی غبی لڑکی ہے اسی وجہ سے میں نے اس سے شادی نہیں کی۔"
"تم اس سے بہت ناراض لگ رہے ہو جونز۔"
"ظاہر ہے ناراضگی کی وجہ بھی تم جانتے ہو، انہوں نے مجھے دھوکا دیا ہے اور سنو کاستور کسی غلط فہمی میں مبتلا مت ہوجانا۔ اسے موقع ملا تو وہ تمہیں بھی دھوکا دے گا۔"
"نہیں وہ میرا بہت مخلص دوست ہے۔"
"میں بھی پہلے یہی کہتا تھا لیکن میگی سے مل کر اس نے میرے ساتھ جو کچھ کیا اس کے بعد دوسروں کی آنکھیں کھل جانی چاہیے۔"
"اس نے میگی سے ان ساڑھے سات سوڈالر کی وجہ سے شادی کی ہے جو تم سے ملے ہیں ورنہ وہ میگی کو تم سے کبھی نہ چھینتا۔"
"اور پھر ان ساڑھے سات سوڈالر سے اس نے ایک مسروقہ کار خرید لی۔"
"کون کہتا ہے کہ کار چوری کی ہے؟" کاستور کو غصہ آنے لگا۔
"سنو، تم موٹر مکینک ہو، پہلی ہی نظر میں بتادو گے کہ اس کار کی کم سے کم قیمت سولہ سوڈالر ہے لہٰذا کوئی بھی ایسی کار کو ساڑھے سات سوڈالر میں فروخت نہیں کرے گا ہوں اگر کار چوری کی ہو تو پھر سوڈالر میں بھی مل سکتی ہے۔"
"ٹام کبھی غلطی نہیں کرسکتا۔"
"مجھے تم سے ہمدردی ہے دوست۔" جونز نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
"تم غیر معمولی اور غیر ضروری اعتماد کے مالک ہو لیکن میں جانتا ہوں کہ ایک دن موت کی نیند ضرور سوؤ گے اور فرشتے بتائیں گے کہ تمہیں ٹام نے زہر دیا ہے۔ ٹام اتنا ذلیل شخص ہے کہ اس نے ایک مرتبہ اپنی ماں کے ٹماٹر چوری کرکے بیچ ڈالے تھے۔ وہ آج میری حالت پر ہنس رہا

تھا لیکن ایک مقولہ یاد رکھو کہ جو پہلے ہنستا ہے آخر میں پہلے روتا بھی وہی ہے۔“

یہ کہہ کر جونز، کندھے جھکائے سڑک پر آ گیا۔ ٹام کے لیے کاستور کا غیر متزلزل خلوص واقعی غیر معمولی تھا لیکن اس میں کاستور کی کوئی خطا بھی نہیں تھی وہ بہت سادہ لوح اور شریف النفس شخص تھا۔ اس کی شرافت کا ثبوت یہ تھا کہ ایک سال سے گیراج چلانے کے باوجود ابھی تک کار نہیں خرید سکا تھا پھر اس کا ذہن سلگنے لگا کیونکہ اس میں اچانک ہی میگی ٹام اور کار کا تصور آ گیا تھا۔

”خدا کرے، کار چوری ہی کی ہو اور اس کا اصل مالک واپس لینے آ جائے۔“

وہ ٹام کو زک پہنچانے اور اپنا انتقام لینے پر سوچنے لگا لیکن وہ جانتا تھا کہ ٹام بہت شاطر شخص ہے کوئی معمولی منصوبہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔

سوال یہ تھا کہ کیا ٹام جیسا شاطر چوری کی کار خرید سکتا ہے اس نے ٹام سے گفتگو کو ذہن میں دہرایا۔ وہ تسلیم کر چکا تھا کہ جس شخص سے اس نے کار خریدی ہے وہ برمنگھم کا نہیں اور اب برمنگھم میں موجود بھی نہیں ہے۔

”اگر کار چوری کی نہیں...... تب بھی...... کاش وہ سوچنے لگے کہ کار چوری کی ہے۔“ پھر جونز چلتے چلتے رک گیا۔

ایک نئی تجویز اس کے ذہن میں ابھرنے لگی۔ ٹام کو اگر یقین ہے کہ کار چوری کی نہیں تو اسے یہ بھی علم نہ ہوگا کہ کار حقیقی مالک ہی نے فروخت کی ہے لہٰذا اگر اسے کسی نہ کسی طرح اس شک میں مبتلا کر دیا جائے کہ کار چوری کی ہے تو ہنی مون کا لطف غارت ہو جائے گا۔

آہ...... کسی کو قتل کرنے سے بہتر یہ ہے کہ اسے موت کا خوف دلایا جائے۔ مرنے کے خوف میں مبتلا کر دیا جائے وہ نیم مردہ ہو جائے گا۔

وہ سینہ تان کر چلنے لگا۔

”اب دیکھتا ہوں کہ وہ کس طرح ثابت کرتا ہے کہ کار مسروقہ نہیں۔“ جونز صرف یہ چاہتا تھا کہ اس کے ساڑھے سات سو ڈالر سے میگی اور ٹام لطف نہ اٹھا سکیں۔

”میں انہیں پریشان کر دوں گا وہ شادی کے ابتدائی دنوں ہی میں ایک دوسرے کو کاٹ کھائیں گے اور ساڑھے سات سو ڈالر وصول ہو جائیں گے۔“

دس منٹ بعد وہ مسز کیلی کے بورڈنگ ہاؤس کی گھنٹی بجا رہا تھا کیلی نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا کیونکہ بعض واقعات کی وجہ سے دونوں کے تعلقات اچھے نہیں رہے تھے۔ جونز اسے دیکھ کر مسکرایا تو کیلی کے چہرے پر پڑنے والی شکنیں بھی دور ہوتی چلی گئیں۔

”آہ...... آج تو تم قیامت ڈھا رہی ہو کیلی۔“

”کیوں، کیا بات ہے آج میں تمہیں اچھی کیوں لگ رہی ہوں۔“

”پتا نہیں بس ایسے ہی دل چاہا کہ تم سے مل لوں کیا حال چال ہے۔“

”میں نے سنا ہے کہ تم بہت پریشان رہتے ہو۔“

”ہاں پریشانیاں تو میرا مقدر ہیں لیکن میں اپنے دشمن کو بھی پریشان دیکھنا نہیں چاہتا حالانکہ ٹام اور میگی سے مجھے نفرت ہے۔“

کیلی کے کان کھڑے ہو گئے وہ دوسروں کی زندگی میں بہت دلچسپی لیتی تھی اور اسے علم تھا کہ شادی سے قبل میگی کا جونز سے تعلق تھا۔ پھر جب جونز اسے مسروقہ کار کا قصہ سنایا تو کیلی کا پیٹ پھولنے لگا۔

جونز کی اس درخواست کے باوجود کہ یہ قصہ کسی کو نہ بتائے وہ مسز فیلوک کے گھر چلی گئی مسز فیلوک کو علم تھا کہ میگی نے انتہائی چالاکی سے کام لیتے ہوئے جونز کو منگنی کے اعلان پر مجبور کر دیا تھا اور پھر وہ حرکتیں کی تھیں کہ جونز منگنی توڑنے پر مجبور ہو گیا تھا اس کے بعد میگی نے مقدمہ دائر کر دیا تھا اور جونز کو حکم ملا تھا کہ وہ میگی کو ذہنی کوفت کے عوض ساڑھے سات سو ڈالر ادا کرے۔

”بے چارے نے جو رقم جمع کی تھی وہ میگی کو مل گئی۔“ کیلی نے مسز فیلوک سے کہا حالانکہ مسز فیلوک کو بھی اس کا علم تھا اور پھر ٹام کمبخت نے اس سے چوری کی کار خریدی۔

”اتنا اچھا نوجوان آخر میگی کے عشق میں مبتلا کیسے ہو گیا؟“

”ارے، بے چارے کو پھانس لیا تھا اس چڑیل نے۔“

”اچھا ہے ٹام اور میگی کو اس کی سزا ملے چوری کی کار

رکھ کر وہ بچ تو نہیں سکتے۔“ مسز فیلوک نے بڑے وثوق سے کہا اور دونوں عورتیں سر ہلانے لگیں۔

”تم نے سنا ہلڈا ٹام اور میگی نے چوری کی کار خریدی ہے۔“

”اوہ نہیں۔“ ہلڈا نے حیرت سے مسز فیلوک کی طرف دیکھا اور پھر دونوں سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگیں دونوں اس نکتہ پر بحث کر رہی تھیں کہ ٹام کی گرفتاری میں کتنی دیر ہے۔

”ارے ٹام کو معلوم تھا کہ کار چوری کی ہے۔“ ہلڈا نے سوزان سے کہا۔

”اب تو اس کی خیر نہیں، بے چارے جونز کو تو انہوں نے کنگال کر ہی دیا مگر اب اس کا بدلہ بھی ملے گا۔“

”ویسے میگی نے جونز کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“ سوزان نے جو خود بھی جونز کی امیدوار تھی نفرت سے کہا۔

”اتنے نفیس آدمی سے ایسا غلط سلوک...... توبہ ہے بہن۔“

سہ پہر تک مسروقہ کار کی کہانی سیاہ فاموں کے ہر گھر میں پہنچ گئی ہر عورت نے اپنے شوہر یا باپ، بھائی تک یہ خبر پہنچائی اور سب اس بات پر متفق نظر آئے کہ ٹام نے جان بوجھ کر مسروقہ کار خریدی ہے کیونکہ سب ہی کا کہنا تھا کہ سولہ سو ڈالر کی کار ساڑھے سات سو ڈالر میں کوئی بھی نہیں بیچ سکتا۔ پھر یہ خبر ٹام اور میگی تک بھی پہنچ گئی۔ کیلی نے میگی سے ملاقات کی۔

”تم کیسے کہتی ہو کہ کار چوری کی ہے۔“

”اور تم یہ کس طرح کہہ سکتی ہو کہ یہ چوری کی نہیں۔“

”مجھے معلوم ہے۔“

”اور لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ تم مسروقہ کار میں گھوم پھر رہی ہو۔“

”کون کہتا ہے...... وہ ذلیل جونز؟“

”اسے برا مت کہو۔“ کیلی نے ترش لہجے میں جواب دیا۔

”اگر ہم سب احمق ہیں تو پھر وکیل ایڈورڈ تو احمق نہیں، وہ بھی یہی کہہ رہا تھا۔

”وہ صرف باتونی ہے کیلی اور اس کا منہ بند کرنے کی کسی میں بھی ہمت نہیں۔“ میگی نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

کیلی اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”خدا کرے سب لوگ غلط کہہ رہے ہوں، لیکن دھواں اتنا زیادہ ہے کہ صرف سگار جلنے کا شبہ نہیں ہو سکتا۔“

اس کے جاتے ہی میاں بیوی میں تکرار شروع ہو گئی۔

”سب بکتے ہیں۔“ ٹام نے عورتوں کو برا بھلا کہتے ہوئے کہا۔

”ہاں اگر وہ بکتے ہیں تو تمہارے حق میں یہی بہتر ہوگا ورنہ......!“ میگی نے ہونٹ چباتے ہوئے خطرناک لہجے میں کہا۔

”کیا کہنا چاہتی ہو۔“

”یہ کہ تم نے کار میری رقم سے خریدی تھی۔ اگر یہ ثابت ہو گیا کہ کار مسروقہ ہے تو پھر تم اپنی خیر منانا۔“

”تم مجھے دھمکی دے رہی ہو۔“

”نہیں لیکن اگر کار چھن گئی ٹام ڈارلنگ تو اس گھر میں بڑا ہنگامہ ہوگا اور تم اس ہنگامے کے مرکزی کردار ہوں گے۔“

نئے دولہا کو اپنی دلہن سے اتنی بدتمیزی کی امید نہیں تھی اسے تو اب تک یہی یقین تھا کہ میگی اس کے کنٹرول میں ہے لیکن اب......

”تم فکر مت کرو میگی، کار چوری کی نہیں ہے۔“ اس نے نرم لہجے میں بیوی کو یقین دلانے کی کوشش کی۔

”تمہیں کس طرح معلوم ہوا کہ ہماری کار مسروقہ نہیں

بے صبرے کیوں ہوتے ہو؟

ایک شیخی خور شکاری اپنے گھر میں آئے ہوئے دوستوں سے کہہ رہا تھا۔

”آپ لوگ جانتے ہیں کہ جنگلی گینڈا جب اپنی مادہ کو بلاتا ہے تو کیسی آواز نکالتا ہے؟“

دوستوں نے جب انکار میں سر ہلایا تو شکاری بولا۔

”سنیے وہ اس طرح کی آواز نکالتا ہے۔“ کہہ کر شکاری نے اپنے گلے سے عجیب گرج دار سی آواز نکالی۔

اس آواز کو سنتے ہی کچن سے اس کی بیوی کی زوردار آواز سنائی دی۔ ”آ رہی ہوں...... ذرا ٹھہرو...... اتنے بے صبرے کیوں ہو رہے ہو؟“

ٹام۔"
"میں شرط لگا سکتا ہوں کہ......!"
"تم پہلے ہی میری رقم کار خرید کر جوئے پر لگا چکے ہو موٹے آدمی۔"
میگی نے تلخی سے کہا۔
"اب ضرورت اس بات کی ہے کہ بازی تمہارے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ میں صرف اتنا ہی چاہتی ہوں۔"
ٹام بہت آزردگی کے عالم میں اپنے گیراج تک گیا جہاں چمکتی ہوئی کار کھڑی تھی۔ وہ کار پر ہاتھ پھیرنے لگا پھر اسے ایک نئے خدشے نے گھیر لیا اگر یہ مسروقہ ہے تو اس کا مالک اس کار کو دیکھتے ہی پہچان لے گا اور پھر تو میں مارا جاؤں گا۔
اسے یقین تھا کہ کار چوری کی نہیں لیکن پورے محلے میں اڑنے والی افواہ کے باعث اب اس کا یقین متزلزل ہو رہا تھا۔ یقین متزلزل ہوتے ہی ایک خدشے نے سر ابھارا کہ کار اس سے چھن نہ جائے۔ کار کا چھننا، ازدواجی زندگی کی تباہی، شہرت کی بربادی اور شاید قید کو دعوت دیتا ہی مون کا خواب بھی پورا نہیں ہوگا گیراج میں کھڑے کھڑے اسے اپنے خدشات کی حدت سے پسینہ آ گیا۔ وہ ایک پٹی پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ وہ بے وقوف نہیں تھا لہٰذا جلد ہی اس نے مسئلے کا حل تلاش کر لیا اور وہ دیوانہ وار میگی کے کمرے میں گھس گیا۔
"بس اب سمجھ لو کہ ساری پریشانیاں دور ہو گئیں۔ میں کار پر نیا رنگ کراؤں گا تا کہ اگر کوئی کار کی تلاش میں آئے بھی تو پہچان نہ سکے۔ مسروقہ کاریں رنگ کی وجہ سے پکڑی جاتی ہیں۔"
"رنگ کس سے کراؤ گے؟" میگی نے نائٹ گاؤن سمیٹتے ہوئے کہا۔
"کاستور سے وہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔"
یہ تجویز میگی کو بھی پسند آئی اور چند ہی منٹ بعد ٹام، کار لے کر کاستور کے گیراج پہنچ گیا اور اس کے دوست نے بڑے غور سے اس کی ہدایات سنیں۔
"سب سے پہلے تو اس پر نیلا رنگ کر دو، اس پر بھورا رنگ اچھا نہیں لگتا پھر اس کے مڈگارڈ نکال دو تا کہ یہ اسپورٹس کار لگے عقبی حصے سے حرکت کرنے والے گلاسوں کو نکال کر پلیٹ گلاس لگا دو اور ہاں کام کے دوران نمبر پلیٹ نکال کر کہیں محفوظ کر دینا ورنہ رنگ سے خراب ہو جائے گی۔"
"بہت خوب سب کام ہو جائے گا۔" کاستور نے بڑے خلوص سے جواب دیا۔
"ذرا جلدی کرنا ویسے مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے کاستور۔"
"شکریہ۔" جونز نے کاستور سے ٹام کے بارے میں جو باتیں کی تھیں وہ کاستور کے ذہن سے حرف غلط کی طرح مٹ گئیں۔
"میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں کاستور...... بالکل اس طرح جیسے تم میرے سسر ہو، سنو، اگر کوئی یہ پوچھنے آئے کہ تم کار کا کیا کر رہے ہو تو کوئی جواب مت دینا لوگ مجھ سے بہت جلے بھنے ہیں سمجھ گئے نا میرے دوست۔"
"فکر مت کرو، کسی کو کچھ بھی نہیں معلوم ہوگا۔"
ٹام واپس چلا گیا اور کاستور فوراً کام میں جت گیا اسے امید تھی کہ ٹام اسے معقول معاوضہ دے گا لیکن وہ غیر معمولی منافع ٹام سے لینے پر بھی آمادہ نہیں ہوتا، اسے توقع تھی کہ اس کار کو نمٹانے سے علاقے میں اس کی شہرت ہو جائے گی اور لوگ زیادہ تر اسی سے کام کرایا کریں گے لوگ تو اسے پہچانیں گے بھی نہیں، اس نے نیلے رنگ کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا۔ وہ آٹھ نو بجے تک کام کرتا رہا اور اگلی صبح سات بجے پھر کام پر آ گیا۔ نو بجے تک اس نے فینڈر ہٹا کر کار دھو ڈالی تا کہ رنگ کر سکے نمبر پلیٹیں بھی ہٹا کر گیراج کے ایک کونے میں ڈال دیں اور رنگ بنانے لگا۔
یہ وہ مرحلہ تھا کہ جب جونز وہاں سے گزرا اس کی نظر اچانک ہی کار پر پڑی اور اسے پلٹ کر گیراج میں آنا پڑا۔
"یہ کس کی کار ہے کاستور؟" اس نے شوخ لہجے میں پوچھا اس کا منصوبہ کامیاب ہو رہا تھا۔
"کسی کی ہے۔"
"نام تو بتا دو دوست۔"
"مجھے نام سے نہیں کام سے غرض ہے۔"
"اچھا...... میں بتا دیتا ہوں یہ کار ٹام کی ہے جو میرے سرمایہ سے خریدی گئی ہے کیوں، میں غلط کہہ رہا ہوں۔"
"میں کسی بات کی تردید نہیں کروں گا۔"

"تصدیق تو کر دو۔"
"تم خود تفتیش کر لو۔" کاستور نے جواب دیا۔
"اچھا تو رنگ کرنے والے ہو کون سا رنگ پسند کیا ہے ٹام نے؟"
"نیلا۔" سادہ لوح کاستور نے لاشعوری طور سے جواب دیا۔
"بہت اچھا لگے گا رنگ کرنا کب شروع کرو گے؟"
"تھوڑی دیر بعد۔" کاستور نہ چاہتے ہوئے بھی سب کہے جا رہا تھا جونز اس نئی صورت حال پر غور کرتا ہوا سڑک پر حقائق اور حالات کو غور کرتے ہوئے اسے قلبی مسرت ہوئی۔
میگی کو پریشان کرنے کا منصوبہ غیر متوقع طور پر زبردست کامیابی سے ہمکنار ہو رہا تھا۔ وہ اس پر جتنا سوچ رہا تھا اسے اتنی ہی خوشی تھی۔ بات واضح تھی ٹام نے یقیناً افواہ سن لی تھی کہ کار چوری ہوئی اور اس پر اتنا پریشان ہوا تھا کہ اب کار کا رنگ تبدیل کرانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ جونز کو اس صورت حال پر اتنی خوشی ہوئی کہ سرمائے کے ڈوبنے کا دکھ بھی بھول گیا۔ اب وہ یہ منصوبہ بنا رہا تھا اس مسئلے کا منطقی انجام کیا ہونا چاہیے۔ چلتے چلتے وہ ایک قطعی فیصلے پر پہنچ گیا جس کی کامیابی کے تصور ہی نے اس کے جسم میں نئی توانائی بھر دی۔ وقت آ گیا ہے کہ میں سارے قرضے وصول کر لوں۔ ایجنٹ بوسٹن کے تاریک اور گندے سے دفتر میں پہنچا تو اس کا دل اچھل رہا تھا۔ بوسٹن اسے دیکھ کر کھل اٹھا۔ جونز ہمیشہ اس کے کام آتا تھا اور جب بھی بوسٹن کو قرضے کی ضرورت پڑتی تھی تو وہ صرف اور صرف جونز ہی سے رابطہ قائم کرتا تھا جونز نے فوراً مسئلہ پر گفتگو کی۔
"تم جانتے ہو کہ میں ٹام سے کتنی نفرت کرتا ہوں بوسٹن۔"
"بالکل...... کیوں نہیں...... اور میں بھی اس سے نہیں کرتا دوست۔"
"گڈ، اب میری بات غور سے سنو۔"
جونز کی زبان قینچی کی طرح چل نکلی اور بوسٹن غور سے سنتا رہا۔
"اور کیونکہ تم انشورنس ایجنٹ ہو لہٰذا میرے بہت سے کام آ سکتے ہو تم اس سے کچھ کیے بغیر اسے پریشان کر سکتے ہو۔" اس نے بات کرتے ہوئے کہا۔
"اس کمینے نے مجھے سوسائٹی کی رکنیت سے بھی خارج کرنے کی کوشش کی تھی جونز۔" بوسٹن نے دانت پیستے ہوئے کہا۔
"بالکل درست، اس طرح تم بھی اپنا مقام لے سکو گے۔"
"میں تیار ہوں۔"
"گڈ۔" جونز نے سکون کی سانس لیتے ہوئے کہا۔
"اب تم اپنا راکٹ چھوڑو گے جو ٹھیک نشانے پر لگے گا۔"
روانگی سے قبل اسے بعض چھوٹی چھوٹی مزید باتیں بتائیں اور جب وہ چلا گیا تو ہنسنے لگا وہ ٹام سے پرانا بدلہ لینا چاہتا تھا اور جونز نے اسے یہ موقع فراہم کر دیا تھا۔
صبح دس بجے جب کاستور نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو اس کو اچنبھا ہوا بوسٹن کار کو غور سے دیکھ رہا تھا۔
"صبح بخیر بوسٹن۔"

مہکتی کلیاں

- جس طرح شبنم کے قطرے مرجھائے ہوئے پھول کو تازگی دیتے ہیں اسی طرح اچھے الفاظ مایوس دلوں کو روشنی دیتے ہیں۔
- جذباتی لوگ نہ تو خود خوش رہ سکتے اور نہ ہی دوسروں کو خوش رکھ سکتے ہیں۔
- اپنی زندگی کا اصول بنا لیجیے کہ کسی سے بُرا کرنے میں کبھی پہل نہ کریں یقین مانیے آپ ہمیشہ سرخرو رہیں گے۔
- پہلی ملاقات میں کسی شخص کے متعلق رائے قائم مت کریں، کیا معلوم اس وقت اس کا آپ کے ساتھ اچھا نہ پیش آنا وقت اور حالات کا تقاضا ہو۔
- اپنی رائے ضرور دیں مگر رائے کو دوسروں پر مسلط کرنے سے گریز کریں۔

نادیہ عباس دیا...... موسیٰ خیل

''صبح بخیر بھائی کس کی کار ہے یہ؟'' بوسٹن نے گاڑی کے گرد چکر لگا کر نشستوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میری نہیں ہے۔''

''میں نے یہ پوچھا ہے کہ کار کس کی ہے۔''

''میں اس پر نیا رنگ کر رہا ہوں۔'' کاستور نے ایک بار پھر ٹالتے ہوئے کہا۔ بوسٹن نے چند لمحوں تک اسے گھور کر دیکھا اور نمبر پلیٹ کی خالی جگہ دیکھنے لگا۔

''نمبر پلیٹیں کہاں گئیں؟''

''میرا خیال ہے کہ اس کار سے تمہارا کوئی تعلق نہیں، بوسٹن۔''

''کیوں نہیں ہے...... میں ایک موٹر کار کمپنی کا انشورنس ایجنٹ ہوں تم یہ بات کیوں بھول جاتے ہو۔''

''یہ کوئی نئی بات نہیں۔''

''میں تم سے چند سوال کرنا چاہتا ہوں کاستور، سوچ سمجھ کر جواب دینا، کیا تمہیں علم ہے کہ یہ کار چوری کی ہے؟''

''پتا نہیں۔'' کاستور نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا اور بوسٹن کار کے نیچے جھانکنے لگا۔

''وہی ہے بالکل وہی ہے۔'' اور پھر سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔

''تم نے خود کو بڑی مصیبت میں پھنسا لیا ہے کاستور۔''

''کیا مطلب؟''

''یہ کار تمہاری ہے نا۔''

''نہیں۔'' کاستور جال میں پھنسنے لگا۔

''میری نہیں ہے۔''

''پھر کس کی ہے۔''

''یہ......!'' کاستور ایک لمحے تک ہچکچاتا رہا لیکن پھر سزا کا خوف غالب آ گیا۔

''یہ ٹام یہاں لایا تھا۔''

''اوہ ٹام...... اس چڑیل کا شوہر...... میں پہلے ہی مشکوک تھا کاستور، شکر ہے کہ یہ کار میری نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف لپکا مگر اس مرتبہ کاستور نے اسے روک لیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

''ٹام کے گھر۔'' یہ کہہ کر اس نے رکنے کی زحمت نہ کی ادھر کاستور بہت پریشان ہوگیا کیونکہ اب اسے بھی یقین ہوگیا تھا کہ اس کے گیراج میں مسروقہ کار کھڑی ہوئی ہے۔

''یہی وجہ ہے کہ ٹام اس کا رنگ بدلوانا چاہتا تھا۔ وہ دوست تھا لہٰذا اس نے فوراً ٹام کو فون کیا۔

''تم مصیبت میں پھنس گئے ہو ٹام۔''

''کیا کہہ رہے ہو، کیسی مصیبت۔''

''تمہاری کار چوری کی ہے۔''

''اوہ...... تو تم بھی یہ کہہ رہے ہو کاستور۔''

''میں ہی نہیں وہ شخص بھی یہی کہہ رہا ہے جس کی کار چوری ہوئی تھی اور اب اس بارے میں انشورنس والے تحقیقات شروع کر چکے ہیں۔''

''کک کیا...... کاستور...... کیا کہہ رہے ہو۔'' ٹام کے لہجے میں میں خوف تھا۔ ''یہ تم کو کس نے بتایا؟''

''کسی نے بھی نہیں لیکن مجھے کسی نہ کسی طرح معلوم ہوگیا ہے۔ انشورنس ایجنٹ بوسٹن نے کچھ دیر پہلے کار کا معائنہ کیا اور اب وہ تمہاری طرف آ رہا ہے بہتر یہی ہے کہ کہیں چلے جاؤ ورنہ قانون کے ہاتھ کار کی چابی اور تمہاری گردن دبوچ لیں گے۔''

ٹام نے ریسیور پٹخ دیا اور پلٹ کر دیکھا اس کی بیوی خونخوار نظروں سے گھور رہی تھی۔

''اب کیا ہوا؟'' اس نے روکھے لہجے میں پوچھا اور ٹام کو سب کچھ بتا دینا پڑا۔

''تم...... احمق...... گاؤدی...... بہت شاطر بنتے تھے۔ تم نے جونز کو میرے ذریعے بے وقوف بنایا اور پھر میری رقم سے چوری کی کار خرید لی اب تمہاری جگہ صرف اور صرف جیل ہے۔''

''بکومت۔'' ٹام نے جھنجلا کر کہا۔ ''میں جیل ویل کہیں نہیں جاؤں گا میری بات سنو بوسٹن یہاں صرف یہ پوچھنے آ رہا ہے کہ کار کس کی ہے اور ہم دونوں اسے یہی جواب دیں گے کہ کار ہماری نہیں ہے۔''

''مگر یہ سفید جھوٹ ہوگا۔''

''یہی جھوٹ مجھے گرفتاری سے بچا سکتا ہے۔''

''اور پھر وہ کار لے کر جائیں گے اور میری ساری رقم ڈوب جائے گی'' میگی نے تڑخ کر جواب دیا۔ ''اس سے

بہتر تو یہ ہے کہ تم کچھ دنوں تک جیل چلے جاؤ۔''

''پلیز میگی مجھ پر رحم کرو۔'' وہ گھگھیانے لگا۔

''مگر وہ جھوٹ پکڑ لیں گے یہ پوچھیں گے کہ کار اگر ہماری نہیں تو پھر کس کی ہے۔''

''ہم کہہ دیں گے کہ کاستور اسے اپنی کار قرار دے رہا تھا۔''

اس لمحے بوسٹن دروازے پر نمودار ہوا اور اس نے پہلا سوال وہی کیا جس کی ٹام کو توقع تھی۔

''کیسی کار؟'' ٹام نے حیرت سے کہا۔ ''کاستور کے پاس کار کہاں سے آئی بوسٹن۔''

''وہ کہتا ہے کہ تم لائے تھے۔''

''ہماری کار کیسے ہوگئی جب کہ ہم نے تو کوئی کار خریدی ہی نہیں۔'' میگی نے اپنے شوہر پر ترس کھا کر کہا۔

''ہوں۔'' یہ نئی صورت حال بوسٹن کے لیے پریشان کن تھی۔

''تب پھر تم دونوں میرے ساتھ چلو تاکہ یہ قصہ گیراج میں کاستور کے سامنے ہی نمٹا دیا جائے۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے ہدایت کی۔ میاں بیوی قدرے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرنے کے بعد اس کے ساتھ چل دیے راستے میں جونز سے ان کا ٹکراؤ ہوگیا جس کے چہرے پر فاتحانہ چمک تھی۔

''ارے...... کیا کسی جنازے میں جا رہے ہو ٹام۔'' اس نے ان کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے شوخ لہجے میں پوچھا میگی اور ٹام دونوں اسے خونخوار انداز سے گھورنے لگے۔

''تم ہمارے ساتھ کیوں چل رہے ہو؟'' ٹام نے تڑک کر پوچھا۔ ''دور ہو جاؤ۔''

''یہ آزاد ملک ہے شاہراہ عام ہے اور ہر ایک کو اس پر چلنے کا حق ہے ٹام کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔''

بوسٹن نے مسکرا کر اپنے دوست کی طرف دیکھا اور دونوں شانہ بشانہ ادا اس سے چند قدم آگے چلنے لگے۔

''آج میری دلی تمنا پوری ہوگئی بوسٹن تم نے دیکھا، دونوں کتنے پریشان ہیں؟''

''اور میری خواہش بھی پوری ہوگئی۔'' بوسٹن نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

پیاری معلومات

+ میرے پیارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی میں صرف ایک حج کیا' چار بار عمرہ کیا۔

+ آپ نے 53 سال مکہ معظمہ میں رہے اور 10 سال مدینہ میں گزارے۔

+ آپؐ کے 3 بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں بیٹوں کے نام محمد قاسم محمد ابراہیم محمد طاہر تھا اور بیٹیوں کے نام حضرت زینب حضرت رقیہ حضرت ام کلثومؓ اور حضرت فاطمہ تھا۔

+ آپؐ کے دانت مبارک جنگ اُحد میں شہید ہوئے۔

+ جب آپؐ بیمار تھے تو آپؐ کے مصلے پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سترہ نمازیں پڑھائیں۔

+ آپؐ نے جب اس دنیا سے پردہ فرمایا تو آپ کو حضرت علیؓ نے غسل دیا۔ آپ کی تدفین کے لیے حضرت ابوطلحہؓ نے لحد مبارک کھودی (سبحان اللہ)۔

+ آپؐ نے فرمایا جو شخص سوتے وقت 21 بار پوری بسم اللہ پڑھے اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ اس شخص کی ہر سانس کے بدلے نیکی لکھو۔

+ سبحان اللہ

مہوش ارم...... بہاولپور

''لیکن گیراج میں کیا کریں گے ہمارا اگلا قدم کیا ہوگا؟''

''کچھ بھی نہیں ٹام صاف کہہ دے گا کہ کار اس کی نہیں ہے اور مجھے اس ڈرامے کا لطف آ جائے گا میں سمجھوں گا کہ میری ڈوبی ہوئی رقم واپس مل گئی۔''

ابھی وہ گیراج کے قریب پہنچے ہی تھے کہ وکیل ایڈورڈ ان کے سامنے آ گیا۔

''اوہ یہ جلوس کہاں جا رہا ہے دوستو۔'' اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''آؤ تم بھی ساتھ چلو ہم چاہتے ہیں کہ تم ایک ایسے مسئلے پر اپنی رائے دو جو جرائم کی فہرست میں شامل ہے۔'' جونز نے بھی قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ اس کی پیشکش فوراً قبول کر لی گئی اس پر ٹام نے جو اعتراض کیا وہ وکیل نے مسترد کر دیا۔ گیراج میں داخل ہوتے ہی کاستور اچھل کر

کھڑا ہوگیا۔
”دیکھا میں نے کہا تھا نا کہ کار ٹام کی ہے۔“ اس نے سینہ پھلا کر بوسٹن سے کہا۔
”میری کار؟“ ٹام نے گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جس پر ابھی رنگ نہیں ہوا تھا صرف بونٹ پر اسپرے کیا گیا تھا۔ ”یہ کار نہ تو میری اور نہ میگی کی ہے ہمارے پاس تو کوئی گاڑی نہیں ہے۔“
حیرت اور خوف سے کاستور کا منہ کھلا رہ گیا۔
”پھر کہو...... کیا کہا تم نے ٹام میرے دوست۔“
”میں یہ کہہ رہا تھا کہ کار ہماری نہیں ہے۔“
”آہ کاستور۔“ جوزنے گرم لوہے پر ضرب لگانے کا موقع دیکھ کر بڑی ہمدردی سے کہا۔ ”میں نے تم کو بتا دیا تھا کہ ٹام اپنے مفاد کی خاطر تمہیں بھی داؤ پر لگا سکتا ہے۔“
”یہ کار کس کی ہے؟“ بوسٹن ماربل نے جوڑے سے پوچھا۔
”ہماری نہیں ہے۔“
”تم نے یہ کار پہلے کبھی نہیں دیکھی۔“
”ایک مرتبہ دیکھی تھی جب کاستور اس میں کہیں جا رہا تھا۔ اس جواب پر کاستور خوف سے کانپنے لگا ٹام نے واضح طور پر یہ بتایا تھا کہ کار کاستور کی ملکیت ہے۔
”سنو ٹام میں ایک دو منٹ بعد پاگل ہو جاؤں گا اور پھر تمہاری خیر نہیں ہوگی۔“ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا اور ٹام اور میگی باہر نکل گئے میگی غصہ سے پاگل ہو چکی تھی۔ اسے یہ دکھ تھا کہ اس نے جوزکو جس مقصد کے لیے بے وقوف بنا کر ساڑھے سات سو ڈالر اینٹھے تھے وہ مقصد حاصل بھی نہیں ہوا اور بدنامی بھی ہوئی وہ سڑک پر ہی گرجنے برسنے لگی۔
ادھر گیراج سے جوڑے کے نکلتے ہی کاستور انہیں یقین دلانے لگا کہ کار اس کی نہیں جس پر بوسٹن نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور جوز بھی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگیا۔ ان کو تنہا دیکھ کر کاستور اور زیادہ خوفزدہ ہوگیا۔ اس کی سمجھ میں اس بے وقت ہنسی کا مطلب نہیں آ رہا تھا لیکن جوزنے اس کی مشکل آسان کردی۔
”اب بولو کاستور اپنے مخلص دوست ٹام کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔“
”وہ بہت کمینہ آدمی ہے۔“ کاستور نے کہا۔ ”تم نے ان کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ تو بہت ہی کم تھا۔“
ایڈورڈ خاموشی سے سب کچھ دیکھتا اور سنتا رہا پھر وہ پھٹ پڑا۔ ”ارے مجھے تو بتاؤ یہ کیا چکر تھا۔“
جوز اور بوسٹن نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے سب کچھ کہہ دیا اور جب وضاحت ختم ہوگئی تو ایڈورڈ نے حالات پر فوراً ہی قابو پالیا۔ ”میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں جوز۔“
”کیا مطلب کیسی مبارک باد۔“
”اتنی خوب صورت کار کا مالک بننے پر۔“
”میں سمجھا نہیں۔“ جوز ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولا۔ ”یہ کار میری نہیں ایڈورڈ مذاق مت کرو۔“
”کون کہتا ہے کہ یہ کار تمہاری نہیں۔“
”میں کہتا ہوں کہ کار میری نہیں ہے۔“
”پھر کس کی ہے۔“
”ٹام اور میگی کی۔“
”وہ تردید کر چکے ہیں۔“
”ٹام جھوٹا ہے۔“ کاستور نے بھی کہا۔
”نہ بے چارے ٹام کو جھوٹا مت کہو عزیز دوست۔“ ایڈورڈ نے ہنستے ہوئے کہا۔ اب وہ اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے بھی کہا تھا کہ کار کاستور کی ہے شاید اس کی وجہ یہ خوف ہو کہ وہ مسروقہ کار خریدنے کے الزام میں پکڑا جائے گا لیکن اس نے ہم سب کے سامنے کہا ہے کہ کار تمہاری ہے اور یقیناً ایسا ہی ہوگا۔“
”میں کس جنجال میں پھنس گیا ہوں۔“ کاستور نے سر پیٹتے ہوئے کہا۔
”اب تم اس کار کا کیا کرو گے کاستور؟“
”یہ میری کار نہیں ہے۔“ کاستور نے بونٹ پر گھونسہ مارتے ہوئے کہا۔
”اچھا سنو۔“ ایڈورڈ نے اس مرتبہ سنجیدگی سے کہا۔
”جہاں تک تمہارے اور ٹام کے درمیان گفتگو کا تعلق ہے تو یہ کار ٹام کی ہے لیکن ہمارے اور قانون کے نزدیک یہ کار تمہاری ہے کیونکہ تمہارے قبضے میں ہے اور جس شخص کو تم مالک قرار دے چکے ہو وہ ملکیت کی تردید کر چکا ہے۔ کئی گواہوں کی موجودگی میں اگر تم اس مصیبت سے چھٹکارا

حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ کار کے مالک کی حیثیت سے اسے فروخت کردو۔“
”بات تو ٹھیک ہے لیکن اس کار کی وجہ سے میں پہلے ہی مصیبت میں پھنس چکا ہوں اور اب کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔“
جوز دونوں کے مکالمے بغور سن رہا تھا۔ ”یہ کار کس کی ملکیت ہے۔“ اس نے ایڈورڈ سے پوچھا۔
”یہی ایک مسئلہ ہے ٹام اور کاستور دونوں اس کی تردید کرتے ہیں لیکن کیونکہ اس لاوارث کار پر کاستور کا قبضہ ہے لہٰذا اگر یہ کار کاستور فروخت کردے تو خریدنے والے کی ملکیت بن جائے گی ورنہ سرکاری تحویل میں لے لی جائے گی۔“
”گویا اگر کاستور کار میرے ہاتھ فروخت کردے تو میں اس کا مالک بن جاؤں گا ایڈ۔“
صدفی صد...... قانونی مالک۔“
”کاستور میرا خیال ہے کہ تمہیں گیراج کا سامان خریدنے کے لیے رقم کی ضرورت ہے۔“ جوزنے مسکراتے ہوئے کہا۔
”پچاس ڈالر کافی ہوں گے۔“
”میں کسی نئے چکر میں تو نہیں پھنس جاؤں گا۔“ کاستور نے خوفزدہ انداز میں ایڈورڈ سے پوچھا۔
”نہیں تم فکر مت کرو میں قانون جانتا ہوں۔“
”ٹھیک ہے کار کی قیمت پچاس ڈالر اور اس پر رنگ کرنے کے اخراجات پچیس میں صرف ایک سو ڈالر طلب کر رہا ہوں۔“ کاستور نے مسکراتے ہوئے کہا اور سودا طے ہوگیا۔
کار پر رنگ ہوگیا تو وہ بالکل نئی ہوگئی ایک ہفتہ بعد جب جوز کار گیراج سے نکال رہا تھا تو اس کا چہرہ مسرت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر کاستور کو خدا حافظ کہا اور کار بورڈنگ ہاؤس کی سمت بڑھا دی پھر گھر آ کر اس نے نفیس ترین سوٹ پہنا اور سیدھا ٹام کے گھر پہنچ گیا وہ دونوں اسے کار میں دیکھ کر ششدر رہ گئے۔
”یہ......!“ ٹام کار کی طرف اشارہ کر کے خاموش ہوگیا۔
”میں نے کاستور سے خریدی ہے اسی کی کار تھی نا۔“ جوزنے ہنستے ہوئے جواب دیا۔
”نہیں یہ ناممکن ہے۔“ میگی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
”مگر...... یہ تو مسروقہ کار تھی جوز؟“
”ہرگز نہیں یہ تم سے کس نے کہہ دیا ٹام تحقیقات سے معلوم ہوا کہ کار چوری کی نہیں تھی۔“
”تب پھر یہ میری کار ہے۔“ ٹام بھڑک اٹھا۔
”اب اس بارے میں وکیل ایڈورڈ سے بات کرو، تم اس کے اور انشورنس ایجنٹ کے سامنے کہہ چکے ہو کہ کار تمہاری نہیں کاستور کی تھی اور میں نے اسی سے خریدی ہے۔“
ٹام کاروباری آدمی تھا وہ سمجھ گیا کہ قانونی اعتبار سے جوز کی پوزیشن بہت مستحکم ہے لیکن میگی ایک عام سی عورت تھی وہ صرف اتنا ہی جانتی تھی کہ اس نے بڑی محنت سے ساڑھے سات سو ڈالر حاصل کیے تھے اور پھر کار خریدی تھی وہ خونخوار نظروں سے ٹام کو گھورنے لگی پھر اس نے ٹام کی کئی نسلوں کے بارے میں انتہائی خوشگوار قصیدہ پڑھ ڈالا۔
”آہ تم دونوں ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے ہو۔“ جوزنے مزا لیتے ہوئے کہا۔
”میری دعا ہے کہ زندگی بھر تم دونوں اسی طرح ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کرتے رہو۔“ یہ کہہ کر اس نے گیئر ڈالا اور کار زن سے آگے بڑھ گئی لیکن وہ آگے جا کر رکا اس نے ریورس میں کار چلائی اور ان کے قریب آ کر بولا۔
”میں ہاٹ اسپرنگس جا رہا ہوں، چلو، تمہیں بھی لے چلوں ہنی مون میں وہیں منالینا۔“
پھر اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا کیونکہ میگی سینڈل اتار کر ٹام کی پٹائی کرنے لگی تھی۔

تلاش سحر

زرین قمر

لوگوں کو لیلیٰ خالد کا نام ہی بھول گیا ہے' جس نے دو اسرائیلی طیارے اغوا کرکے پوری دنیا میں فلسطینی حریت پسند خواتین کی دلیری کی دھاک بٹھا دی تھی۔ لیلیٰ خالد نے بڑی شہرت پائی۔

پاکستان میں وہ اتنی مقبول تھی کہ اس کے اسکارف اور وردی کے ڈیزائن کے کپڑے خواتین میں بہت پسند کیے جاتے تھے۔ اس زمانے میں ہمارے بڑے بڑے لیڈر اپنے بچوں کو لیلیٰ خالد بننے کی تلقین کرتے تھے لیکن آج اسلامی ممالک اس موضوع پر کھل کر بات نہیں کرتے' مذاکرات کی مصلحتوں میں الجھے ہوئے ہیں جن سے شاید آزادی کی منزل پر پہنچنا ممکن نہیں۔

نارنگی رنگ کی فراک پہنے ہاتھ پھیلائے چاروں طرف لگے نارنگیوں کے درختوں کے بیچ چھوٹے سے میدان میں وہ خوشی سے تیزی سے جھوم رہی تھی۔ چکر کاٹ رہی تھی اور اپنے ساتھ کھیلتے اپنے پانچ بہن، بھائیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی اس کے شانوں تک کٹے ہوئے بال بھی اس کے ساتھ ساتھ جھوم رہے تھے۔ وہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ اسی لیے اس کو سب کی توجہ اور محبت ملتی تھی وہ جو سوچتی، چاہتی، پالیتی اور کچھ بھی کر گزرتی تھی۔ چاروں طرف لگے نارنگیوں کے درختوں میں اورنج کلر کی نارنگیاں جھول رہی تھیں اس سال فصل بہت اچھی ہوئی تھی فضا میں دور دور تک نارنگیوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی اور لیلیٰ کو یہ بہت پسند تھیں۔

"میں اب نہیں کھیلوں گی، مجھے نارنگیاں کھانا ہیں۔" اس نے اٹھلا کر کہا اور کھیل سے نکل گئی وہ دوڑتی ہوئی کبھی ایک درخت اور کبھی دوسرے درخت کی طرف جا رہی تھی اور ہر درخت سے اپنی پسند کی چمکتے رنگوں والی رس دار نارنگیاں توڑ کر اپنی جھولی میں ڈالتی جا رہی تھی۔

"لیلیٰ اتنی نارنگیاں تو ٹوٹی پڑی ہیں یہ کھالو۔" اس کے بھائی نے آگے بڑھ کر کہا جو اس سے سال بھر بڑا تھا۔

"نہیں بھائی میں خود اپنے ہاتھ سے توڑ کر کھاؤں گی۔" اس نے ضدی لہجے میں کہا اور اس کا بھائی پیچھے ہٹ گیا اسے معلوم تھا کہ لیلیٰ جو سوچ لیتی ہے وہ وہی کرتی ہے اس وقت لیلیٰ کی عمر تین سال تھی۔

لیلیٰ اپنے والد خالد کی بہت چہیتی تھی وہ 1944ء میں فلسطین کے شہر حیفہ میں پیدا ہوئی وہ اپنے آٹھ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی اور سب کی توجہ کا مرکز تھی زندگی پر سکون انداز میں گزر رہی تھی کہ 1948ء میں فلسطین سے وہاں کے آبائی باشندوں کو ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا گیا اور ایسا 1918ء میں ہونے والے ایک معاہدے کے تحت کیا گیا جس میں اسرائیلیوں کو اس علاقے میں پناہ گزین کی حیثیت سے رہنے کی اجازت دی گئی تھی۔

1948ء میں یہودیوں ہی کے ایک گروہ نے اس علاقے میں مسلمانوں پر حملے شروع کر دیے اور ایسے حالات پیدا کر دیے کہ وہ اپنے آبائی گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ایسے ہی عرب خاندانوں میں سے ایک خاندان لیلیٰ کا بھی تھا۔ لیلیٰ خالد اس وقت چار سال کی تھی وہ اپنی آنکھوں سے یہ تو دیکھتی تھی کہ کچھ لوگ مسلمانوں کا قتل عام کر رہے ہیں لوگ گھر چھوڑ چھوڑ کر جا رہے ہیں بہت سے خاندان اپنے پیچھے اپنا سامان بھی چھوڑ گئے ہیں لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے، اب اس کی ماں نے اس پر گھر سے باہر جانے پر کیوں پابندی لگا دی ہے اب وہ اپنے نارنگیوں کے باغ میں کیوں نہیں جا سکتی پھر آہستہ آہستہ جب حالات نے اسے سمجھایا تو سب اس کی سمجھ میں آنے لگا۔

جس روز وہ حفیہ میں اپنا آبائی گھر چھوڑ کر آ رہی تھی تو بہت رو رہی تھی اس کی ماں بار بار اس کی ڈھارس بندھا رہی تھی۔

"لیلیٰ چپ ہوجاؤ۔ ہم تھوڑے دنوں کے لیے جا رہے ہیں، ہم پھر واپس آئیں گے۔" انہوں نے لیلیٰ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن میرے نارنگیوں کے باغ سوکھ جائیں گے ان کی دیکھ بھال کون کرے گا۔" اسے اپنی نارنگیوں کا بہت خیال تھا۔

"باغ ٹھیک رہیں گے لیلیٰ۔" اس کے والد نے کہا۔

"میں تمہارے باغوں کی دیکھ بھال کروں گا۔"

"کیا آپ نہیں جا رہے ہیں؟" لیلیٰ نے پوچھا۔

"نہیں، میں یہاں رہوں گا اور اپنے گھر اور باغ کی حفاظت کروں گا میں یہ سرزمین ان یہودیوں سے واپس لوں گا۔" اس کے والد نے پرعزم لہجے میں کہا۔

"اگر حالات زیادہ خراب ہوں تو بھی وہیں آجانا۔" اس کی والدہ نے اس کے والد سے کہا۔

"میں شاید نہ آؤ، ان شاء اللہ تعالیٰ میں تم لوگوں ہی کو بلالوں گا۔ حالات ٹھیک ہوجائیں گے ہم سب پھر سے اپنے اس گھر میں آباد ہوں گے۔" اس کے والد نے پرامید انداز میں کہا۔

"کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم بھی یہیں رہیں۔" اس کی والدہ نے اس کے والد کو راضی کرنے کی آخری بار کوشش کی۔

"نہیں میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا، یہاں کے حالات تم دیکھ ہی رہی ہو کسی کی جان و مال محفوظ نہیں تم لوگ لبنان میں محفوظ رہوگے اور میں یہاں جدوجہد جاری رکھوں گا۔ حالات ٹھیک ہونے پر میں تم سب کو بلالوں گا۔" اس کے والد نے انہیں مطمئن کرتے ہوئے کہا۔

پھر وہ سب ایک کار میں بیٹھ کر خفیہ سے لبنان کے لیے روانہ ہوگئے تھے وہ سارا سامان بھی وہیں چھوڑ گئے تھے اور لبنان میں آکر ایک چھوٹے سے گھر میں رہائش اختیار کی تھی یہ گھر ایک لبنانی علاقے تیر (Tyre) میں واقع ایک پناہ گزین کیمپ کا حصہ تھا۔

جہاں لیلیٰ خالد اور اس کی فیملی کی رہائش تھی اس کے برابر کے گھر میں بھی نارنگیوں کا درخت لگا تھا اور نارنگیاں لیلیٰ کی کمزوری تھیں اس نے کئی بار وہ نارنگیاں توڑنے کی کوشش کی، لیکن اس کی ماں نے ہر بار اسے روک دیا جبکہ حیفہ میں ایسا نہیں ہوتا تھا وہ آزاد تھی اپنی مرضی کی مالک تھی جو نارنگی چاہتی توڑتی اور کھاتی تھی۔

"نہیں لیلیٰ تم یہ نارنگیاں نہیں توڑ سکتیں۔" اس کی والدہ نے سختی سے منع کیا۔

"کیوں...... مجھے یہ پسند ہیں۔" لیلیٰ نے ضدی لہجے میں کہا۔

"ہاں میں جانتی ہوں لیلیٰ کہ تمہیں نارنگیاں پسند ہیں لیکن تم انہیں نہیں توڑ سکتیں۔" انہوں نے نصیحت کی۔

"کیوں، کیوں نہیں توڑ سکتی؟" اس نے سوال کیا وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"کیونکہ یہ تمہاری نارنگیاں نہیں ہیں۔" اس کی والدہ نے سمجھایا اور وہ انہیں حیرت سے دیکھنے لگی۔

"یہ کسی اور کے گھر میں لگی ہیں۔ ان کا مالک گھر والا ہے تم اس کی اجازت کے بغیر انہیں ہاتھ نہیں لگا سکتیں۔" انہوں نے کہا اور لیلیٰ ان سے ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی جہاں وہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔

"لیلیٰ بری بات ہے تم بڑی ہو رہی ہو اس بات کو سمجھو کہ یہ نارنگیاں ہماری نہیں ہیں۔" اس کی والدہ نے اسے سمجھایا۔

"تو ہم اپنی نارنگیوں کے درخت وہاں کیوں چھوڑ آئے؟" اس نے روتے ہوئے معصومانہ سوال کیا۔

"ہم درختوں کے ساتھ تمہارے والد کو بھی تو چھوڑ آئے ہیں کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ ایک دن ہم واپس ضرور جائیں گے پھر تم دوبارہ سے ان نارنگیوں کے باغ میں کھیلوگی، نارنگیاں توڑوگی، کھاؤگی اور تمہارے والد تمہارے لیے اور ڈھیر ساری چیزیں اور کھلونے لائیں گے۔" اس کی والدہ نے سمجھایا۔

لیکن لیلیٰ کو کھیلنے کے لیے کھلونے نہیں ملے اس نے بچپن تیر کے پناہ گزین کیمپ میں بڑی کسمپرسی میں گزارا، زندگی کی ضروریات میں سے بہت سی اسے فراوانی سے نہیں ملتی تھیں اس نے اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد لبنان ہی میں واقع ایک امریکن یونیورسٹی سے مزید تعلیم حاصل کی اس نے 1962 سے 1963ء تک اس یونیورسٹی میں پڑھا لیکن پھر مالی مشکلات کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکی اور ایک اسکول میں تدریسی شعبے سے منسلک ہوگئی۔

اسکول میں تدریس کے دوران میں وہ اپنے نامساعد حالات سے مقابلہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اردگرد کے حالات سے بھی خود کو دور نہیں رکھ سکی وہ شام میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو دیکھتی اور خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی لیکن یہ اس کی فطرت کے خلاف تھا اس نے ارادہ کرلیا کہ

وہ مسلمانوں کے ساتھ فلسطین کی آزادی میں عملی کردار ادا کرے گی چنانچہ اس نے اپنے بھائی کی تقلید کرتے ہوئے پندرہ سال کی عمر میں ہی فلسطینی تنظیم "پاپولر فرنٹ فار لبریشن آف فلسطین" (پی ایف ایل پی) میں شرکت اختیار کرلی اور وہاں باقاعدہ ٹریننگ حاصل کرنے لگی۔

ٹریننگ کے دوران لیلیٰ خالد کے ساتھیوں اور تنظیم کے سرکردہ لوگوں پر یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ لیلیٰ خالد ایک سچی محب وطن ہے اور وہ پی ایف ایل پی میں اپنے جذبہ حب الوطنی ہی کی بدولت آئی ہے وہ بہادر اور نڈر ہے اس نے بہت جلد فائٹنگ کے اہم گر سیکھ لیے تھے۔ دور تک نشانہ لگانا، مختلف ہتھیاروں کا استعمال اس کے لیے ایک کھیل سے کم نہیں تھا پھر 1967ء میں مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے ایک ایسا اعلان کیا کہ دنیائے عرب کے مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

"اسرائیل جنگ چاہتا ہے تو ہم اس کے لیے تیار ہیں۔ ہم جنگ کریں گے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں فلسطین واپس دلوا کر رہوں گا۔"

جمال عبدالناصر کا یہ اعلان جب ریڈیو سے نشر ہوا تو لیلیٰ نے بھی سنا وہ اس روز بہت خوش تھی۔

"آپ نے سنا امی مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے اپنی تقریر میں کیا اعلان کیا ہے؟" اس نے اپنی والدہ سے پوچھا۔

"ہاں لیلیٰ میں نے سنا ہے مجھے خوشی ہے کسی کو تو ہماری تکلیفوں کا احساس ہو۔ کوئی تو ہے جو ہمارا خیال کر رہا ہے اور ہمارے لیے لڑنے کو تیار ہے۔ اب وہ اسرائیل کو سبق سکھائے گا۔" اس کی والدہ کے لہجے میں بھی جوش تھا۔

"ہاں اور فتح ہماری ہوگی ساری دنیا کے مسلمان اس کی اس تقریر کی تعریف کر رہے ہیں۔" لیلیٰ خالد نے کہا۔

"لیکن میں وعدہ کرتی ہوں کہ صرف مصر کی فوجیں ہی نہیں لڑیں گی ان کے ساتھ ساتھ ہم بھی اسرائیل سے اپنی دربدری کا بدلا لیں گے۔" لیلیٰ نے عزم سے کہا۔

"اللہ جو کرے گا بہتر ہی کرے گا۔" اس کی والدہ نے اس کی ڈھارس بندھائی وہ جانتی تھیں کہ لیلیٰ اس معاملے میں بہت حساس ہے اس نے اتنی کم عمری میں اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ گھر اور وطن چھوڑا اور اس کے بعد کسمپرسی کی زندگی ایک کیمپ میں گزاری اور تعلیم بھی حاصل کی اس کی زندگی کا مقصد صرف اور صرف اپنے وطن فلسطین واپس جانا تھا اور حالات ایسے تھے کہ فلسطین کو اسرائیلیوں سے آزاد کرانے کے لیے جدوجہد کرنا لازمی تھا اور لیلیٰ اس کے لیے تیار تھی۔

جمال عبدالناصر کے اعلان کے بعد مسلمان ملکوں میں بھی موجود مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی اور سب کا یہ خیال تھا کہ جمال عبدالناصر نے جو وعدہ کیا ہے وہ اسے ضرور پورا کرے گا اور فلسطینیوں کو ان کا وطن واپس مل جائے گا۔

1967ء میں جمال عبدالناصر کے بجائے اسرائیل نے مصر پر حملہ کردیا اس نے یہ حملہ 5 جون کو مصر کے ائرفورس گراؤنڈ پر کیا اس حملے میں طیارے اور ہیلی کاپٹر استعمال کیے گئے تھے یہ جنگ زیادہ عرصے جاری نہیں رہی اور اس جنگ میں اسرائیل نے مصر کو ہرا دیا بہت سے مصری فوجی ہلاک ہوئے اور بہت سے قید ہوگئے۔

اقوام عالم دم سادھے تمام صورت حال دیکھ رہی تھی مسلمانوں کا خواب ٹوٹ گیا تھا اور لیلیٰ خالد کی امید بھی دم توڑ گئی تھی اس جنگ میں نا صرف اسرائیل نے مصر کو ہرا دیا تھا بلکہ فلسطین کا باقی حصہ بھی ہتھیا لیا تھا جو وہاں سے بھی اس نے فلسطینیوں کو نکلنے پر مجبور کردیا تھا۔ بہادر لیڈروں کے وعدے کام نہیں آئے تھے تب لیلیٰ کو احساس ہوا کہ اسے اپنی جنگ خود ہی لڑنا ہوگی۔

"میں سمجھتی ہوں کہ ہمیں اپنی آزادی کی جنگ خود ہی لڑنا ہوگی۔" لیلیٰ خالد نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے اپنی تنظیم کے ایک ساتھی سے کہا۔ یہ اس شام کی بات تھی جب اسرائیل کی فتح کا اعلان ہوا تھا اور لیلیٰ خالد ریڈیو پر یہ اعلان سننے کے بعد بہت اداس اور مایوس تھی وہ ٹریننگ کیمپ کے باہر اپنی رائفل ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" اس کے ساتھی نے کہا۔

"ہم اگر مدد کے لیے دوسروں کی طرف دیکھتے رہیں گے تو کبھی بھی اپنا مقصد حاصل نہیں کرسکیں گے۔" لیلیٰ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"جب ہم نے اپنے لیے جدوجہد کا یہ راستہ چن ہی لیا ہے تو پھر ہمیں نڈر ہوکر اس جدوجہد کے لیے خود کو تیار بھی کرنا ہوگا اور کسی خوف کے بغیر اس جنگ میں حصہ بھی لینا ہوگا۔"

"ہم سب تمہاری اس بات سے متفق ہیں۔" اس کے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں نے بھی اس کی تائید کی اور اس دن کے بعد لیلیٰ خالد نے خود کو پی ایف ایل پی کی اسپیشل آپریشن اسکواڈ کا

باقاعدہ حصہ بنالیا اور جدوجہد آزادی کی پہلی خاتون بن گئی۔

پی ایف ایل پی کا اسپیشل آپریشن اسکواڈ جوائن کیے ہوئے لیلیٰ خالد کو ایک سال ہی ہوا تھا کہ اسے قسمت نے ایسا موقع دیا جس کے بعد اسے دنیائے اسلام میں بے پناہ شہرت حاصل ہوئی اور وہ مشرق وسطیٰ میں فلسطین کی جدوجہد آزادی کا نشان بن گئی، اس نے اس مقصد کے لیے تنظیم کو اپنی خدمات خود پیش کی تھیں۔

29 اگست 1969ء وہ دن تھا جب لیلیٰ نے اپنی قسمت آزمائی تھی وہ ایک روشن اور شفاف دن تھا موسم بہت خوشگوار تھا لیلیٰ خالد اس ٹیم کا حصہ بنی جس نے ٹی ڈبلیو اے فلائیٹ ہائی جیک کی یہ فلائٹ روم سے ایتھنز جا رہی تھی وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ فلائیٹ میں موجود تھی اس کے ساتھ اس کا ایک ساتھی بھی تھا جو پی ایف ایل پی سے تعلق رکھتا تھا اور اس جہاز کے اغوا کے منصوبے یہ دونوں ہی اہم کردار تھے۔

لیلیٰ خالد اور اس کے ساتھی نے سفید ٹراؤزر اور سفید جیکٹ پہنی ہوئی تھی وہ دونوں بڑے اطمینان سے اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے جہاز میں سکون تھا اس وقت ائر ہاسٹس جہاز کے مسافروں کو کافی پیش کر رہی تھی اچانک لیلیٰ خالد اور اس کا ساتھی اٹھے اور کاک پٹ کے قریب جا کر رک گئے ایئر ہوسٹس نے ان کے اس طرح اٹھنے کی وجہ پوچھی لیکن لیلیٰ خالد نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش کر دیا پھر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی جیکٹ کے نیچے چھپی ہوئی رائفل نکال لی تھی اور زور سے کاک پٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا یہ سب اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ جہاز میں موجود مسافروں کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا دوسرے ہی لمحے کاک پٹ کا دروازہ کھلا اور لیلیٰ خالد رائفل محتاط انداز میں تھامے ہوئے پائلٹ کے کیبن میں داخل ہوئی تھی اس کا ساتھی بھی گن سنبھالے کاک پٹ کے دروازے میں کھڑا تھا اب جہاز کے مسافروں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا لیکن لیلیٰ کے دوسرے ساتھی صورت حال کو قابو کر چکے تھے۔

"یہ سب کیا ہے؟" پائلٹ نے لیلیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"فلسطین موومنٹ پی ایف ایل پی تمہارے جہاز کو ٹیک اوور کر چکی ہے۔" لیلیٰ خالد نے جواب دیا وہ بہت پرسکون نظر آ رہی تھی۔

لیلیٰ کو اس انداز میں وہاں دیکھ پائلٹ اور کو پائلٹ دونوں بہت حیران تھے اگر اس کے ہاتھوں میں گن اور سر پر فلسطینی تنظیم کا چیک دار اسکارف نہ ہوتا تو انہوں نے جو کچھ سنا اس پر انہیں یقین نہ آتا کیونکہ دیکھنے میں لیلیٰ خالد بہت کم عمر اور معصوم نظر آ رہی تھی، اس کے چہرے پر معصوم بچوں جیسی جھلک تھی آنکھوں میں سکون اور نرمی وہ کسی طرح بھی ایک دہشت گرد نہیں دکھائی دے رہی تھی لباس دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی ماڈرن حسینہ ہے اور بعد میں اسے عالمی طور پر بھی ایک خوب صورت مجاہدہ جیسا لقب دیا گیا تھا۔

"تم کیا چاہتی ہو۔" پائلٹ نے پوچھا۔

"خاموشی سے پرواز کرتے رہو۔" لیلیٰ نے جواب دیا اسی وقت کو پائلٹ کی نظر لیلیٰ نے دوسرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہینڈ گرنیڈ پر پڑی وہ موقع کی نزاکت کو بھانپ چکا تھا۔

"میرا خیال ہے ہمیں اغوا کیا جا رہا ہے۔" اس نے اپنے ساتھی سے کہا اور پائلٹ نے ائر ٹریفک کنٹرول مرکز سے رابطہ کیا۔

"ہیلو...... ہیلو...... یہ ٹی ڈبلیو اے فلائٹ 840 ہے۔" وہ مائیکروفون میں بول رہا تھا۔

"نہیں...... نہیں...... نہیں......!" لیلیٰ نے اس سے مائیکروفون جھپٹ لیا۔

"تم اب فلائیٹ 840 نہیں ہو۔" لیلیٰ نے بات مکمل کی اور خود مائیکروفون میں بولنے لگی۔

"لیڈیز اینڈ جینٹل مین یور اٹینشن پلیز۔"

اس نے ماہرانہ انداز میں مسافروں کو مخاطب کیا۔

"آپ کی نئی کیپٹن سعدیہ ابو غزالی بات کر رہی ہے۔" اس نے اپنا اصل نام لیتے ہوئے کہا۔

"یہ جہاز اب پی ایف ایل پی کی کمانڈ میں ہے۔" لیلیٰ نے کہا اور مسافروں میں پھر کھلبلی مچ گئی وہ ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

"جہاز کو اسرائیل کی طرف لے چلو اور اسے حفیہ کے اوپر سے اڑاتے ہوئے چلو۔" لیلیٰ خالد نے کہا اس کے ہاتھ میں گرنیڈ تھا جس کی پن نکلی ہوئی تھی اور وہ اسے لہرا لہرا کر بات کر رہی تھی۔ انداز ایسا تھا کہ اگر اس کے کہنے پر عمل نہیں ہوا تو وہ جہاز کو اڑا دے گی پائلٹ نے بلا چوں وچرا اس کی تقلید کی تھی۔

لیلیٰ کے باقی ساتھیوں نے ہاتھ ان کے سروں کے پیچھے باندھنے کی ہدایت کر دی تھی جس پر سب نے عمل کیا تھا بچے

خوف سے اپنے ماں باپ کی گودوں میں دبکے ہوئے تھے اور بعض مسافروں نے رونا شروع کر دیا تھا۔

"جہاز میں ایندھن کم ہے؟" پائلٹ نے لیلیٰ کو بتایا۔

"دمشق کی طرف چلو، مجھے پتا ہے ایندھن وہاں مل چلے گا۔" لیلیٰ نے کہا۔

"لیکن حفیہ کے اوپر سے پرواز کرنا ہے۔"

لیلیٰ نے پھر ہدایت کی۔

جب جہاز ہائفہ پر سے گزر رہا تھا تو لیلیٰ والہانہ محبت سے حفیہ کی سرزمین کو دیکھ رہی تھی جہاں وہ پیدا ہوئی تھی جہاں اس کی زندگی کے چار سال گزرے تھے جہاں اس کی زمین اور گھر تھا اور جہاں اس کے نارنگیوں کے باغات تھے، وہ سرزمین جہاں اسے واپس آنا تھا لیکن ابھی اسے وہاں جانے کی اجازت نہیں تھی اور وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی وہ چوبیس سال بعد اس سرزمین کو دیکھ رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد فضا میں دو اور جہاز اس کے جہاز کے دونوں اطراف میں آ چکے تھے اور وہ کیپٹن سے بات کر رہے تھے۔

"ہم یہاں پہنچ گئے ہیں، تم کیا چاہتے ہو۔" وہ پوچھ رہے تھے۔

"ہمیں اغوا کیا گیا ہے ہماری فلائٹ روم سے ایتھنز جا رہی تھی ایندھن کم ہے ہمیں ہنگامی طور پر لینڈنگ کرنا ہے۔" پائلٹ نے بتایا۔

"ٹھیک ہے ہم تمہیں گائیڈ کریں گے۔" دوسرے جہاز سے جواب دیا گیا اس کے بعد لیلیٰ کاک پٹ سے باہر آ گئی تھی وہاں اس نے اپنے ساتھی کو چھوڑ دیا تھا اور ہدایت کر دی تھی کہ کسی بھی قسم کی رعایت نہ کی جائے اگر پائلٹ کی طرف سے کوئی حرکت ہو تو بلا دریغ جہاز اڑا دیا جائے۔

جہاز میں تمام مسافر اپنے ہاتھ اپنے سروں کے پیچھے باندھے بیٹھے تھے۔

"تم ظالم ہو، تم دہشت گرد ہو۔" ایک عورت غصے سے چیخی۔

"چپ ہو جاؤ، ہمارا مقصد مسافروں کو نقصان پہنچانا نہیں ہے، لیکن اگر کسی نے کوئی غلط حرکت کی تو میں گولی مارنے میں دیر نہیں کروں گی۔" لیلیٰ نے کہا جس کے ایک ہاتھ میں پن نکلا ہوا گرنیڈ اور دوسرے میں رائفل موجود تھی اس کی دھمکی کا اثر ہوا تھا اور وہ عورت خاموش ہو گئی تھی۔

"تم کیا سمجھتی ہو، تم زندہ بچ جاؤ گی۔" ایک شخص نے کہا جو اس کے قریب والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔

"مجھے اس کی پروا نہیں۔" لیلیٰ نے کہا۔

"تم کو ہمیں ہائی جیک کر کے کیا ملے گا ہمارے بچے پریشان ہیں۔" ایک عمر رسیدہ عورت بولی۔

"یہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا سب ہی خاموش بیٹھیں پھر وہ ایئر ہوسٹسوں کی طرف مڑی۔

"تم اپنا کام کرتی رہو، مسافروں کو کچھ ضرورت ہو تو وہ پوری کرو، ہمارا مقصد مسافروں کو پریشان کرنا یا مارنا نہیں ہے جب تک کہ ہمیں مجبور نہ کر دیا جائے۔"

"اور ہاں یاد رکھو کاک پٹ میں میرا ساتھی موجود ہے اور وہ اپنے کام کا بہت ماہر اور طبیعت کا بہت سفاک ہے اگر کسی کی طرف سے کوئی حرکت ہوئی تو وہ خود کو اور جہاز کو اڑانے میں دیر نہیں کرے گا۔"

لیلیٰ خالد کی اس ہدایت کے بعد کسی نے کوئی بھی مزاحمت نہیں کی تھی۔

"ہمارے پاس ایندھن ختم ہو رہا ہے چنانچہ جہاز دمشق کے ایئرپورٹ پر اترے گا۔" لیلیٰ نے کچھ دیر بعد اعلان کیا اس پر بھی مسافروں نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا وہ سمجھ گئے تھے کہ کچھ بھی کہنا فضول ہے، جو کچھ ہو رہا ہے وہ اپنے انجام کو پہنچے گا تب ہی ان کی جان چھوٹے گی۔

"کچھ ہی دیر بعد جہاز دمشق ایئرپورٹ پر اتار لیا گیا تھا اس سلسلے میں دو جہاز جو امدادی پرواز کر رہے تھے انہوں نے بھی مدد کی تھی جہاز کے لینڈ کرتے ہی مسافروں میں کچھ بے چینی دیکھنے میں آئی تھی لیکن پھر ایئر ہوسٹوں نے انہیں مطمئن کر دیا تھا۔

"تمام لوگ اپنی اپنی جگہوں پر اطمینان سے بیٹھیں جیسے ہی جہاز سے اترنے کے انتظامات ہو جائیں گے آپ کو اتار دیا جائے گا پھر وہ سب انتظامات ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی دمشق ائر پورٹ پر سیکیورٹی بڑھا دی گئی تھی اور کسی بھی ناخوشگوار واقعہ سے نمٹنے کے لیے فائر بریگیڈ اور ایمبولینس بھی موجود تھیں۔"اب تمام لوگ جہاز سے اترنے کے لیے تیار ہو جائیں سب اطمینان سے باری باری اتریں گے اگر کوئی بدنظمی کی تو آپ لوگوں کے لیے دشواری پیدا ہو سکتی ہے، بالکل اطمینان رکھیں، گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں آپ کو با

حفاظت اتارا جائے گا اور پھر جس کو جہاں جانا ہے اسے یہاں سے اس کی منزل کی طرف روانہ کرا دیا جائے گا۔" ایک ایئر ہوسٹس نے مسافروں کے اطمینان کے لیے اعلان کیا جس کے بعد مسافروں میں پائی جانے والی کچھ بے چینی بھی ختم ہوگئی لیکن ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ لیلیٰ خالد ایک بار پھر اسپیکر پر آ گئی۔

"مسافر اطمینان سے لیکن جلدی جہاز سے اتریں کیونکہ جہاز میں بم ہے۔" لیلیٰ نے کہا اس کا اتنا کہنا تھا کہ مسافروں میں بھگدڑ مچ گئی تھی اور ایئر ہوسٹس نے اسے شکایتی نظروں سے دیکھا تھا۔

تمام مسافروں کے جہاز سے اترنے کے بعد انہیں تیزی سے ایئر پورٹ سے باہر کی طرف لے جایا جا رہا تھا بہت سا سیکیورٹی عملہ اور پولیس کا عملہ وہاں موجود تھا سب سے آخر میں لیلیٰ خالد، اس کے ساتھی اور دونوں پائلٹ جہاز سے باہر آئے تھے اور پولیس نے لیلیٰ خالد اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کرلیا تھا مسافروں میں سراسیمگی اور ہراس پھیل چکا تھا وہ خاصے پریشان نظر آرہے تھے لیکن وہاں موجود سیکیورٹی اور ایئر پورٹ کے عملے نے انہیں خاصا مطمئن کردیا تھا۔

لیکن اپنی گرفتاری سے پہلے لیلیٰ خالد نے جہاز سے باہر آتے ہی ٹی ڈبلیو اے فلائٹ 840 کے جہاز کو بم سے اڑا دیا تھا اس کے بعد اس نے گرفتاری دی تھی جہاز دھماکے کے ساتھ شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا تھا اور ذرا ہی دیر میں جل کر خاکستر ہوگیا تھا مسافروں میں کچھ عرب فیملیز بھی تھیں کہ جن کا مطالبہ تھا کہ لیلیٰ کو گرفتار نہ کیا جائے۔

"آپ ایسا کیوں چاہتی ہیں انہوں نے بین الاقوامی دہشت گردی کی ہے جہاز اغوا کیا ہے اور آپ کہتی ہیں کہ انہیں گرفتار نہ کیا جائے۔" ایک صحافی نے ایک عرب خاتون سے پوچھا جو جہاز میں موجود تھی اور لیلیٰ خالد کی گرفتاری پر احتجاج کر رہی تھی۔

"اس لیے کہ اس نے کسی کو مارا نہیں اس نے ہمارے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی۔" اس عورت نے جواب دیا۔

"لیکن جہاز اغوا کر کے خوف و ہراس تو پھیلایا ہے۔ قانون کی خلاف ورزی تو کی ہے۔" اس صحافی نے پوچھا جو حادثہ کی خبر سن کر ائر پورٹ پہنچا تھا۔

"پھر عرب اور کیا کریں۔" اس خاتون کے ساتھ موجود مرد نے کہا۔

"فلسطینیوں کو ان کی سرزمین سے زبردستی نکالا جا رہا ہے اتنے سال گزرنے کے بعد بھی ان کی کہیں شنوائی نہیں ہے تو وہ اور کیا کریں۔" اس شخص نے دوبارہ کہا جس پر صحافی نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہ دوسرے مسافر کی طرف بڑھ گیا۔

"یہ سب کیسے ہوا؟" اس نے عمر رسیدہ مسافر سے پوچھا۔

"پتا نہیں، شروع میں تو سب ٹھیک ٹھاک تھا جہاز نے کامیابی سے پرواز شروع کی تھی لیکن پھر کچھ دیر بعد اچانک وہ اپنی سیٹ سے کھڑی ہوگئی اس کے ایک ہاتھ میں گن تھی اس نے تمام لوگوں کو اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہنے کی ہدایت کی اور پھر کاک پٹ کی طرف بڑھ گئی اس عرصے میں اس نے اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک ہینڈ گرنیڈ نکال کر اس کی پن بھی نکال دی تھی اور کاک پٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی تھی یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوگیا کہ کسی کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا جب تک مسافر صورت حال سمجھتے اس کے ساتھی اپنی اپنی پوزیشن سنبھال چکے تھے انہوں نے سب کے ہاتھ سر کے پیچھے بندھوا دیے تھے۔" اس شخص نے بتایا۔

"کیا کسی مسافر کو کوئی نقصان پہنچا کوئی زخمی ہوا یا کوئی ہلاکت ہوئی۔" اس صحافی نے پوچھا۔

"نہیں کوئی ہلاکت نہیں ہوئی کوئی زخمی بھی نہیں ہوا کسی بھی مسافر کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا۔" اس نے جواب دیا۔

اس موقع پر جب لیلیٰ کو گرفتار کیا جا رہا تھا اس کی بہت سی تصویریں اتاری گئیں جو بعد میں میڈیا کے حوالے کردی گئیں اور اس واقعے کی خبر کے ساتھ ساتھ لیلیٰ خالد ساری دنیا میں شہرت پا چکی تھی ریڈیو، ٹی وی، اخبارات ہر جگہ اس کے بارے میں لکھا جا رہا تھا اور خاص طور سے دنیائے عرب اور مسلم دنیا میں وہ جدوجہد آزادی کی ایک مجاہدہ کے روپ میں سامنے آئی تھی یہ خبر کافی عرصے تک اخبارات اور میڈیا کی زینت بنی رہی پھر اس پر کتابیں بھی لکھی گئیں۔

لیلیٰ خالد اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کرنے کے بعد پولیس اسٹیشن لے جایا گیا جہاں اس سے بہت سے سوالات کیے گئے۔

"تم نے جہاز اغوا کیوں کیا؟" پولیس انسپکٹر نے اس سے پوچھا۔

"تاکہ دنیا کی توجہ فلسطین کے مسائل کی طرف کروا سکیں انہیں بتا سکیں کہ ہمارے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔" لیلیٰ خالد نے پراعتماد لہجے میں ہنس کر کہا۔

اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ اس وقت وہ دمشق میں ہے جو اسرائیلی حکومت کا حصہ بن چکا ہے۔

"تم کس تنظیم کے لیے کام کرتی ہو۔" اس سے پوچھا گیا۔

"میں کئی بار بتا چکی ہوں کہ میں پی ایف ایل پی کے لیے کام کرتی ہوں جو فلسطین میں وہاں کے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کی ایک بڑی تنظیم ہے۔" لیلیٰ نے جواب دیا۔

"تم نے ہائی جیکنگ کے لیے یہی جہاز کیوں اغوا کیا؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"یہ ہمارا پلان تھا، ہمیں کوئی نہ کوئی جہاز تو اغوا کرنا ہی تھا اس جہاز کے لیے ہمارے پاس اطلاع تھی کہ اس میں اسرائیل کا سفیر یزدگ رابن سفر کر رہا ہے ہم دراصل اسے یرغمالی بنانا چاہتے تھے لیکن بعد میں پتا چلا کہ وہ اس فلائٹ میں موجود نہیں ہے۔" لیلیٰ نے کہا۔

"اگر اسرائیلی سفیر تمہارے ہاتھ لگ جاتا تو تم کیا کرتیں۔"

"اسے اپنے ساتھ لے جاتے، اسے یرغمال بنا کر اپنے مطالبات منواتے۔" لیلیٰ نے بے پروائی سے کاندھے اچکا کر کہا اور انسپکٹر حیران رہ گیا وہ اتنی کم عمر لڑکی کی اتنی دیلرانہ باتیں سن کر حیران تھا۔

"جہاز اغوا کرنے کے دوران کسی کو نقصان بھی پہنچ سکتا تھا، تمہیں انسانی جانوں سے کھیلنے کی اجازت کس نے دی۔"

"ہمیں سختی سے احکامات تھے کہ جہاز کے کسی مسافر کے ساتھ غلط سلوک نہ کیا جائے نہ ہی کسی کو نقصان پہنچایا جائے ہم اپنے احکامات کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔" لیلیٰ نے کہا۔

پھر گرفتاری کے دوران لیلیٰ خالد اور اس کے ساتھیوں سے کئی روز تک پوچھ گچھ کی جاتی رہی اور ایک دن اس پولیس اسٹیشن کے انسپکٹر نے اسے بتایا کہ پی ایف ایل پی کے کسی اور کارکن نے ایک اور جہاز اغوا کرلیا ہے اور لیلیٰ خالد کی رہائی کا مطالبہ کردیا ہے اسے یہ خبر سن کر اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا لیکن جب جیل میں موجود ٹی وی پر اس نے یہ خبر دیکھی تو وہ حیران رہ گئی تھی واقعی پی ایف ایل پی کے ایک جیالے نے اس کی خاطر جہاز اغوا کرلیا تھا اور وہ لیلیٰ اور اس کے ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ کر رہا تھا جبکہ ذاتی طور پر لیلیٰ اس کو یا وہ لیلیٰ کو نہیں جانتے تھے لیکن ایک جہاز اغوا کرنے کے بعد لیلیٰ خالد کو راتوں رات جو شہرت ملی تھی یہ اس کی ہی وجہ تھی کہ لوگوں کی ہمدردیاں فلسطین اور اس کے مظلوم عوام کے ساتھ ہوگئی تھیں لیلیٰ نے خود یہ بھی دیکھا کہ جس جہاز کو اس نے اغوا کیا تھا اس کے ایک اسٹیورڈ نے ٹی وی پر اپنے انٹرویو کے دوران کہا۔

"یہ بڑے شرم کی بات ہے کہ فلسطینیوں کو ان کی زمین سے بے دخل کردیا گیا ہے اور انہیں جبری طور پر وہاں سے نکالا جا رہا ہے۔ اسرائیل کے اس عمل کی مذمت کرنا چاہیے۔"

اسٹیورڈ کا یہ بیان سن کر لیلیٰ بہت خوش ہوئی تھی اور اس نے سوچا تھا کہ اس کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی جب ساری دنیا کو اصل حقیقت کا علم ہوگا تو ان کی ہمدردیاں فلسطینیوں کے ساتھ ہوں گی۔

لیلیٰ اور اس کے ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ کرنے کے لیے جو جہاز اغوا کیا گیا تھا وہ کامیاب رہا اور اسرائیلی وزیراعظم نے وہ مطالبہ مانتے ہوئے لیلیٰ اور اس کے ساتھیوں کو رہا کردیا۔

ٹی ڈبلیو اے جہاز کا اغوا کامیاب رہا تھا جس کے بعد لیلیٰ خالد اور پی ایف ایل پی کو ساری دنیا کے میڈیا میں شہرت حاصل ہوگئی تھی تمام اخبارات، ویڈیو اور ٹی وی اس واقعے کی خبریں نشر کر رہے تھے۔ مڈل ایسٹ اور اسلامی ممالک میں لیلیٰ خالد ایک مشہور ہیروئن کے روپ میں ابھر کر سامنے آئی تھی نوجوان لڑکیاں اس کے لباس کی کاپی کر رہی تھیں اس کا اسکارف اس کے انداز سب کچھ نوجوان نسل میں مشہور ہو رہا تھا وہ سب کے لیے ایک آئی کون بن گئی تھی اسے مختلف ناموں اور القابات سے نوازا جا رہا تھا اسے دہشت گرد لڑکی اور مجاہد حسینہ جیسے خطابات دیے جا رہے تھے۔ اس کی ایک تصویر بہت مشہور ہوئی تھی اور پی ایف ایل پی کی جدوجہد کی سمبل بن گئی تھی اس تصویر میں اس نے ایک جیکٹ پہنی ہوئی تھی اس کے سر پر چیک دار اسکارف لپٹا ہوا تھا جو فلسطین کے جھنڈے کے رنگوں سے مماثلت رکھتا تھا اس کے ہاتھ میں اے کے 47 رائفل تھی اور اس کے ہاتھ میں پہنی ہوئی انگوٹھی اس تصویر میں نمایاں تھیں جس میں رائفل کی ایک گولی لگی ہوئی تھی اس تصویر میں اس کی آنکھیں شرم سے جھکی ہوئی تھیں اور چہرے پر بچوں جیسی مسکراہٹ تھی اگر اس کے ہاتھ میں رائفل اور انگلی میں بولٹ والی انگوٹھی نہ ہوتی تو کوئی اس تصویر کو دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس تصویر میں موجود لڑکی جہاز اغوا کرسکتی ہے۔

لیلیٰ کی یہ تصویر بین الاقوامی شہرت پا گئی ہر در و دیوار پر اس کے پوسٹر نمایاں تھے اور وہ اپنے عہد کی ایک مشہور ترین مجاہدہ بن گئی تھی۔

1969ء میں ٹی ڈبلیو اے فلائٹ کے اغوا کرنے اور پھر رہائی پانے کے بعد لیلیٰ خالد منظر سے یکدم غائب ہوگئی کافی عرصے میں اس کی بہت سی داستانیں مشہور ہوئیں اس کی شادی کی داستانیں اس کی بہن اور بہنوئی کے قتل کی داستانیں غرض جتنے منہ اتنی باتیں سننے میں آتی تھیں۔

پھر 1970ء میں لیلیٰ خالد دوبارہ منظر عام پر آئی اس بار اس نے پہلے سے بھی زیادہ بہادری سے جہاز اغوا کیا تھا لیکن دنیا نے ایک بڑی تبدیلی اس میں محسوس کی تھی اس کے چہرے کے نقوش کافی حد تک تبدیل ہوگئے تھے اس نے اپنے چہرے کی چھ بار پلاسٹک سرجری کرائی تھی۔

6 ستمبر 1970ء کو لیلیٰ خالد اور پیٹرک آرگولیو (امریکن) نے ایف آئی اے پی فلائٹ ہائی جیک کی یہ فلائٹ ایمسٹرڈیم سے نیویارک جا رہی تھی اس بار بھی وہ فلائٹ کے مسافروں میں موجود تھی لیکن پلاسٹک سرجری کی وجہ سے اسے پہچانا نہیں جاسکا تھا۔

ایمسٹرڈیم ایئرپورٹ پر جب وہ کامریڈ پیٹرک کے ساتھ مسافروں کی لائن میں ایئر فلائٹ کے کاؤنٹر سے آگے بڑھ رہی تھی تو اسرائیلی آفیسر نے انہیں روک لیا تھا انہوں نے ان کے بیگوں کی تلاشی لی تھی لیکن انہیں کچھ نہیں ملا تھا کیونکہ ہینڈ گرنیڈ (جنہیں لیلیٰ فلائٹ کے دوران استعمال کرنے والی تھی) اس کے ٹراؤزر کی جیبوں میں تھے اس کے علاوہ پی ایف ایل پی کی انتظامیہ نے ایک اور بھی احتیاط کی تھی کہ لیلیٰ اور پیٹرک کے پاسپورٹ بھی ہینڈ اوور سے حاصل کیے گئے تھے اس کا پاسپورٹ دیکھ کر تلاشی لینے والے آفیسر نے اس سے اچانک سوال کر دیا۔

"کیا تم اسپینی بول سکتی ہو؟"

"Siseaor۔" اچانک ہی لیلیٰ نے منہ سے نکالا اور یہ واحد لفظ تھا جو اسپینی زبان کا وہ جانتی تھی اس کی قسمت اچھی تھی کہ آفیسر نے اس سے اس کے بعد کوئی اور سوال نہیں کیا تھا اور وہ ایک گہری پرسکون سانس لے کر آگے بڑھ گئی تھی۔

فلائٹ روانہ ہونے کے بعد وہ کافی دیر تک اپنے ساتھی آرگیلو کے ساتھ پرسکون انداز میں اپنی سیٹ پر بیٹھی رہی تھی ارگیلو ایک نائیجرین تھا اور پی ایف ایل پی کا حصہ تھا اس آپریشن میں اسے لیلیٰ کا ساتھی بنایا گیا تھا۔

آدھی فلائٹ کے دوران خالدہ اور ارگیلو اپنی سیٹوں سے اٹھے وہ تیزی سے کاک پٹ تک گئے تھے اور آرگیلو نے کاک پٹ کے دروازے پر زور زور سے دستک دینا شروع کر دی تھی اس دوران میں لیلیٰ خالد نے اپنی جیبوں سے ہینڈ گرنیڈ نکال کر اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیے تھے اور ان دو گرنیڈ کی پنیں اپنے منہ سے کھینچ کر نکال دی تھیں ان کی کوشش تھی کہ کاک پٹ میں داخل ہو کر پائلٹ کو دھمکی دے کر بے بس کر دیا جائے اور پھر جہاز کو اغوا کر کے مطلوبہ مقام تک لے جایا جائے۔

"دروازہ کھولو۔" لیلیٰ نے چیخ کر پائلٹ سے کہا۔ لیکن اس بار کاک پٹ کا دروازہ پہلی ہائی جیک کی طرح نہیں کھلا تھا جہازوں کا عملہ پہلی ہائی جیکنگ کے بعد محتاط ہوگیا تھا پائلٹ کو سختی سے ہدایات تھیں کہ کاک پٹ کسی کے کہنے پر نہ کھولا جائے اس کے علاوہ جہاز میں مسلح گارڈ بھی موجود تھے جیسے ہی لیلیٰ اور اس کے ساتھی نے کاک پٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا ان مسلح گارڈ نے فائرنگ شروع کر دی تھی اور نشانہ لیلیٰ خالد کا ساتھی آرگیلو اور لیلیٰ ہی تھے آرگیلو نے لیلیٰ کے سامنے آ کر اسے بچانے کی کوشش کی تھی گولیاں آرگیلو کی پشت میں لگی تھیں اور وہ نیچے گر گیا تھا اس کے گرنے کے ساتھ ہی ایک گولی لیلیٰ کے شانے میں لگی تھی اور وہ اندھیروں میں ڈوبتی چلی گئی تھی۔

گرتے گرتے اسے محسوس ہوا تھا جیسے کوئی چیز بہت زور سے اس کے سر لگی ہو۔

کچھ دیر بعد جب اسے ہوش آیا تو وہ زخمی تھی اور زمین پر پڑی ہوئی تھی اور مسلح گارڈ اسے ٹھوکریں مار رہے تھے مسافر چیخ رہے تھے۔

"تم لوگ خون بہانا بند کرو آخر یہ کب تک چلتا رہے گا۔" لیلیٰ کو جہاز کی ایک مسافر عورت کی آواز سنائی دی۔

لوگ بری طرح چیخ رہے تھے کچھ خواتین اور بچے رو بھی رہے تھے جہاز کو ہنگامی طور پر لندن کے ہیتھرو ائرپورٹ پر اتار لیا گیا تھا اور لیلیٰ کو Faling پولیس اسٹیشن لے جایا۔ گیا تھا جہاں اسے بتایا گیا کہ اس کا ساتھی اس حادثے میں ہلاک ہوگیا ہے۔

"اوہ، میرے خدا وہ بہت مہربان اور اچھا تھا۔" لیلیٰ نے بے ساختہ کراہتے ہوئے کہا۔

"ہوں...... اچھا تھا اس لیے اس نے تمہارے ساتھ مل کر جہاز اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا۔" پولیس انسپکٹر نے اس سے کہا۔

"وہ ہماری ڈیوٹی تھی۔" لیلیٰ نے بے پروائی سے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"اور اگر تمہارے ہاتھوں میں موجود گرنیڈ پھٹ جائے تو کتنے لوگ جان سے جاتے کتنے لوگ زخمی ہوتے کیا یہ انسانیت ہے۔" انسپکٹر نے چیختے ہوئے کہا۔

"ہمیں سختی سے ہدایت تھی کہ جہاز کے مسافروں کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے اور ہم ان ہدایات پر عمل کرنے کے پابند ہیں۔" لیلیٰ نے کہا۔

"اور اگر بم پھٹ جاتا۔"

"تو مجھے افسوس ہوتا کیونکہ میرا مقصد صرف دھمکانا تھا کسی کو مارنا یا زخمی کرنا نہیں۔"

"آخر تمہارا مقصد کیا ہے؟"

"صرف اور صرف یہ کہ فلسطین کے لوگوں کو ان کی سرزمین پر آزادی سے رہنے کا حق دیا جائے۔" لیلیٰ نے کہا۔

لیلیٰ کو جیل بھیج دیا گیا جہاں وہ اٹھائیس دن قید میں رہی وہاں اس پر دو خواتین جیلرز کی ڈیوٹی لگائی گئی تھی جو باری باری اس کے سیل کے باہر ڈیوٹی دیتی تھیں لیلیٰ نے آہستہ آہستہ ان سے تعلقات استوار کرنا شروع کر دیے۔

"سنو، تمہارا نام کیا ہے؟" لیلیٰ نے ایک سے پوچھا اس کی ڈیوٹی زیادہ تر صبح کے اوقات میں ہوتی تھی۔

"ماریہ۔" اس نے جواب دیا۔

"تم یہاں کب سے ہو؟"

"میں تقریباً دو سال سے یہاں ملازم ہوں۔" ماریہ نے جواب دیا۔

"تم نے یہ نوکری کیوں کی، یہاں تو تم خود بھی قیدیوں والی زندگی گزار رہی ہو؟" لیلیٰ نے دوستانہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں ایک طرح سے تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔" ماریہ نے کہا۔

"یہ ملازمت میری مجبوری تھی میرے بچے چھوٹے ہیں اور گھر چلانے والا کوئی نہیں مجھے یہ نوکری آسانی سے مل گئی چنانچہ میں نے کر لی۔" ماریہ نے کہا۔

"خوب۔" لیلیٰ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم بتاؤ تم تو لڑکی ہو، یہ جہاز اغوا کرنا...... یہ تم نے کیوں شروع کیا؟ کیا اس کام کے بہت پیسے ملتے ہیں؟" ماریہ نے پوچھا۔

"نہیں ہمیں اس کام کے پیسے نہیں ملتے میں پی ایف ایل پی کی ممبر ہوں اور یہ کام میری ڈیوٹی میں شامل تھا۔" لیلیٰ نے جواب دیا۔

"پی ایف ایل پی کیا ہے؟" ماریہ نے پوچھا۔

"یہ فلسطینی عوام کی جدوجہد آزادی کی ایک تنظیم ہے جس کا مقصد دنیا کو یہ بتانا ہے کہ فلسطینی عوام کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے اور دنیا ہماری جدوجہد آزادی میں ہمارا ساتھ دے۔" لیلیٰ نے اسے مختصراً بتایا۔

"ہوں۔" ماریہ نے کہا۔

"کیا جہاز اغوا کرنے سے کوئی فائدہ ہوا؟" ماریہ نے پوچھا۔

"اتنا تو ہوا کہ لوگوں کو اصل مسئلے کا علم ہوا ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات میں جہاز کی ہائی جیکنگ کی خبر کے ساتھ یہ خبر بھی شائع ہوئی کہ یہ ہائی جیکنگ کیوں کی جا رہی ہے اور کون کر رہا ہے۔" لیلیٰ نے بتایا۔

"تمہیں اس سے کیا فائدہ ہوگا؟" ماریہ نے پوچھا۔

"یہ فائدہ کم ہے کہ میں دنیا کی توجہ فلسطین کی طرف کروانے میں کامیاب ہوگئی ہوں۔" لیلیٰ نے کہا۔

"فلسطین کا فائدہ میرا فائدہ ہے اور فلسطین کی آزادی میری آزادی ہے اور آزادی کا مطلب ہے کہ میں حفیہ جاسکوں گی اپنے گھر اپنے باغات میں جہاں میرا بچپن گزرا۔" لیلیٰ نے کہا۔

"تم حیفہ کی رہنے والی ہو؟" ماریہ نے ہمدرد لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔" لیلیٰ نے مختصر سا جواب دیا۔

"وہاں تو اسرائیلیوں نے بہت ظلم کیے ہیں میری ایک دوست وہاں رہتی ہے اس سے مجھے وہاں کی خبریں ملتی رہتی ہیں۔"

"تم کہو کیا میں نے جو کیا وہ غلط کیا۔" لیلیٰ نے کہا۔

"میں نہیں مانتی۔" ماریہ نے جواب دیا اور اس کے پاس سے ہٹ گئی تھی اسے لیلیٰ سے ہمدردی تو ہوگئی تھی لیکن اس کی سرکاری ذمہ داریوں کی وجہ سے وہ اس کی تائید نہیں کرسکتی تھی۔

چند دنوں میں لیلیٰ خالد کی دوستی رات میں ڈیوٹی پر آنے

والی ملازمہ سے بھی ہوگئی۔

''تمہیں پتا ہے میں فلسطین پر ایک کتاب لکھوں گی۔'' ایک روز لیلیٰ نے رات والی ملازمہ کو بتایا جس کا نام مارتھا تھا۔

''اچھا اس سے کیا ہوگا؟'' مارتھا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''اس سے بھی دنیا کو آگاہی ملے گی کہ فلسطین میں مسلمانوں کے اوپر کیسے ظلم ہو رہے ہیں۔'' لیلیٰ نے کہا۔

''خوف تم مجھے بھی اس کتاب کی ایک کاپی بھیجنا میں پڑھوں گی کہ تم کیا لکھو گی۔'' مارتھا نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں بھیجوں گی۔'' لیلیٰ نے وعدہ کرلیا۔

''تم نے اپنی انگلی میں یہ کیسی عجیب سی انگوٹھی پہنی ہوئی ہے۔'' مارتھا نے اس کے ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں، اس میں کیا عجیب ہے؟'' لیلیٰ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی بھی عورت اپنی انگوٹھی میں بندوق کی گولی نہیں لگا سکتی۔ انگوٹھی تو عورت کا زیور ہوتا ہے جو وہ سجاوٹ کے لیے پہنتی ہے کوئی ہتھیار تھوڑی ہوتا ہے جو اس میں گولی لگائی جائے۔'' مارتھا نے کہا۔

''ہاں تم ایسا سوچتی ہو لیکن میری زندگی میں میک اپ، زیور، فیشن، محبت نام کی کوئی چیز نہیں، میرا اپنی ذات کے لیے کوئی شوق نہیں میں مجاہدہ ہوں...... اسلام کی مجاہد...... فلسطین کی مجاہدہ۔'' لیلیٰ نے پرجوش انداز میں کہا۔

''یہ تم نے کہاں سے خریدی؟'' مارتھا نے پوچھا۔

''یہ میں نے خریدی نہیں ہے بلکہ میں نے خود بنائی ہے۔'' لیلیٰ نے کہا۔

''تم نے...... وہ کیسے؟''

''جب میں نے پی ایف ایل پی میں اپنی ٹریننگ کے پہلے روز ہینڈ گرنیڈ کا استعمال کیا تو اس میں سے جو رنگ نکلا وہی میں نے ایبولٹ کے گرد لپیٹ لیا اور انگوٹھی بن گئی تب سے میں یہی پہنے ہوئے ہوں۔'' لیلیٰ نے بتایا اور مارتھا حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''میں نے جب گرفتاری کے بعد تمہیں پہلی بار دیکھا تو میں حیران رہ گئی تھی تم پولیس اسٹیشن میں ایک بینچ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں حیرت سے سوچ رہی تھی کہ یہ تو ایک دبلی پتلی، معصوم، خوب صورت سی کم عمر لڑکی ہے یہ دہشت گرد نہیں ہوسکتی۔'' مارتھا نے کہا اور لیلیٰ اداسی سے مسکرائی۔

''میں دہشت گرد نہیں ہوں۔'' اس نے پرسکون انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں مجاہدہ ہوں، میں اپنے وطن کے لیے جدوجہد کر رہی ہوں، بتاؤ اگر تمہارے وطن پر کوئی قبضہ کرلے اور تمہیں زبردستی وہاں سے نکالنے کے درپہ ہوجائے تو تم کیا کروگی کیا تم اسے احساس نہیں دلاؤ گی کہ وہ ظلم ہو رہا ہے۔'' لیلیٰ نے پوچھا تو مارتھا نے بے پروائی سے کاندھے اچکا دیے۔

پھر اس رات لیلیٰ کو بتایا گیا کہ پی ایف ایل پی کی طرف سے اس کی رہائی کی کوششیں تیز کردی گئی ہیں اور ٹی وی اور ریڈیو سے پی ایف ایل پی کی طرف سے اعلانات کیے جارہے ہیں کہ لیلیٰ خالد کو رہا کیا جائے۔

''شاید تم رہا ہو جاؤ۔'' مارتھا نے اس سے کہا۔

''ہاں ہوسکتا ہے اگر تم رہا ہوگئیں تو کیا کرو گی؟'' مارتھا نے پوچھا۔

''میں...... اور زیادہ ہوشیاری کے ساتھ جہاز اغوا کرنے کی کوشش کروں گی۔ تاکہ پکڑی نہ جاؤں۔'' لیلیٰ نے ہنستے ہوئے کہا اور مارتھا اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

''ہاں کامیابی حاصل کرنے کے لیے یہی عزم چاہیے ہمیں تھک کر بیٹھنا نہیں ہے نہ ہی کسی رکاوٹ کے راستے میں آنے سے اپنا سفر بدلنا ہے ہمیں آگے بڑھتے رہنا ہے تمام رکاوٹوں اور مشکلات سے نمٹتے ہوئے۔'' لیلیٰ نے کہا۔

چند روز بعد لیلیٰ خالد کو جیل سے لندن کے پولیس اسٹیشن لے جایا گیا جہاں اسے پتا چلا کہ پی ایف ایل پی کی طرف سے ایک تحریری مطالبہ برطانوی وزیر اعظم کو پیش کیا گیا ہے جس میں مغربی یرغمالیوں کے بدلے میں لیلیٰ خالد کی رہائی کے لیے کہا گیا ہے اس کام میں تیزی تب آئی جب لیلیٰ خالد کے ایک ساتھی نے جو فلسطینی کرسچن تھا ایک جہاز اغوا کرلیا تھا اور بدلے میں اس کی رہائی کا مطالبہ کردیا تھا لیلیٰ خالد حیران تھی وہ اسے نہیں جانتی تھی لیکن اس شخص نے لیلیٰ کی مدد کی تھی اسے بتایا گیا کہ وہ شخص نہتا تھا اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا لیکن اس نے دھماکا کرنے والی ڈیوائس اپنے جسم کے ساتھ لگایا ہوا تھا اور اس نے لیلیٰ کی رہائی کا مطالبہ کیا تھا۔ لیلیٰ نے راتوں رات جو شہرت پائی تھی یہ اس کا نتیجہ تھا کہ ایک اجنبی اس کی مدد کر رہا تھا پھر برطانوی وزیر اعظم کو یہ مطالبہ ماننا پڑا کیونکہ بہت سے برطانوی بھی پی ایف ایل پی کی تحویل میں تھے جنہیں وہ لیلیٰ کے بدلے چھوڑنے کے لیے تیار تھے۔

یوں لیلیٰ دوسری بار بھی آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

جہاز اغوا کرنے کے بعد لیلیٰ خالد مختلف علاقوں میں گھومتی رہی لبنان، شام اور جورڈن وہ ہر کچھ عرصے بعد اپنا ٹھکانہ بدل دیتی تھی پھر اس نے ایک عرب فزیشن سے شادی کرلی جس سے اس کے دو بیٹے ہوئے اور اب وہ جورڈن میں اپنے شوہر اور بیٹوں کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے اس کی مستقل رہائش جورڈن ہی میں ہے اور اسے آج بھی فلسطین میں واقع حیفہ میں اپنے گھر جانے کی اجازت نہیں۔

وہ اکثر فلسطین کی صورت حال پر ہونے والی مختلف کانفرنسوں میں شرکت کرتی رہتی ہے اور آج بھی ایک فعال کارکن ہے حال ہی میں ایک مشہور فلسطینی صحافی Viner Kathanine نے اس کا انٹرویو لیا جس نے میڈیا پر بڑی پذیرائی حاصل کی لیلیٰ اسٹوڈیو میں اپنے روایتی چیک دار اسکارف کے ساتھ موجود تھی گو اب اس کی عمر خاصی ڈھل چکی ہے لیکن اس کے چہرے سے عزم و حوصلہ اب بھی نمایاں ہے۔

''ماضی میں آپ نے جو کچھ کیا اس نے آپ کی زندگی کو آپ کے لیے مشکل بنا دیا آپ نے اپنے لیے اتنا مشکل راستہ کیوں چنا؟'' کیتھرین نے پوچھا۔

''میں سمجھتی ہوں کہ میرے لیے دو ہی راستے تھے یا تو میں دوسرے لوگوں کی طرح لائن لگا کر قیدیوں کی طرح اپنے لیے راشن کارڈ اور کمبل حاصل کرتی اور یا کلاشنکوف لے کر اپنا حق چھین لیتی میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔'' لیلیٰ نے کہا۔

''آپ نے بہت چھوٹی عمر میں فلسطین کی جدوجہد آزادی میں حصہ لیا آپ نے دو جہاز بھی اغوا کیے کیا آزادی کی جدوجہد کے لیے جہاز اغوا کرنا ضروری تھا؟''

''جہاز اغوا کرنے کا مقصد کسی کو نقصان پہنچانا نہیں تھا بلکہ دنیا کو گھنٹی بجا کر جگانا تھا کہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہوں اور سوچنے پر مجبور ہوں کہ فلسطین میں مسلمانوں کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے اور واقعی ایسا ہی ہوا جب میں نے پہلا جہاز اغوا کیا تو اس کے اسٹیورڈس نے کیمرے کے سامنے آکر کہا کہ یہ بہت شرمناک ہے کہ فلسطینیوں سے ان کا ملک چھین لیا گیا ہے۔''

''لیکن زیادہ تر لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ دہشت گردی تھی کہ جہاز اغوا کیے جائیں اور لوگوں کو یرغمال بنایا جائے۔''

''نہیں میں اس کی مخالفت کرتی ہوں کیا مسلمانوں کو زبردستی فلسطین سے نکال دینا دہشت گردی نہیں، میں نے جو جہاز اغوا کیے اس میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ کوئی مسافر زخمی نہ ہو کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔''

''آپ فلسطین کے لیے اس لیے لڑیں کہ وہاں سے آپ کی دیریا وابستگی تھی؟''

''نہیں ایسا نہیں ہے میرے والدین فلسطینی نہیں تھے وہ لبنانی تھے میں فلسطین کے لیے صرف اس لیے لڑی کہ یہ انصاف کا تقاضہ تھا اور فلسطین سے میری محبت تھی جس نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا بالکل اسی طرح جس طرح غسان کنفانی نے کیا اس نے ایک اور حریت پسند کی مثال دی اس نے بھی بچپن ہی سے صورت حال کا سمجھ لیا تھا اور ہتھیار ڈالنے سے انکار کردیا تھا۔''

''آج کل آپ انقرہ اور استنبول میں ہونے والی کانفرنسوں اور سیمینار میں شرکت کر رہی ہیں آپ کیا سمجھتی ہیں کیا وقت کے ساتھ ساتھ آپ کی جدوجہد کے لیے حالات سازگار ہوئے ہیں۔'' کیتھرین نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ ابھی تک تو نہیں، لوگوں نے اپنے چہروں پر مصلحت کی چادر ڈال رکھی ہے۔ بہت سے ممالک ہیں جو کھل کر اسرائیل کی مخالفت نہیں کرنا چاہتے لیکن میرا پھر بھی یہی کہنا ہے کہ اس مقصد کے لیے جن لوگوں نے قربانیاں دی ہیں وہ رائیگاں نہیں جائیں گی اور فلسطینیوں کا حق ہے جو بھی جدوجہد اور اپنے بچاؤ کے ذریعے وہ استعمال کرسکتے ہیں وہ کریں چاہے انہیں ہتھیار ہی کیوں نہ اٹھانے پڑیں۔'' لیلیٰ خالد نے جواب دیا پھر وہ کیتھرین سے جدا ہوگئی تھی۔ اسے کسی اور کانفرنس میں شرکت کرنا تھی۔

اس انٹرویو کے کچھ عرصہ بعد لیلیٰ خالد کو مشہور فلمساز Lina makbol کی کال آئی۔

''میں لینا مقبول بول رہی ہوں۔''

''جی میں سن رہی ہوں۔'' لیلیٰ خالد نے کہا وہ اس وقت بہت اچھے موڈ میں تھی۔

''میں فلمساز ہوں۔''

''میں جانتی ہوں۔'' لیلیٰ نے برجستگی سے جواب دیا۔

"میں آپ پر فلم بنانا چاہتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"مجھ پر وہ کیوں......؟" لیلیٰ نے پوچھا۔

"آپ فلسطین کی جدوجہد میں ایک اہم کردار ہیں میں دنیا کو دکھانا چاہتی ہوں کہ آپ نے 1969ء سے اب تک کس طرح فلسطین کے لیے کام کیا۔"

"ہوں، ٹھیک ہے۔" لیلیٰ نے کہا۔ "آپ جب چاہیں آسکتی ہیں آنے سے پہلے مجھے فون ضرور کر دیجیے گا۔"

"ٹھیک ہے، میں جلد ہی حاضر ہوں گی۔" لینا مقبول نے کہا۔

پھر چند دن بعد ہی وہ فون کرنے کے بعد لیلیٰ سے ملنے گئی تھی وہ عمان کے ایک اپارٹمنٹ میں رہتی تھی اس کے یہاں کوئی ملازمہ نہیں تھی اور وہ اس عمر میں بھی اپنا سارا کام خود کرتی تھی۔ جب لینا مقبول اس سے ملنے پہنچی تو سارے اپارٹمنٹ میں بہترین کھانے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ لیلیٰ اپارٹمنٹ کی صفائی کر رہی تھی اور ڈرائنگ روم میں رکھے ہوئے صوفوں کی سیٹنگ بدلنے میں مصروف تھی۔ لینا مقبول کو دیکھ کر وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھی اور تپاک سے اس سے مصافحہ کیا پھر اسے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتی ہوئی ایک بڑا صوفہ کھسکانے لگی تو لینا مقبول اس کی مدد کرنے کے لیے آگے بڑھی۔

"ارے...... آپ اکیلے کیسے کریں گی۔ لائیں میں آپ کی مدد کروں۔"

"نہیں، آپ بیٹھیں میں کرلوں گی میں اس طرح کام کرنے کی عادی ہوں۔" لیلیٰ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں نے خود کو آرام کا عادی نہیں بنایا میں ہمیشہ سے سارے کام اپنے ہاتھوں سے کرتی ہوں۔" لیلیٰ نے صوفے کو درست پوزیشن میں رکھتے ہوئے کہا اس نے سرمئی کلر کا ٹراوزر اور ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی بال کاندھوں سے اونچے کیے ہوئے تھے اور وہ ستر سال کی عمر میں بھی چاق و چوبند نظر آ رہی تھی چہرے سے اس کی عمر تقریباً دس سال کم محسوس ہو رہی تھی۔

"مجھے فلم بنانے کا خیال کیسے آ گیا؟" لیلیٰ نے مسکراتے ہوئے لینا مقبول سے پوچھا۔

"آپ نے پچھلے دنوں ترکی میں فلسطین کے لیے ہونے والے سیمینار میں شرکت کی تھی۔ آپ اب بھی فلسطینیوں کی جدوجہد کی ایک رکن سمجھی جاتی ہیں اور اس حوالے سے مختلف پروگراموں میں شرکت کرتی رہتی ہیں ہمارے پاس آپ کی 1969ء اور 1970ء سے اب تک کی کئی ویڈیوز موجود ہیں مجھے خیال آیا کہ ان تمام معلوات اور ویڈیوز کو جمع کروں اور اب آپ کی موجودہ زندگی کے بارے میں بھی معلومات حاصل کر کے اور تمام چیزوں کو یکجا کر کے ایک فلم بنائی جائے تاکہ تاریخ میں ریکارڈ رہے کہ آپ نے کس طرح فلسطین کی آزادی کے لیے کام کیا۔"

لینا مقبول نے کہا اس کی نظریں لیلیٰ کے ڈرائنگ روم میں لگی اس کی مشہور زمانہ تصویر لگی ہوئی تھی جو 1970ء کے بعد سے بہت مشہور ہوئی تھی اور اس تصویر کی بدولت لیلیٰ ساری دنیا میں پہچانی جانے لگی تھی اس تصویر میں اس نے ایک ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی جو مردانہ ڈیزائن کی تھی اس نے سر اور کاندھوں پر فلسطینی پرچم کے رنگوں سے بنا چیک دار اسکارف لپیٹا ہوا تھا اس کے ہاتھ میں رائفل تھی جسے اس نے مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ کی درمیانی انگلی میں بڑی انگوٹھی میں رائفل کی بولٹ نمایاں تھی، لیلیٰ کی نظریں نیچے جھکی ہوئی تھیں چہرے پر معصومیت تھی اگر اس کے ہاتھ میں رائفل نہ ہوتی اور اس نے فلسطینی مجاہدہ کی وردی نہ پہنی ہوتی تو اس کی تصویر کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہ لڑکی ہے جس نے 69-70 میں یہود کے دل دہلا کر دکھ دیے تھے اور ساری دنیا کے سامنے فلسطین کی جدوجہد آزادی کی علامت بن کر ابھری تھی۔

"ایک زمانے میں آپ کو "خوب صورت حسینہ" "دہشت گرد لڑکی" خطرناک خوب صورتی" جیسے القابات سے نوازا گیا۔" لینا مقبول نے کہا۔

"ہاں۔ وہ وقت تھا جب میں سب کے لیے موضوع بحث بنی ہوئی تھی اس وقت لوگوں نے میرے بارے میں عجیب عجیب طرح کے کمنٹس دیے تھے۔" لیلیٰ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ نے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری بھی کرائی تھیں حالانکہ آپ پہلے ہی خوب صورت تھیں؟"

"ہاں یہ پلاسٹک سرجری میں اپنی شناخت چھپانے کے لیے کرائی تھی تاکہ پکڑی نہ جاؤں اور آسانی سے اپنا کام کرتی رہوں۔ دراصل میرے شبے میں میری بہن اور بہنوئی کو قتل کر دیا گیا تھا۔ لیلیٰ نے افسردگی سے کہا۔

"میری بہن میری ہمشکل تھی میری بھی ان دنوں پسند کی شادی ہوئی تھی لیکن جہازوں کے اغوا کی وجہ سے میرے پیچھے بہت سے اسرائیلی دشمن لگے ہوئے تھے پھر کسی کو میری بہن پر میرا شبہ ہوا اور اس نے میری بہن اور بہنوئی کو قتل کر دیا تب مجھے

پی ایف ایل پی کی طرف سے ہدایات دی گئیں کہ میں روپوشی ہو جاؤں پھر میں نے اپنی روپوش کے دوران ہی یہ فیصلہ کیا کہ اس طرح چھپ کر بیٹھنا تو بزدلی ہے میں کب تک چھپی رہوں گی اس طرح میں پی ایف ایل ایف میں اپنے فرائض بھی انجام نہیں دے سکوں گی چنانچہ میں نے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کرانے کا فیصلہ کیا۔"

"میں نے سنا ہے کہ سرجری آپ نے کئی بار کرائی۔" لینا مقبول نے پوچھا۔

"ہاں ڈاکٹر نے میری ناک اور تھوڑی میں تبدیلیاں کیں جو کامیاب رہیں اس کے لیے مجھے چھ آپریشن کرانا پڑے پھر مجھے کوئی بھی پہچان نہیں سکتا تھا۔" لیلیٰ نے بتایا۔

"میں نے آپ کی آپ کی سرگزشت پڑھی ہے، My People Have To Live اس میں آپ نے لکھا ہے کہ سرجری کے دوران آپ نے خود کو بے ہوش کرانا پسند نہیں کیا تھا۔"

"ہاں یہ درست ہے میں کھلی آنکھوں سے سب دیکھنا چاہتی تھی کہ میری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے یا نہیں۔"

"اب تو آپ عملی طور پر جدوجہد میں حصہ نہیں لے رہی ہیں لیکن فلسطین پر ہونے والی کانفرنسوں میں اب بھی شرکت کرتی ہیں؟"

"ہاں، جیسا کہ میں نے اپنی سرگزشت میں لکھا ہے۔ میرے سامنے ایک بڑا اور اعلیٰ مقصد تھا اپنی ذات سے زیادہ جس میں تمام ذاتی مقاصد اور معاملات بے معنی ہو جاتے ہیں اور اب بھی وہی مقصد میرے سامنے ہے اور شاید مرتے دم تک رہے گا یا اس وقت تک جب تک فلسطین کو آزادی نہیں مل جاتی۔"

"ایک عورت کی حیثیت سے اس جدوجہد میں حصہ لینے پر کن مشکلات کا سامنا کیا؟"

"ہمارے یہاں عورتوں کے لیے صرف یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ گھر میں رہ کر گھریلو ذمہ داریاں ادا کرے لیکن میں نے ایک فائٹر کی طرح لڑتے ہوئے مردوں کے شانہ بشانہ کام کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہی کہ ہم بھی مردوں کے ساتھ ساتھ اس جدوجہد میں شامل ہیں اسی لیے ہمیں ان کی طرح نظر آنا پڑتا ہے ہمارے لباس، ہمارا اٹھنا بیٹھنا، ہماری بول چال ہم اپنی ظاہری حالت ان جیسی بنا لیتے ہیں اور اس کے ہمیں نقصان بھی ہوتے ہیں۔"

"مثلاً کیا نقصانات۔"

Robin Morgass نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

"مصیبتوں کو پیار کرنے والی اور دہشت کی علمبردار لیلیٰ خالد نے دو طرح کے نقصان اٹھائے ایک تو یہ کہ اسے لوگوں کی توجہ حاصل ہوتی تھی وہ بہت مشہور ہو گئی تھی جس سے اس کی آرگنائزیشن کے مرد اس سے ملتے تھے اور عورتوں کو اس سے شکایت تھی کہ اس نے ہمیشہ انقلاب کی بات کی عورتوں کے حقوق کی بات نہیں کی۔" لیلیٰ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لوگ یہ کیوں نہیں سمجھتے میں فلسطینیوں کی نمائندگی کرتی ہوں عورتوں کی نہیں۔"

"آپ کیا سمجھتی ہیں کیا عورت بہتر فائٹر ہو سکتی ہے؟" لینا مقبول نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے یہ ضروری نہیں کہ ہم یہ ثابت کریں کہ ہم عورت ہیں میں جانتی ہوں کہ عورت ایک فائٹر ہو سکتی ہے ایک آزاد جدوجہد کی فائٹر اور ایک سیاسی شخصیت بھی ہو سکتی ہے اور اگر وہ محبت کر بیٹھے یا اس سے کوئی محبت کرنے لگے تو وہ شادی بھی کر سکتی ہے بچے بھی پیدا کر سکتی ہے اور ماں بن کے اپنی ذمہ داری بھی پوری کر سکتی ہے جیسے کہ میں نے فائٹنگ کے دوران تیس سال کی عمر میں شادی کی میرے دو بچے ہیں اور اب میں اپنی سیاسی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ایک ماں کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں پوری کر رہی ہوں۔"

"آپ عورت پہلے ہیں یا فلسطینی؟"

"اس سے کوئی فرق پڑتا میں عورت ہونے کے ساتھ ساتھ فلسطینی بھی ہوں۔"

"ایک سوال میرے ذہن میں اکثر گونجتا رہا میں نے سنا ہے کہ 1970ء میں جب آپ برطانیہ کے پولیس اسٹیشن میں تھیں اور آپ کے ایک ساتھی مروان نے آپ کو رہا کرانے کے لیے جہاز اغوا کیا تو وہ نہتا تھا اس نے پھر بھی اپنی بات منوالی تھی اور آپ کو رہا کرا لیا تھا۔" لینا مقبول نے پوچھا۔

"وہ......" لیلیٰ خالد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہ ان معنوں میں نہتا تھا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں تھا لیکن اس نے اپنے جسم پر تیراکی کا لباس پہنا ہوا تھا اور اس کا الاسٹک کھینچ لیا تھا جس سے اس کے جسم میں ابھار پیدا ہو گیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ اس نے خودکش مواد اپنے جسم کے ساتھ باندھا ہوا ہے جسے وہ اڑا دے گا۔" لیلیٰ نے ہنستے

ہوئے کہا۔
"آج کل فلسطین میں امن قائم کرنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں کیا آپ ان سے مطمئن ہیں؟"
"امن قائم کرنے کا جو عمل چل رہا ہے وہ عربوں کے حق میں نہیں ہے وہ اسرائیلیوں کے حق میں ہے میں اب فلسطینی قومی کونسل کی ممبر بن گئی ہوں اور سیاسی جدوجہد میں شامل ہو گئی ہوں۔" لیلیٰ نے کہا اسی وقت ڈرائنگ روم میں ایک عمر رسیدہ مگر توانا شخص داخل ہوا جس کے ساتھ دو نوجوان بھی تھے جو خاصے اسمارٹ اور خوب صورت تھے۔
"ان سے ملو یہ میرے شوہر فیاض رشید ہلال ہیں یہ ایک فزیشن ہیں اور یہ میرے دونوں بیٹے بشر اور بدر ہیں تمہیں پتا ہے میرے بیٹے ہی میرے باڈی گارڈز کی ذمہ داریاں بھی سنبھالتے ہیں۔" لیلیٰ نے فخر سے کہا۔
"میں اپنی فلم کی تکمیل کے لیے آپ کے بچپن کے کچھ حصے بھی حیفہ میں فلمانا چاہتی ہوں اس سلسلے میں میں حیفہ جانا چاہتی ہوں کیا آپ اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہتی ہیں یا وہاں کے لوگوں کو کوئی پیغام دینا چاہتی ہیں۔"
"میرے والد میرے ساتھ نہیں آ سکے تھے، وہ فلسطین کی آزادی کی جنگ حیفہ میں رہ کر لڑنا چاہتے تھے لیکن انہیں فتح نصیب نہیں ہوئی اور دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی وہاں مارے گئے مجھے حیفہ کے لوگوں سے صرف یہ کہنا ہے کہ وہ مایوس نہ ہوں ہمیں ایک نہ ایک دن ہماری منزل ضرور ملے گی میرے دل میں شدید خواہش ہے کہ میں حیفہ میں ایک بار اپنے گھر ضرور جاؤں اس کے در و دیوار دیکھوں، وہاں میرے بچپن کی یادیں ہیں۔" لیلیٰ نے کہا اس کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئی تھیں۔
"میں آپ کا پیغام وہاں کے لوگوں تک ضرور پہنچاؤں گی۔" لینا مقبول نے اٹھتے ہوئے کہا۔
"ہماری والدہ بہت بہادر ہیں انہوں نے ہمارے تربیت بھی اسی انداز میں کی ہے اور ہم دونوں بھائی بھی اسی تنظیم کا حصہ ہیں اور خدمات انجام دے رہے ہیں۔" بدر نے کہا جو لیلیٰ کا بڑا بیٹا ہے۔
"میں جب واپس آؤں گی تو ایک بار پھر آپ سے ملنے آؤں گی اور حیفہ کا آنکھوں دیکھا حال آپ کو بتاؤں گی۔" لینا مقبول نے لیلیٰ سے کہا جو اسے اپنے شوہر اور بیٹوں کے ساتھ دروازے تک رخصت کرنے آئی تھی۔

پھر اپنے وعدے کے مطابق لینا مقبول کچھ عرصے بعد دوبارہ لیلیٰ خالد سے ملنے آئی تھی اس موقع پر لیلیٰ کا شوہر فیاض رشید ہلال اور اس کے بیٹے بدر اور بشر بھی موجود تھے۔
"میں اپنے وعدے کے مطابق آ گئی ہوں۔" لینا نے کہا۔
"میں حیفہ میں بہت سے لوگوں سے ملی ہوں وہاں اب بھی ان میں وہی جذبہ پایا جاتا ہے جو پہلے تھا آج بھی وہ جدوجہد آزادی جاری رکھے ہوئے ہیں وہاں کے بچے بچے کی نس نس میں آزادی سے محبت سمائی ہوئی ہے۔" لینا مقبول نے کہا۔
"میں جانتی ہوں فلسطین کی جدوجہد آزادی کے کئی چہرے ہیں امن کے مذاکرات بھی چلتے رہیں گے اور مسلح جدوجہد بھی غرض جب تک ہمارے ملک پر قبضہ رہے گا تب تک یہ جدوجہد جاری رہے گی تمہیں پتا ہے اب یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ فلسطینیوں کو بھی اسرائیل کے مقابلے میں ایک ریاست قائم کرنے کی اجازت ہونا چاہیے جس کا ایک دار الحکومت ہو اسرائیل نے 67ء سے فلسطین کی سرزمین پر قبضہ کیا ہوا ہے اور انہیں چاہیے کہ اسے چھوڑ کر جائیں اور پناہ گزینوں کو ان کے علاقوں میں جانے دیں اگر ایسا نہیں ہوتا تو ہماری جدوجہد جاری رہے گی۔"
"ہاں مجھے اندازہ ہے۔" لینا مقبول نے کہا۔
"جب میں حیفہ کے گلی کوچوں سے گزر رہی تھی تو میں نے دیکھا کہ جگہ جگہ دیواروں پر لیلیٰ خالد کا نام لکھا ہے آزادی کے نعرے لکھے ہیں اور بچے بچے کی زبان پر آزادی کا نعرہ ہے وہ گلیوں میں کھیلتے ہوئے بھی اجنبیوں کو دیکھ کر وکٹری کا نشان بناتے ہیں۔
"We Wil Win" ان کی زبان پر یہی نعرہ ہوتا ہے۔
"بعض لوگ آپ کو اب بھی جدوجہد آزادی کی ہیروئن سمجھتے ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ آپ دہشت گرد ہیں۔" لینا مقبول نے کہا۔
"میں جب یہ الزام سنتی ہوں تو ایک اور سوال کرتی ہوں۔" لیلیٰ نے کہا اور کچھ لمحے خلاؤں میں گھورتی رہی اس کے بیٹے اور شوہر اسے مستحسن نظروں سے دیکھ رہے تھے۔
یا ہمارے علاقے میں دہشت گردی کس نے پھیلائی ہماری زمینوں پر قبضہ کن لوگوں نے کیا؟ ہمیں ہمارے گھروں سے زبردستی نکلنے پر کس نے مجبور کیا۔ وہ ہیں دہشت گرد ہم تو اس دہشت کو ختم کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں ہمارے بچے ہیں

اور HumanRace کا حصہ ہیں۔
"کیا آپ اب بھی فلسطینی مقصد کے لیے مرنا پسند کریں گی؟"
"بالکل۔" لیلیٰ نے اعتماد سے جواب دیا۔
"کوئی بھی فلسطینیوں کے حق سے انہیں محروم نہیں کر سکتا جب میں پی ایف ایل پی میں تھی تو میری ایک اور بھی ذمہ داری تھی میرے پاس فلسطینی جدوجہد کی فائل تھی جسے ترتیب دینا اور اپ ٹو ڈیٹ رکھنا بھی میری ذمہ داری تھی جس میں ہمارا پورا پروگرام ہوتا تھا کہ جدوجہد کیسے کرنا ہے اور بہتری کے لیے کون کون سے کام کرنا ہیں لوگوں کو کس طرح واپس اپنے علاقوں میں لانا ہے جبکہ اسرائیل اس کے خلاف کام کر رہا ہے وہ ہماری ساری کوششوں کو ناکام بنانے کی کوشش کرتا ہے وہ مذاکرات کے عمل کو نظر انداز کر رہا ہے۔"
"میں آپ کے لیے زیادہ تو کچھ نہیں کر سکی لیکن میں حیفہ میں آپ کے گھر گئی تھی وہاں اب بھی پیڑوں پر نارنگیاں لگتی ہیں آپ کے گھر کی حالت بہت خراب ہے وہ کھنڈر بن گیا ہے وہاں ویرانی کا راج ہے میں وہاں سے آپ کے لیے ایک تحفہ لائی ہوں شاید آپ کو پسند آئے۔" لینا مقبول نے ایک ٹائلوں کا شاپر اس کی طرف بڑھایا جسے اس کے بیٹے بشر نے پکڑ لیا اور پھر لیلیٰ کو دے دیا لیلیٰ کے چہرے پر خوشی کے آثار نمودار ہو گئے۔ اس نے تیزی سے شاپر میں ہاتھ ڈالا اور جب ہاتھ باہر نکالا تو اس میں ایک پیکٹ تھا۔
"یہ کیا ہے؟" اس نے تجسس سے پوچھا۔
"آپ کھول کر دیکھیں شاید آپ کو پسند آئے۔" لینا مقبول نے کہا۔
"لیلیٰ نے اس پیکٹ کو کھولا تو اس میں ایک خوب صورت ڈبہ رکھا تھا جس کو کھولنے پر اس کی نظریں ایک ٹوٹے ہوئے ٹائل پر پڑی اور اس نے فوراً اس ٹائل کو اٹھا کر آنکھوں سے لگایا وہ اسے بار بار چوم رہی تھی اور سسکیاں لے رہی تھیں۔
"اوہ اوہ میرے خدا۔" اس نے دکھ سے کہا۔
"اتنے عرصہ بعد...... آخرکار...... یہ چھوٹا سا میرے گھر کا حصہ اس پر میں کھیلی ہوں یہ ٹائل میرے والد نے بڑی چاہت سے لگائے تھے انہیں کبھی نہیں بھول سکتی میں ننگے پاؤں فرش پر چلتی تھی تو میری ماں مجھے ڈانٹتی تھی پر مجھے ان ٹھنڈے اور چکنے ٹائلوں پر ننگے پاؤں چلنے میں مزہ آتا تھا۔" لیلیٰ بہت جذباتی ہو گئی تھی اس نے وہ ٹائل لے کر ٹیبل پر سجا لیا تھا۔
"اس سے قیمتی تحفہ کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔"
"تم نے میرے گھر کا ٹکڑا مجھے لا کر دیا ہے۔" لیلیٰ کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں اس کے شوہر نے اس کی آنکھوں سے ٹشو پیپر سے آنسو صاف کیے ایک بیٹا دوڑ کر پانی لے آیا۔
"آپ پرسکون ہو جائیں آپ روئیں نہیں بس۔" اس کے بیٹے بشر نے کہا اور پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔
"یہ خوشی کے آنسو ہیں۔" لیلیٰ نے کہا۔
"میں اتنے سال کی جدوجہد کے بعد بھی اپنی زمین کا اتنا سا ٹکڑا بھی حاصل نہیں کر سکی لیکن میں مایوس نہیں ہوں...... میں مایوس نہیں ہوں ایک دن آئے گا اسی طرح...... بالکل اسی طرح ہمیں ہمارا گھر بھی ملے گا ضرور ملے گا۔" لیلیٰ نے یقین سے کہا۔ لینا مقبول خاموش بیٹھی تھی اس کی آنکھوں میں بھی آنسو جھلملا رہے تھے۔
"کوئی بھی یہ حق نہیں رکھتا کہ فلسطینیوں کو ان کے حق سے محروم کر دے۔" لیلیٰ نے شوہر فیاض سے کہا۔
"وہ لوگوں کی واپسی کے حق کو بدل نہیں سکتے۔ یہ ان کا قانونی حق ہے یونائیٹڈ نیشن کے قانون 194 میں یہ بات کہی گئی ہے کہ اسرائیل فلسطینیوں کے اس حق کو تسلیم کرے گا اور انہیں ان کے گھروں میں جانے کی اجازت دے گا جنہیں 1948ء میں زبردستی نکالا گیا اس سارے جھگڑے کا حل یہی ہے کہ فلسطینیوں کو ان کی زمینوں، جائیدادوں، گاؤں اور گھروں کو واپس جانے دیا جائے۔" لیلیٰ بول رہی تھی پھر لیلیٰ نے الماری کھول کر اپنی کتاب کی ایک جلد نکالی۔
My People Shall Live اس نے ایک ہاتھ میں کتاب اور دوسرے میں اپنے گھر کا ٹوٹا ہوا ٹائل اٹھایا ہوا تھا اس کی آنکھیں پرنم تھیں اور لینا مقبول اس کے شوہر، بچوں کے ساتھ اس کی ویڈیو بنا رہی تھی۔
"میں مایوس نہیں ہوں۔" لیلیٰ بول رہی تھی۔ "اگر اتنے سال کی جدوجہد کے بعد 2015ء میں یو این او پر فلسطین کا پرچم لہرایا جا سکتا ہے تو کچھ بھی ناممکن نہیں یہ جدوجہد ضرور رنگ لائے گی اور فلسطین آزاد ہوگا۔" اس کے لہجے میں عزم تھا جسے لینا مقبول محسوس کر سکتی تھی۔

قسط نمبر 1

عشق کسی کی ذات نہیں

امجد جاوید

عشق حقیقی ہو بھلے مجازی ،عشق پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہوتی .عشق چاہے اپنے مقصد کے لیے ہو، کسی ذات سے ہو یا پھر رب تعالیٰ سے، وہ اپنا آپ منوا لیتا ہے. حق و باطل کے درمیان اپنے کردار سے وہی لکیر کھینچ سکتا ہے جس کے پاس آفاقی سچائی ہو. قوت عشق سے وہ میدان عمل میں اترتا ہے جو ایک کردار کی شہادت دیتا ہے. انسانی ذات ہی وہ میدان عمل ہے جہاں حاصل عشق کا ظہور ہوتا ہے.

ایک دوشیزہ کی کہانی جو معاشرے کی روایتی پابندیوں کو توڑ کر اپنے کردار سے یہ ثابت کر دیتی ہے کہ من سچا ہو تو زمانہ جھک جاتا ہے.

عشق اور حاصل عشق کے درمیان ڈولتی ہوئی دل گداز کہانی، قارئین نئے اُفق کے لیے توشہ خاص.

''شبانہ! یہ جو تم نے اپنی ریسرچ رپورٹ کے لیے موضوع چنا ہے، کیا یہ تمہارے لیے ٹھیک ہے؟'' سعدیہ افضل نے بڑے غور سے شبانہ وقار کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ اپنے سوال کا ردعمل اُس کی آنکھوں میں ہی دیکھ سکتی تھی۔ کیونکہ شبانہ وقار کا چہرہ نقاب میں تھا۔ دو برس کی رفاقت میں سعدیہ سمجھ گئی تھی کہ شبانہ کی یہ آنکھیں اتنا کچھ کہہ جاتی ہیں کہ لفظوں کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اور بہت سارے مفہوم خود بخود سمجھ میں آجاتے ہیں۔ سعدیہ کے لیے شبانہ کی آنکھیں بہت اہمیت اختیار کرگئی تھیں۔ وہ اکثر سوچا کرتی تھی کہ یہ کاجل کی ہلکی سی ڈور والی سادہ سی آنکھیں، ان میں ایسی کیا کشش ہے؟ جن میں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے۔ نہ بھویں بنی ہوئی جو کمان جیسی لگیں۔ فطری بھویں جن کے نیچے قدرتی چمک روشن چہرے کی نوید دیتی تھیں۔ سیندوری رنگت میں، کاجل کی ہلکی ڈور والی سیاہ آنکھیں اتنی جاذب نظر بھی ہوسکتی ہیں؟ سعدیہ جس قدر سوچتی، اس قدر ان آنکھوں کے راز کھلتے چلے جاتے۔ شبانہ کا پورا بدن سیاہ حجاب میں چھپا ہوا تھا۔ آنکھوں کے علاوہ اس کے ہاتھ دکھائی دیتے تھے۔ جن پر نہ حنا تھی اور نہ ہی ناخنوں پر محنت کی گئی تھی۔ سادہ سے بھرے بھرے ہاتھ، جن میں گلابی پن نمایاں تھا۔ یوں دکھائی دیتے جیسے رس بھرے گداز ہاتھوں کو ذرا سی ٹھیس لگی تو ان میں دراڑیں پڑسکتی ہیں۔ سعدیہ کو یوں لگتا کہ یہ کانچ کے جیسے ہاتھ کسی دوسرے بدن پر رکھ دیئے جائیں تو بلاشبہ ان میں سکون بخش دینے کی صلاحیت ہوگی۔ مضمون بھانپ لیتے ہیں خط کا لفافہ دیکھ کر کے مصداق، یہ ہاتھ اور آنکھیں بتا رہی تھیں کہ شبانہ وقار کس قدر خوبصورت ہوسکتی ہے۔ ان دو برس میں اتفاق نہیں ہوا تھا کہ دونوں کبھی تنہائی میں ملی ہوں۔ اس لیے سعدیہ نہ اندازہ ہی لگا سکتی تھی اور نہ یقین سے کچھ کہہ سکتی تھی کہ وہ کس قدر حسین ہے۔

حسب معمول شبانہ کی آنکھیں دھیرے سے مسکرائیں تو کاجل کی ہلکی سی دھار واضح ہوگئی اور وہ سیاہ باتونی آنکھیں باتیں کرنے لگیں۔ جس پر سعدیہ گڑبڑا گئی اور تیزی سے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

''میرا مطلب ہے، شوبز سے متعلق موضوع چن کر تم نے غلطی تو نہیں کی؟''

''کیوں کیا ہوا ہے اس موضوع کو؟'' شبانہ نے کہا تو یوں لگا جیسے لہجہ بھی لفظوں کو ملائمت بخش سکتا ہے۔ اس پر سعدیہ نے اپنے سامنے پڑا ہوا کافی کا سفید مگ گھمایا اور سوچنے والے انداز میں سر کو جھکالیا۔ وہ شاید مناسب لفظ تلاش کرنے میں مشکل محسوس کررہی تھی یا پھر اُس کا اپنا خیال ہی واضح نہیں تھا۔

وہ دونوں اپنے میڈیا ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ والی کینٹین میں تھیں۔ جہاں ان کے اپنے شعبہ کے علاوہ دیگر شعبہ جات کے طلبہ و طالبات بھی موجود تھے۔ سعدیہ اور شبانہ دونوں آمنے سامنے بیٹھیں، دو مختلف طبقہ ہائے فکر کی نمائندہ دکھائی دے رہی تھیں۔ جسے موافق کہنے کی بجائے مخالف ہی کہا جاسکتا تھا۔ سعدیہ افضل بوائے کٹ بالوں والی کامنی سی لڑکی تھی، جس کی سفید دودھیا گردن، سیاہ بالوں میں نمایاں ہوجاتی تھی۔ روشن پیشانی، بنی سنوری بھویں، گہری بھوری آنکھوں کے درمیان کچھ ایسا تھا جہاں چمک تو تھی مگر کشش نہیں تھی۔ ننھے سے ناک میں ہیرے کی لونگ تھی۔ نچلے ہونٹ کا رسیلا پن لپ سٹک کی تہہ کے نیچے دبا ہوا تھا۔ ہلکے سبز رنگ کے کھلے گلے والی ہاف سلیوشرٹ، اونچے پائنچوں والی شلوار پہنے ہوئی تھی۔ اس کی انگلیوں کو بڑھے ہوئے ناخنوں نے مدد دی ہوئی تھی جن پر سرخ رنگ کی نیل پالش تھی۔ دائیں کلائی میں گہرے سبز رنگ کی ڈوری تھی جس میں سفید موتی تھے۔ اس ہاتھ سے وہ سفید مگ گھما رہی تھی۔ جسم کی خوبصورتی عیاں کرنے والا لباس پہننے والی سعدیہ کی دوستی سرتاپا حجاب میں ملبوس شبانہ سے تھی۔ وہ اکثر شبانہ سے اوٹ پٹانگ سوال کرلیا کرتی تھی۔ اس وقت بھی سعدیہ نے یہ سوال پوری سنجیدگی کے ساتھ حیرت ملی ہمدردی سے کیا تھا۔ جبکہ شبانہ سمجھ رہی تھی کہ اسے ہمدردی نہیں بلکہ کچھ دیر بعد مذاق اڑانے کے لیے تمہید باندھ رہی ہے۔

''مطلب......! شوبز سے متعلق یہ ریسرچ رپورٹ تم مکمل کر پاؤ گی؟'' اس نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ تب شبانہ نے بڑے اعتماد سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے ریشم لہجے میں کہا۔

''کیوں نہیں مکمل کر پاؤں گی۔ میں جب میڈیا کی

تعلیم حاصل کرنے یہاں کیمپس تک آسکتی ہوں تو یہ شوبز۔ میڈیا سے ہٹ کر تو نہیں ہے۔ اسی کا حصہ ہے اور میرے خیال میں اسی شعبے پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔''

''بات یہ نہیں ہے یار!'' سعدیہ نے سپ لے کر کہا پھر چند لمحے توقف کے بعد بولی۔ ''اصل میں تمہاری شخصیت کے ساتھ یہ موضوع جچتا نہیں ہے۔'' اس نے یہ بات ہونٹوں میں مسکراتے ہوئے کہی تھی۔ اس پر شبانہ خاموش رہی کہ وہ اپنی بات پوری طرح مکمل کرلے۔ کوئی جواب نہ پاکر وہ بولی۔ ''کہاں تم، اتنی سخت پابندی کے ساتھ حجاب میں ملفوف رہنے والی لڑکی، کہاں شوبز کی بے باکیاں ان کا کوئی کامبی نیشن نہیں بنتا یار تم نے اگر الیکٹرک میڈیا ہی کے بارے میں ریسرچ کرنا تھی تو کسی ٹاک شو یا کسی مذہبی پروگرام کے حوالے سے کوئی ہلکا پھلکا جائزہ لے لیتیں۔ یہ کدھر پھنس رہی ہو تم....'' اس نے بڑی مشکل سے اپنی بات شبانہ کو سمجھانا چاہی۔

''جو بات تم مجھے سمجھانا چاہ رہی ہو نا تم خود اس میں واضح نہیں ہو۔ تمہیں خود معلوم نہیں کہ آخر کہنا کیا چاہ رہی ہو۔ اسی لیے سیانے کہتے ہیں کہ پہلے سوچو، پھر بولو۔'' شبانہ نے خوشگوار لہجے میں یوں کہا جیسے وہ اس کی بات کو اہمیت نہ دیتے ہوئے یونہی ہوا میں اُڑا دینا چاہتی ہو۔ اس پر سعدیہ نے چونکتے ہوئے کہا۔

''تمہارا مطلب ہے، میں یونہی ہانک رہی ہوں، بے مقصد گفتگو کررہی ہوں تمہارے خیال میں۔''

''ظاہر ہے جب تک آپ اپنا پیغام دوسروں پر واضح نہیں کردیتے، تب تک ابلاغ نہیں ہوتا۔ اب تم اپنے بیان ہی میں منتشر ہو۔ تمہارا پیغام ہی ادھورا ہے تو سامنے والا بندہ کیا سمجھ سکتا ہے۔'' شبانہ نے بڑی خوبصورتی سے اس پر چوٹ کردی۔ سعدیہ کو امید نہیں تھی کہ شبانہ ہی اس کا مذاق اڑانا شروع کردے گی۔ اس لیے بڑی سنجیدگی سے بولی۔

''نہیں۔ میں بالکل سیریس ہوں اور تمہیں آئندہ آنے والی مشکلات سے آگاہ کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے یوں کہا جیسے وہ کسی گمبھیر صورتِ حال کے بارے میں اسے بتانا چاہتی ہو۔

''مثال کے طور پر آئندہ آنے والی مشکلات کیا ہوسکتی ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے شبانہ یقیناً مسکرائی ہوگی کیونکہ نگاہوں نے سعدیہ پر اس کی مسکراہٹ واضح کردی تھی۔

''سب سے پہلے تمہارے والدین جو کٹر قسم کے مذہبی لوگ ہیں وہ تو شوبز کا نام سنتے ہی تمہاری پڑھائی بند کردیں گے۔ پھر تم ہوگی اور تمہارے گھر کی چاردیواری.... باہر کی تازہ ہوا میں سانس لینے کو بھی ترس جاؤ گی۔'' سعدیہ نے خوف ناک انداز میں کہا۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' اس نے بڑے سکون سے سعدیہ کی بات رد کردی۔

''یہ تم فقط میری بات کے رَد میں کہہ رہی ہو یا واقعی تمہارے والدین تمہیں منع نہیں کریں گے۔ کیا تمہیں اپنے والدین پر اعتماد ہے کہ وہ تمہیں نہیں روکیں گے۔'' اس کے لہجے میں دبی دبی حیرت تھی۔

''نہیں روکیں گے، تمہارے پاس کوئی دوسری مشکل ہو تو بتاؤ۔'' وہ اعتماد سے بولی تو اس نے حیرت سے کہا۔

''ظاہر ہے اس کے لیے تمہیں شوبز کے لوگوں سے ملنا ہوگا۔ کسی نہ کسی اسٹوڈیو میں بھی جانا پڑے گا اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تمہارے والدین یا ان کے حلقہ اثر کے لوگ، مطلب جو تمہارا طبقہ ہے ....وہ ان شوبز والوں کو کیا سمجھتا ہے؟''

''سعدیہ! میں نے کہا نا، یہ کوئی مشکل نہیں ہے میرے لیے، اس سارے پس منظر کو سمجھتے ہوئے میں نے یہ موضوع چنا ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''کیوں شبانہ! کیوں یہ تم نے خواہ مخواہ میں اتنا بڑا رسک لیا؟ ہمارا آخری سال ہے بلکہ یوں کہو کہ آخری ماہ ہے یہاں اس کیمپس میں، پھر فری ہوجانا ہے۔ صرف فائنل امتحان ہی بچتے ہیں نا۔ تم کیوں اپنی پڑھائی کے پیچھے پڑی ہو۔ میرا مطلب ہے کہ تم بڑے آرام سے نیبل اسٹوری جیسی ریسرچ دے سکتی ہو۔ آخر کتنے مارکس ہیں اس کے؟'' وہ یوں الجھتے ہوئے بولی جیسے وہ اپنی بحث بھول گئی ہو۔ شبانہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے خاموش رہی۔ بڑے تحمل سے بات سن کر بولی۔

''تم گواہ ہو سعدیہ! کلاس میں پہلے دن سے لے کر آج تک، ہر کسی نے میرے ساتھ کچھ الگ سا سلوک کیا ہے۔ میرے ہی کلاس فیلوز، میرے ساتھ معمول سے ہٹ

کرٹیٹ کرتے رہے۔صرف اس لیئے کہ میں اس حجاب میں ہوتی ہوں۔کچھ لوگ میرا مذاق اُڑاتے رہے۔کچھ میرے ساتھ احترام سے پیش آتے ہیں۔کئی لڑکے لڑکیاں اب تک میرا چہرہ دیکھنے کی شدید خواہش رکھتے ہیں۔ میرے چہرے کے بابت افواہیں اب تک گردش کر رہی ہیں۔تم بھی ان سے واقف ہو۔میں لڑکوں ہی کے نہیں لڑکیوں کی تضحیک کا نشانہ بنتی رہی ہوں۔صرف اس لیے کہ میں حجاب پہنتی ہوں۔ مجھے یوں تاثر دیا جاتا ہے کہ جیسے میں کوئی الگ سی مخلوق ہوں۔جس کا دنیا کے معاملات سے کوئی سروکار نہیں ہے۔'' شبانہ کہتی چلی گئی تو سعدیہ نے تیزی سے کہا۔

''تم وہ بات کہو جو کہنا چاہتی ہو۔اتنی لمبی تمہید کیوں؟''

''میں تمہیں یہ باور کرانا چاہتی ہوں کہ سب کا میرے ساتھ سلوک معمول سے ہٹ کر ہے۔باوجود اس کے کہ زیادہ لوگوں نے اس حجاب کے باعث مجھے احترام دیا ہے۔کہنا میں یہ چاہتی ہوں کہ دنیا کی پروا کیئے بغیر زندگی گزارنے کا میرا اپنا طرزِ فکر ہے۔جس کے تحت اگر میں حجاب لیتی ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں دنیا کا کوئی کام نہیں کر سکتی۔میں ہر کام کر سکتی ہوں۔'' اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے، مگر یہ شوبز؟'' سعدیہ نے کہتے ہوئے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''یہ شوبز والے کوئی ماورائی مخلوق تو نہیں ہیں۔ہم جیسے انسان ہیں۔اصل بات یہ ہے سعدیہ، ہمارے سارے ٹیچرز سمیت یہ سب لوگ اس موضوع کو میرے لیے شجر ممنوعہ تصور کرتے ہیں۔اس حوالے سے تضحیک آمیز ریمارکس پاس کیئے گئے۔میں نے یہ موضوع چیلنج سمجھ کر لیا ہے۔میں اسے مکمل کر کے دکھاؤں گی۔'' وہ پُرعزم لہجے میں بولی۔

''میں تو تمہاری فیملی کے حوالے سے کہہ رہی تھی نا۔'' وہ تیزی سے بولی۔

''سب ہی یہی سمجھتے ہیں۔جس وقت میں نے یہاں داخلہ لیا تھا۔اس وقت بھی میری فیملی والے انجانے خوف اور منفی ردعمل کے باعث مجھے میڈیا کی تعلیم حاصل کرنے سے روک رہے تھے۔میں نے انہیں میڈیا اور اپنے مقصد کے بارے میں بتایا ۔ انہیں دلائل دیئے۔میں اپنے ارادے میں پختہ تھی۔وقت نے ثابت کیا کہ انجانے خوف اور منفی ردعمل کی کوئی حیثیت نہیں رہی۔میں میڈیا کی تعلیم حاصل کر رہی ہوں۔'' اس نے غیر جذباتی لہجے میں انتہائی تحمل سے کہا تو وہ انتہائی تجسس سے بولی۔

''مقصد! کیا مقصد ہے تمہارا اور وہ کیا دلائل تھے؟'' سعدیہ کے پوچھنے پر شبانہ نے اس کی جانب غور سے دیکھا، پھر گہری سنجیدگی سے بولی۔

''میں بتاؤں گی تمہیں لیکن، ابھی وقت نہیں ہے، پھر کسی وقت۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔کیا اس کے لیے کسی خاص ماحول کا اہتمام کرنا ہوگا۔'' سعدیہ نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

''شاید ایسا ہی ہے، نہ یہ وقت ہے اور نہ ہی تم ان باتوں کو سمجھ پاؤ گی۔یہ میرا وعدہ رہا سعدیہ۔میں اپنا مقصد تمہیں ضرور بتاؤں گی۔اور پھر چاہوں گی کہ اگر وہ مقصد تمہارے ضمیر کے مطابق ہو تو پھر تم اسے قبول کر لینا۔اگر تم یہ سمجھو کہ میں غلط ہوں تو بلاشبہ اسے رد کر دینا۔ یہ تمہیں اختیار ہوگا۔میں تمہاری بات مان لوں گی۔'' شبانہ نے صاف انداز میں کہا تو سعدیہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

''ابھی تم کہہ رہی تھیں کہ شوبز والے ماورائی لوگ نہیں ہیں۔ہم جیسے انسان ہیں۔مگر اِس وقت تم خود ماورائی لگ رہی ہو۔کیونکہ پہلے تم نے اس طرح کی بات نہیں کی۔'' یہ کہہ کر اس نے سپ لینے کے لیے مگ ہونٹوں سے لگالیا۔

''پہلے کبھی ایسا موقعہ ہی نہیں آیا تھا۔'' وہ بڑے سکون سے بولی۔

''اب جبکہ ایسا موقع آ ہی گیا ہے تو تم نے کون سا اپنے مقصد کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا ہے۔'' وہ منہ بسورتے ہوئے بولی۔تب شبانہ نے اسی تحمل سے کہا۔

''بتاؤں گی اور ضرور بتاؤں گی۔یہ میں نے تمہیں ہی نہیں، دوسروں کو بھی بتانا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر توقف کے بعد بولی۔''تم دیکھنا، میں یہ ریسرچ رپورٹ خود تیار کروں گی اور اس میں کسی کی بھی مدد نہیں لوں گی۔''

''آخر ایسی کیا بات ہے جو تم اس معاملے میں اتنی سیریس ہو رہی ہو۔'' سعدیہ نے پھر سے تجسس میں پوچھا۔

''بتاؤں گی.....فی الحال تم کافی جلدی ختم کرو۔کلاس کا

وقت ہونے والا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے شبانہ نے پرس میں سے اپنا سیل فون نکالا اور اس پر وقت دیکھتے ہوئے بولی۔''تقریباً سات منٹ رہتے ہیں۔''

''تم میری بات گول کر رہی ہو نا؟'' سعدیہ نے بھویں سکیڑتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں ایک بار بتا تو دیا کہ میں اپنا آپ منوانا چاہتی ہوں۔اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے۔'' وہ سکون سے بولی۔

''مقصد پھر سہی؟'' سعدیہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔پھر مگ میں سے سپ لے کر بولی۔''لیکن اس وقت تم جلدی مت کرو۔یقین جانو، میڈم کی یہ کلاس لیتے ہوئے میں بور ہو جاتی ہوں۔اس قدر تفصیل میں چلی جاتی ہیں کہ جیسے ہم نرسری کے بچے ہوں اور.....'' وہ بدمزہ ہوتے ہوئے بولی تو شبانہ نے ہولے سے کہا۔

''دنیا میں بہت سارے کام اپنے لیے نہیں، دوسروں کے لیے کیئے جاتے ہیں۔بلکہ کرنا پڑتے ہیں۔شکر کرو، ہمیں ایسی ٹیچر نصیب ہوئی ہے جو کم از کم دیانت داری سے پڑھاتی ہیں۔یہی سمجھ کر ان کی کلاس لے لیا کرو کہ تم ان کی دیانت داری کو سراہ رہی ہو۔''

''ایک ہم ہی رہ گئے ہیں دوسروں کو سراہنے کے لیے۔ ہر کوئی اپنی زندگی کے لیے محنت اور مشقت کرتا ہے خیر اُٹھو ورنہ تمہارا کوئی نیا لیکچر سننا پڑے گا۔'' سعدیہ نے مگ ایک جانب رکھا اور اپنا پرس اٹھاتے ہوئے اٹھ گئی۔

وہ کیا اٹھی اک حشر بپا ہو گیا۔اس کے بدن کا ہر پیچ وخم اپنے آپ ابھر کر سامنے آ گیا، کہاں پر کتنے نشیب وفراز ہیں۔یہاں تک بدن کو کسنے والی ڈوریاں بھی لباس میں سے ابھر آئی تھیں۔وہ دونوں کینٹین سے باہر نکلیں تو ہر جانب اچھی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔جاتی ہوئی سردی میں دھوپ خاصی تلخ لگ رہی تھی۔سعدیہ نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپتے ہوئے کہا۔

''ویسے تمہاری موج ہے۔تیز دھوپ میں تمہارا چہرہ تو بچا رہتا ہے۔تمہیں جلد کی حفاظت والی کریم وغیرہ نہیں لگانا پڑتی ہوگی۔''

''ہاں۔دھول مٹی اور بہت ساری میلی نگاہوں سے بھی بچ جاتی ہوں۔جس کا تمہیں احساس نہیں ہے۔'' اس نے

میں اور وہ

☆میں چار سال کا تھا وہ جب وہ پیدا ہوئی
☆میں نے اسکول میں داخلہ لیا تو وہ دو سال کی تھی
☆میں پرائمری میں تھا وہ پریپ میں تھی
☆میں مڈل میں تھا وہ پرائمری میں تھی
☆میں میٹرک میں تھا وہ میٹرک میں تھی
☆میں میٹرک میں تھا وہ FSC میں تھی
☆میں میٹرک میں ہی تھا وہ BSC میں تھی
☆میں میٹرک میں ہی تھا وہ MSC میں تھی
☆میں میٹرک میں ہی تھا وہ PHD کر رہی تھی
☆میں میٹرک میں ہی تھا وہ ڈاکٹر بن گئی
☆کل اس کی شادی ہے اور میرا میٹرک کا پیپر ہے
قارئین! میرے حق میں دعا کیجیے گا۔

فوزیہ سلطانہ......تونسہ شریف

گہرے انداز میں کہا جسے وہ سمجھ تو گئی مگر نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

''ویسے کتنی عجیب بات ہے۔لڑکی ہوتے ہوئے بھی میں نے تمہارا پورا چہرہ نہیں دیکھا، بس ان بولتی آنکھوں ہی سے شناسائی ہے۔فری ہو جانے سے پہلے پہلے تمہارے گھر آؤں گی اور وہیں تمہارا چہرہ دیکھوں گی۔''

''شوق سے، چاہے ابھی چلو میرے ساتھ۔'' شبانہ نے کہا تو وہ اس کی بات نظر انداز کر کے بولی۔

''یہ کار ڈرائیو کرتے ہوئے تمہیں الجھن نہیں ہوتی، مجھے تو ہوتی ہے۔''

''سو دفعہ بتا چکی ہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔میں سکون سے ڈرائیونگ کر لیتی ہوں۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی تو سعدیہ کے دل میں خیال آیا کہ نجانے ہنستے ہوئے شبانہ کیسی لگتی ہو گی۔وہ اس کی سوچ سے بے نیاز ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔''بہت ساری باتوں کا تجربہ اس وقت ہوتا ہے۔ جب بندہ اس مرحلے سے گزر جائے۔اسے ہی تجربہ کہتے ہیں۔سوتم۔''

''خدا کے لیے یار! تم تو بس کرو۔ہم ایک نہایت بور قسم کا لیکچر سننے کے لیے قدم بڑھا رہے ہیں۔'' سعدیہ نے

اکتائے انداز میں کہا تو شبانہ خاموش ہوگئی۔
وہ دونوں قدم سے قدم ملاتی ہوئی کلاس روم میں پہنچ گئیں۔سعدیہ اپنے بال سنوارتی کلاس روم میں داخل ہوئی تو کسی نے آوازہ کس دیا۔
''وہ آئیں کونٹرار یز حسب معمول دونوں نے ہی اسے نظر انداز کیا اور خالی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی ضد دکھائی دے رہی تھیں۔

❁......❁......❁

سہ پہر ہو جانے کے باوجود زرق شاہ ابھی تک بستر میں تھا۔دوسری بار الارم بجا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر پھر سے بند کردیا۔چند لمحے یونہی گزر گئے۔تب اس کا سیل فون بج اٹھا۔اس نے کروٹ بدلی۔سکرین پر نمبر دیکھے پھر کال رسیو کرتے ہوئے تلخی سے کہا۔
''اچھا ٹھیک ہے،میں اٹھ گیا ہوں''
''سر جی،جلدی کریں،ہمیں میٹنگ سے دیر ہو جائے گی۔''دوسری جانب سے اس کے سیکرٹری نے کہا تو اسی تلخ لہجے ہی میں بولا
''اوئے اچھا یار!تم انتظار کرو،میں آرہا ہوں۔اب فون نہیں کرنا۔''یہ کہتے ہوئے اس نے فون بند کیا اور ایک جانب اُچھالتے ہوئے زور سے انگڑائی لی۔اس نے محسوس کیا کہ منہ کا ذائقہ بہت تلخ سا ہے۔بھاری ہوتا ہوا سر بتا رہا تھا کہ رات اس نے کچھ زیادہ ہی پی لی تھی۔اس نے زور سے آنکھیں بند کیں۔پھر اٹھ کر باتھ روم کی جانب چلا گیا۔
آنکھوں میں نیند کا خمار لیے زرق شاہ تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آیا۔وہاں سناٹا تھا۔اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ابھی گھر سے نہ نکلے۔مگر اسے ایک نجی چینل کے پروگرام میں شریک ہونا تھا۔وہیں اس کی ملاقات معروف ہدایت کار باقر رضوی سے ہونے والی تھی۔وہ ایک نئی ڈرامہ سیریل شروع کرنے والا تھا۔شوبز میں اس کا بڑا نام تھا۔زرق شاہ جیسے ابھرتے ہوئے اداکاروں کے لیے اس کی سیریل کرنا بہت اہمیت رکھتا تھا۔دونوں کی فون پر ابتدائی بات ہو چکی تھی۔بس ان کی ملاقات رہتی تھی جو طے ہو چکی تھی۔باقر رضوی نے بھی اسی دن ملاقات کا وقت دے دیا تھا۔ممکن تھا کہ وہ زرق شاہ کو اسی دن اسکرپٹ دے دیتا۔اگرچہ زرق شاہ شوبز کے ساتھ ساتھ عوام میں بھی اپنی جگہ بنا چکا تھا۔مگر جدوجہد کے اس دور میں وہ ان لوگوں کے ساتھ کام کرنے پر مجبور تھا،جن کی شہرت تھی۔شوبز کی دنیا میں باقر رضوی کا ان دنوں طوطی بولتا تھا۔دیگر شعبوں کی طرح،شوبز کی دنیا میں بھی گروپ بازی،منافقت اور دوسرں کو بچھاڑ کر آگے نکل جانے کی روش تھی۔جس کے باعث زرق شاہ جیسے اداکاروں کو بھی اُن لوگوں کی ضرورت ہوتی تھی جو اپنے اپنے گروہ بنا کر ایک دوسرے کے حریف بنے ہوئے تھے۔زرق شاہ کے لیے باقر رضوی سے ملاقات ایک اچھا موقعہ تھا سو مجبوری کی حالت میں،نہ چاہتے ہوئے بھی وہ باہر جانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔
''چھوٹے شاہ جی،آپ کچھ کھا پی لیتے؟''اس کی گھریلو ملازمہ نوراں نے اس کے پاس آکر ہولے سے کہا۔
''میرا کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔''اس نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا،پھر چند لمحے توقف کے بعد پوچھا۔''یہ سب گھر والے کدھر ہیں؟''
''سب ہی لان میں بیٹھے ہیں۔''نوراں آہستگی سے بولی۔
''آ......آچھا......''اس نے ہنکارہ بھرنے والے انداز میں کہا۔
''اگر تھوڑا بہت کچھ کھانے کو من چاہ رہا ہو تو ادھر لان میں آجائیں...''نوراں نے کہا تو زرق شاہ نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سگریٹ کیس میں سے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے کہا۔
''وہ باہر فدا ہوگا،اسے بھجوادو۔''یہ کہہ کر وہ صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔اس نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا اور سوچنے لگا کہ وہ کس قدر اپنے آپ سمیت دوسرں سے بھی غافل ہو گیا ہے۔ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے اپنے کہاں ہیں۔دن رات کی شوٹنگ میں تھکے ہوئے اعصاب اور نیند سے بوجھل دماغ کے ساتھ اسے فقط بستر ہی کا خیال آتا تھا۔لیکن وہ چند پریاں جن کے ساتھ وہ وقت گزارا کرتا تھا،وہ بھی اس کی ضرورت تھیں۔انہیں بھی وقت دینا پڑتا تھا۔یوں دن رات کا فرق

ختم ہو کر رہ گیا تھا۔اس کی شہرت جس قدر بڑھتی چلی جارہی تھی۔وہ اس قدر ہی اپنے آپ سے جدا ہوتا جارہا تھا۔ان لمحات میں اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے والدین کے پاس جا بیٹھے۔ان کے ساتھ باتیں کرتا ہوا وقت گزارے مگر اس خواہش کی تکمیل میں اسے بلاشبہ دیر ہو جاتی۔باقر رضوی کے ساتھ وہ ہر حال میں ملاقات چاہ رہا تھا۔ان بے بس لمحوں میں اس نے اپنے آپ کو سوچنا چاہا تھا مگر سیکرٹری فدا نے آکے کہا۔
''جی سر!''
''فون کرلیا تم نے،رضوی صاحب سے ملاقات ہوگی؟''اس نے تصدیق چاہی تاکہ اگر اسے تھوڑا سا وقت مل جائے تو وہ اپنے گھر والوں کے پاس گزارے۔
''جی سر جی!وہ وہاں پہنچنے والے ہیں۔پروگرام سے پہلے ملاقات طے ہے۔''فدا نے بتایا۔
''تو اس کا مطلب ہے ہمیں چلنا چاہیے۔''اس نے خود پر جبر کرتے ہوئے کہا۔
''جی بالکل،وہاں تک جاتے ہوئے ہمیں تھوڑا وقت بھی لگے گا۔''فدا نے کہا تو وہ ایک دم سے اٹھ گیا۔
ٹی وی اسٹوڈیو تک پہنچتے ہوئے زرق شاہ کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔انسان کچھ بھی کرلے من کے موسم کا اثر چہرے پر ضرور پڑتا ہے۔جونہی وہ گیٹ تک آئے زرق شاہ نے اپنا چہرہ یوں بنالیا جیسے وہ بہت خوشگوار ہے۔اداکار چہرے کے تاثرات ہی سے متاثر کرتے ہیں۔وہ ایک اچھا اداکار تھا۔یہ اداکار جب کسی کردار کو پیش کررہے ہوتے ہیں تو ان کی اپنی شخصیت منفی ہو جاتی ہے۔وہ کسی دوسرے کردار میں ڈھل جاتے ہیں۔گویا وہ بھی اپنا چہرہ تاثرات کے نقاب میں چھپاتے ہیں اور اسی نقاب کے مطابق اداکاری کرتے ہیں،جس کردار کا وہ نقاب اوڑھتے ہیں۔زرق شاہ استقبالیے ہی سے اپنا خوشگوار تاثر دیتا ہوا اندر کی جانب بڑھا۔
پروڈیوسر کے کمرے میں محفل جمی ہوئی تھی۔پروڈیوسر کے علاوہ ہدایت کار رضوی،معروف اداکارہ ہما اور رائٹر رازی موجود تھے۔ان کے درمیان موضوع گفتگو نئی ڈرامہ سیریل ہی تھی۔
''لو جی!اب ہر شے فائنل کرلیں۔''پروڈیوسر نے کہا۔

''جی، اسکرپٹ تیار ہے، لوکیشن فائنل ہے، ایکٹرز بھی پورے ہو گئے ہیں۔ بس آپ شروع کرنے کی اجازت دیں۔'' رضوی نے کہا تو پروڈیوسر تیزی سے بولا۔

''وہ تو ٹھیک ہے، آؤٹ ڈور میں کتنا وقت لیں گے۔ وہ تاریخیں فائنل ہو چکی ہیں؟''

''وہ سمجھیں طے ہیں۔'' یہ کہہ کر رضوی نے زرق شاہ کی جانب دیکھا اور بولا۔''شاہ جی سے ہی تاریخیں لینا تھیں۔ یہ میرے ساتھ آؤٹ ڈور پر جائیں گے ان سے۔''

''رضوی صاحب! آپ کے سامنے میری کیا مجال ہے۔ جیسے آپ حکم دیں، میں تیار ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے عاجزی سے کہا تو پروڈیوسر خوش ہو گیا۔

''لو جی، اب آپ کل سے ہی شروع کر لیں۔''

''اس کے یوں کہنے پر وہ بھی نئی سیریل کی شروعات کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ ان لمحات میں زرق شاہ کو اندازہ ہو گیا کہ اب وہ ان کی ضرورت بنتا جا رہا ہے۔ عوام میں پہچان بنی ہے تو انھوں نے بھی اپنے قریب کیا۔ وہ سوچ چکا تھا کہ اس نے معاوضہ کیا لینا ہے۔ اب زیادہ دنوں کی بات نہیں رہی تھی جب وہ نامور اداکاروں میں شمار ہو گا۔ وہ مسکرا دیا۔ کچھ دیر پہلے مرجھا کر رکھ دینے والی مایوسی ختم ہو گئی تھی۔ کامیابی چاہے جتنی بھی ہو، اس پر انسان کا خوش ہونا فطری امر ہے۔

❀......❀......❀

شبانہ وقار عشاء پڑھ چکی تو اس نے مصلیٰ تہہ کر کے کرسی کی پشت پر دھر دیا۔ اس وقت وہ اپنے کمرے میں ہونے کے باعث حجاب میں نہیں تھی۔ بڑی ساری آف وائٹ چادر کے ساتھ بدن اور سر ڈھکا ہوا تھا۔ چادر کے ہالے میں سے اس کی گوری رنگت کا گلابی پن ایسی تازگی کا احساس دے رہا تھا جیسے بارش کے بعد ہر شے نکھر جائے۔ اسرار میں راز ہونے کی مانند، اس کے حسن میں پاکیزگی کا تاثر روح کی مانند رچا بسا ہوا تھا۔ اس میں تقدس بھری کشش تھی۔ فطری کمان بھویں اور بولتی آنکھیں پورے چہرے کا مان رکھے ہوئے تھیں۔ پتلے لبوں کے دائیں جانب اوپر کی طرف سیاہ تل تھا۔ بھرے بھرے گلابی گالوں کے درمیان تیکھا ناک اسی مناسبت سے تھا جیسے اس کے حسن کو سہارا دیے ہوئے ہو۔ کس کر باندھے ہوئے گیسوؤں سے اس کی پیشانی مزید کشادہ ہو گئی تھی۔ سب سے زیادہ کشش اس کی جلد میں تھی، جیسے کسی معصوم بچے کی ہوتی ہے۔ گردن سے پیشانی تک یہی عندیہ ملتا تھا۔ شبانہ نے ایک نگاہ آئینے پر ڈالی، اپنی چادر کو مزید درست کیا اور کمرے میں سے نکلتی چلی گئی۔ وہ ڈرائنگ روم میں جانا چاہتی تھی۔ جہاں اس کے امی، ابو اور بھائی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ تینوں کسی معاملے پر بات کر رہے تھے جب وہ اپنی امی کے پہلو میں صوفے پر جا بیٹھی۔ اس کے سنجیدہ چہرے پر دیکھتے ہوئے اس کے بھائی طارق نے پوچھا۔

''بہنا! آج خلاف معمول، کتابوں میں سر دینے کی بجائے، یہاں کیسے دکھائی دے رہی ہو؟''

طارق اس سے بڑا تھا اس لیے اس کے لہجے میں خوشگواریت کے ساتھ رکھ رکھاؤ بھی تھا۔ وہ خوبرو نوجوان تھا۔ اس پر چھوٹی چھوٹی تراشیدہ داڑھی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

''کوئی فرمائش ہو گی؟ کیوں ایسا ہی ہے نا؟'' اس کے ابو وقار الدین نے عمامہ درست کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''تو پھر کیا بات ہے، یوں خاموشی سے آ کر بیٹھ گئی ہو؟'' امی قرۃ العین نے اس سے پوچھا تو شبانہ اپنے باپ سے بولی۔

''دراصل میں آپ سے اجازت چاہ رہی تھی؟'' اس نے ادب کہا۔

''اجازت! کس چیز کی اجازت؟'' وہ چونکتے ہوئے بولے۔

''ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ایک ریسرچ رپورٹ ہر طالب علم نے کرنی ہوتی ہے۔ سو میں نے بھی تیار کرنی ہے۔ میں نے جو موضوع لیا ہے، اس کے لیے مجھے آپ کی اجازت بہر حال چاہیے۔'' اس نے محتاط انداز میں کہا تو بھائی نے چونک کر پوچھا۔

''موضوع ایسا ہے، جس کے لیے اجازت چاہیے۔ کیا ہے موضوع؟''

''ہماری ثقافت اور شوبز کی روایات۔'' اس نے عام سے انداز میں کہا لیکن اس کے ساتھ ہی من میں ایک لہری

سرائیت کر گئی۔ کہیں والدین سے اجازت لینے میں بحث و مباحثہ کی صورت نہ بن جائے۔ جس کے باعث اس کے بارے میں کوئی غلط تاثر نہ پیدا ہو جائے۔ اس کے بھائی نے حیرت زدہ لہجے میں کہا

''شوبز۔ یہ تمہارے دماغ میں کیا سمائی ہے، جانتی ہو کہ شوبز کہتے کسے ہیں؟''

''بھائی! بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس سے متعلق کام بھی کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ اعتماد سے بولی

''استغفر اللہ۔ تمہیں کوئی دوسرا موضوع نہیں ملا، کیا میڈیا کا مطلب صرف شوبز ہے؟'' وہ تیز لہجے میں یوں بولا جیسے شبانہ کی بات اسے بہت بری لگی ہو۔ تب وقار الدین نے طارق کو اشارے سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''مجھے بات کرنے دو۔'' یہ کہہ کر اس نے تحمل سے پوچھا۔''بیٹی، یہ ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے موضوع ملا ہے یا تم نے خود چنا ہے؟''

''میں نے خود چنا ہے ابا جی۔'' اس نے پھر اعتماد سے کہا۔

''حیرت ہے، مگر کیوں بیٹی؟'' وقار الدین نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''اس لیے کہ یہ میری ذات کے لیے بہت اہم ہے۔ میں اپنے کلاس فیلوز اور اپنے ٹیچرز پر ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ میں دلدل سے بھی پھول چن سکتی ہوں۔'' وہ ادب سے بولی۔

''یہ فلسفہ زدہ بات میری سمجھ میں نہیں آنے والی۔'' اس کے باپ نے یوں کہا جیسے وہ اکتا گیا ہو۔ تب ہی طارق نے کہا۔

''ابا جی، اسی وقت کے لیے میں نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ اسے کیمپس مت بھیجیں۔ ایم اے ہی کرنا ہے تو گھر بیٹھ کر بھی کر سکتی ہے۔ اوپر سے غضب یہ ہوا کہ میڈیا کی تعلیم کے لیے اسے اجازت دے دی۔ اب بھگتیے، آج یہ کہہ رہی ہے کہ شوبز پر تحقیق کرے گی، کل ممکن ہے کہ۔''

''طارق، تم ذرا خاموش رہو۔'' اس کی امی نے ذرا سخت لہجے میں کہا اور پھر شبانہ کی طرف دیکھ کر بولی۔''اللہ سے ڈرو۔ صرف اتنی سی بات پر تم اپنا ایمان خراب کرنے پر تلی ہو۔ تمہیں شاید احساس نہیں ہے کہ وہ دنیا کیسی ہے

مہکتی کلیاں

- انسان ایک دکان ہے اور زبان اس کا تالا تالا جب کھلتا ہے تو معلوم ہوتا ہے دکان سونے کی ہے یا کوئلے کی۔
- انسان بزدل اتنا ہے کہ سوتے ہوئے خواب میں بھی ڈر جاتا ہے اور بے وقوف اتنا ہے کہ جاگتے ہوئے بھی اپنے رب سے نہیں ڈرتا۔
- دل ٹوٹنا کیا ہوتا ہے اس چڑیا سے پوچھ جس کا ایک ایک تنکے سے بنا ہوا گھونسلا کسی سنگ دل نے اس کی آنکھوں کے سامنے توڑ دیا یا اس ماں سے پوچھو جس کا جوان بیٹا اس کی آنکھوں کے سامنے چل بسے۔

رابعہ مبارک......پتوکی

، وہاں کیسے کیسے لوگ ہیں۔ چھوڑو، اس جھنجھٹ کو، سیدھے سیدھے گھر میں بیٹھو۔'' اس کی امی نے فیصلہ سنا دیا۔

''میری بہن! تم بہت معصوم ہو، تمہیں فقط سنی سنائی معلومات ہیں، لیکن تم نہیں جانتی ہو کہ وہ دنیا کیسی ہے۔ تمہارا اس طرح کی بات سوچنا بھی گناہ ہے۔ ہم جیسے لوگوں کو اس دنیا سے دور ہی رہنا چاہیے۔ کیا تم جانتی نہیں ہو کہ تقویٰ کا تقاضہ کیا ہے؟'' طارق نے بہ ظاہر نرم لہجے میں بات کی تھی لیکن دورانِ لہجہ غصہ چھلک رہا تھا۔

''تمہارا اپنے آپ کو منوانا اتنا کیوں ضروری ہے۔'' وقار الدین نے پوچھا۔

''مجھے دو برس ہو گئے ہیں یونیورسٹی جاتے ہوئے۔ اس سارے دورانیے میں صرف حجاب پہننے کی وجہ سے دوسرے درجے کی طالبہ سمجھی گئی ہوں۔ ایک ایسی مذہبی لڑکی، جیسے دنیا سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ بلکہ میڈیا کی تعلیم حاصل کرنا میرا حق ہی نہیں ہے۔ میرے بارے میں یہی خیال کیا گیا ہے کہ میں ایک مخصوص دائرے میں بند، محدود سوچ رکھنے والی تنگ نظر مذہبی لڑکی ہوں۔ مجھے اس سے غرض نہیں ہے کہ میرے بارے میں کیسا تاثر ہونا چاہیے۔ لیکن ہم جیسے لوگوں کا کام مسجدیں سنبھالنا نہیں ہے۔ کیا دنیا کے دیگر کاموں کو ہم ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔'' اس نے ادب بھرے لہجے میں کہا۔

"لیکن دین کا شوبز سے کیا تعلق ہے۔ اسے تو سرے سے ختم ہو جانا چاہیے؟" طارق نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بھائی، مجھے بتائیں، کون ختم کرے گا؟" اس نے نرم لہجے میں اعتماد سے کہا۔ یہ ایک ایسا سوال تھا جس پر وہ چند لمحے سوچتا رہا، پھر پرسکون انداز سے بولا۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"یہی کہ جب تک کسی مرض کی تشخیص نہیں ہو جاتی۔ اس وقت تک مرض کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ تشخیص کے لیے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے بھائی کہ شوبز ختم نہیں ہوا۔ بلکہ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ اس میں ترقی آ رہی ہے۔ قیام پاکستان کے وقت ہمارا معاشرہ کیا تھا؟ اور اب کیسا ہے؟ میں کسی پر بھی الزام نہیں دھرتی کہ فلاں کا قصور ہے۔ میں تو یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آخر ایسا کیا ہوا۔ جس اسلامی ریاست کو اسلامی اصولوں کی تجربہ گاہ بننا تھا، وہ تجربہ گاہ، یہ معاشرہ کیوں نہیں بنا سکا۔"

"کیا تم شوبز ختم کرنے نکلی ہو؟ آخر مقصد کیا ہے تمہارا؟" طارق نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

"میں ایسا کچھ نہیں چاہ رہی ہوں۔ میں نہیں سمجھتی کہ میرے اتنے سے کام کر لینے سے دنیا بدل جائے گی۔ انقلاب آ جائے گا یا کوئی تھوڑا سا بھی فرق پڑے گا۔ میں تو اپنے ارد گرد لوگوں کو راستہ دکھانا چاہتی ہوں۔ وہ بھی میڈیا کے ذریعے۔ جہاں تک میری اس ریسرچ رپورٹ کا تعلق ہے۔ اس سے میں ثابت یہ کرنا چاہتی ہوں کہ میں اپنے دائرے میں رہتے ہوئے، اپنے مقاصد کے لیے کام کر سکتی ہوں۔" اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

"تو اس کا مطلب ہوا کہ تم فقط اپنے اساتذہ اور کلاس فیلوز پر رعب ڈالنا چاہتی ہو۔ یہ فقط تمہاری انا کا مسئلہ ہے۔ اس کے علاوہ کوئی خاص ضرورت نہیں ہے تمہیں۔" طارق نے طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے بات کی اہمیت کم کر دینا چاہی۔

"یوں تو میڈیا کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اس سے کون سا استفادہ حاصل کرتے ہیں۔ آپ کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ علم بھی عورتوں کے لیے شجر ممنوعہ ہے۔ اس کا مطلب، وہ لوگ جنہیں آپ نفرت سے سیکولر کہتے ہیں، وہ آپ کے بارے میں ٹھیک کہتے ہیں۔" شبانہ نے پُراعتماد لہجے میں کہا تو وقارالدین نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اگر ہم نے اسے میڈیا کی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دی ہے تو پھر میرا نہیں خیال کہ اسے ایسی کسی بے ضرر تحقیق سے روکا جائے۔"

"کل اگر یہ باقاعدہ کام کرنے کے لیے اجازت مانگے گی تو آپ اس کی بے سر و پا دلیلیں سن کر اجازت دے دیں گے۔" طارق نے تنک کر کہا۔

"کام تو میں کروں گی بھائی! لیکن وہ میں اپنے حساب سے کروں گی۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ کبوتر کی مانند آنکھیں بند کر لی جائیں تو بلی کا خطرہ ٹل جاتا ہے۔ اگر آپ کی ایسی سوچ ہے تو آپ کی بہت بڑی بھول ہے۔ آپ اپنے بیڈروم میں بیٹھ کر پوری دنیا کو اس انداز سے دیکھ رہے ہیں، جیسے کوئی اپنی مرضی سے آپ کو دکھانا چاہتا ہے۔" وہ دبے دبے جوش سے بولی۔

"اس لیے میں ٹی وی نہیں دیکھتا۔ تاکہ میں ان کی مرضی کی دکھانے والی چیزیں نہ دیکھوں۔" وہ کاندھے اچکاتے ہوئے بولا

"تو پھر کیا ہوا، آپ کے ٹی وی نہ دیکھنے سے دنیا کے چینل بند ہو گئے۔ جس طرح آپ کی مرضی ہے کہ نہ دیکھیں، اسی طرح ان کی یہ مرضی ہے کہ دکھائیں گے۔ اس کشمکش میں آپ کا موقف کدھر گیا۔ وہ مظلوم لوگ جو آپ کی رائے چاہتے ہیں۔ جنہیں آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ وہ کہاں جائیں۔ کیا ہم سب بہ حیثیت مسلمان اسلام کا حقیقی چہرہ، اس کے اصلی خدوخال کے ساتھ دکھانے میں کامیاب ہیں یا تو آپ نہیں کی پوری طرح مدد کیجیے بالکل جیسے آپ ہیں یا پھر انہیں آزاد چھوڑ دو، ان پر کوئی قدغن مت لگاؤ۔" شبانہ نے بڑے تحمل کے ساتھ اپنا موقف کہہ دیا۔

"تمہارا خیال ہے، اس ریسرچ سے لوگوں کو رہنمائی مل جائے گی؟" طارق نے کمزور سی دلیل دی۔

"نہ ملے، مگر میں نے اپنے مقصد کے لیے ایک قدم آگے بڑھایا ہے۔ بھائی، میرا کردار میرے ساتھ ہے۔ اسے اس وقت تک کوئی نہیں چھین سکتا، جب تک میں نہ چاہوں۔ میرے پورے تعلیمی کیریئر میں آپ کو کسی ایسی غلط بات کا تاثر ملا، جس سے میرے کردار پر کوئی حرف آتا ہو؟" اس نے اس بار پورے جوش سے کہا۔

"الحمدللہ! مجھے میری بیٹی پر فخر ہے۔" وقارالدین نے پیار سے کہا۔

"ٹھیک ہے تمہاری مرضی تم جو چاہو، اباجی اگر تمہیں اجازت دیتے ہیں تو ٹھیک ہے۔" آخرکار طارق نے ہتھیار ڈال دیے تو شبانہ نے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔

"بیٹی احتیاط کا تقاضا تو یہی ہے کہ میں تمہیں منع کر دوں۔ مگر میرا مان یہ کہتا ہے کہ تمہیں نہ صرف اجازت دوں بلکہ میں تمہاری مدد بھی کروں۔" وقارالدین نے بڑے جذب سے کہا تو شبانہ کے چہرے پر فخر کے دیے روشن ہو گئے۔

"ابو! آپ کی یہ بیٹی ہر حال میں آپ کا یہ مان رکھے گی۔" شبانہ نے انتہائی خوشی سے کہا۔

"پھر تم وہاں پر جاؤ گی کیسے؟" اس کی امی قرۃ العین نے پوچھا

"فقط میں اکیلی نہیں ہوں۔ میرے کچھ کلاس فیلوز بھی ہیں۔ ہم اکٹھے جائیں گے یا انفرادی طور پر، بہرحال آپ فکر نہ کریں۔ میں سب دیکھ لوں گی۔" وہ سرشار لہجے میں بولی۔ پھر چند لمحے توقف کے بعد کہا۔ "امی، میں قدم قدم آگے بڑھنا چاہتی ہوں۔ میں اگر کسی ٹی وی چینل کو چھو آؤں گی تو تب اتنی سی نہیں ہو جاؤں گی۔"

"تمہیں اجازت مل گئی ہے بیٹی۔ میں تمہیں اللہ کے سپرد کرتی ہوں۔" امی نے کہا تو وہ اٹھ گئی۔

شبانہ کو اجازت مل چکی تھی۔ اب وہ پورے اعتماد کے ساتھ ریسرچ رپورٹ مکمل کر سکتی تھی۔ اسے اپنی بات منوا لینے کی خوشی نہیں تھی اور نہ ہی اپنی انا کی تسکین چاہتی تھی۔ بلکہ اسے اپنی ذات پر یہ اعتماد بڑھتا ہوا محسوس ہوا کہ جو کچھ وہ سوچ رہی ہے اور جس مقصد کے لیے وہ قدم بہ قدم آگے بڑھ رہی ہے، وہ غلط نہیں ہے۔ وہ اپنا آپ منوانا چاہ رہی تھی۔ جس وقت اس نے شوبز کا موضوع لیا تھا، سب نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا اور آخر میں سعد نے اظہار بھی کر دیا تھا۔ اگر وہ اپنی تحقیق مکمل کر گئی تو یقیناً اس کے بارے میں یہ تاثر بن جائے گا کہ وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ آئندہ آنے والے دنوں کے لیے اسے یہی تاثر چاہیے تھا۔ اگر وہ ناکام ہو گئی تو پھر میڈیا کی تعلیم حاصل کرنا ہی بے مقصد تھا۔ میڈیا کے لیے تخلیقی ہونے کے ساتھ ساتھ باصلاحیت، بااعتماد اور باکردار ہونا اولین شرط ہے۔ ورنہ پھر کسی کی بانسری بجانے والے لوگ ہی رہ جاتے ہیں۔ ان کی اپنی ذات کی اہمیت بالکل ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس نے اپنے کمرے میں آ کر کلاک پر وقت دیکھا اور کاغذ لگا کلپ بورڈ اٹھا لیا۔ وہ اس لمحے سے اپنے کام کا آغاز کر دینا چاہتی تھی۔

❀......❀......❀

صبح کا سہانا وقت تھا۔ سورج ابھی نکلنا ہی چاہتا تھا۔ مشرقی افق دھیرے دھیرے نارنجی ہونا شروع ہو گیا تھا۔ جب زرق شاہ آؤٹ ڈور لوکیشن پر پہنچا۔ وہ رات ہی یونٹ کے ساتھ وہاں آ گئے تھے اور اس جگہ سے تھوڑے فاصلے پر حویلی میں ٹھہرے تھے۔ جس جگہ سین فلمایا جانا تھا۔ وہ گاؤں سے باہر ایک ڈیرہ تھا۔ وہیں پورا یونٹ اپنے اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ اس سیریل میں زرق شاہ ایک جاگیردار کا بیٹا بنا ہوا تھا جو کچھ عرصے قتل ہو جاتا ہے اور تمام تر جاگیرداری انتظام اس کی ماں "بے جی" چلا رہی ہوتی ہے۔ وہ اپنی ماں کا اس حد تک احترام کرتا ہے کہ اگر وہ کوئی غلط اور بے جا فیصلہ بھی کر لیتی ہے تو یہ نہ صرف قبول کرتا ہے، بلکہ اس فیصلے پر عمل درآمد بھی کرواتا ہے۔ وہ لندن سے اپنی تعلیم فقط اس لیے ادھوری چھوڑ کر آ جاتا ہے کہ وہ اکیلی نہ رہے اور اس کا ہاتھ بٹائے۔ وہ اپنے باپ کے قاتلوں کو بھی تلاش کرتا ہے۔ یوں زیادہ تر گاؤں، حویلی اور ان کھیتوں کی سائیٹ پر سین تھے جو باقر رضوی پہلے شوٹ کر لینا چاہتا تھا۔ پھر اس کے بعد ہی وہ شہر میں اپنا کام مکمل کرنا چاہتا تھا۔

سین کے مطابق زرق شاہ اس وقت میک اپ میں تھا۔ کیمرہ اسی پر کھلنا تھا۔ ڈرامے کا آغاز ہی یہیں سے ہونا تھا کہ وہ کھیتوں میں جاگنگ کرتا ہوا ڈیرے پر آتا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے گاڑی ہے جس پر گن مین ہیں۔ زرق شاہ ٹریک سوٹ میں ملبوس تھا۔ ایک ہاتھ میں تسبیح اسٹک تھی اور دوسرے ہاتھ میں سگریٹ تھا۔ سین شروع ہونے کا منتظر تھا۔ رات سے لے کر اب تک اسے احساس ہو گیا تھا کہ باقر رضوی اسے بڑی اہمیت دے رہا ہے۔ وہ اپنے دل

ہی دل میں ٹھان چکا تھا کہ وہ بڑا دل لگا کر کام کرے گا تا کہ اس پر مزید راہیں کھل جائیں۔ اس سین میں ایک بھی مکالمہ نہیں تھا۔ اس کے بعد والے سین میں مکالمے تھے۔ سب کچھ تیار ہو گیا تو اسے آواز دی گئی۔ اس نے سگریٹ ایک جانب پھینکا اور کیمرے کے سامنے چلا گیا۔ تھوڑی دیر تک اسے مختلف پہلوؤں سے شوٹ کیا گیا۔ ہر بار اسے بھاگنا پڑتا۔ یہاں تک کہ وہ سین اوکے ہو گیا تو ڈیرے پر سین فلمانے کی تیاریاں شروع ہونے لگیں۔ باقر رضوی اس کی فطری تھکن کے ساتھ ہی وہ سین فلمانا چاہتا تھا۔ اس لیے بہت جلد اسے کیمرے کے سامنے بلالیا گیا، یہاں تک کہ اسے ایک سگریٹ بھی نہیں پینے دیا گیا۔ پھر ڈیرے پر کافی دیر تک شوٹنگ کے بعد زرق شاہ کا کام ختم ہو گیا۔ وہ پھولے سانس کے ساتھ ایک طرف پڑی ہوئی کرسی پر آبیٹھا۔ تب تک دن کافی حد تک نکل آیا تھا۔ روشنی ہر سو پھیل گئی تھی۔ وہ اپنے پھولے ہوئے سانس کو درست کر رہا تھا کہ اس وقت اس کا سیکرٹری فدا منرل واٹر کی بوتل لے کر اس کے پاس آگیا۔

''یہ لیں سر جی۔'' اس نے خوشامدانہ لہجے میں بوتل آگے بڑھائی۔

''سگریٹ دو۔'' زرق شاہ نے بوتل پکڑتے ہوئے کہا اور پھر منہ کو لگالی۔ فدا نے ایک سگریٹ نکالی اور اس کے ہونٹوں میں دیتے ہوئے پوچھا۔

''تھک تو نہیں گئے آپ؟'' یہ کہہ کر اس نے لائٹر سے سگریٹ سلگا دیا تب وہ کش لے کر بولا

''قصائیوں کی طرح کام لیتا ہے؟'' یہ کہ اس نے ساتھ میں زوردار گالی نتھی کردی۔

''یہ تو ہے سر جی، مگر مجبوری ہے۔'' فدا نے چاپلوسی سے کہا، حالانکہ اسے بھی ساری صورت حال کا پتہ تھا۔

''اچھا یار بھوک بڑی لگی ہے، ان کا تو پتہ نہیں کب بریک ہوگا، تو مجھے کچھ کھانے کے لیے دے۔'' زرق شاہ نے اکتائے والے انداز میں کہا۔

''میں اپنے ساتھ کچھ پھل لے آیا تھا، وہی لاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے پلٹ گیا۔ زرق شاہ نے کرسی پر بیٹھے ہوئے ٹانگیں پھیلائیں اور سامنے ہونے والی شوٹنگ دیکھنے لگا جو بقیہ اداکاروں کے ساتھ ہو رہی تھی۔ وہ اسی محویت میں دیکھ رہا تھا کہ ڈیرے کے باہر کار آ کر رکی اور ساتھ ہی ہارن کی آواز آئی۔ اس نے یونہی سرسری سا پلٹ کر دیکھا، وہ ہما کی گاڑی تھی اور اس میں بیٹھی ہما اُسے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اگلے چند لمحوں میں وہ گاڑی سے نکل کر سیدھی اس کی طرف بڑھ آئی۔ وہ دور ہی سے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ پھر قریب آ کر اس نے بڑے جوش کے ساتھ ہاتھ ملایا اور بولی۔

''کام ختم ہو گیا تمہارا؟''

''نہیں، ابھی تھوڑا سا ہے مگر تم ادھر کہاں، تمہارا تو یہاں کوئی کام نہیں ہے۔'' زرق شاہ نے حیرت سے پوچھا

''یہیں پر میرے کچھ سین ہیں۔ اب پتہ نہیں لوکیشن کیا ہے۔ بس رضوی صاحب نے بلالیا ہے مجھے۔'' وہ اٹھلاتے ہوئے بولی تو زرق شاہ نے اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ سیاہ رنگ پتلون کے ساتھ گلابی شرٹ اور گلے میں نیلے رنگ کا مفلر تھا۔ سنہری کیے ہوئے بال کندھوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ چہرے پر بے تحاشا میک اپ کیا ہوا تھا۔ پھر اس نے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارا کتنا کام رہ گیا ہے یہاں؟''

''شاید کل تک یہ سارے سین ختم ہو جائیں۔ پھر یہیں پاس ایک حویلی ہے، اس میں ایک دو دن کا کام ہوگا۔ میرے خیال میں تین دن ہیں، میرا کام ختم ہو جائے گا۔'' زرق شاہ نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا۔

''بس میرا ابھی ایک دو دن کا کام ہے۔'' ہما نے اپنے بالوں کو جھٹکتے ہوئے کہا۔

''اچھا ہوا یار تم آگئیں، بہت بوریت ہے یہاں پر۔'' اس نے دور تک پھیلے کھیتوں کو دیکھتے ہوئے کہا تو اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

''ٹھہرے کہاں پر ہیں؟''

''اس حویلی کے ایک پورشن میں، یہ سارا یونٹ یہیں اس ڈیرے پر ہوتا ہے۔'' وہ بولا پھر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''سناؤ خبریں کیا ہیں؟'' اس پر ہما نے قہقہہ لگایا اور بڑے مزے سے بولی۔

''وہ تمہارا یار بڑے غصے میں ہے۔ یہ سیریل کرنا چاہ

رہا تھا، نہیں ملا تو اب تمہارے خلاف بڑی باتیں کر رہا ہے۔''

''کیا۔'' زرق شاہ نے بھی ہنستے ہوئے پوچھا۔

''باتیں کیا ہونی ہیں۔ وہی کہ زرق شاہ کو کام نہیں مل رہا تھا، وہ اب ختم ہو رہا ہے، وغیرہ وغیرہ....'' ہما نے کہا پھر چونکتے ہوئے۔ ''تم ایسا کرو، میرے ساتھ ایک اسکینڈل بنالو، بڑا مزا آئے گا، خواہ مخواہ کی شہرت اور حاسدوں کو بھی خوب جلائیں گے۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ کیا فائدہ یار ایویں لوگوں کو وضاحتیں کرنا پڑیں گی۔'' اس نے مایوسی میں کہا۔

''یہ بھی تو دیکھو شہرت کس قدر ملے گی۔ بہت کچھ حاصل کرنے کے لیے، کچھ نہ کچھ تو کھونا پڑتا ہے۔ وضاحتوں کے دوران ہی اس معاملے کو ہوا ملے گی۔'' اس نے زرق شاہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر ابھی وقت نہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''وقت نہیں ہے، تم کچھ اور ہی سوچ رہے ہو؟'' ہما نے بھویں اچکاتے ہوئے وضاحت طلب انداز میں پوچھا۔

''ارے نہیں یار جو تمہارے ذہن میں ہے وہ بات نہیں۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ ابھی ہمیں تھوڑا مزید کام کر لینا چاہیے۔ اپنی پہچان کو مزید پختہ کر لینا چاہیے، پھر یہ تو فارغ وقت کی باتیں ہیں نا۔'' اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تمہاری بات کا جواب تو میں بعد میں دوں گی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ میرے ذہن میں کیا ہے، یہ تو بتاؤ۔'' ہما نے اپنی بات پر اڑتے ہوئے کہا۔

''اُو! تم نے غلط مطلب لے لیا، ایسا نہیں ہے کہ میں تمہارے مقام اور عوام میں مقبولیت کچھ کم سمجھتا ہوں یا تمہاری جگہ کسی اور کو دینا چاہتا ہوں، ایسا نہیں ہے۔'' اس نے وضاحت کی۔

''تو پھر کیا بات ہے؟'' ہما نے تیزی سے پوچھا

''دراصل شہرت کے لیے اب ایسی کوشش بے کار ہے۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ اس کے معیار بدل گئے۔ لوگوں کی سوچ بدل گئی ہے۔ جدید دنیا میں اب یہ چیزیں کوئی فائدہ نہیں دیتیں۔ کوئی وقت تھا جب اداکاروں کی زندگی بڑی پراسرار تھی۔ لوگ اُن کی نجی زندگی کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ مطلب اداکاروں میں ایک کشش تھی، اب ایسا کچھ نہیں ہے۔'' زرق شاہ نے اپنی سوچ بتائی تو ہما تیزی سے بولی۔

''پھر تو آج کے ایکٹر کو زیادہ محنت کی ضرورت ہے۔ لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اداکاری کے علاوہ اور کچھ کی بھی ضرورت ہے۔ تم نے تو میری بات کی تائید کی ہے۔''

''یہ جو تم کہہ رہی ہو نا اور بہت کچھ اس کے بھی معیار بدل گئے ہیں۔ اپنے ملک کی فلم انڈسٹری ختم ہو چکی ہے۔ حالانکہ یہ کبھی انڈسٹری تھی ہی نہیں۔ اس کی جگہ ڈراموں نے لے لی ہے۔ جو ٹکنیک کار تھا اب اس طرف آ گیا ہے۔ وہ جنہیں فلم انڈسٹری میں کوئی پوچھتا نہیں تھا، آج ڈرامے کی دنیا میں وہ چھائے ہوئے ہیں۔ اپنے رضوی صاحب ہی کو لے لو، یہ کیا تھے؟ آج کیا ہیں؟ کیا یہ اپنے کام، محنت یا تجربے کے باعث اس سطح پر ہیں کہ لوگ کروڑوں روپے ان پر لگا رہے ہیں۔ نہیں میری جان ایسا نہیں ہے۔ یہ سب گروپ بازی کا کمال ہے۔ گروپ سے باہر نکل کر جتنے مرضی اسکینڈل بنالو، کام نہیں ملے گا، میں یہ کہنا چاہتا ہوں۔'' اس نے تفصیل سے ہما کو سمجھایا۔

''کاش میں تعلیم حاصل کر لیتی، تمہاری طرح تجزیہ تو کر لیتی۔'' ہما نے یوں کہا جس کی زرق شاہ کو سمجھ نہ آسکی کہ وہ واقعی اپنی خامی کا احساس کر رہی ہے یا اس پر طنز کر رہی ہے۔

''یار تیرا حسن ہی ساری ڈگری ہے۔'' اس نے یونہی بات کہہ دی۔

''تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا

''نہیں، میں بالکل درست کہہ رہا ہوں۔ جب تک ہم اسکرین کے معیار پر پورے اترتے رہے، یہاں رہیں گے۔ اس کے بعد ہماری جگہ لینے کے لیے بہت سارے لوگ ہیں۔ میں نے معیار بدل جانے کی بات کی ہے، وہ غلط نہیں ہے۔ دیکھو سیدھی سی بات ہے۔ ہم لوگ تفریح سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ بندہ جو اپنی روزی روٹی کے چکر میں ہے، پریشان حال ہے، اسے تفریح سے کیا؟ یا دوسرے لفظوں میں ہم سے کیا؟''

"لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ ہے شاہ جی، کہ وہ اپنا غم بھلانے کے لیے ہمیں دیکھتا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"چلو میں تمہاری بات ہی مان لیتا ہوں مگر کب تک؟ کب تک دیکھے گا۔ بھوک ایک حقیقت ہے۔ جبکہ مجموعی طور پر ملکی صورت حال یہ ہے، انڈسٹری نہیں، بجلی نہیں، معیشت بے حال ہے تو ہمیں اسپانسر کون کرے گا۔ پروڈیوسر تو گھاٹے کا سودا نہیں کرے گا نا اور چینل کہاں سے اتنا سرمایہ دیتے رہیں گے؟" زرق شاہ نے اپنی رائے دی تو ہما نے سر جھٹکتے ہوئے کہا

"چلو چھوڑو۔ تم تو خوف ناک باتیں لے کر بیٹھ گئے ہو۔" یہ کہہ کر اس نے تھوڑے فاصلے پر کھڑے اپنے سیکریٹری کی طرف دیکھا اور اشارے سے اپنے سگریٹ منگوائے وہ تیزی سے آگے بڑھا اور سگریٹ لائٹر اسے تھما کر چلا گیا۔ ہما نے ایک سگریٹ سلگایا اور باقر رضوی کی طرف دیکھنے لگی جو کافی دور اپنے یونٹ کے ساتھ شوٹنگ میں مصروف تھا۔ زرق شاہ نے بھی سگریٹ سلگایا تو ان کے درمیان خاموشی آن ٹھہری۔ پھر ہما ہی نے اس خاموشی کو توڑا۔ "یار بھوک لگ رہی ہے۔ یہ لنچ بریک کب ہوگا؟"

"ہو جائے گا، میرے خیال میں یہ سین شوٹ ہوتے ہی۔" زرق شاہ نے اپنا اندازہ بتایا تو ہما نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہا

"ویسے نا اس ملک میں فن اور فنکار کی قدر نہیں ہے۔ وہ جتنا بھی شہرت یافتہ ہو جائے، معاشرے کے ایک خاص طبقے ہی میں شمار ہوتا ہے۔ تمہاری بات ٹھیک ہے کہ اب وہ قدر نہیں رہی، معیار بدل گئے ہیں، ایسا کیوں ہو جائی؟"

"میں نے شوبز کی دنیا میں آ کر تھوڑا بہت اسے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر لگتا ہے تم نے کچھ نہیں سیکھا۔ فن اور فنکار کی قدر تب ہوتی جب صحیح معنوں میں فن کو پیش کیا جائے اور فنکاروں کو ان کی جائز محنت ملے۔ یہ فن اور فنکار والی ساری بحث ہی فضول ہے۔ اب اصل تو ہے دولت کمانا، جس کے لیے یہ ساری بھاگ دوڑ ہے۔ فن کے بارے میں بھی تو ہم لوگوں نے اپنا معیار بدلا ہے۔ پہلے کہتے تھے کہ فن روح کو جولانی بخشتا ہے۔ آج کہتے ہیں کہ وہ فن اتنا ہی اعلیٰ ہوگا جس کے جتنے پیسے ملتے ہیں۔ اب فن کا معیار دولت ہے۔" زرق شاہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ ہما اس کی بات کا جواب دیتی، اس نے باقر رضوی کو دور سے آتے ہوئے دیکھا تو فوراً ہی کھڑی ہو گئی۔ زرق شاہ اس کی اضطراری کیفیت کو دیکھ کر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس نے سوچا اب تک جو اس نے اتنی باتیں کی ہیں ساری فضول بحث تھی۔ ہما اچھی طرح سمجھتی ہے کہ اس نے کیا کرنا ہے۔

❀......❀......❀

اس روشن صبح جب وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ پہنچی تو سعدیہ اس کی منتظر تھی۔ وہ تھوڑی سی پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ شبانہ اس کے قریب پہنچی تو علیک سلیک کے بعد اس نے پوچھا

"کیا بات ہے چہرے پر خوشگواریت نہیں ہے؟"

"یہ گھر والے بھی نا، اچانک کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کر دیتے ہیں۔ بس اسی وجہ سے۔" وہ اکتائے ہوئے انداز میں بولی۔

"کیا ہو گیا؟" اس نے ہمدردی سے پوچھا

"فاران سے رشتہ آ گیا ہے، وہ لوگ جلدی چاہ رہے ہیں۔ گھر والے بھی راضی ہیں۔ ان کا فرمان ہے کہ چھوڑو یہ سب اور چلی جاؤ اس کے ساتھ جسے میں پسند نہیں کرتی۔" سعدیہ نے یوں کہا جیسے وہ لڑنا چاہتی ہو۔ اس پر شبانہ نے چند لمحے سوچا اور بولی۔

"اگر تمہارے والدین راضی ہیں، وہ اگر اچھا سمجھتے ہیں تو۔"

"اونہیں! وہ اپنا بوجھ اتارنا چاہ رہے ہیں۔ اس معاشرے میں بیٹیاں بوجھ نہیں ہیں کیا؟" وہ جلے ہوئے لہجے میں بولی۔

"اچھا خیر آج صبح ہی صبح اسی بحث کو مت چھیڑو، جس کا حاصل کچھ نہ ہو۔ اپنا موڈ ٹھیک کرو۔" شبانہ نے کہا تو وہ سر کو جھٹکتے ہوئے خاموش رہی۔ تب جب ہی کہ شبانہ نے پوچھا۔

"میڈم آ گئی ہیں کیا؟"

"ہاں، اپنے آفس میں ہیں۔" اس نے ہولے سے کہا

"چلو آؤ، ان سے ملتے ہیں۔" وہ بولی۔

"تم جاؤ، میں یہیں ٹھیک ہوں۔" سعدیہ نے کہا تو شبانہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر آگے بڑھ گئی۔ اسے سعدیہ کا رویہ اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں بنائی دنیا میں آباد رہنا چاہتی تھی۔ جس کا حقیقت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا۔ یہ کوئی ایک دن کی بات نہیں تھی۔ ایسی خیالی دنیا میں رہنے والی لڑکیاں ایک ہی دن میں اپنا ماحول خود نہیں بنا لیتی۔ اس معاشرے میں رہتے ہوئے آہستہ آہستہ ان کے ذہنوں میں یہ خیالی دنیا تخلیق ہوتی ہے۔ اس خیالی دنیا کی تعمیر میں جو بھی رنگین ساز و سامان اکٹھا کیا جاتا ہے، وہ اسی معاشرے کی حقیقی دنیا سے لیا جاتا ہے۔ ناآسودگی کا احساس اس خیالی دنیا میں رہ کر ہی ختم کیا جاتا ہے۔ اس دنیا میں رہتے ہوئے وہ خود مالک ہوتی ہیں۔ جو چاہیں سو کریں۔ تشنہ خواہشوں کی تسکین یہیں ہو جائے تو پھر حقیقی دنیا کی تلخیاں کون برداشت کرے۔ اس نے سوچا کہ وہ سعدیہ سے اس موضوع پر بات کرے گی۔

"میڈم! کیا میں آ سکتی ہوں۔" اس نے دروازے میں کھڑے ہو کر اجازت چاہی۔ تو میڈم نے اپنی عینک میں سے جھانکتے ہوئے اس کی جانب دیکھا اور پھر خوشگوار سے انداز میں بولی۔

"آؤ...... آؤ...... شبانہ آؤ۔"

"شکریہ میڈم۔" اس نے میز کی دوسری جانب پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا اور بڑے احترام سے پوچھا۔ "آپ کے پاس وقت ہے تو میں اپنی ریسرچ رپورٹ کے حوالے سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔"

"ہاں ہاں بولو یقیناً تم اپنا موضوع بدلنا چاہ رہی ہو گی۔" میڈم نے ہنستے ہوئے کہا جیسے اسے یہی امید تھی۔

"نہیں میڈم، بلکہ میں اس پر بنیادی کام کر کے آئی ہوں۔" شبانہ نے کہا تو میڈم چونک گئی۔

"واہ! مطلب کیا تمہارے گھر والوں نے اجازت دے دی؟"

"جی۔" اس نے اختصار سے کہا اور اپنی فائل میں سے چند کاغذ نکال کر میڈم کے سامنے رکھ دیے اور بولی۔ "یہ ایک خاکہ ہے، آپ دیکھیں اور میری راہنمائی کریں کہ کیا میں اس پر کام کر لوں، یا مزید کوئی؟"

"ویسے مجھے یقین نہیں تھا کہ تمہیں گھر سے اجازت مل جائے گی، میں آپ کے والد صاحب کے بارے میں جانتی ہوں۔ وہ شہر کے معروف بزنس مین ہیں۔ لیکن اچھے خاصے مذہبی بھی ہیں۔"

"اچھی بات ہے نا میڈم وہ مذہبی ہیں۔ آپ کو بھی اور مجھے بھی مذہبی تو ہونا چاہیے۔" شبانہ نے صاف لفظوں میں کہا

"مذہبی ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ بندہ دائروں میں بند ہو کر رہ جائے۔" میڈم نے بحث چھیڑنا چاہی تو وہ فوراً بولی۔

"اس کا ثبوت یہ ہے کہ میرے والد صاحب نے مجھے دائروں میں بند نہیں کیا۔ میں ان فضاؤں میں آزادانہ اڑ سکتی ہوں۔ اب یہ میرا کام ہے نا کہ میں اپنی حدوں کو پہچانوں، انہوں نے مجھے تعلیم دے دی۔ اچھا بھلا سمجھا دیا۔ مذہب بندے کو قید نہیں کرتا اور خصوصاً دین اسلام تو ہر طرح کی غلامی سے آزاد کراتا ہے۔ اب انسان اپنے آپ کو اپنی خواہشوں کے مطابق غلام بنا لے تو الگ بات ہے۔" شبانہ نے دبے دبے جوش سے کہا مگر احترام ملحوظ خاطر رکھا۔ اس پر میڈم نے اس کے حجاب میں لپٹے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا، پھر مسکراتے ہوئے بولیں۔

"یہ تم اپنی وکالت کر رہی ہو یا پھر اس خاص طبقے کی جسے مذہبی کہا جاتا ہے؟"

"میں ان اصولوں کی بات کر رہی ہوں جو ہمارے دین نے ہمیں دیے۔ بلاشبہ میں کوئی ایسا اختیار نہیں رکھتی کہ فتویٰ جاری کر دوں۔ لیکن تجزیے کے لیے، غور و فکر کرنے کے لیے سوچ تو رکھتی ہوں۔ اس کے مطابق میں یہی سمجھتی ہوں کہ جو اصولوں پر کاربند رہا وہ کامیاب ٹھہرا، جو انحراف کرتا ہے، وہ چاہے کوئی بھی ہو وہ ناکام رہتا ہے۔" شبانہ نے اپنی رائے دے دی۔

"اس کا مطلب ہے تم سمجھتی ہو کہ وہ خاص طبقہ کہیں نہ کہیں انحراف کرتا ہے۔" میڈم نے اپنی بات منوانا چاہی۔

"اس کا نتیجہ سامنے آ جاتا ہے۔ نتیجہ ظاہر کر دیتا ہے کہ فیصلہ کیسا تھا؟" اب کے شبانہ نے خاصے محتاط انداز میں کہا۔

"خیر! مجھے خوشی ہوئی کہ تم مثبت سوچ رکھتی ہو اور تمہارے والدین کو تم پر اعتماد ہے۔" یہ کہتے ہوئے میڈم

نے اس کے لکھے ہوئے کاغذات پر نگاہ ڈالی۔پھر کچھ دیر پڑھتے رہنے کے بعد سر اٹھاتے ہوئے کہا۔"بالکل ٹھیک ہے۔اس میں کچھ انٹرویوز ہوں گے تاکہ رپورٹ جاندار بن جائے۔"

"جی میڈم! یہی تو میں چاہ رہی تھی کہ آپ راہنمائی کریں کہ مجھے کن لوگوں کے انٹرویوز کرنا ہوں گے۔باقی اخبار اور میگزین وغیرہ تو میں لائبریری سے دیکھ لوں گی۔"

"ہاں، وہ بتاتی ہوں۔ویسے اس میں سروے رکھ کر تم نے اچھا کیا۔"میڈم نے کاغذات پر دیکھتے ہوئے کہا۔پھر سر اٹھاتے ہوئے وہ کچھ دیر تک اسے بتاتی رہی کہ کیا کچھ کرنا ہے۔شبانہ مطمئن ہوگئی تو میڈم نے پوچھا۔"تم فکر نہ کرو، یہاں سے میرا خیال دو تین اور اسٹوڈنٹ ہیں۔جن کی ٹی وی کے متعلق ریسرچ ہے۔آپ لوگ اکٹھے چلے جانا۔"

"وہ میں دیکھ لوں گی کہ کس طرح سہولت رہتی ہے۔آپ بس ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے لیٹر بنوا دیں۔"اس نے کہا

"ہاں، وہ کل مل جائے گا تمہیں اور کوئی بات؟"میڈم نے پوچھا۔

"بہت شکریہ۔"شبانہ نے کہا اور اٹھ گئی۔

وہ آفس سے باہر نکلی تو اس کی توقع کے مطابق سعدیہ وہیں راہداری میں کھڑی سوچوں میں گم تھی۔وہ اس کے قریب چلی گئی۔سعدیہ نے اس کا احساس کرکے زخمی سی مسکراہٹ چہرے پر سجالی۔

"ارے واہ۔لگتا ہے کہ اس وقت دنیا کی مظلوم ترین مخلوق تم ہی ہو۔"شبانہ نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"مجھے کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا ہے، اس لیے کیا کروں؟"وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"آؤ، چلو لان میں بیٹھتے ہیں۔وہیں باتیں کرتے ہیں۔"شبانہ اسے ساتھ لے کر کاریڈور سے نکلی۔راستے میں دونوں خاموش رہیں اور لان میں آگئیں۔لان کے گوشے میں ایک سنگی بینچ خالی تھا۔وہاں اور اسٹوڈنٹ بھی تھے۔وہ دونوں اس سنگی بینچ پر جا بیٹھیں تو شبانہ نے کہا۔

"دیکھو سعدیہ، تمہیں مظلوم بننے کی ضرورت نہیں اور نہ میں یہ کہوں گی کہ تم اپنے والدین سے کوئی بدتمیزی والا رویہ اپناؤ۔انہیں بتاؤ کہ تم کیا چاہتی ہو۔میرا نہیں خیال کہ وہ تمہاری بات رد کریں گے۔"

"تم پتہ نہیں کس طرح سوچتی ہو۔میں اپنے والدین کو زیادہ جانتی ہوں۔ان کا معیار امارت ہے۔جس لڑکے سے وہ میری شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔اس کا بزنس تین ملکوں میں پھیلا ہوا ہے۔اس کے لیے تو میرے والدین مجھے قربان کردیں گے۔"سعدیہ نے کہا۔

"تم اپنی بات دلائل سے ثابت کرو کہ تم اس کے ساتھ اچھا وقت نہیں گزار پاؤ گی۔"شبانہ نے کہا۔

"اس معاملے میں وہ مجھے جاہل اور احمق کہتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ دولت سے ہر شے خریدی جاسکتی ہے۔یہاں تک کہ سکون بھی۔تیز دھوپ میں، اے سی کے پرسکون ماحول میں وقت، وہی وقت گزار سکتا ہے، جس کے پاس دولت ہے۔غریب آدمی یا تو گرمی جھیلے گا یا پھر تیرے جیسے ناصحوں کے دیئے قناعت کے درس کو یاد کرتے ہوئے وقت گذارے گا۔دولت ایک حقیقت ہے۔میں بھی مانتی ہوں مگر بندے کا کوئی کردار تو ہونا چاہیے۔"سعدیہ نے تیز لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"وہ بولی۔

"وہ شراب پیتا ہے، عورتوں کی محفلوں میں خوش رہتا ہے، یہ ان کے ماحول کی عام سی باتیں ہیں۔ان کی عورتیں کیا کرتی ہیں۔یہ بھی مجھے معلوم ہے۔میں نہیں سمجھتی کہ میں اس ماحول میں خود کو ایڈجسٹ کر پاؤں گی۔"سعدیہ نے تقریباً رو دینے والے انداز میں کہا تو وہ چونک گئی۔یقیناً وہ کچھ دیر پہلے غلط سوچ رہی تھی۔وہ اسے محض خیالی دنیا میں رہنے والی لڑکی تصور کرکے بدگمانی کرچکی تھی۔یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔تب اس نے سوچتے ہوئے پوچھا

"تمہیں اس ماحول سے نفرت ہے یا اس بندے کے کردار سے؟"

"ظاہر ہے بندہ، اس کا کردار ہی ماحول بناتا ہے نا۔"یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بڑے کرب سے بولی۔"شبانہ، تم زندگی کو دو اور دو چار کے حساب سے دیکھ رہی ہو، لیکن ایسا ہے نہیں۔ہر عورت کے من میں ایک گھر کا تصور موجود ہوتا ہے۔اور گھر پرسکون اور محبت کی لطافتوں سے رچا بسا ہوتا ہے۔ان ساری چیزوں کو انسان بناتا ہے۔

اگر میری حیثیت ایک شوپیس کی ہے تو اس میں میری مرضی کا تھوڑا بہت دخل تو ہوگا۔"وہ اجنبی سے لہجے میں بولی۔

"ویسے میں یہی سمجھتی تھی کہ تم ایک خیالی دنیا میں رہنے والی لڑکی ہو اور۔"شبانہ نے کہنا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"خیالی دنیا سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا۔ہر ایک کے ذہن میں ہوتی ہے۔یہ نہ ہو تو وہ زندگی کا تصور نہیں کر سکتا۔میرے من میں بھی ہے اور تمہارے من میں بھی یقیناً ہوگی۔اسے ہم مختلف نام دے دیتے ہیں۔قدرت نے یہ بڑا اچھا کیا ہے کہ انسان کو یہ صلاحیت بھی دے دی ورنہ تو گھٹ کر مرجاتا۔اب یہ مت پوچھنا کہ میرے من میں کیا ہے۔"

"ایسا بھی نہیں ہوسکتا نا کہ معاشرتی پابندیوں سے ماورا ہو کر ایک انسان کو آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ جو چاہے سو کرے۔"شبانہ نے جان بوجھ کر یہ کہا تاکہ اس کے اندر کا غبار صاف ہوجائے۔

"انسان کبھی بھی آزاد نہیں رہ سکتا۔اس کی اپنی جسمانی ساخت ہی اسے دوسروں کا محتاج کردیتی ہے۔اسی وجہ سے ہی تو اس نے معاشرتی زندگی کو اپنایا ہے۔آزادی کا مطلب یہ نہیں کہ دوسروں پر جبر کیا جائے۔آزادی تو یہ ہے کہ انسان کو مثبت قوتوں کو اظہار کے ایسے مواقع ملیں کہ وہ آزادی سے اپنی صلاحیتیں آزما سکے۔اب مجھے وہ ماحول پسند نہیں اور نہ ہی میں اس ماحول میں جینا چاہتی ہوں لیکن مجھے اس جانب دھکیلا جارہا ہے۔میں اس پر بات کروں گی تو یہی معاشرہ مجھے سب سے پہلے مطعون قرار دے دے گا کہ میں اپنے والدین سے بغاوت کررہی ہوں۔ایک شاندار زندگی کو ٹھوکر مار رہی ہوں۔لوگ تو ترستے ہیں۔بھئی وہ ترستے رہیں، میرے لیے وہ شاندار نہیں ہے۔"سعدیہ الجھے ہوئے انداز میں کہتی چلی گئی۔

"تو پھر تم کیا کرو گی؟"شبانہ نے ہولے سے پوچھا۔

"میں نے کیا کرنا ہے، ایک مشرقی لڑکی کی مانند وہی کروں گی جو میرے والدین چاہیں گے۔پھر ساری زندگی عذاب بھگتوں گی۔اپنی مرضی سے ہٹ کر جیوں گی۔اپنی ناآسودہ خواہشوں کی تکمیل میں زندگی گذارتے ہوئے ایک دن یونہی ختم ہو جاؤں گی۔"اس نے انتہائی مایوسی سے کہا۔لیکن شبانہ کے لیے ایک سوچ چھوڑ گئی۔وہ چند لمحے اس نکتے کو ذہن میں بٹھانے کے لیے خاموش رہی، پھر بولی۔

"اتنا مایوس بھی نہیں ہوتے۔اپنی ساری سوچوں کو جھٹک دو۔آؤ، تمہیں ایک مزے کی کافی پلاؤں۔اپنا موڈ خوشگوار کرو کل اس پر بات کریں گے۔کل تک کے لیے اسے بھول جاؤ۔"

"ایسے ہوگا نہیں۔لیکن تم کہتی ہو تو کوشش کرتی ہوں۔"سعدیہ نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا اور اٹھ کر اس کے ساتھ چل دی۔

اس دن کیمپس سے آنے کے بعد شبانہ نے ظہر کی نماز ادا کی اور اپنے بیڈ پر ایک جانب سمٹ کر بیٹھتے ہوئے سعدیہ کے بارے میں سوچنے لگی کہ وہ جتنی آزاد ہے، اپنے ماحول میں اس قدر روشن خیال تصور کی جاتی ہے۔لیکن اس کا خمیر تو مشرقی ہے، مشرقی عورت اپنی سوچ اور ماحول کے تابع جتنی مرضی آزاد ہوجائے لیکن اس کی کہیں نہ کہیں ایک حد اسے شرم یا حیا کا احساس دے جاتی ہے۔اور پھر سعدیہ ایسی لڑکی نہیں ہے جو مکمل طور پر مغربی ثقافت کی دلدادہ ہے یا اس طرز کی زندگی چاہتی ہے۔کچھ ایسا ہے، جس کے باعث وہ کسی ایسے شخص سے متنفر ہے اپنی ازدواجی زندگی میں بھی آزادی کا قائل ہے۔اس نے کہا کہ اس کے والدین ایسی سوچ رکھتے ہیں کہ دولت سے ہر شے خریدنا ممکن ہے۔تو بھلا حیا یا شرم بھی خریدی جاسکتی ہے؟ پاک دامنی دولت سے لاسکتے ہیں؟ لیکن ان کے ہاں اس کا احساس نہیں ہے، قدر و قیمت نہیں ہے۔ایسی باتوں کی تو وہ گنتی میں ہی نہیں لاتے۔شبانہ کو یہ سب سوچتے ہوئے حیرت ہو رہی تھی کہ سعدیہ کے جو بھی خیالات رہے ہوں وہ اس سے جتنا مرضی بحث کرتی ہے۔نجانے کہاں کہاں سے دلائل اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیتی ہے۔اس کے حجاب کا، گھٹے ہوئے ماحول کا، مذہبی تنگ نظری کا یا جو بھی وہ اس کی مخالفت میں کہتی تھی۔دراصل وہ اس کے اپنے ہی الجھے ہوئے خیالات ہیں۔اس کے پاس غور و فکر کے لیے جو مرکزی نقطہ نہیں ہے۔جس کے محیط پر وہ اپنی سوچ کو پختہ کر سکے۔ابھی اس کی مٹی میں نم ہے۔وہ زرخیز ہے، اس کی زمینِ فکر پر اگر جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا ہے تو اس میں قصور اس کا

نہیں، اس ماحول کا ہے۔ جس نے درست فصل کا بیج نہیں بویا۔ ورنہ فکر ثمر آور ضرور ہوتی۔ اب اگر اس سے یہ توقع کی جائے کہ فوراً زرخیز زمین ثمر آور فصل دے دے گی تو یہ سوچ درست نہیں ہے۔ پہلے جھاڑ جھنکاڑ صاف کرنا ہوگا۔ پھر کہیں جا کر زمین تیار ہوگی اور تب بیج ڈالا جائے گا۔ یہ اس کی غلطی تھی کہ وہ سعدیہ کو پہچان نہیں سکی۔ اس نے کبھی کوشش نہیں کی تھی کہ اس کے من کو ٹٹول سکے۔ بس اپنی ہی کہتی رہی تھی۔ اس کا ظاہر دیکھ کر طے کر لیا کہ وہ ایک خواب زدہ لڑکی ہے۔ شبانہ کے اندر اپنی غلطی کا احساس ابھرنے لگا۔ یہ اس کی اپنی کوتاہی تھی کہ وہ اسے سوچ فکر نہیں دے سکی۔ اگرچہ اس کا ارادہ تھا کہ وہ کسی وقت اسے بتائے گی کہ میں حجاب کیوں لیتی ہوں۔ پھر سعدیہ کا جی چاہے تو اسے قبول کرے یا نہ کرے۔ اور طرح کی بہت ساری باتیں تھیں جو ان کے درمیان ہوتی رہتی تھیں۔ یہ اچھا ہوا کہ وہ ایسے اپنے خیالات بتا دیتی تھی۔ لیکن جہاں وہ ہٹ دھرمی پر اترتی تو خاموش ہو جاتی۔ اب وقت اور حالات نے اسے ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا جہاں وہ ٹھٹک کر کھڑی تھی۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب اس کی بھرپور رہنمائی کی جا سکتی تھی۔

شبانہ نے یہ سب بڑے خلوص سے سوچا اور پھر اپنے طور پر ایک فیصلہ کر لیا۔ وہ سعدیہ کی مدد ضرور کرے گی۔ یہ اس کا حق ہے اور فرض بھی۔ یہ فیصلہ کر کے اسے بہت آسودگی محسوس ہونے لگی تھی۔

❁……❁……❁

زرق شاہ کو آؤٹ ڈور پر آئے ہوئے تیسرا دن تھا۔ اگرچہ گاؤں کا وہ سادہ ماحول، خوشگوار اور دلفریب نظارے بہت بھلے لگ رہے تھے لیکن دن رات کی شوٹنگ سے وہ تنگ آ چکا تھا۔ ہما جو اس کے ساتھ اسکینڈل بنوانے اور خلوص سے دوستی نبھانے کی باتیں کرتی رہی تھی، دوسرے دن ہی واپس چلی گئی تھی۔ اس نے بڑے سکون سے کہہ دیا تھا کہ شوٹنگ ہے یار کیا کروں لوکیشن پر جانا ہے۔ اور وہ بڑے سکون سے سنتا رہا اور اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔ جیسے ہی وہ گئی تو زرق شاہ کا یہ احساس مزید بڑھ گیا کہ دنیا کس قدر خود غرض ہے۔ صرف اپنے مطلب کے لیے کتنی میٹھی زبان استعمال کرتی ہے۔ وہ ہما کی ساری باتیں مان لیتا تو شاید وہ ایک دن مزید اس کے لیے رک جاتی۔ پھر خود ہی یہ سوچ کر مسکرا دیا کہ وہ کس ناتے رک جاتی۔ ان میں نہ تو کوئی دوستی ہے اور نہ ہی کوئی ایسا تعلق جس پر مان کیا جا سکتا ہو۔ اسے اتنے لوگوں کے درمیان بھی شدید تنہائی کا احساس ہوا اور یہ احساس تیسرے دن مزید بڑھ گیا۔ تب اس نے باقر رضوی سے پوچھا۔

''رضوی! میرے کتنے سین رہ گئے ہیں؟''

''بس ایک ہی ہے میری جان، آج شام تم واپس چلے جاؤ گے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو کر لیں نا وہ، میں جاؤں۔'' زرق شاہ نے بظاہر مسکراتے ہوئے کہا لیکن لہجہ اکتاہٹ بھرا تھا۔

''بس تھوڑا صبر، کر لیتے ہیں وہ بھی۔'' باقر رضوی نے کہا۔

''ٹھیک ہے رضوی صاحب، جیسے آپ کہیں۔'' اس نے کہا اور الگ سے جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس وقت حویلی کے اندر ایک سیٹ پر ''بے جی'' کے سین تھے۔ زیادہ تر سین ہو چکے تھے۔ بس صحن میں ایک جذباتی سا سین رہتا تھا۔ بے جی کا کردار کرنے والی ایکٹر بڑی دھانسو قسم کی عورت تھی۔ وہ ابھی تک تیار ہو کر باہر نہیں نکلی تھی۔ سارا یونٹ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ زرق شاہ کی ذہنی رو اس عورت کی طرف چلی گئی۔ وہ اس ڈرامہ سیریل میں اس کی ماں بنی ہوئی تھی لیکن حقیقی دنیا میں وہ شاید اسے احترام کا درجہ بھی نہ دیتا۔ فطری طور پر شوبز کی دنیا میں بھی طاقت ہی چلتی تھی۔ جس ایکٹر اور فنکار کی پشت پر کوئی جتنا طاقت ور ہاتھ ہوتا تھا وہ اس دنیا میں اتنا زیادہ ہی دکھائی دیتا ہے۔ اصل میں یہاں سرمایہ کاری کرنے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جو خود طاقتور ہوں۔ انہیں تو وہی لوگ عزیز ہوں گے جو نہ صرف ان کے لیے سرمایے کی حفاظت کریں بلکہ ان کے بھی خیر خواہ ہوں۔ کسی زمانے میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ جس نے کالے دھن کو سفید کرنا ہے وہ یہاں سرمایہ کاری کرے۔ بڑا منافع بخش کاروبار ہے۔ اور یہی وجہ بنی کہ فلم انڈسٹری زوال پذیر ہوتی چلی گئی۔ پھر اداکاروں کی کھیپ میں سارے وہی لوگ تو نہیں ہوتے جو فن ہی کے لیے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بڑے مقصد ہوتے ہیں جنہیں حاصل کیا جاتا ہے۔ زرق شاہ سوچتے سوچتے پھر

وہی پرانی بات سوچنے لگا کہ آخر میں کیوں اس دنیا میں اتنی محنت کرتا چلا جا رہا ہوں؟

وہ ایک امیر باپ کا بیٹا تھا۔ جس کا بزنس پھیلا ہوا تھا۔ دولت کی اس کے پاس کمی نہ تھی۔ عزت تو اس کے اردگرد رہنے والے بھی لوگ کرتے تھے۔ ایک شہرت تھی جس کے لیے اس نے یہ راستہ چنا۔ شوبز کی دنیا میں چکاچوند ہی تو ہوتی ہے۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ گلیمر کی اس دنیا میں کس قدر اکتاہٹ اور پریشانی ہے۔ اسکرین پر دکھائی دینے والی دنیا اس کے دماغ پر اس طرح چھا گئی کہ اس نے اداکار بننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ شروع شروع میں اس نے بڑی دولت لگائی تھی۔ اس دور میں ایک جنون تھا کہ میں یہ مقام حاصل کر کے رہوں گا جس کی تمنا میرے دل میں ہے۔ یہی جنون اسے آگے ہی آگے لے جاتا رہا اور اس وقت وہ اپنے طے کیے مقام کے لب بام پر تھا۔ وہ اکثر سوچتا کہ اس راہ میں گنوایا کیا ہے؟ صرف اور صرف اپنے والدین اور بہن کے ساتھ گزارا جانے والا وہ وقت جو انہیں دینا چاہیے تھا۔ گذرتے وقت کے ساتھ گھر والوں نے بھی اسے نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ تاہم اس نے پایا بھی بہت کچھ تھا۔ مطلب نکل جانے پر فوراً آنکھیں پھیر جانے والے، دوسروں کو لتاڑنے اور ان کا حق غصب کرنے والے، سازشیں کر کے اپنی جگہ بنانے والے، سادہ اور پرخلوص لوگ جو اسے سراہتے تھے، کبھی کبھی تو وہ ایسی دنیا میں پہنچ جاتا جہاں وہ خود حیران رہ جاتا کہ لوگ ایسی محبت سے بھی ملتے ہیں۔ شوبز کی دنیا کو وہ جس قدر جانتا چلا جا رہا تھا۔ اس کا اپنا آپ بھی ویسا ہی ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس ماحول کا رنگ ڈھنگ وہ اختیار کر چکا تھا۔ وہ بھی اس دنیا کو وہی کچھ لٹا رہا تھا جو اس نے دیا تھا۔ وہ اگر کبھی بہت پریشان ہوتا تو پرانی یادیں دہراتا تھا، جن میں وہ بہت سادہ تھا۔ اپنے دوستوں کو یاد کرتا جو اب نجانے کہاں تھے۔ ان دنوں میں جو زندگی کے رنگ تھے، اسے زیادہ بھلے محسوس ہوتے تھے۔

''شاہ جی آ جائیں۔'' کسی نے اسے پکارا تو وہ اپنے خیالات سے نکل آیا اور پھر شوٹنگ میں مصروف ہو گیا۔

اس وقت سہ پہر ہو رہی تھی، جب وہ اپنے ڈرائیور کے ساتھ اس گاؤں سے نکلا۔ ان تین دنوں میں اسے یہاں زیادہ تنہائی ملی تھی اور اس نے بہت سوچا تھا۔ اس لیے واپس شہر کی جانب آتے ہوئے اس پر یہی سوچیں سوار تھیں۔ صورت حال یہ نہیں تھی کہ وہ مایوس تھا۔ بلکہ وہ اس دنیا پر غور و فکر کرنے کے بعد مزید آگے بڑھنے کے راستے تلاش کرتا تھا۔ اس دنیا کے رنگ ڈھنگ پر سوچتا۔ تعلقات کو مزید وسعت کے بارے میں نئے نئے پہلو ڈھونڈتا رہا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھا سیکرٹری خاموش تھا۔ آدھے سے زیادہ سفر طے ہو گیا تو اس نے خاموشی کو توڑا۔

''سر جی کیا بات ہے، بڑے خاموش ہیں آپ؟''

''بس یار، بڑی بوریت ہوئی یہاں پر آ کر، یہ رضوی کی سیریل نہ ہوتی تو کبھی نہ آتا۔'' زرق شاہ نے اکتاہٹ سے کہا تو اس نے دبے بے جوش سے کہا

''لیکن سر جی، یہ سیریل بڑی ہٹ جائیگی، آپ کو ابھی سے بتا دوں۔ آپ شاید اس سیریل کے رائٹر سے نہیں ملے۔ میں نے اس سے بڑی لمبی گپ شپ کی ہے۔ اس سے پوری کہانی سنی اور اسکرپٹ بھی دیکھے ہیں۔'' سیکرٹری نے یوں کہا جیسے بہت بڑا معرکہ مارا ہو۔

''تو۔'' اس نے ہنکارا بھرا

''یہ بڑی منفرد سی کہانی ہے لیکن اس بے چارے رائٹر کے نام سے نہیں جائے گی۔ یہ پروڈیوسر کے نام سے جائے گی؟'' سیکرٹری نے افسوس سے کہا تو زرق شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تمہیں کیسے پتہ؟''

''میں نے رضوی کی باتیں سن لی تھیں۔ وہ ایک دن فون پر بات کر رہے تھے۔ اصل میں اس رائٹر کا نام نیا ہے اور رضوی اس پر رسک نہیں لینا چاہتے، اس لیے اپنی سیریل کے ساتھ ایک بڑا نام لیں گے۔'' سیکرٹری نے کہا تو وہ بولا

''بس یار، اس دنیا میں یہی چلتا ہے، دوسروں کا فن غصب کر کے اپنا مطلب نکالتے ہیں اور پھر اس پر شرمندگی بھی محسوس نہیں کرتے۔ اصل میں ہر بندہ اپنی جگہ پر مضبوطی سے کھڑا ہونے کے لیے دوسروں کا سہارا لیتا ہے لیکن اس کا کاندھا دبا کر رکھنا چاہتا ہے تا کہ اپنی جگہ قائم رہے۔ حالانکہ اصل شے تو رائٹر کا خیال ہے، جس پر باقی لوگوں نے رنگ بھرنے ہوتے ہیں۔''

''سر جی یہ اب ایسا ہو رہا ہے۔ ورنہ پہلے رائٹر کی اہمیت

ہوتی تھی۔طویل نشستیں ہوتی تھیں، کہانی پر بحث ہوتی پھر کہیں آگے کام بڑھتا تھا لیکن اب تو۔‘‘سیکرٹری نے مایوسی سے کہا۔

’’ایسا تو بس اسی ملک میں چل رہا ہے، ورنہ دنیا کو دیکھو۔اس شعبے میں کہاں سے کہاں چلی گئی ہے۔بلکہ میں نے تو ایک عالمی ہدایت کار کی یہ بات پڑھی تھی۔ایک صحافی نے اس سے تازہ فلم کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں تک پہنچی ہے۔کیونکہ اس فلم کو چند سال لگ گئے تھے۔اس پر ہدایت کار نے جواب دیا تھا کہ سب مکمل ہو گیا، اب فقط شوٹنگ رہتی ہے اور یہاں عالم یہ ہے کہ رائٹر بھی سیٹ پر آ کر لکھتے ہیں۔ظاہر ہے، اس میں بھی تو پڑھے لکھے اور تحقیقی لوگ آئیں گے تو اعلیٰ درجے کی بزنس والی فلمیں بنیں گی۔‘‘

’’پھر تو میرے جیسے بندے کی روزی روٹی ختم ہے سر جی؟‘‘سیکرٹری نے ہنستے ہوئے کہا تو زرق شاہ بھی کھلکھلا کر ہنس دیا

’’ارے نہیں یار، کم از کم اس ملک میں ایسا دور نہیں آنے والا، یہاں بہت سارے عوامل ہیں جو میڈیا کو آگے نہیں بڑھنے دے رہے، جیسا شوبز کو آگے بڑھنا چاہیے تھا۔‘‘زرق شاہ نے کہا

’’لیکن شوبز کی کشش تو ختم نہیں ہوئی۔یہ بزنس تو اب بھی اچھا خاصا منافع بخش ہے۔‘‘سیکرٹری نے سمجھنے والے انداز میں کہا

’’ہے، ابھی تک منافع دیتا ہے یہ بزنس۔تفریح کے نام پر ہو کیا رہا ہے۔سینما ختم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ چھوٹی سکرین نے لے لی ہے۔جو اپنے اثرات کے لحاظ سے چھوٹی نہیں ہے۔دنیا بھر کی ثقافت اس چھوٹی سکرین میں سمٹ آئی ہے۔بجائے اس کے کہ ہم اپنی ثقافت پیش کریں، ہم نقالی پر اتر آئے ہیں۔جو ظاہر ہے دوسرے ملک کی ثقافت کو آگے بڑھانے والی بات ہو گی۔اس طرح لاشعوری طور پر ہم اپنی ثقافت کو تاریکیوں میں دھکیل رہے ہیں۔‘‘زرق شاہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

’’سر جی، میری سمجھ میں تو ایسی باتیں نہیں آتیں۔آپ ٹھہرے پڑھے لکھے بندے، آپ ان باریکیوں سے واقف ہیں۔ہمارا جو کام ہے، اسے ہم محنت سے کر رہے ہیں۔‘‘سیکریٹری نے اپنی طرف سے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

’’بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی، اس سے آگے تک جاتی ہے۔خیر، تم جو کہہ رہے ہو وہ ٹھیک ہے۔‘‘زرق شاہ نے کہا اور سکون سے سیٹ کی پشت گاہ پر اپنا سر ٹکا دیا۔سفر کٹ رہا تھا اور وہ اپنے طور پر سوچنے لگا کہ چاہے بڑی اسکرین ہو یا چھوٹی۔اس میں دولت وہی کماتا ہے جو عوام کے مزاج اور جذبات کے مطابق چیز دیتا ہے۔یہاں صرف تفریح دی جا رہی ہے۔اس میں ہماری ثقافت ہو یا نہ ہو، ایسے میں اصل مقصد فن یا ثقافت کو پیش کرنا تو نہیں ہے نا۔اس کے علاوہ کچھ اور ہو سکتا ہے۔یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ سارے لوگ فن کی خدمت کے لیے یا کسی مقصد کے لیے اکٹھے ہیں۔اس کے علاوہ اور بہت ساری دلچسپیاں ہوں گی۔جس کے باعث وہ اس شعبے سے منسلک ہیں اور وہ جانتا تھا کہ کیسے کیسے لوگ ہیں جو شوبز کا لیبل لگا کر کیا کچھ کرتے پھر رہے ہیں۔وہ ان سب کو دیکھتا اور پھر اپنی محنت کا موازنہ کرتا۔وہ صرف یہی دیکھ رہا تھا کہ وہ خود ان سب میں نمایاں کیسے رہ سکتا ہے۔اپنی جدوجہد کے دور میں اس نے بہت سارے لوگوں کو پرکھا بھی تھا۔کئی لوگوں نے اگر اس کی انگلی پکڑ کر آگے جانے کے لیے رہنمائی کی تھی تو چند لوگوں نے اسے لتاڑا بھی تھا۔وہ ساری یادیں اور سارے رویئے اس کے ذہن میں تھے۔اس وقت اس کی انا کو بڑی تسکین ملتی تھی جو کوئی ایسا بندہ اس کے سامنے جھکا ہوا ہوتا جس نے کبھی اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا اور اس بندے کو اس نے کبھی معاف نہیں کیا تھا، جسے وہ کسی بھی وجہ سے پسند نہ کرتا ہو۔

وہ اپنی سوچوں میں کھویا ہوا شہر آن پہنچا۔اگرچہ وہ گھر سے بہت دور تھا لیکن اسے سکون کا احساس ابھی سے ہونے لگا تھا۔اس نے ساری سوچوں کو جھٹکا اور باہر کی رنگینیوں میں کھو گیا۔

❀……❀……❀

اس وقت شبانہ وقار ٹی وی اسٹیشن کے جنرل منیجر کے پاس بڑے اعتماد سے بیٹھی ہوئی تھی۔ان کے درمیان رسمی سی گفتگو ہو چکی تھی اور شبانہ نے تفصیل سے اپنا مقصد بتا دیا تھا۔تب جنرل مینیجر نے اسے سامنے پڑی ہوئی لسٹ پر دیکھتے ہوئے کہا۔

’’بڑی خوشی ہوئی مس شبانہ کہ آپ ایک مختلف پہلو سے شوبز کو دیکھ رہی ہیں۔امید ہے کہ آنے والے طالب علم بھی شوبز کو اہمیت دیں گے۔آپ کی میڈم میری کولیگ رہی ہیں۔میرے لیے بہت محترم ہیں۔ان کا فون آیا تھا اور انہوں نے خصوصی طور پر آپ سے تعاون کرنے لیے کہا تھا۔جس حد تک ممکن ہو سکا، میں آپ سے تعاون کروں گا۔‘‘

’’جی بہت شکریہ!‘‘شبانہ نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا تو جنرل مینیجر نے دوبارہ لسٹ کو دیکھا اور کہا۔

’’اگرچہ ہماری لائبریری آپ کے لیے حاضر ہے تاہم آپ نے چونکہ زیادہ تر انٹرویو کرنے ہیں اور آپ کی اس فہرست میں جو چند مخصوص شخصیات ہیں۔میں آپ کو ان کے نمبر دے دیتا ہوں۔آپ خود بھی رابطہ کر لیجیے گا۔میں بھی کہہ دیتا ہوں۔‘‘اس نے اطمینان بھرے انداز میں کہا اور انٹرکام پر کسی کو اندر آنے کے لیے کہا۔

’’جی بہت بہتر۔‘‘شبانہ بولی تو ایک سیکریٹری نما لڑکی کمرے میں آ گئی جیسے دیکھتے ہی جنرل مینیجر نے کہا

’’یہ فہرست لیجیے۔‘‘اور ان کے نمبرز مس شبانہ کو دے دیں۔انہوں نے ان سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔آپ ان سب سے کہہ دیں کہ میں نے کہا ہے۔‘‘

’’جی، میں کہہ دیتی ہوں۔‘‘اس لڑکی نے فہرست پکڑتے ہوئے کہا

’’اور ہاں، پتہ کریں کہ اس فہرست میں شامل، کوئی صاحب ابھی ادھر ہیں تو مس شبانہ کو ان سے ملوا دیں۔‘‘جنرل منیجر نے کہا اور شبانہ کی جانب دیکھ کر بولا۔’’آپ ان کے روم میں جائیں ان کے ساتھ۔یہ آپ کو اچھی سی کافی پلوائیں گی۔‘‘

’’جی تھینک یو۔‘‘شبانہ نے اُٹھتے ہوئے کہا اور لڑکی کے ساتھ چل دی۔وہ دونوں ایک کمرے میں پہنچیں تو سیکرٹری نے کہا

’’تشریف رکھیں، میں پتہ کرتی ہوں، آپ اتنی دیر میں کافی پئیں۔‘‘

’’کافی کے لیے بہت شکریہ، میں نہیں پیئوں گی، آپ معلوم کریں۔‘‘شبانہ نے سکون سے کہا تو سیکرٹری انٹرکام کی جانب متوجہ ہو گئی۔

کچھ دیر بعد سیکرٹری نے شبانہ وقار کو ایک سجے ہوئے کمرے میں قریشی صاحب سے ملوا دیا۔وہ ان دنوں ایسے پروڈیوسرز میں شمار ہوتے تھے، جن کا نام تھا اور بے شمار کام ان کے کریڈیٹ پر تھا۔سیکرٹری تعارف وغیرہ کے بعد چلی گئی۔قریشی ایک موٹا سا گنجا شخص تھا۔اس نے سنہری کمانی دار عینک لگائی ہوئی تھی۔اس کے سامنے کافی سارے کاغذ پھیلے ہوئے تھے۔اس سے پہلے کہ ان میں کوئی بات شروع ہوتی۔دروازہ کھلا اور زرق شاہ کے ساتھ نوخیز سی لڑکی کمرے میں داخل ہوئے۔ان کے پیچھے ایک دبلا پتلا سا شخص تھا۔ان تینوں نے بڑی معنی خیز نگاہوں سے حجاب میں لپٹی شبانہ وقار کو دیکھا، پھر حیرت اور تجسس ملی نظروں سے اردگرد پڑی خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔قریشی نے ان سب کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

’’آپ زرق شاہ ہیں۔اس وقت اداکاروں میں ان کا بڑا نام ہے۔ممکن ہے اسکرین پر آپ نے انہیں دیکھا ہو اور ان کے نام اور کام سے آپ واقف ہوں گی۔یہ ساتھ میں نیہا ہیں۔یہ بھی اب اپنا نام بنا رہی ہیں۔بہت تھوڑے وقت میں انھوں نے اپنا نام بنا لیا ہے۔اور ساتھ میں مشہور ڈرامہ نگار رازی صاحب ہیں۔‘‘یہ کہہ کر وہ ان تینوں سے شبانہ کا تعارف کروانے لگے۔اس دوران شبانہ کی نگاہیں نیہا پر ٹک گئیں جو انتہائی تنگ اور مختصر سے لباس میں تھی۔اس کے چہرے پر اچھا خاصا میک اپ تھا اور نگاہوں میں اکتاہٹ بھرا تاثر تھا۔اس کے ساتھ زرق شاہ تھا جو چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ اور نگاہوں میں ہلکی سی ہتک آمیز رمق لیے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔البتہ رازی کا نہ صرف چہرہ بے تاثر تھا بلکہ نگاہوں میں بھی کوئی جذبہ ہویدا نہیں تھا۔شبانہ وقار کے لیے یہ طرز عمل کوئی نیا نہیں تھا۔یہاں آتے ہوئے بہت سوں نے اسے ایسی ہی حیرت اور تجسس بھری نگاہوں سے دیکھا تھا۔تعارف کا مرحلہ طے ہو جانے کے بعد قریشی نے کیا۔

’’اچھا ہے کہ یہ بھی یہیں موجود ہیں اور آپ اپنی تحقیق کے حوالے سے ان کے تجربات اور معلومات سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔‘‘

’’جی بہت بہتر!‘‘اس نے کہا تو رازی نے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

''مس! آپ نے تحقیق کے لیے جو موضوع چنا ہے، اس کے بارے میں بھی کچھ جانتی ہیں آپ؟''

''جی میں نے اس پر ہوم ورک تو کیا ہے، مزید سیکھنے کے لیے ہی تو یہاں تک آئی ہوں، ویسے آپ رہنمائی کریں گے کہ آپ کس پہلو کے بارے میں کہہ رہے ہیں۔'' شبانہ نے پوچھا

''میرا مطلب ہے آپ ثقافت کے بارے میں کیا جانتی ہیں؟'' اس نے طنزیہ سے لہجے میں اپنی علمیت جتائی۔تب شبانہ نے بڑے اعتماد سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو ثقافت کی حتمی تعریف نہیں ملی، اگر آپ کے علم میں ہے تو بتائیں۔''

''اس کا مطلب ہے آپ نے ہوم ورک کیا ہے، لیکن پھر بھی آپ بتائیں کہ آپ کے خیال میں ثقافت کیا ہے؟'' رازی نے متاثر ہوتے ہوئے پوچھا تو وہ بولی۔

''میرے خیال میں ثقافت اکتسابی، شعوری یا ارادی طرز عمل کا نام ہے، مطلب ہماری تمام عادات، افعال، خیالات، رسوم و اقدار اس میں شامل ہوتے ہیں جنہیں ہم ایک منظم معاشرے کے رکن کی حیثیت سے عزیز رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس پر عمل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں، اس میں بہت حد تک تاریخی اثرات بھی ہوتے ہیں۔''

''بہت خوب۔'' رازی نے سر ہلاتے ہوئے کہا جیسے وہ اس کی معلومات کا اعتراف کر رہا ہو۔ تب پروڈیوسر نے زرق شاہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا

''زرق شاہ، تم بھی کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

''مجھے تو سمجھ نہیں آ رہی ہے کہ یہ حجاب میں لپٹی ہوئی مس شبانہ، آخر کس کلچر کی بات کرنے یہاں آئی ہیں۔ یہ تو خود اپنے کلچر سے انحراف کر کے ہمارے سامنے بیٹھی ہیں۔ ایسے میں تو بات کرنا ہی فضول ہے، یہ تو نری منافقت ہے نا؟'' اس کے لہجے میں طنز کے ساتھ ہتک آمیز احساس چھلک رہا تھا۔

''نہیں شاہ جی، یہ حجاب تو اسلامی ثقافت کا حصہ ہے۔'' رازی نے تیزی سے کہا۔

''تو پھر اسلامی ثقافت پر تحقیق کریں۔ ہماری روایت تو یہ نہیں ہیں اور نہ ہی ہماری یہ ثقافت ہے۔ اسلامی ثقافت، شوبز اور یہ حجاب' موضوع بنتا نہیں ہے سر جی۔ فضول موضوع پر مغز کھپانا، وقت ضائع کرنے والی بات ہی ہے نا۔'' زرق شاہ تیزی سے بولا تو قریشی نے شبانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ زرق شاہ کی رائے پر آپ کیا کہیں گی؟''

''دیکھیں یہ انسانی حق ہے کہ وہ اپنی تحریر اور تقریر میں آزاد ہے۔ میں ان کی سوچ کو غلط یا درست کہنے کی مجاز نہیں ہوں۔ یہ ان کا حق ہے کہ جیسی بھی سوچ رکھیں۔'' شبانہ نے کمال تحمل سے کہا تو اس پر وہ نوخیز تنگ کپڑوں والی اداکارہ نیہا تیزی سے بولی۔

''اصل میں ان بی بی صاحبہ کے پاس جواب نہیں ہے، ورنہ ضرور کہتیں۔''

''جواب تو ہے اور وہ بڑا تفصیلی جواب ہے لیکن میں آپ لوگوں پر اپنی رائے مسلط نہیں کرنا چاہتی اور نہ ہی بحث کرنا چاہتی ہوں۔ میں تو اپنے موضوع کی مناسبت سے آپ کی رائے لینے آئی ہوں۔'' وہ بڑے نرم لہجے میں بولی۔

''جواب! کیا دے سکتی ہیں یہ جواب اور پھر انسانی حقوق کی بات۔ حالانکہ خود یہ جس طبقے کی نمائندگی کر رہی ہیں۔ وہاں انسانی حقوق کو بے دردی سے پامال کیا جاتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ خود ہیں۔ حجاب میں لپٹی ہوئی لڑکی، بلکہ نقاب میں چہرہ چھپائے لڑکی۔'' زرق شاہ نے طنزیہ انداز سے کہا۔ اس کے لہجے میں کافی حد تک احتجاج چھلک رہا تھا۔ ایک دم سے کمرے کا ماحول بوجھل ہو گیا۔ شبانہ نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ بلاشبہ زرق شاہ وجیہہ تھا۔ مردانہ وجاہت ایسی کہ کوئی بھی لڑکی اسے نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ وہ جو ایک خاص کشش ہوتی ہے، کافی حد تک جذباتی ہو جانے کی وجہ سے مزید بڑھ گئی تھی۔ شبانہ نے گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اب اس کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ اور آنکھوں میں تمسخرانہ انداز تھا۔ جیسے وہ شبانہ کا مذاق اڑا رہا ہو کہ وہ کیسی باتیں کر رہی ہے۔ پتہ نہیں کیوں شبانہ کو اس شخص پر غصہ نہیں آ رہا تھا۔ وہ چاہتی تو اتنی ہی تخی سے بات کا جواب دے سکتی تھی مگر یہی وہ مواقع ہوتے ہیں، یہاں پر دی گئی تربیت کام

آتی ہے۔ وہ انہیں اپنی ہی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ وہ پہلی بار ایسے کسی ماحول میں آئی تھی اور وہ سمجھنا چاہ رہی تھی کہ ان لوگوں کی نفسیات کیا ہے۔ ایسی کیا چکا چوند ہے جس سے لوگ متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس نے بڑے ہمدردانہ نگاہوں سے زرق شاہ کو دیکھا تا کہ بہت اچھے انداز میں اسے کوئی ایسا جواب دے کہ نہ صرف ماحول کا بوجھل پن ختم ہو جائے بلکہ وہ جس مقصد سے آئی ہے وہ پورا ہو جائے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی رائٹر رازی نے کہا۔

''قریشی صاحب، آپ اس بچی کو پھر وقت دے دیں یا ہم دوبارہ آ جاتے ہیں۔ شاید اب مزید بات کرنے کے لیے ماحول نہیں رہا۔''

''کیوں کیا خیال ہے مس شبانہ؟'' قریشی نے یوں کہا جیسے وہ بھی اس ماحول سے جان چھڑا لینا چاہتا ہو۔ تب شبانہ نے کہا۔

''سر، میرے پاس سوالوں کی ایک فہرست ہے۔ آپ چاہیں تو ان کے جواب دے دیں۔''

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔'' رازی نے موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ پھر لمحہ بھر توقف کے بعد بولا۔ ''اگر آپ مناسب خیال کریں تو وہ سوال نامہ مجھے دے دیں۔ میں اس پر آپ کے لیے کوشش کروں گا۔''

''مس شبانہ، میرے خیال میں یہ ٹھیک رہے گا۔'' پروڈیوسر قریشی نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا تو شبانہ نے اپنے بیگ سے فائل نکالی، اس میں سے سوال نامہ نکالنے لگی۔ تب ہی زرق شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''قریشی صاحب، انہوں نے کرنی تو شوبز کی مخالفت ہی ہے، ظاہر ہے نقاب پوش لڑکی تو اپنے انداز ہی سے ثقافت اور اس میں موجود روایات کو دیکھے گی۔''

''نہیں مسٹر شاہ، آپ شاید موضوع کو نہیں سمجھ پائے۔ میں نے کہا تھا، شوبز کی روایات۔'' شبانہ نے فوراً تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ''ویسے اگر آپ پڑھ سکتے ہیں تو یہ سوال نامہ دیکھ لیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے کاغذ اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ انداز ایسا تھا جس پر وہ تلملا اٹھا اور تقریباً غراتے ہوئے بولا۔

''آپ جس یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہیں۔ اس کے اسٹوڈنٹ وہاں کے خواب بھی نہیں دیکھ سکتے، جہاں میں پڑھا ہوں۔ عالمی معیار ہے اس کا۔''

''کیسی تعلیم ہوتی ہے وہاں مسٹر زرق شاہ، جس میں عورت سے بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں سکھایا جاتا۔ کیا یہ اچھی بات نہیں ہے کہ میں آپ کی ہر تلخ بات کا تحمل سے جواب دے رہی ہوں۔'' شبانہ نے کہا تو زرق شاہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا وہ بولی۔ ''میرے خیال میں کوئی بھی ایسی ثقافت نہیں ہے جہاں انسان کو اپنی آگہی کا درس نہ ملتا ہو۔''

''کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟'' زرق شاہ نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''یہی کہ ابھی آپ نے یہ کہا کہ آپ کی روایات یا ثقافت میں حجاب یا نقاب کا کوئی عمل دخل نہیں ہے، کیا میں درست کہہ رہی ہوں شاہ جی؟'' اس نے بہت نرم لہجے میں پوچھا۔

''ہمارا کلچر اسلامی نہیں، بلکہ دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو عربی کلچر نہیں ہے، ہمارا کلچر ہندوستانی ہے، جس کے آثار موہنجوڈارو، ہڑپہ یا ٹیکسلا میں ملتے ہیں۔ شاید آپ اس سے واقف ہوں۔ یہ زمین کئی صدیوں سے اپنی ثقافت اور روایات رکھتی ہے۔ ممکن ہے اس وقت عربی کلچر اپنی شناخت بنا رہا تھا۔ کیا اب آپ سمجھی ہیں؟'' اس نے شبانہ کی طرف دیکھتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''مان لیتی ہوں۔ جبکہ میرے موضوع میں ایسی کوئی بات نہیں جو حجاب کا تاثر دے، یا نقاب میں رہنے والا بات نہیں کر سکتا۔ میرا موضوع ثقافت ہے۔ ہماری ثقافت اور شوبز کی روایات'' شبانہ نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تا کہ اس کا ردعمل جانچ سکے۔

''آپ فقط موضوع کی بات کر رہی ہیں جبکہ میں اس کی روح سمجھ گیا ہوں۔'' اس نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن آپ اپنے آپ کو اب تک نہیں سمجھ پائے۔ شاید آپ کو بھی نہیں معلوم کہ آپ نے اپنی اب تک کی ساری گفتگو بے فائدہ کی ہے؟'' شبانہ نے پراعتماد لہجے میں کہا تو وہ ایک دم سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

''ظاہر ہے، آپ کو سچی بات تو اچھی نہیں لگے گی۔''

''اور سچ یہ ہے کہ آپ کو میرے موضوع سے نہیں

،میرے نقاب سے تکلیف ہوئی ہے۔'' اس نے اعتماد سے کہا۔

''بالکل۔ آپ ایک خاص طبقے کی نمائندہ ہیں۔ یہ آپ ظاہر کررہی ہیں۔ یہ منافقت ہی تو ہے کہ آپ مردوں میں بیٹھی ہوئی ہیں مگر حجاب کے ساتھ۔ یہ ایک اسلامی کلچر ہے؟'' زرق شاہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''تو دوسرے لفظوں میں اسے یوں کہا جاسکتا ہے کہ بنا حجاب کے مردوں کے ساتھ بیٹھنا ہی آپ کا کلچر ہے۔'' شبانہ نے دبے دبے جوش سے کہا جبکہ اس کا انداز دھیما تھا۔ اس پر زرق شاہ نے لمحہ بھر توقف کیا، پھر بولا۔

''بی بی! میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں مگر اب واضح انداز میں کہے دیتا ہوں کہ آپ جس طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کا کام سوائے تنقید کرنے کے اور کچھ نہیں ہے۔''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔'' وہ ایک دم سے اڑ گئی۔

''تو پھر آپ سمجھ لیں کہ ہمارا کلچر تو یہی ہے۔'' وہ حتمی انداز میں بولا

''چلیں اب آپ نے لکیر کھینچ دی اور اندازہ ہوگیا کہ آپ لکیر کے اُس طرف ہیں۔ میں مان لیتی ہوں کہ حجاب کے ساتھ یا نقاب کے ساتھ ہم اپنے معاشرے میں منافقت کررہے ہیں یا نہیں کررہے، اس کا فیصلہ پھر آپ نہیں کرسکتے کہ آپ کا تو یہ کلچر نہیں ہے۔ اس لیے آپ کو رائے زنی کا کوئی حق نہیں۔ مگر آپ کو احساس ہے کہ آپ بذاتِ خود کھلے عام منافقت کررہے ہیں، اس پر فیصلہ بھی خود ہی دے رہے ہیں۔ اس کا احساس ہے آپ کو۔'' اس بار شبانہ خاصی جذباتی ہوگئی تھی

''کیا مطلب؟ آپ کہنا کیا چاہ رہی ہو؟'' اس نے پھر غراتے ہوئے یوں کہا جیسے اس کی انا پر کاری ضرب لگی ہو۔

''میں ایسی بات کہنا نہیں چاہتی۔ اگر کہہ دوں گی تو آپ کو بہت برا لگے گا۔ اور دوسری بات کہ یہ پھر جواب الجواب ہوجائے گا کہ آپ نے مجھے منافق کہا تو میں نے بھی آپ کو کہہ دیا۔ میرے خیال میں اس بحث کو یہیں سمیٹ کر بلکہ ختم کر کے اپنے بارے میں سوچا جائے کہ واقعی ہم کہیں منافقت تو نہیں کررہے ہیں۔ اپنے ساتھ، دوسروں کے ساتھ۔'' شبانہ نے فائل میں سے مزید کاغذ نکالتے ہوئے کہا اور انہیں رائٹر اور پروڈیوسر کے آگے رکھتے دیئے۔ تب رائٹر رازی نے کہا

''آپ کی بات بہت حد تک ٹھیک ہے مس شبانہ، مگر ذہن میں رہ جائے گا کہ آخر شاہ جی کیا منافقت کررہے ہیں آپ کے حساب سے۔''

''جی...... جی...... کہیے آپ۔'' قریشی نے بھی بدلے ہوئے لہجے میں کہا

''ان سے پوچھ لیں، کیا اجازت دیتے ہیں کہ میں کہہ دوں۔'' شبانہ نے یوں کہا جیسے وہ کہنا نہ چاہتی ہو لیکن ان کے کہنے پر مجبوراً کہنا پڑ رہا ہو۔

''ڈونٹ وری، آپ کہہ دیں۔'' زرق شاہ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا

''آپ خود کو شاہ کہلواتے ہیں۔ کیا آپ سیّد ہیں، یا ویسے ہی نام رکھا ہوا ہے؟'' شبانہ نے یوں پوچھا جیسے تصدیق کررہی ہو۔

''نہیں، یونہی نہیں کہلواتا۔ میں سیّد ہوں، سیّد زرق شاہ۔'' اس نے فخر سے کہا

''تو پھر آپ اپنے آپ پر غور کیجیے، آپ کون ہیں؟ اور کیا کررہے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی غور کیا کہ آپ کی نسبت اسلامک کلچر سے بنتی ہے یا نہیں۔ اگر آپ کو معلوم نہیں ہے کہ آپ کس ثقافت سے تعلق رکھتے ہیں تو آپ جہاں چاہیں، میں اس پر بات کرنے کو تیار ہوں۔ تفصیل سے بات کرسکتی ہوں۔ میں نے جو نقاب لیا ہے تو کم از کم میں اپنی نسبت سے منافقت نہیں کررہی۔ فیصلہ آپ کر لیجیے۔'' شبانہ نے زرق شاہ کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا جو بری طرح چونک گیا تھا۔ اس کے چہرے پر لمحوں میں کئی رنگ آ کر بدل گئے تھے۔ وہ کتنی دیر تک سناٹے میں رہا۔ اسے کوئی جواب فوری طور پر نہ سوجھ سکا۔ تب شبانہ نے کہا ''میں پھر آؤں گی، اب میں جارہی ہوں۔'' اس نے کہا اور اپنا بیگ سمیٹنے لگی۔ تب قریشی نے تیزی سے کہا

''آپ بیٹھیں نا، میرا مطلب، آپ اچانک چل دیں۔''

''نہیں سر، میں اچانک نہیں جارہی ہوں۔ سوالنامہ آپ کو دے دیا ہے۔ آپ کا رابطہ نمبر میرے پاس

ہے۔ میں فون کر کے آجاؤں گی۔ اب میرا کام ختم ہے یہاں پر۔ ویسے میرا فون نمبر اس سوال نامے پر درج ہے۔ فی امان اللہ۔'' وہ اٹھتے ہوئے صاف انداز میں بولی۔

''میں آپ کو کال کردوں گا۔'' قریشی نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی' قریشی شبانہ کو دیکھتا رہ گیا۔ زرق شاہ کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا تھا۔

❁......❁......❁
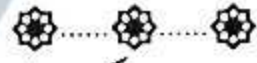
زرق شاہ کافی دیر سے اپنے کمرے میں ایزی چیئر پر بیٹھا ہوا تھا۔ رات گہری ہوگئی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پر پڑا ایش ٹرے سگریٹ کے ٹوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ٹی وی چل رہا تھا۔ کمرے میں مدہم روشنی تھی۔ اس کی نگاہیں تو ٹی وی اسکرین پر تھیں مگر ذہن میں پروڈیوسر قریشی کے کمرے میں آنے والی شبانہ تھی۔ اسے اپنے اردگرد کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ اسے تو یہ بھی احساس نہیں تھا کہ وہ اتنی دیر سے صرف اور صرف ایک ہی بات سوچے چلا جارہا ہے۔ اس کے حواسوں پر ایک ہی چہرہ سوار تھا جو سیاہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ اس کی ایک ایک بات کو وہ سوچ رہا تھا۔ یہاں تک کہ نہ جانے کتنی بار وہ ان باتوں کو اپنے من میں دہرا چکا تھا۔ وہ جب بھی اس بات پر پہنچتا کہ اپنے آپ پر غور کریں' آپ کون ہیں؟ کیا آپ نے کبھی غور کیا کہ آپ کی نسبت اسلامک کلچر سے بنتی بھی ہے یا نہیں۔'' تو نجانے اسے کیوں لگتا کہ جیسے ایک تازیانہ ہے جس سے اس کی روح تک گھائل ہوتی جارہی ہے۔ یہ احساس زیادہ بڑھتا تو وہ سوچنے لگتا کہ وہ ایسا سوچ ہی کیوں رہا ہے؟ تب اس کے سامنے لفظ دھواں سے بن جاتے اور سوچیں ایک دوسرے میں الجھ کر رہ جاتیں۔ اسے کوئی بات بھی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ وہ اس وقت کے لیے پچھتا رہا تھا جب وہ قریشی کے کمرے میں گیا اور اس لڑکی سے ملاقات ہوگئی۔ اسے بات ہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں اپنے نام کے ساتھ منافقت کررہا ہوں۔ یہ کیا بات ہوئی۔ وہ غلط کہہ رہی تھی یا درست کہہ رہی تھی۔ کیا ہے یہ سب؟ وہ جھنجلا جاتا اور پھر سے ایک نئی سگریٹ سلگا کر نئے سرے سے سوچنے لگتا۔ پھر اچانک اس نے ساری سوچوں کو جھٹک دیا اور سوچنے لگا۔ اگر وہ لڑکی نقاب کے بغیر آتی تو کیسی دکھائی دیتی؟ وہ کتنی دیر تک سوچتا رہا۔ اس کے ذہن میں کوئی سا بھی خاکہ نہ بن سکا۔ ایک ہیولا سا اس کے سامنے رہا۔ مگر وہ اپنی شعوری کوشش کے باوجود ایسا کوئی چہرہ نہ بنا سکا، جس پر وہ خود ہی مطمئن ہو جاتا۔ بہتیرے چہرے اس کے ذہن میں بن کر یوں مٹتے رہے جیسے عکس برآب ہوتا ہے یا پھر ایک مصور کی مانند جو کینوس پر چہرہ بناتا ہے، اسے پسند نہیں آتا۔ پھر اپنے خیال کا عکس اس چہرے میں نہیں پاتا تو اسے مٹا دیتا ہے۔ بہت دیر تک وہ اسی لاحاصل کوشش میں ہلکان ہوتا رہا۔ مگر کبھی بھی ایک چہرے پر وہ مطمئن نہ ہوسکا۔ اس کے اپنے چہرے پر ٹی وی کے مختلف رنگوں کی روشنی پڑ رہی تھی اور اسے ہوش بھی نہ تھا کہ ٹی وی کی اسکرین پر کیا ہورہا ہے۔ اس نے انگلیوں پر سگریٹ کے جلنے کی حدت محسوس کی تو دیکھا سگریٹ ختم ہوچکا تھا۔ اس نے ٹکڑا ایش ٹرے میں مسلا اور اٹھ کر بیڈ کی جانب بڑھا۔ لاشعوری طور پر اس نے کلاک پر نگاہ ڈالی تو بری طرح چونک گیا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔

''اتنا وقت گزر گیا؟'' وہ زیرلب بڑبڑایا۔ پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا، ''میں یہ کیا اوٹ پٹانگ سوچ رہا ہوں۔ خواہ مخواہ اس لڑکی کے بارے میں فضول سوچتا چلا جارہا ہوں، جس کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ فضول اتنا وقت ضائع کیا اس کے لیے۔'' اس نے بیڈ پر لیٹے ہوئے تلخی سے سوچا۔

''مگر یہ حقیقت ہے کہ تم اس کے بارے میں اتنا سوچ رہے ہو۔ کوئی بات تو ضرور ہے نا۔'' اس کے من سے آواز ابھری

''بات......؟ کیا بات ہوسکتی ہے، میرے خیال میں تو کوئی بات نہیں ہے؟'' اس نے لاپرواہی سے سوچا

''تو پھر اتنے پریشان کیوں ہوگئے ہو؟''

''پریشان؟ نہیں تو۔''

''بے سکون تو ہو نا۔''

''چلو مان لیا میں بے سکون ہوں تو پھر؟''

''تو وجہ تلاش کرو نا جس کے باعث پریشان ہو۔''

''وجہ؟ کیا وجہ ہوسکتی ہے؟''

''میں نے اس کے حجاب پر ضرورت سے زیادہ ہی تنقید کردی تھی اور اس نے مجھے خاصی بدتمیزی سے بہت

کچھ کہا۔ بس یہی ہوسکتا ہے کہ وہ لڑکی ہونے کا مارجن لے گئی۔ مجھے باتیں سنا گئی اور میں اسے کچھ نہ کہہ سکا۔ حالانکہ میں ٹھیک کہہ رہا تھا۔ بھلا اس کا وہاں کیا کام؟ اسے وہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"تو گویا تم اپنی انسلٹ ہوجانے کی وجہ سے بے سکون ہو؟"

"یس۔ میں چاہتا تو اسے مزید کھری کھری سنا سکتا تھا، جس طبقے سے وہ تعلق رکھتی تھی میں اس کا کچا چھٹا کھول کر رکھ دیتا مگر وہ لڑکی تھی نا۔"

"نہیں یہ بات نہیں۔ تم نے تو کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ اسے منافق تک کہہ دیا۔ کیا تم یہ توقع کررہے تھے کہ وہ تمہارے سامنے زبان ہی نہ کھولتی۔ لڑکی تھی تو کیا ہوا؟ اس میں اتنی ہمت تھی، اعتماد تھا کہ وہ وہاں تک آگئی۔ پھر کیا واقعی وہ ایسے طبقے سے تعلق رکھتی تھی جس کے بارے میں تم نے فرض کرلیا۔ وہ میڈیا کی تعلیم حاصل کررہی ہے۔ شوبز سے متعلق ریسرچ کرنے آگئی ہے۔ وہ بولڈ لڑکی تھی، تب ہی تمہاری ہر بات کا سلیقے سے جواب دیا۔ یہ تو تم مانو نا۔"

"ہاں۔ سچی بات تو یہی ہے کہ ابتداء میں نے کی۔ ورنہ شاید وہ کوئی بات نہ کرتی۔ تب ہی اس نے میری ذات تک کو نشانہ بنالیا۔ جب اور کچھ نہ سوجھا تو میرے سیّد ہونے پر اعتراض کردیا اور یہ نسبت کیا ہوتی ہے؟"

"تمہیں تو خود پر بڑا ناز ہے کہ تم بہت پڑھے لکھے ہو، اسے سمجھتے ہو؟"

"یار! یہ ذات پات، رنگ، نسل اسلام میں تو نہیں ہیں نا۔ سب برابر ہیں، مساوات ہے۔ اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی نا۔ اس لیے فوراً ذات پر اتر آئی۔ اب اگر خدا نے مجھے سیّد فیملی میں پیدا کردیا تو اس میں میرا کیا قصور؟"

"اگر تم اپنے سیّد ہونے پر فخر کرتے ہو تو کیوں کرتے ہو؟"

شاید وہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ اتنی اعلیٰ وارفع ذات کے بندے کو یہاں نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں نہیں ہونا چاہیے؟"

"تو کیا تم اسی وجہ سے پریشان ہو؟"

"یار، میں پریشان نہیں ہوں۔ مجھے غصہ آرہا ہے اس پر، بندے کا دہرا معیار نہیں ہونا چاہیے؟ خود کو پیش اس طرح کرنا کہ۔"

"نہیں یار، اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔ اگر وہ حجاب میں تھی تو یہ اس کا حق ہے، تمہیں قبول کرنا چاہیے۔ انسانی آزادی ہے۔ تم خود کہہ رہے کہ ان کا طبقہ انسانی حقوق کی پامالی کرتا ہے۔ اس طرح تو تم بھی کررہے، کیا اس کے عورت ہونے کی وجہ سے تم اسے کمتر خیال کررہے ہو؟"

"نہیں، یہ سب باتیں نہیں ہیں۔" اس نے سر کو جھٹکتے ہوئے سوچا۔

"تو پھر کیا ہے، کیوں بے سکون ہو؟"

"اصل میں مجھے اس کا تکبرانہ انداز بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔ میرے سامنے تو لوگ بچھ جاتے ہیں۔ میری دولت، میری شہرت کو ایک جانب رکھو۔ میرے خیال میں مجھے کوئی لڑکی ایسی نہیں ملی جو میری وجاہت کو نظر انداز کر جائے اور اس نے تو ذرا بھی اہمیت نہیں دی۔ بلکہ اس نے تو مجھے میری ذات سمیت رگید کر رکھ دیا۔ جیسے میں اور میری وجاہت، میری شخصیت کا اس پر ذرا برابر بھی اثر نہ ہوا ہو۔"

"تو یہ بات ہے تمہیں اپنا آپ نظر انداز ہوجانے کا دکھ ہے۔"

"بالکل خود کو بڑی شے سمجھنے والی لڑکیاں میرے سامنے موم ہوجاتی ہیں اور یہ مجھے نظر انداز کرے، میں یہ بہرحال برداشت نہیں کرسکتا۔ اور وہ جسے میری ذات پر بات کرنے کا کوئی حق نہیں وہ کیوں؟"

"مطلب، تم خود بات کرسکتے ہو۔ کسی کو بات کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ پھر یہ کہاں کی مساوات ہے۔ نہیں تم اب بھی خود فیصلہ نہیں کرسکے ہو کہ ڈسٹرب کیوں ہو؟"

"پتہ نہیں کیوں۔ مگر یہ سچ ہے کہ میں ڈسٹرب ہوں، بے سکون ہوں اور خود کو عجیب سا محسوس کررہا ہوں۔"

"اس کی تو سمجھ نہیں آرہی ہے مگر یہ طے ہے کہ وہ مجھے بالکل بھی اچھی نہیں لگی۔ بلکہ غصہ آرہا ہے۔ مجھے اس پر نفرت سی ہورہی ہے مجھے۔ آخر وہ کیا تحقیق کرے گی۔ یہی نا کہ اس کے من ہی من میں شوبز کی دنیا کو دیکھنے کی خواہش ہوگی اور اس خواہش سے مجبور ہوکر یہاں تک آگئی ہے۔ من میں کچھ اور چل رہا ہوتا ہے اور اوپر سے کچھ اور کہہ رہی ہوتی ہیں۔ اور پھر خودنمائی کا شوق، لوگ بڑی پارسا کہیں، نمایاں دکھائی دیں۔ اپنے آپ کو عیاں کرنے کے لیے یہ حجاب کا سہارا لیتی ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں، میں چاہوں تو میں چاہوں تو۔"

"کیا چاہو تم؟"

"میں چاہوں تو ایسی لڑکی کو چند دنوں میں اپنے اشاروں پر نچا سکتا ہوں۔ یہ دبی ہوئی، گھٹن زدہ لڑکیاں انہیں تو بس اشارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تو کچے دھاگے سے بندھی ہوتی ہیں۔ جب چاہے کھینچ لیا جائے انہیں۔"

"شاید تم اس لڑکی کے بارے میں ایسا نہ کرسکو جو انتہائی سخت قسم کے لفظ کہہ کر اپنے جذبات کا اظہار کرگئی ہے۔ اگر ایسی لڑکی ہوتی۔ جیسا تم سوچ رہے ہو، تب کچھ نہ کچھ تو اس کے لہجے میں سے، لفظوں میں سے یا کسی بھی اعتبار سے اندازہ لگا سکتے۔ اب تم خوامخواہ اس کے بارے میں غلط سلط سوچ کر خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کررہے ہو۔ اور دعویٰ یہ ہے کہ جو چاہے اس سے منوا سکتے ہو۔ تسلیم کرلو کہ وہ ایک بولڈ لڑکی تھی اور تمہیں تمہاری حیثیت بتا گئی ہے۔ بات ختم۔"

"بات ایسے ختم نہیں ہوجاتی۔ اب قریشی یا رازی جیسے بندے بھی اس کی پاک بازی اور پارسائی سے متاثر ہوں اور مجھے ہی غلط ہونے کی بابت کہیں۔ صرف یہ کہ وہ حجاب کے باعث اپنا تاثر بنا گئی۔ میں اس کی پارسائی ختم کرکے رکھ دوں گا۔ میں ایسا کرسکتا ہوں۔"

"آج تمہیں اس کا قلق ہورہا ہے، کل تک تم اسے بھول جاؤ گے۔ یونہی آپ اپنا وقت ضائع کرو گے۔ اب بھی کیا کررہے، فضول سوچتے چلے جارہے ہو۔ نیند جو تمہارے لیے بہت قیمتی ہے، اسے برباد کررہے ہو۔ چھوڑو اسے اور سب کچھ بھلا کر سوجاؤ۔ تمہارا وقت قیمتی ہے۔ آج پروڈیوسر وقت مانگ رہے ہیں۔ کل تمہارا شمار ان آرٹسٹوں میں سے ہوگا جن کے وقت کے حساب سے سارے کام طے کیے جاتے ہیں اور تم ہو کہ ایک معمولی لڑکی کے لیے اتنا سوچ کر وقت برباد کرچکے ہو۔"

اس نے خود کو مطمئن کیا اور سونے کی کوشش کرتے ہوئے ٹی وی ریموٹ سے آف کردیا۔ اس نے آنکھیں بند کرکے تکیے پر سر رکھا تو وہ پھر سے نگاہوں کے سامنے آگئی۔ اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

"یہ کیا۔ وہ پھر میرے ذہن پر مسلط ہے۔ نہیں چھوڑوں گا۔ میں اس سے اپنی بے عزتی کا بدلہ ضرور لوں گا۔ انہی لوگوں کے سامنے، جن کے سامنے اس نے اتنی باتیں کی ہیں۔"

اس نے فوراً ہی فیصلہ کرلیا۔ جس پر اس کی انا کو تھوڑی سی تسکین ملی۔ تب وہ سمجھ گیا کہ آخر وہ پریشان کیوں تھا۔ اتنی بے سکونی فقط اسی وجہ سے تھی کہ وہ اس سے بدلہ لینا چاہ رہا تھا۔ یہ سوچتے ہی وہ مسکرایا۔ اسے خود پر پورا اعتماد تھا کہ یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ اس بار اس نے تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کیں تو وہ نہیں تھی جیسے ہوا میں تحلیل ہوگئی ہو۔ اس نے سارے خیالات کو ذہن سے نکالا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

❁......❁......❁

اس صبح شبانہ وقار کی جب آنکھ کھلی تو عادت کے مطابق اس نے دیوار پر لگے کلاک کو دیکھا۔ تب وہ بری طرح چونک گئی۔ فجر کا وقت بہت تھوڑا رہ گیا تھا۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کے دل میں جیسے درد سا ہوا۔ ایک ٹیس سینے میں پھیلتی چلی گئی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ایسا کیوں ہوا؟ وہ جلدی سے اٹھی تاکہ وضو کرسکے۔ نماز پڑھ لینے کے بعد بھی اس کے دل میں کھٹکا رہا تھا۔ اسے افسوس ہونے لگا کہ وہ رات اس اداکار کے بارے میں اتنا کیوں سوچتی رہی ہے کہ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ وقت پر بیدار نہیں ہوسکی۔ یونیورسٹی جانے میں ابھی بڑا وقت تھا۔ سو وہ پھر سے اپنے بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا کہ جس بندے کے ساتھ اتنی تلخ کلامی ہوگئی ہے، وہ اسے اس قدر سوچے گی؟

کل جب وہ ٹی وی اسٹیشن سے پلٹ کر آئی تو اس کا من بوجھل تھا۔ اسے یوں محسوس ہورہا تھا کہ جیسے بندہ کچھ دیر انجان گلیوں سے بھٹک کر، بے مراد سا واپس پلٹ آئے۔ اگرچہ جس توقع کے ساتھ وہ وہاں پر گئی تھی، وہ تو پورا ہوگیا تھا لیکن اس کا من کیوں بوجھل تھا۔ یہی وجہ ٹٹولتے ہوئے اسے زرق شاہ ہی یاد آیا۔ جس نے اس کے

ساتھ بہت سخت لہجے میں گفتگو کی تھی۔ وہ پہلی نگاہ میں اسے منفرد سا ضرور لگا تھا مگر پھر بعد میں اس کی وجاہت کا دھیان ہی نہیں رہا۔ جب تک اس نے بات نہیں کی تھی۔ اس وقت تک وہ کتنا اچھا، پرکشش اور وجیہہ دکھائی دے رہا تھا۔ مگر پھر جیسے ہی اس نے اپنی بات کی، تب اس کا من ظاہر ہوگیا۔ اس کے بارے میں معلوم ہوگیا کہ وہ کیسی سوچ رکھتا ہے؟ اتنا تضاد تھا اس کی شخصیت اور سوچ میں؟

وہ زرق شاہ کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر ایک افسوس بھرا احساس اس سے لپٹ گیا تھا۔ اس بھرپور احساس نے زرق شاہ کے لفظوں ہی سے جنم لیا تھا۔ لفظ بھی تو اپنی مہک رکھتے ہیں۔ لفظوں کی مہک جب انسان کے احساس سے ٹکراتی ہے تو اپنا تاثر ضرور منواتی ہے۔ وہ جب بھی اس کے لفظوں اور باتوں پر غور کرتی تو افسوس اس وقت فزوں تر ہو جاتا۔ اس کے لہجے میں سے اٹھتی حقارت، استہزا اور نفرت کے تاثر کا احساس کرتی رہی۔ وہ ایسا کیوں ہے؟ اس کی تو اسے سمجھ آرہی تھی لیکن نجانے کیوں اس کا ذہن یہ تسلیم کرنے کو تیار ہی نہیں ہو رہا تھا کہ جیسا اس نے کہا ہے، وہ ویسا نہیں ہے۔

''تم کیوں سوچتی ہو ایسا؟'' اس نے اپنے آپ سے سوال کردیا تھا۔

''بس میرا دل گواہی دے رہا ہے، ورنہ میرے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔''

'دلیل تو اس وقت دی جاتی ہے نا جب کوئی بات منوانی ہو، یہ تو اس سے بھی پہلے کی بات ہے کہ باوجود برا لگنے کے وہ پھر بھی برا نہیں لگ رہا ہے، ایسا کیوں؟''

''میں نہیں سمجھ سکتی کہ ایسا کیوں ہوا ہے، بس نہیں لگ رہا ہے وہ برا۔''

''یہ تو کوئی بات نہیں ہے کہ بس لگ برا تو نہیں لگ رہا، کوئی وجہ تو رہی ہوگی، اس وجہ کو تلاش کیوں نہیں کر رہی ہو؟''

''میرے خیال میں تو ایسی کوئی وجہ نہیں ہے۔''

''تم خود سوچنا نہ چاہو تو الگ بات ہے، مگر یہی وہ لمحات ہوتے ہیں جب بندہ خود فریبی میں مبتلا ہوتا ہے۔''

''خود فریبی یہ کیا سوچ رہی ہو تم؟''

''ظاہر ہے، یہ خود فریبی ہی تو ہے۔ کوئی اس کا اچھا پن ہے ضرور جس کے باعث تم اس میں کشش محسوس کر رہی ہو۔ اچھائی اور برائی میں تم فرق محسوس نہیں کر پا رہی ہو۔''

''اس کا اچھا پن کیا ہوسکتا ہے جو مجھے متاثر کرے گا۔''

''دیکھو، سچ کو جان بوجھ کر چھپانا بھی تو غلط بات ہے۔ اپنے آپ سے چھپانا، بہت بڑی ٹھوکر کا باعث بھی تو بن سکتا ہے؟''

''ہاں۔ یہ تو ہے۔''

''پھر سوچو نا، کم ازکم اپنے آپ کو تو مطمئن کرو۔ حالانکہ تم نے اسے بڑے سخت جواب دیئے ہیں۔ اس نے تمہاری ذات تک کی نفی کردی ہے۔''

''میں مانتی ہوں۔ جیسا رویہ اس کا تھا، مجھے تو خود اس سے نفرت کرنی چاہئے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ مجھے اس سے ذرا سی بھی نفرت محسوس نہیں ہو رہی۔ اب میں جتنا بھی اس کے بارے میں سوچتی ہوں، دل یہی چاہتا ہے کہ اسے ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''یہ حقیقت بھی تو ہے نا کہ وہ ایسا ہے۔ یہ حقیقت کیوں جھٹلا رہی ہو تم؟''

''ہاں شاید وہ ایسا لگتا نہیں''

''تو پھر کیسا لگتا ہے۔''

''کہیں ...... کہیں تم اسے صرف ایک لڑکی' فقط ایک لڑکی ہونے کی حیثیت سے تو نہیں دیکھ رہی ہو۔ اس کی وجاہت، جنسِ مخالف کی کشش اور شخصیت نے تجھے اس قدر متاثر کردیا ہے کہ سارے لفظ اور اس میں موجود تاثر سب اپنی اہمیت کھو گئے ہیں۔''

''یہ حقیقت ہے کہ میں ایک لڑکی ہوں، میرا تعلق کسی اور مخلوق سے تو نہیں ہے، عورت ہونے کے ناطے جنسِ مخالف میں کشش محسوس کرنا ایک فطری امر ہے اور میں اسے جھٹلا نہیں سکتی۔ بلاشبہ اس میں کشش ہے۔ اور شاید ایسی ہی کوئی بات ہو۔ مگر لگتا نہیں ہے کہ وہ کوئی ایسی شخصیت رکھتا ہے کہ میں اس سے متاثر ہو جاؤں۔''

''اور متاثر ہونا کیسے کہتے ہیں۔ اس کی ساری شخصیت کو تم نے اپنی سوچوں میں بسا لیا ہے۔ جہاں افکار تھے، تمہاری اپنی سوچ تھی۔ اب وہاں پر اس کا خیال ہے۔ وہ پوری طرح سے تمہارے خیالوں میں براجمان ہے اور تمہیں احساس نہیں ہے اور مسلسل انکار کیے جا رہی ہو۔''

''اگر وہ وجیہہ ہے، پرکشش ہے تو اپنی جگہ، میرے افکار تو نہیں بدل سکتے، افکار اپنی جگہ، لیکن کسی بھی نظارے سے لطف اندوز تو ہوا جا سکتا ہے۔ میں اس سے نفرت کیوں کروں۔''

''لیکن نفرت نہ کرنے کا کوئی جواز تو نہیں ہے نا۔ تم یہ تسلیم کیوں نہیں کرلیتیں کہ اس کی سحر انگیز شخصیت نے تمہیں متاثر کیا ہے۔ تم کون سا کسی دھات کی بنی ہوئی ہو، گوشت پوست کی ایک لڑکی، جو دل کے ساتھ جذبات، من کے ساتھ خواہش اور دماغ کے ساتھ حقیقت کا ادراک بھی رکھتی ہو۔ مان لینے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ یہ دل جو بے پروائی برت رہا ہے۔ اس پر کوئی نہ کوئی اثر ضرور ہوا ہے۔''

''ہاں۔ میں لڑکی ہوں۔ میں بھی جذبات رکھتی ہوں۔ مجھے بھی کوئی اچھا لگ سکتا ہے۔''

''لیکن تمہارے وہ افکار، وہ سوچ اور تربیت کیا ہوئی، کیا اس نے تمہیں نہیں سکھایا کہ اپنی ذات کا حصار کہاں تک ہوتا ہے۔''

''میں سب سمجھتی ہوں۔ لیکن میں کون سا اس کے زیر اثر آگئی ہوں... میں مانتی ہوں کہ اس کی شخصیت کا سحر کسی بھی لڑکی کو پاگل کر دینے کے لیے کافی ہے۔ میں اس کے لیے مری تو نہیں جا رہی ہوں۔ انسانیت کے ناتے، میری اپنی ذاتی خواہش یہ ہے کہ اس قدر وجیہہ بندے کو اتنا کھردرا اور ہٹ دھرم نہیں ہونا چاہئے۔''

''اگر وہ وجیہہ نہ ہوتا تو پھر اسے کھردرا اور ہٹ دھرم ہونے کا حق تھا۔ بات تو پھر وہیں آن ٹکی ناشبانہ وقار۔ اگر اس کے افکار متاثر کرتے تو بات دوسری تھی۔ تم اس کی شخصیت سے متاثر ہوئی ہو۔ یہ تو جسم کی پکار ہوتی ہے، انسانی خواہش۔''

''خدا نہ کرے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''تم سوچ رہی ہو۔ تم اس آدھے ادھورے کپڑوں والی لڑکی سے کیوں ہمدردی محسوس نہیں کر رہی ہو کہ وہ ایک لڑکی ہے اور اسے ایسا ہی ہونا چاہئے۔ اس نے تمہاری اتنی مخالفت بھی نہیں کی۔''

''بعض فطری جذبات اور احساسات ایسے ہوتے ہیں کہ بندے کو ان پر قابو نہیں رہتا۔ میں اپنے فطری جذبات اور احساسات یا خواہشات کو اپنے اندر سے نکال کر باہر نہیں پھینک سکتی۔ یہ تو قدرت کی طرف سے ہیں۔ انہوں نے بھی تو اپنا آپ منوانا ہے۔ میں ان سے انکار کس طرح کروں۔ ہاں ان پر قابو پا سکتی ہوں۔''

''تو یہ طے ہے کہ زرق شاہ نے تمہیں متاثر کیا اور تمہارے اندر کی عورت اس سے مرعوب ہوگئی۔ اس سارے معاملے کو کیا کہتے ہیں۔ ان کا کیا ہوگا یا کیوں ہوگا۔ یہ سارے معاملے الگ ہیں۔''

''اب ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ میری ذات پر، میری تربیت پر یا میرے افکار پر حاوی ہوگیا ہے۔ بس وہ اچھا لگا ہے مگر اس کے افکار اچھے نہیں لگے۔ یہ بھی تو ہے نا کہ میں اس حوالے سے اسے سوچتی جا رہی ہوں کہ اتنا اچھا اور وجیہہ نوجوان ایسے جذبات رکھتا ہے۔''

''اب تم خود غرضی کی بات کر رہی ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ، وہی سب کچھ سوچے جو تم سوچتی ہو، کیا یہ ضروری ہے کہ وہ تیرے جیسے افکار رکھے، تمہاری طرح کا نکتہ نظر ہو۔ کیا پتہ وہ تم سے بھی اچھا مسلمان ہو۔ تمہیں کیا معلوم کہ تم بھی درست ہو یا نہیں۔ تمہارے افکار بھی تو۔''

''نہیں میرے افکار، میری سوچ غلط نہیں ہوسکتی۔''

''چلو مان لیتے ہیں۔ تب ایسا حق تم دوسرں کو بھی تو دو۔ وہ اختلاف کریں گے تو معلوم ہوگا کہ کوئی کیا سوچ رہا ہے۔ محض اپنی سوچ کو مسلط نہیں کرنا چاہیے۔ کسی شے کو بھرنے کے لیے اسے پہلے خالی کیا جاتا ہے۔ ورنہ سب کچھ گڈمڈ ہو جاتا ہے۔''

''مجھے اس کے افکار سے کیا لینا دینا' جب میرا یہ فرض ہی نہیں ہے، مجھے تو اپنا کام کرنا ہے۔ اب ایک اچھی دکھائی دینے والی چیز کو میں اپنی یادوں سے کھرچ کر کیسے نکال سکتی ہوں۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ خود ہی کم اہمیت ہو کر ختم ہو جائے گی۔ مجھے اس پر خود اپنے آپ سے اتنی بحث وتمحیص کرنی ہی نہیں چاہیے۔''

''اب تم ٹھیک سوچ رہی ہو، اپنی فطری جبلت کے تحت تم نے اس میں کشش محسوس کی۔ لیکن اپنے افکار کے باعث وہ تیرے معیار کا نہیں۔ سو اس فضول جنگ کو خود پر مسلط نہ کرو، ورنہ تم اپنے فرض کو بھول جاؤ گی۔''

ساری سوچیں جھٹک کر وہ تھوڑی دیر کے لیے خالی

الذہن بیٹھی رہی۔ پھر اٹھ کر یونیورسٹی جانے کی تیاری کرنے لگی۔ تیار ہونے کے بعد وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ اسے یہ احساس ہی نہیں تھا کہ آج اس نے آئینے کے سامنے معمول سے کچھ زیادہ ہی وقت لگا دیا ہے۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی بہت دیر تک اپنے آپ کو دیکھتی رہی تھی۔

❀ .... ❀ .... ❀

زرق شاہ کے دماغ سے شبانہ سے ہونے والی ملاقات اور باتیں نکل ہی نہیں رہی تھیں۔ وہ انہیں بھلا دینا چاہتا تھا مگر وہ تھیں کہ نکل ہی نہیں رہی تھیں۔ وہ احساس جو اس کے دماغ میں کنڈلی مارے بیٹھا تھا، وہی اسے بھلانے نہیں دے رہا تھا۔ شبانہ کا اس کی ذات کی نفی کر دینے والا رویہ ہی تھا جس نے اسے بری طرح جھنجوڑ کے رکھ دیا تھا۔ کہیں سے بھی کوئی ایسا پہلو دکھائی نہیں دے رہا تھا جس سے شبانہ نے اس کی ذات کا اثبات کیا ہو۔ اپنی سوچوں کا زہر اس میں محرومی کا احساس اجاگر کر رہا تھا۔ وہ جو غرور کے پروں سے شہرت کی فضاؤں میں اڑان بھر رہا تھا۔ اچانک اسے یہ احساس ہوا کہ کوئی ہے جو اس کی ذات کی بری طرح نفی کر سکتا ہے۔ یہ اس کے لیے حیرت انگیز بات تھی کہ اس نے اپنی فطرت کا جو پہلو بھی شبانہ کے سامنے کھولا، اس نے اسی پہلو پر لکیر پھیر دی۔ اپنی ذات کی نفی ہو جانے اور بے دردی سے لکیر پھر جانے پر شکست کا احساس بڑا جان لیوا ہوتا ہے۔ اور یہ حقیقت پوری طرح عیاں تھی کہ شبانہ ایسا کر چکی ہے۔ اس کا نتیجہ اسی صورت میں واضح ہو رہا تھا کہ اس کے اندر محرومی کا احساس اٹھ رہا تھا۔ بالکل ایسے کہ جس طرح کہیں کوئی چنگاری سلگ اٹھی ہو اور اس کا دھواں اپنی کڑواہٹ کا احساس دلا رہا ہو۔ اس کے تن میں احساس کا دھواں آہستہ آہستہ پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ اور اسے لگ رہا تھا کہ اس غبار میں اس کی اپنی شخصیت گم ہوتی چلی جا رہی ہے۔

من میں چلتی ہوئی جنگ میں انسان خود تماشائی نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ جب بھی جنگ ہوتی ہے تو میدان کارزار میں توڑ پھوڑ ہونا تو یقینی امر ہے۔ اور پھر جنگ میں بندہ خود شریک ہو تو فتح یا شکست کا فیصلہ ہو جانے سے قبل دفاع بھی کرتا ہے اور آگے بڑھ کر بھرپور وار بھی کرتا ہے۔ احساس محرومی اسے شکست کی طرف دھکیل رہی تھی۔ شبانہ اسے فاتح کی حیثیت سے دکھائی دے رہی تھی۔ یہ فطری امر ہے کہ اس کے ساتھ آگے بڑھ کر وار کرنے اور شکست کو فتح میں بدلنے کی خواہش شدت اختیار کرتی چلی جا رہی تھی۔ وہ کسی ایسے حملہ آور سے شکست قبول کرنا اپنی توہین تصور کر رہا تھا جو اسے بالکل بھی پسند نہ ہو۔ وہ شبانہ کو اپنے سامنے جھکا لینا چاہتا تھا۔ انتقام کی چنگاری سلگ اٹھی تھی اور اسے بے چین کیے ہوئے تھی۔ یوں وہ جس قدر محرومی میں ڈوبتا، اس قدر انتقام اسے ابھرنے کی جانب مائل کرتا۔ اب فقط اس کی انا کو تسکین اسی وقت ہوتی جب وہ اپنے فیصلے پر عمل درآمد کرتا، اب یہ کیسے ممکن تھا؟ وہ اتنے دنوں تک یہی سوچتا رہا تھا۔

وہ تیسرے دن کی ایک خوشگوار سہ پہر تھی۔ دھوپ خاصی چمک رہی تھی۔ اوائل فروری کی یہ دھوپ بھی کینو کی مانند کھٹی میٹھی تھی۔ اس دن شیڈول میں پروڈیوسر قریشی سے ملنا تھا۔ اسی لیے اسے شبانہ بڑی شدت سے یاد آئی تھی۔ لیکن کوئی راہ ایسی بھائی نہیں دے رہی تھی جس سے وہ اپنا فیصلہ منوا سکتا۔ وہ آئینے کے سامنے ٹائی کی گرہ لگا رہا تھا کہ اچانک اس کے دماغ میں یہ سوچ در آئی کہ کیوں نا شبانہ سے ملا جائے۔ اس نے خود ہی تو کہا تھا کہ وہ کہیں بھی بیٹھ کر بات کر سکتی ہے۔ ظاہر ہے کوئی تعلق ہوگا تو ہی میں اسے اپنے سامنے جھکا سکوں گا اور اپنی ذات کی نفی کر دینے کا انتقام لے پاؤں گا۔

"ٹھیک ہے، تم اس سے مل لو گے، وہ تم سے مل بھی لے گی، لیکن تم بات کیا کرو گے۔ کیا کہو گے تم؟"

اس سوال نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر وہ ملاقات کرنے آ بھی گئی تو وہ کیا کرے گا۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اس نے خود سے کہا۔

"دو ہی راستے ہیں۔ ایک یہ کہ جو وہ سوچ رہی ہے۔ جن افکار کی بنیاد پر اس نے میرے خیالات کی نفی کر کے میری ذات کو نظر انداز کیا ہے۔ میں یہ ثابت کروں گا وہ غلط ہیں اور میں درست ہوں۔ وہ اگر اپنی شکست قبول کر لیتی ہے تو بلاشبہ یہ میری فتح ہے۔ جس سے نہ صرف میری انا کی تسکین ملے گی بلکہ میں مطمئن رہوں گا کہ میں درست سوچ رکھتا ہوں۔"

"اور دوسری راہ......"

"یہ ہے کہ میں اپنی ذات کی سحر انگیزی کا جادو اس کے اندر بیٹھی لڑکی پر طاری کر دوں گا۔ یہاں تک کہ وہ اپنا آپ کھول دے گی۔ یہ حجاب اور نقاب کی کیا حیثیت ہے۔ جب میں اس کا دل ہی اپنے قابو میں کر لوں گا تو پھر جس طرح چاہوں اس کی تعمیر و تخریب کروں۔ پھر وہ چاہتے ہوئے بھی مجھے نہیں روک پائے گی۔ اس کے سارے بدن پر میرا تسلط ہوگا۔"

"اگر یہ تم نہ کر پائے تو؟"

"ایسا ہو نہیں سکتا، میں جس راہ پر بھی چلوں گا کامیاب ٹھہروں گا۔"

"کامیابی تو اس صورت میں ہوتی ہے نا جب بندہ پوری یکسوئی سے کسی مقصد کے لیے شروعات کرے۔ تم تو ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پائے ہو کہ کون سی راہ پر چلو گے؟"

"ہاں۔ میں مانتا ہوں۔ میں ابھی فیصلہ نہیں کر پایا۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

"پہلی صورت میں تم کھل کر اس کے سامنے آجاؤ گے۔ چونکہ بات افکار و خیالات کی ہے، اس کے لیے دلیل کی جنگ ہوگی، تم جیت گئے یا ہار گئے۔ اس میں تمہارے وقت کا بڑا نقصان ہوگا۔ اس کے لیے تمہاری توجہ بٹ کر رہ جائے گی۔ اور آخر میں کیا ہوگا؟ چاہے فتح ہو یا شکست، وہ تمہاری دسترس میں نہیں ہوگی۔ تم اسے شکست بھی دے دو گے تو کیا وہ تمہاری بات مان لے گی؟ جبکہ دوسری صورت میں وہ مکمل تمہارے اختیار میں ہوگی۔"

"کیا دوسری صورت میں دھوکا دہی نہیں ہے۔"

"محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔"

"یہ وہ فقرہ ہے جو اپنی شکست کا خود اعتراف کرتا ہے۔ کیا تمہیں اپنے آپ پر، اپنے افکار پر بھروسہ نہیں ہے۔ تم اگر دوسری راہ اپناؤ گے تو پہلے قدم پر شکست قبول کر لو گے۔ تمہارے افکار ایسے نہیں ہیں جو تمہیں فتح دلا سکیں۔ اسی لیے دھوکا دینے کے بارے میں سوچ رہے ہو۔ وہ بھی ایک عورت کے مقابلے میں۔ اس کی جذباتی زندگی میں ہلچل پیدا کرنا تمہارے خیالات کی، تمہاری سوچ و فکر کی واضح شکست ہے۔ اس کا مطلب ہے تمہارے پاس کوئی وجہ نہیں ہے جس کے بارے میں تم وضاحت کر سکو۔ پھر تو وہ ٹھیک تھی۔ اور پھر یہ مردانگی تو نہ ہوئی۔ اس طرح تم اپنی سوچ و فکر پر خود ہی لکیر پھیر رہے ہو۔"

"بات تو ٹھیک ہے۔ معقول بھی ہے۔ اس طرح تو میں بھی منافقت کروں گا نا۔ یوں تو میری شکست ہو گی۔" اس نے چونکتے ہوئے سوچا۔ ان لمحوں میں وہ خود پر گزرنے والی کیفیت کو سمجھ رہا تھا کہ جنگ سے پہلے قبول کی جانے والی شکست کس قدر اذیت ناک ہوتی ہے۔ لڑی گئی جنگ کی فتح یا شکست اطمینان بخش ہوتی ہے۔

"بس وہ میرے دماغ سے نکل جائے۔ وہ جب تک مجھے یاد آتی رہتی۔ اس وقت تک مجھے بے چین رکھے گی۔" اس نے اکتائے ہوئے انداز میں سوچا۔ انہی لمحات میں سیل فون کی آواز نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ تب وہ خود پر حیران ہوا کہ وہ اب تک آئینے کے سامنے کھڑا سوچ رہا ہے۔ کیا اس کی یاد اس قدر حاوی ہو گئی ہے کہ اسے اپنا آپ بھلا دے۔ وہ چونکتے ہوئے بے بس سا ہو کر صوفے پر آن بیٹھا۔ فون کی مسلسل آواز اسے اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ اس نے بے دلی سے فون اٹھا کر دیکھا تو وہ پروڈیوسر کا تھا جس کی آواز اسے یوں لگی جیسے پرسکون ماحول میں کوئی گدھ چیخنے لگے۔

"یار! ابھی تک تم آئے کیوں نہیں ہو۔ ہم سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں؟" اس نے برہم لہجے میں کہا۔

"میں بس نکلنے ہی والا تھا۔ کچھ دیر میں آپ تک پہنچ جاؤں گا۔" اس نے اپنے لہجے کو اس حد تک نرم کیا تو وہ خوشامدی انداز بن گیا۔

"ٹھیک ہے، پہنچو۔" پروڈیوسر نے کہا اور فون بند کر دیا۔

زرق شاہ کو اس کا لہجہ اچھا نہیں لگا تھا۔ اس نے اکتائے ہوئے انداز میں فون جیب میں رکھ لیا اور اٹھنے لگا۔ انہی لمحات میں اس کے دماغ میں خیال آیا۔

"کیا میں فیصلہ ہی نہیں کر پاؤں گا کہ مجھے اس کے ساتھ کیا کرنا چاہیے۔ کیا مجھے ابھی سے شکست مان لینی چاہیے۔ اسے بھلا دینا چاہیے یا پھر......" یہاں تک سوچتے ہوئے اس کے سارے لفظ تحلیل ہو گئے۔ جیسے وہ خلا میں آگیا ہو۔ جہاں کسی بھی قسم کی کوئی کشش نہیں ہوتی۔

ڈرائیور تیزی سے کار بھگائے چلا جا رہا تھا اور وہ عقبی نشست پر خاموش بیٹھا سوچ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے

سامنے وہی دو آنکھیں تھیں، جو نہ صرف بولتی تھیں بلکہ لفظوں کے مفہوم کی ادائیگی میں معاون بھی تھیں۔ یوں جیسے لفظوں میں روح، ان آنکھوں کی ادا سے ہے۔ مجھے اس لڑکی کو بھول جانا چاہیے۔ جو ہوا سو ہوا، زندگی میں پتہ نہیں کتنے لوگ ملتے ہیں اور ان سے نجانے کیا کیا باتیں ہوتی ہیں۔ کیسے کیسے تاثر ذہن میں بنتے ہیں۔ پھر ذرا سا وقت گذرتا ہے تو وہ سب بھول جاتا ہے۔ یوں کسی کے بارے میں سوچتے رہنا، ماضی میں پڑے رہنے کے مترادف ہے، مجھے تو آگے دیکھنا ہے۔ اس نے سوچا اور پھر باہر کے مناظر میں کھوگیا۔

وہ پروڈیوسر قریشی کے کمرے میں پہنچا تو وہاں فقط باقر رضوی ہی تھا۔ اسے ایک دم جھٹکا سا لگا۔ یہاں تو کافی سارے لوگوں کو ہونا چاہیے، بہرحال وہ اپنے تاثرات کو چھپاتے ہوئے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجا کر پاس بیٹھ گیا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد قریشی نے کہا۔

''زرق شاہ! سنا ہے تم نے رضوی صاحب سے تعاون نہیں کیا، آوٹ ڈور سے جلدی آگئے ہو۔''

اس نے یہ سنتے ہی حیرت سے رضوی کی جانب دیکھا جو اپنا چہرہ دوسری طرف کیے بیٹھا تھا۔ فوری طور پر زرق شاہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ اس لیے بولا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے، میں ان کی اجازت ہی سے آیا تھا۔ انہوں نے ہی کہا تھا کہ اب کوئی کام نہیں ہے''

''یہ آپ کو بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جب تک یونٹ وہاں ہے، ادھر رہنا چاہیے تھا آپ کو۔'' قریشی نے کہا تو وہ فوراً سمجھ گیا کہ بات کیا ہوسکتی ہے اس لیے مسکراتے ہوئے بولا۔

''آپ وہ بات کہیں جو رضوی صاحب کہنا چاہتے ہیں۔''

''مطلب......!'' قریشی نے کہا۔

''مطلب یہی ہے کہ میں نے ان سے بھرپور تعاون کیا ہے۔ اب جو بھی مجھے سائن کرے گا، میں نے تو اس سے تعاون کرنا ہے۔'' وہ چھپے ہوئے لفظوں میں اپنی بات کہہ گیا۔

''دیکھیں جب ایک بندے کا کام مکمل نہیں ہوا تو آپ دوسرے بندے کا کام کیوں پکڑتے ہیں اور وہ بھی۔'' قریشی نے کہا تو زرق شاہ بولا۔

''ان سے میری پہلے بات ہوچکی تھی لیکن جو تاریخیں میں نے رضوی صاحب کو دی ہیں۔ ان میں تو خلل نہیں پڑا نہ......''

''بہرحال آپ محتاط رہیں اور پہلے یہ سیریل ختم کروائیں، پھر بعد میں کسی اور طرف دیکھیے گا۔'' قریشی نے احساس دلا کر اپنی بات کہہ دی تو زرق شاہ کو ان لمحات میں وہ لوگ ڈکٹیٹر سے کم نہیں لگے جو فقط اپنا فیصلہ مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے پہلے وہ کوئی جواب دیتا قریشی کا فون بج اٹھا۔ وہ کال سننے میں مصروف ہوگیا۔ کچھ دیر بعد اس نے فون میز پر رکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''یہ وہی حجاب والی لڑکی کا فون تھا۔ یاد ہے آپ کو زرق شاہ جس کے ساتھ آپ نے بڑی بدتمیزی کی تھی۔''

''بدتمیزی۔ میں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔'' اس نے کہا

''خیر۔ آپ رضوی صاحب سے ملیں اور اگر کوئی انہیں گلہ شکوہ ہے تو دور کردیں۔ وہ لڑکی کچھ دیر میں آنے والی ہے، میں اس کا پرفارما پر کردوں۔ اس بے چاری کے بہت فون آچکے ہیں۔'' قریشی نے کہا اور دراز میں سے کاغذات نکال کر انہیں دیکھنے لگا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ دونوں اٹھ جائیں۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور ایک دوسرے سے کچھ کہے بنا اٹھ گئے۔

❁......❁......❁

اس دن شبانہ ٹی وی چینل کے اسٹوڈیو کے لیے کیمپس سے نکلنا چاہتی تھی کہ اسے سامنے سے سعدیہ آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ حیران ہوئی کہ یہ اس وقت یہاں کیوں آئی ہے۔ وہ دونوں ملیں تو شبانہ نے یہی سوال اس سے کردیا وہ اکتاتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''یار گھر میں بور ہورہی تھی، کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا، اس لیے سوچا کہ ایک چکر کیمپس کا لگا آؤں۔''

''مطلب، کوئی کام نہیں ہے؟'' شبانہ نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

''ہاں، مگر تم کہاں جارہی ہو، آؤ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' سعدیہ نے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔

''سعدیہ، میں بیٹھ تو جاتی، لیکن ابھی مجھے ٹی وی چینل

سے ایک پروڈیوسر کا فون ملا ہے۔ انہوں نے وہ کام مکمل کرلیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ لے لوں اور کچھ دوسرا ملے تو یاد دہانی کروا دوں۔'' شبانہ نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''کتنا وقت لگے گا تمہیں اپنا کام ختم کرنے میں؟'' اس نے پوچھا

''یہی دو تین گھنٹے۔ میں نے کون سا وہیں بیٹھے رہنا ہے۔'' شبانہ نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ چند لمحے سوچتی رہی، پھر بولی۔

''چلو تم جاؤ۔'' اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ شبانہ چونک گئی۔

''بات کیا ہے اتنی بجھی بجھی سی کیوں ہو؟''

''کچھ نہیں، تم جاؤ جلدی آگئے تو ٹھیک ورنہ کل بات کریں گے۔'' سعدیہ نے کہا اور پھر کوئی بات سنے بغیر آگے نکل گئی۔ شبانہ کو بڑا عجیب سا لگا تھا، اس نے راہداری میں ہولے ہولے قدم اٹھاتی سعدیہ کی جانب دیکھا اور پھر طویل سانس لے کر پارکنگ کی جانب بڑھ گئی۔ اس نے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پرس اور فائلوں کو پچھلی سیٹ پر رکھا ہی تھا کہ اس کا فون بج اٹھا جو پرس میں تھا۔ اس نے فون نکالا اور اسکرین پر نگاہ ڈالی، اجنبی نمبر تھے۔ اس نے کال ریسو کرتے ہوئے ہیلو کہا۔

''میں زرق شاہ بات کررہا ہوں۔''

''اوہ! تو یہ آپ ہیں۔ فرمایئے؟''

''میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔'' اس نے انتہائی نرم لہجے میں خمار بھرتے ہوئے کہا۔

''کہیے، کب اور کہاں ملنا چاہیں گے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''جہاں آپ پسند کریں۔ میرا مطلب ہے جہاں آپ ایزی ہوں، سکون محسوس کریں۔'' وہ اسی خمار آلود لہجے میں بولا

''ٹھیک ہے، اس وقت میں اسٹوڈیو کی طرف جارہی ہوں۔ اب دیکھیں وہاں کتنا وقت لگتا ہے۔'' وہ پرسکون سے بولی۔

''اگر آپ وہاں پر ٹھہریں تو میں وہیں آجاتا ہوں۔ یا پھر کسی بھی ریستوران میں۔'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''اگر وہاں آسکتے ہیں تو ٹھیک، ورنہ ہم پھر طے کرلیں گے۔'' شبانہ نے الوداعی فقرے کہہ کر فون بند کردیا۔ پھر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس کی ذہنی رو زرق شاہ کی طرف چلی گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا فون آنا اسے اچھا لگا ہے۔ اپنی تحقیق کے لیے اس نے کچھ ڈرامے دیکھے تھے جن میں وہ بھی تھا۔ خاصی اچھی اداکاری کرلیتا تھا وہ۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہی زرق شاہ ہے جس سے وہ مل چکی ہے۔ پھر جیسے ہی یہ خیال آیا کہ اس نے بات کیا کرنی ہے تو اس کی تلخی بھری باتیں اور نفرت آمیز لہجہ اسے یاد آگیا۔ بڑی سڑک تک پہنچتے ہوئے اس نے اسے ذہن میں رکھا اور پھر اسے ذہن سے نکال دیا۔

وہ پروڈیوسر قریشی اور جنرل منیجر سے مل کر، ان سے پرفارما وصول کرکے ٹی وی اسٹوڈیو سے باہر نکلی۔ چند لوگوں کو اس نے یاد دہانی کروائی۔ وہ خوش تھی کہ چلو کام کی ابتداء تو ہوئی۔ وہ جس وقت پارکنگ میں لگی اپنی گاڑی تک آئی تو اس کا سیل فون بجا، اسکرین پر زرق شاہ کے نمبر جگمگا رہے تھے۔

''جی، فرمائیں۔''

''سوری میں ٹی وی نہیں پہنچ سکا، اس لیے آپ۔''

''بتائیں، مجھے کہاں آنا ہوگا؟'' اس نے فوراً پوچھ لیا۔ تب ہی اس نے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی لابی کے بارے بتایا تو اس نے فوراً کہہ دیا۔ ''ٹھیک ہے، میں آرہی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔

وہ لابی میں پہنچی تو بہت ساری نگاہیں اس کی طرف اٹھی تھیں مگر وہ بے نیازی اس میز کی جانب بڑھ گئی جہاں زرق شاہ موجود تھا۔ وہ وہاں پہنچی تو زرق شاہ احتراماً کھڑا ہوگیا اور بڑے ہی نرم لہجے میں بولا۔

''خوش آمدید، یہاں آکر آپ نے میرا مان بڑھایا، تشریف رکھیں۔''

''اسلام وعلیکم۔'' شبانہ نے کہا اور پھر اپنا پرس میز پر رکھتے ہوئے بیٹھ گئی۔ زرق شاہ نے سلام کا جواب دیتے ہوئے ذرا سی خفت محسوس کی اور وہ سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تو اس نے کہا۔ ''جی فرمائیں؟''

''میں دراصل آپ سے اس دن کے رویے پر

معذرت کرنا چاہ رہا ہوں، ممکن ہے آپ کا دل دکھا ہو؟'' وہ آہستگی سے بولا

''اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں کہ آپ کو معذرت کرنی چاہیے تو ٹھیک ہے۔ آپ کا یہی احساس ہی کافی ہے۔'' وہ نرم لہجے میں بولی۔

''دیکھیں جہاں تک میرے نکتہ نگاہ کی بات ہے، مجھے اس پر کوئی ملال نہیں۔ اس پر میں قائم ہوں۔ میں نے تو اس لیے معذرت چاہی تھی کہ آپ لڑکی ہیں اور صنف نازک سے بہت اچھا رویہ رکھنا چاہیے۔ اسی تناظر میں۔'' وہ بہ مشکل اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ جبکہ شبانہ اس کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اسے یوں مشکل سے لفظ ادا کرتا ہوا زرق شاہ اچھا لگا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ انسانی ہمدردی بھی شامل ہو چکی تھی کہ بندہ اپنی غلطی کا اعتراف کر رہا ہے۔

''ٹھیک ہے، میں سمجھ گئی، اور کوئی بات؟'' اس نے پوچھا

''نہیں اور کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

''تو مجھے اجازت دیں۔'' شبانہ نے پرس اٹھاتے ہوئے کہا تو زرق شاہ نے چونکتے ہوئے حیرت سے بولا۔

''ابھی سے؟'' وہ حیرت سے بولا

''جب کوئی مزید بات ہی نہیں ہے تو میرے خیال میں یہاں بیٹھنا فضول ہے۔'' شبانہ نے یوں کہا جیسے وہ خود بھی نہ اٹھنا چاہ رہی ہو۔ اس کا من کہہ رہا تھا کہ وہ کوئی مزید بات کرے لیکن وہ کوئی قوت تھی جو اسے اٹھنے پر مجبور کر رہی تھی۔

''مطلب، کوئی بھی بات نہیں ہو سکتی کیا؟'' اس نے پوچھا

''میں آپ کے بلانے پر آئی ہوں کہ آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔ میرے خیال میں آپ نے جو کہنا تھا کہہ دیا۔ اگر آپ مزید کوئی بات کہنا چاہیں تو میں یہاں ہوں، ورنہ۔'' اس نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ دوسرے لفظوں میں اس نے باور کرا دیا کہ فضول بیٹھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

تب زرق شاہ نے سیاہ حجاب میں ملبوس اس لڑکی کی جانب دیکھا، جس کی بولتی آنکھیں اس پر مرکوز تھیں۔ اس نے پہلی بار شبانہ کی آنکھوں کو غور سے دیکھا اور چونک گیا۔ اسے لگا کہ یہ آنکھیں منفرد سی ہیں۔ ان میں کچھ ایسا ہے جو سب سے ہٹ کر ہے۔ کیا ہے وہ لمحوں میں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا لیکن اس نے اپنے من میں ایسے محسوس کیا جیسے گرم تپتے ہوئے صحرا میں اچانک خوشگوار ٹھنڈی ہوا کا جھونکا موسم ہی کو بدل کر رکھ دے۔ اسے اپنے آپ پر حیرت ہوئی۔ وہ اپنے آپ کو سوچے یا ان آنکھوں کو دیکھے۔ تب ہی اس نے خود کو نظر انداز کرتے ہوئے، ان آنکھوں کو غور سے دیکھا۔ وہ خود پر تو بعد میں توجہ دے سکتا تھا لیکن وہ آنکھیں تو اوجھل ہو جانے والی ہیں۔ اس نے شعوری کوشش کے ساتھ ان آنکھوں میں دیکھا تو پہلا خیال یہی آیا ''انسان کی دو آنکھوں میں زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا۔ میں نے یکے بعد دیگرے دونوں آنکھوں کو دیکھنے کی کوشش کی ہے تو ایک آنکھ میں دنیا نظر آئی اور دوسری آنکھ میں آخرت فاصلے پر تھی اور میں درمیان میں معلق ہو گیا ہوں....'' وہ چونک گیا، یہ کیسا خیال آیا ہے مجھے، یہ دنیا اور آخرت کا تصور کیوں؟ وہ ایک دم سے گڑبڑا گیا۔ تب ہی وہ بے ساختہ بولا۔

''آپ کی آنکھیں بہت خوبصورت ہیں۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' اس نے اعتماد سے یوں کہا جیسے یہ بات اس کے لیے نئی نہ ہو۔ حالانکہ زرق شاہ کے لہجے نے اس کے اندر یوں ہلچل پیدا کی تھی جیسے ساحل پر آنے والی لہر زور سے آئے اور پھر شور مچا کر پُرسکون ہو جائے۔

''شبانہ! میری زندگی میں بہت سی لڑکیاں آئی ہیں اور اب بھی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں لڑکیوں ہی میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ یہ میری پیشہ ورانہ مجبوری بھی ہے لیکن آپ میں ایک خاص بات ہے۔ آپ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ بااعتماد بھی ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟'' اس نے بات کو یوں سنبھالا جیسے فرش پر گرنے والے شیشے کے گلاس کو ٹوٹنے سے پہلے بچا لیا جائے۔

''محترم شاہ صاحب! بات یہ ہے کہ میں کوئی ماورائی مخلوق نہیں ہوں۔ ایک عام سی لڑکی ہوں۔ لیکن میری تربیت کرنے والوں نے مجھے بتایا ہے کہ میں کیا ہوں اور مجھے کیسا ہونا چاہیے۔ شاید اس لیے میں آپ کو منفرد سی لگی

ہوں۔'' وہ نرم انداز سے بولی۔

''کیا بتایا انہوں نے؟'' زرق شاہ نے دلچسپی سے پوچھا

''یہی کہ سب سے پہلے میں انسان ہوں۔ اس کے بعد میں عورت ہوں اور اس کے بعد میں مسلمان ہوں۔ پھر اسی طرح میری حیثیت کا تعین ہے۔ انسان ہونے کے ناتے میرا تعلق پوری دنیا کے انسانوں سے ہے۔ وہی خوبیاں، وہی صلاحیتیں میرے اندر بھی ہیں، جو دنیا بھر کے انسانوں میں ہیں۔ میری جسمانی ساخت میرے عورت ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ اور عورت رہنا میری فطری مجبوری ہے۔ کاروبارِ زندگی میں میرا حصہ ایک عورت ہونے کی حیثیت ہی سے ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ ایک عورت ہونے کے ناتے میرا رویہ، میری ذمے داری اور میرا مقصد کیا ہونا چاہیے۔ جو ایک فطری تقاضا ہے اور زندگی گذارنا، یا اس دنیا کے ساتھ ربط و تعلق یا معاشرت کیسی ہونی چاہیے۔ یہ مجھے اس وقت معلوم ہوتا ہے جب میں خود کو مسلمان کی حیثیت سے دیکھتی ہوں۔ پھر میں ایک بیٹی ہوں، بہن ہوں۔'' شبانہ نے بڑے تحمل سے کہا۔

''ظاہر ہے تربیت یافتہ انسان بااعتماد تو ہوتا ہے۔ جب اسے خاص انداز میں تربیت دی جائے۔'' زرق شاہ پوری طرح بحث کے موڈ میں آگیا۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی۔ ان کے پاس ویٹر آ گیا۔ زرق شاہ نے مینیو شبانہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ اپنی پسند۔''

''میں کچھ نہیں لوں گی۔'' اس نے حتمی انداز میں کہا تو زرق شاہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اپنے لیے جوس منگوا لیا۔ ویٹر کے چلے جانے کے بعد شبانہ نے کہا۔

''آپ نے کچھ زیادہ ہی اندازہ لگا لیا ہے، لفظ ''تربیت یافتہ'' نے شاید آپ کے تصور نے کچھ ایسے معنی دے دیے ہوں۔ ایسا کچھ نہیں میں نے وہی عام تعلیم حاصل کی ہے۔ لیکن خاص یہ ہے کہ مجھے احساس دیا گیا ہے۔ اسے آپ شعور کہہ لیں یا پھر خیال کہ میں کیا ہوں۔ اور میں نے اسے پورے دل سے قبول کیا ہے۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔

''وہ احساس، شعور یا خیال آخر کیا ہے، وہی تو میں پوچھنا چاہ رہا ہوں۔'' زرق شاہ نے تحمل سے پوچھا

''ہمارے لیے زندگی گزارنے کا بہترین لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے۔ جس سے دوسرں کا نقصان نہ ہو اور خود بھی تحفظ سے رہے، بس اتنی سی بات ہے۔'' شبانہ نے کہا۔

''وہ تو ہر بندے کو معلوم ہے۔ یہ کوئی نئی بات تو ہے نہیں۔ میرے خیال میں آپ بات چھپا گئی ہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا

''دیکھیں شاہ صاحب! بہ حیثیت انسان نہ چاہتے ہوئے بھی سیکھتا ہے۔ اس کا ماحول اسے سکھاتا ہے۔ پھر وہ اپنے کردار سے اظہار کرتا ہے کہ اس کے اندر کیسے خیالات ہیں۔ اس نے کیا سیکھا، کیسی پرورش پائی، یا پھر وہ انسانیت کے کس درجے پر ہے۔ کردار ہی معیار ہوتا ہے۔ اگر تو کردار ٹھیک ہے تو ظاہر ہے اس کے خیالات یا دوسرے لفظوں میں زندگی گزارنے کا لائحہ عمل درست ہے۔ اور اگر نہیں تو کہیں نہ کہیں کمی کوتاہی ضرور ہے۔ اس پر سوچنا چاہیے۔'' وہ پرسکون انداز میں بولی۔

''میں اب تک آپ کی بات سے یہ سمجھا ہوں کہ بندے کا ماحول ہی اسے بناتا یا دوسرے لفظوں میں بگاڑتا ہے۔ یعنی بناؤ یا بگاڑ ماحول ہی کی وجہ سے ہے، اس تناظر میں، میرا آپ سے یہ سوال ہے کہ اگر آپ کا ماحول مذہبی نہ ہوتا تو کیا آپ یوں حجاب یا نقاب میں ہوتیں؟'' اس نے تیزی سے پوچھا

''ممکن ہے۔ ایسا ہی ہوتا، میں بھی سلیولیس شرٹ میں پھرتی یا جو بھی میرا ماحول ہوتا لیکن میں آپ کو ایک بات بتا دوں، مجھے کبھی کسی نے حجاب پہننے پر مجبور نہیں کیا۔ یہ میں نے اپنی مرضی سے پہنا ہے۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ یہ میرے لیے درست ہے۔'' شبانہ نے بڑے تحمل سے کہا۔

''لیکن یہ تو ایک خاص مذہبی ہونے کی علامت بھی تو ہے نا؟'' زرق شاہ نے کہا۔

''اچھی بات ہے نا۔'' شبانہ نے تحمل سے ہی کہا۔

''اسی بات سے تو آپ کٹر قسم کی مذہبی لگ رہی ہیں۔'' وہ بولا

''شاہ جی، میں نے اب تک مذہب کے حوالے سے بات نہیں کی۔ میں نے اس پہلو کو چھوا تک نہیں ہے کہ دین اور انسان کا تعلق کیا ہے۔ میں نے تو اب تک عام معاشرتی

حوالے سے باتیں کی ہیں۔تو اس میں میرے کٹڑ ہونے یا یہ ہونے کا کیا پتہ چلتا ہے۔معاف کیجئے گا،ابھی آپ کا وژن وہ نہیں، جو ہونا چاہیے۔اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔کیونکہ آپ نے بھی تو وہی سوچنا ہے جو خیال آپ کو دیئے گئے ہیں۔''شبانہ نے کہا

''میں سمجھا نہیں، آپ بات کو گھما رہی ہیں۔''وہ تیزی سے بولا

''میں نے بات کو کہیں بھی نہیں گھمایا بلکہ آپ میری بات سمجھ نہیں رہے۔ابھی کچھ لمحے پہلے میں نے کہا تھا کہ انسان اپنے کردار ہی سے اظہار کرتا ہے۔چلیں مجھے بتائیں،کیا آپ کے اور میرے جسم کا کوئی مذہب ہے؟''اس نے اچانک پوچھا تو زرق شاہ نے سوچتے ہوئے کہا

''میرے خیال میں کسی جسم کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔''

''بالکل ایسے ہی جیسے آپ بنیادی طور پر زرق شاہ ہیں،سید زرق شاہ لیکن جب آپ کو کسی ڈاکٹر کا کردار ملتا ہے تو آپ ڈاکٹر بن جاتے ہیں۔غریب بے روزگار بن جاتے ہیں یا ایسے کوئی بھی کردار تو یہ کیوں اپناتے ہیں آپ سارے کردار؟''

''ظاہر ہے مجھے وہ کردار ملتا ہے۔رائٹر اسے لکھتا ہے۔ڈائریکٹر مجھے دیتا ہے اور میں خود پر طاری کر لیتا ہوں۔''

''یعنی ایک خیال جو رائٹر نے سوچا،آپ نے اسے عملی صورت دے دی،وہ بن گئے۔اصل شے کیا ہوئی۔ وہ خیال، جو رائٹر نے سوچا تھا۔اب اسی بات کا دوسرا پہلو دیکھیں۔سید زرق شاہ مختلف کردار بدلتا ہے۔اسی طرح آپ کسی غیر مسلم کا کردار بھی بدل سکتے ہیں۔کبھی کوئی کبھی کوئی تو پھر آپ سید زرق شاہ ہی کیوں رہتے ہیں؟ ہونا تو یہ چاہئے کہ آپ بے نام رہیں لیکن آپ اپنے نام کے لیے،اپنی پہچان بنانے کے لیے دن رات محنت کرے چلے جارہے ہیں کیوں؟ تاکہ آپ کو لوگ،آپ کی ذات کے حوالے سے،آپ کی شخصیت کے حوالے سے جانیں۔ایسا کیوں ہے؟''شبانہ نے تفصیل سے کہتے ہوئے سوال چھوڑ دیا۔

''یہی کہ میں ہوں،مطلب میری ذات اور......''وہ کہہ نہ سکا اور سر جھٹک کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔

''میں بتاتی ہوں شاہ صاحب،وہ خیال،وہ شعور اور وہ احساس جس نے آپ کو اپنی پہچان دی ہے۔وہ چاہتا ہے کہ نام کمایا جائے اس کا کوئی سا بھی ذریعہ اپنائیں اس سے تو کسی نے نہیں روکا آپ کو۔اسی پہچان کو اجاگر کرنے کے لیے کئی کردار بدلتے ہیں۔''

''یہ تو ہے آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔''وہ بولا۔

''اس طرح میں اگر اپنے خیالات کا اظہار اپنے حجاب سے کرتی ہوں تو آپ نے اسے مذہبی کہہ دیا۔مذہب تو بہت دور کی بات ہے شاہ جی،اگر ہم بہ حیثیت انسان ہی اپنے آپ پر توجہ کر لیں تو کسی کی طرف انگلی نہ اٹھائیں۔بات لمبی ہو جائے گی،ورنہ میں آپ کو بتاتی کہ زندگی گذارنے کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہئے۔''

''آپ بتائیں۔''وہ تیزی سے بولا۔

''میرے خیال میں ساری باتیں میں نے ہی کی ہیں،حالانکہ آپ نے مجھے بلایا تھا۔''اس نے یاد دلایا

''اوہ ہاں۔''اس نے یوں اظہار کیا جیسے اسے یاد آ گیا ہو۔پھر بولا۔''آپ کی ایک بات ہی نے مجھے بہت پریشان کیا ہوا ہے کہ میری نسبت کیا ہے۔کلچر کے حوالے سے بات ہوئی نہیں، جو میں کرنا چاہتا تھا۔آپ نے تو ایک نئی بات میرے سامنے رکھ دی۔خیر وہ پھر سہی۔لیکن یہ بات تو آپ مانیں کہ حجاب لینے والی خواتین مذہبی ہوتی ہیں اور انہیں اور ان کی سوچ کو مذہب کے دائرے ہی میں بند کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔آپ پوری دنیا کے ساتھ رابطے کی سوچ رکھی ہیں۔لیکن دُنیا تو مختلف مذاہب ،روایات،کلچر،ماحول،تہذیب اور پتہ نہیں کیا' کیا ان سب کا مجموعہ ہے۔جبکہ آپ کسی کے ساتھ بیٹھ کر کھا پی نہیں سکتیں،کیا شوشل رویہ ہوگا آپ کا۔یہ خواہ مخواہ کی رکاوٹ اس لیے بنائی گئی ہے کہ ایک خاص طبقے کی علامت ابھرے۔کیا اس کے بغیر کردار کا اظہار نہیں ہو سکتا؟''وہ سکون سے بولا مگر اس کے لہجے میں طنز کی آمیزش تھی۔

''شاہ صاحب آپ نے اپنی بات میں کئی ساری باتیں کر دی ہیں جو بہر حال ایک طویل بحث کی متقاضی ہیں۔اور میرے پاس اتنا وقت نہیں۔میں اپنی دوست کے ساتھ وعدہ کر کے آئی ہوں کہ اسے وقت دوں گی۔میں کوشش کروں گی کہ آپ کے ہر سوال کا جواب دوں۔آپ اپنے سوال اکٹھے کر رکھیں۔''شبانہ نے خوشگوار انداز میں کہا تو زرق شاہ نے کہا

''اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں آپ کی ریسرچ میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں......''

''کیسے کریں گے آپ میری مدد؟''اس نے پوچھا۔

''جو اور جس طرح چاہیں۔''یہ کہتے ہوئے وہ فوراً بولا،''دیکھیں،یہ میں آپ پر احسان نہیں کر رہا ہوں، بلکہ اپنے فائدے کی سوچ رہا ہوں۔''وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''وہ کیسے؟''اس نے پوچھا۔

''ظاہر ہے میں آپ سے وقت لوں گا تو اس کے عوض آپ کا وہ وقت تو بچا دوں جو آپ نے ریسرچ کے معاملے میں لگانا ہے۔اس طرح دونوں کا فائدہ ہو جائے گا۔''زرق شاہ نے خمار آلود لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔''شبانہ نے چونکتے ہوئے کہا اور پھر تیزی سے اپنا پرس اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔''میں اب چلتی ہوں،اللہ حافظ۔''اس نے کہا اور زرق شاہ کی بات سنے بغیر باہر کی جانب بڑھ گئی۔

وہ ہوٹل کی پارکنگ میں آئی اور اپنی گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے سعدیہ سے رابطہ کیا۔ مسلسل بیل جانے کے باوجود وہ فون نہیں اٹھا رہی تھی۔یقیناً وہ ناراض ہو گئی تھی ورنہ وہ اس کا فون سن لیتی۔اس نے سیل فون ڈیش بورڈ پر رکھا اور پارکنگ سے نکلتی چلی گئی۔اسے افسوس ہو رہا تھا کہ سعدیہ کا دل ضرور دکھا ہوگا کہ وہ وعدہ کرنے کے باوجود پہنچ نہیں پائی تھی۔اس نے یہ سوچ کر خود کو مطمئن کر لیا کہ وہ کل ڈھیر سارا وقت سعدیہ کو دے گی۔

❁......❁......❁

نیلے آسمان پر سورج سفید بادلوں کی اُوٹ میں آیا تو جیسے زمین پر سے دھوپ سمٹ گئی ہو۔سعدیہ نے محسوس کیا کہ اس کے کمرے میں روشنی کم ہو گئی ہے۔اس نے وال کلاک کی جانب دیکھا تو سہ پہر ہونے والی تھی۔اس نے ایک طویل سانس لی اور بیڈ پر پہلو بدل لیا۔اس کے کمرے میں ہر شے بے ترتیب تھی۔یہاں تک کہ اس نے کتنے دنوں سے بیڈ شیٹ بھی تبدیل نہیں کی تھی۔کسی ملازمہ کی

جرات نہیں تھی کہ اس کی اجازت کے بغیر اس کے کمرے میں آجائے۔یہی کمرہ اگر ترتیب سے سجا ہوتا تو اچھا لگتا۔ لیکن اس وقت تو قیمتی سے قیمتی شے بھی معمولی لگ رہی تھی۔اس کا اپنا من بوجھل تھا۔اس لیے وہ باہر کسی شے پر بھی توجہ نہیں دے پارہی تھی۔ایسے میں نہ اس نے اپنے کمرے پر توجہ دی تھی اور نہ خود پر۔حالانکہ یہ ایسا وقت تھا جب اسے ہر طرح سے تیار ہونے اور بہت اچھا تاثر دینے کی ضرورت تھی۔مگر وہ بے نیازی کمرے میں پڑی کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھی۔جہاں دھوپ اور چھاؤں کی آنکھ مچولی چل رہی تھی۔ایسے لمحات میں اس کا سیل فون بج اٹھا۔وہ کچھ دیر بجتا رہا۔اسے لگا جیسے فون کرنے والا اس سے بات کرکے ہی رہے گا۔وہ کسلمندی سے اٹھی اور سائیڈ ٹیبل پر پڑا فون اٹھایا اسکرین پر شبانہ کے نمبر جگمگا رہے تھے۔اس نے کال ریسیو کرتے ہی کہا۔

''ہاں بولو! کیوں کیا ہے فون؟''اس کے لہجے میں ناراضگی تھی۔

''اسلام علیکم! بعداز سلام عرض ہے کہ......''شبانہ نے شوخی سے کہا تو وہ بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''میں جب ناراض ہوں اور میرا دل چاہ رہا ہے کہ تم جاؤ بھاڑ میں۔تب میں تمہیں سلامتی کی دُعا کیسے دے سکتی ہوں۔''وہ ناراض لہجے میں بولی۔

''اچھا میری بات سنوگی۔مجھے دیر کیوں ہوگئی تھی؟''شبانہ نے تحمل سے کہا۔

''وجہ کچھ بھی رہی ہو لیکن مجھے تو وقت نہیں دیا نا، حالانکہ آج مجھے تمہاری سخت ضرورت تھی۔''وہ اسی ناراضگی سے بولی۔

''خیریت سعدیہ؟''شبانہ نے تشویش سے پوچھا۔

''خیریت نہیں ہے نا۔مجھے آج بہت حوصلے اور ہمدردی کی ضرورت تھی۔یہی مجھے نہیں مل پارہی ہیں۔''وہ مرجھائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ہوا کیا ہے۔کچھ بتاؤ گی تب ہی تمہیں حوصلہ یا ہمدردی مل سکتی ہے۔''وہ تیزی سے بولی۔

''وہ میرا منگیتر ہے نا جمال ناصر! وہ، اس کی ماں اور بہن یہاں ہمارے گھر میں موجود ہیں۔جس وقت میں تمہیں کیمپس میں ملی تھی، اس وقت وہ ائرپورٹ سے آنے والے تھے۔میرا دل نہیں چاہا کہ میں ان کا سامنا کروں اور اُدھر کیمپس چلی گئی۔''اس نے بتایا۔

''یہ بات مجھ سے کہتی تو میں کہیں نہ جاتی۔جبکہ وہ تمہارے گھر میں آگئے ہیں۔آمنا سامنا تو اب بھی ہو گا۔کب تک بچ پاؤ گی۔اب میں تمہیں چھپانے سے رہی۔''اس نے کہا۔

''وہ تو کوئی بات نہیں۔لنچ سب نے اکٹھے لیا ہے۔میں تو بس انہیں احساس دلانا چاہتی ہوں کہ ان کے لیے میرے دل میں کوئی گرم جوشی نہیں ہے۔''اس نے صاف انداز میں کہا۔

''پاگل! اب جبکہ تم نے احساس دلانے کا نہ صرف فیصلہ کرلیا ہے اور ایسا رویہ دکھا بھی دیا تو اب حوصلے کی کیا ضرورت۔ہمدردی وہ حاصل کرتے ہیں، جن میں خود کوئی صلاحیت نہ ہو۔میری جان! تمہیں اپنی جنگ خود ہی لڑنا ہو گی۔اس کا نتیجہ دو صورتوں ہی میں ہے نا، شکست یا فتح۔تیسرا کوئی آپشن نہیں ہے۔''شبانہ نے کہا۔

''میں جانتی ہوں، وہ صرف آج کی رات یہاں رہیں گے، کل فیصلہ دینا ہے کہ میری قسمت کا۔یہاں فتح و شکست کی بات ہی بعد کی ہے۔مجھے اپنی جنگ لڑنے کا اِذن بھی نہیں ملے گا اور میں مشرقی لڑکی، والدین کی خوشنودی کے لیے وہاں چلی جاؤں گی جہاں ساری زندگی فرسٹیڈ ذہن کے ساتھ سمجھوتے کرتے گزار دوں گی۔زیادہ بغاوت کروں گی تو بے حیثیت ہوکر رہ جاؤں گی۔''وہ مایوسی میں بولی۔

''ارے میری جان! جب فرسٹیڈ ہونا ہے وہ تب کی بات ہے۔تم ابھی سے بکھر رہی ہو۔دیکھو پہلے تمہیں خود اپنے آپ میں مضبوط ہونا ہے اور ذات کی مضبوطی یکسوئی کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔''شبانہ نے سمجھایا۔

''یار کبھی کبھی مجھے تمہاری باتیں، تمہاری طرح عجیب سی لگتی ہیں۔اَن پریکٹیکل، بلکہ جن کی سمجھ ہی نہ آسکے۔مطلب، تم یکسوئی کی بات کررہی ہو۔میری جان پر بنی ہوئی ہے اور تمہیں یہ سوجھ رہا ہے۔''سعدیہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اچھا ساری باتیں بھول جاؤ، صرف ایک بات کا جواب دو۔آخر وہ تمہیں اچھا کیوں نہیں لگ رہا نہ جواب

مجھے مت دینا۔بلکہ پورے خلوص کے ساتھ اپنے آپ سے پوچھنا۔پھر انتہائی صاف گوئی سے اپنے آپ ہی کو جواب دینا۔تمہیں نہ صرف یکسوئی کی سمجھ آجائے گی بلکہ وہ وجہ بھی جو تمہارے لاشعور میں تو ہے لیکن تمہیں اس کا ادراک نہیں۔''وہ نرم انداز میں لفظ لفظ بولی تو سعدیہ چند لمحوں تک خاموش رہی۔پھر بولی۔

''بات تو تمہاری دل کو لگتی ہے، مجھے اصل میں وہ بات تلاش کرلینی چاہیے، جس کے باعث میں ناصر جمال سے متنفر ہوں۔ٹھیک ہے، میں سوچتی ہوں، لیکن اگر پھر بھی سمجھ نہ آئی تو میں۔''

''تمہیں کوئی بات پوچھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہو گی، سمجھ میں نہ آنے والی کوئی وجہ ہی نہیں ہے۔''شبانہ نے پرجوش انداز میں کہا۔تب ہی سعدیہ کے دروازے پر ہلکے سے دستک ہوئی۔وہ چونک گئی۔

''ٹھیک ہے، میں صبح تم سے ملوں گی، پھر بتاؤں گی کہ میں نے کیا سوچا۔''سعدیہ نے کہا اور پھر الوداعی فقروں کے بعد فون بند کردیا۔

دروازے پر اس کی ماما تھی۔اس نے جونہی سعدیہ کو دیکھا اور حیرت سے بولی۔

''اے لڑکی، تمہیں کچھ ہوش بھی ہے کہ نہیں، یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے؟''یہ کہتے ہوئے اس نے اندر جھانکا اور بولی۔

''یہ تمہارا کمرہ ہے، یہ کیا ہے کیوں ایسا رویہ اپنائے ہوئے ہو۔تم جانتی نہیں ہو کہ گھر میں آئے ہوئے مہمان کون ہیں۔اور وہ یہاں پر کیوں آئے ہیں؟''تیز تیز مگر دبے لہجے میں کہتے ہوئے اس کی ماما کا لہجہ ایک دم سے بدل گیا۔وہ خاموش کھڑی رہی۔''بولتی کیوں نہیں؟''اس بار ماما نے تلخ لہجے میں کہا۔

''کیا ہوا ہے مجھے، میں ٹھیک تو ہوں۔''وہ بولی۔

''ٹھیک ایسے ہوتے ہیں۔تم سمجھتی کیوں نہیں ہو اور پھر تم یہاں کیوں پڑی ہو۔ان کے پاس بیٹھو۔وہ سب لان میں تمہارے پاپا کے پاس بیٹھے ہیں، تم ناصر کو کمپنی دو، یہ کیا فضول جاہل لڑکیوں کی طرح اِدھر پڑی ہو۔''اس کی ماما کو کچھ نہ سوجھا تو بے نقط سنانی چلی گئی۔اس پر سعدیہ نے ایک لمبا سانس لیا اور کہا۔

''ٹھیک ہے، میں ابھی آتی ہوں۔''

''ایسے مت آجانا۔''ماما نے کہا اور چند لمحے اس کی جانب دیکھتے رہنے کے بعد واپس چلی گئی۔وہ کچھ دیر تک وہیں دروازے میں کھڑی سوچتی رہی، پھر پلٹ کر کمرے میں چلی گئی۔

وہ لان میں جانے کے لیے اپنے کمرے سے نکلی تو ہلکے کاسنی رنگ کی ہاف سلیو قمیض، سفید شلوار پہنے ہوئی تھی اور اسی رنگ کا آنچل گلے میں ڈالا ہوا تھا۔وہ اپنے معمول کے لباس ہی میں تھی۔سفید ہلکے سلیپر پہنے وہ خراماں خراماں لان کی طرف جارہی تھی۔بوائے کٹ بالوں کے ساتھ کان کے بندے چمک رہے تھے۔وہ اُن کے پاس آگئی۔سبھی نے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکراتے ہوئے سب کو وش کرکے بیٹھ گئی۔وہ نجانے کس موضوع پر بات کررہے تھے۔اس کے آتے ہی خاموش ہوگئے۔اس نے درمیان میں رکھی میز پر پڑے برتنوں سے اندازہ لگایا۔وہ سب چائے پی چکے تھے۔ناصر جمال مسلسل اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔تب ہی ناصر جمال کی ماما نے کہا۔

''سعدیہ! تم اتنی فریش نہیں دکھائی دے رہی ہو، کیا بات ہے؟''

''امتحان سر پر ہیں۔اس لیے دن رات کتابوں میں سر دیئے رہتی ہے۔''ماما نے اس سے پہلے ہی کہہ دیا۔

''او! کب تک ختم ہورہے ہیں یہ امتحان۔''ناصر جمال نے پوچھا۔

''دو مہینے تو لگ ہی جائیں گے۔''وہ ہولے سے بولی۔

''پھر اس کے بعد کیا کرنا ہے؟''اس نے عام سے لہجے میں کہا تھا لیکن وہ اس میں موجود مہین سے طنز کو محسوس کیے بنا نہیں رہ سکی۔

''کچھ نہ کچھ تو ہوگا ہی۔''اس نے بحث سے بچنے کے لیے گول مول سے انداز میں کہہ دیا۔

''مطلب، تمہارے ذہن میں کوئی آئیڈیا نہیں ہے کہ پڑھنے کے بعد تم کچھ کرنا بھی چاہوگی یا نہیں؟''وہ بولا

''فی الحال، میں امتحان دوں گی۔اس کے بعد پوری توجہ سے سوچوں گی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔''اس نے گویا بات ختم کرتے ہوئے کہا۔تو ان سب کے درمیان خاموشی آن

ٹھہری۔ تب ہی ناصر جمال نے کہا۔

''سعدیہ! مجھے تمہارے اِس شہر کا ایک خاص علاقہ دیکھنا ہے۔ ایسے ہی وزٹ کرکے آنا ہے۔ کیا تم مجھے وہاں تک لے جاؤ گی؟''

''کیوں نہیں۔'' اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

''تو پھر نکالو گاڑی اور چلیں۔'' وہ تیزی سے بولا۔

''ہاں ہاں جاؤ بیٹی! مجھے ناصر نے کہا تھا کہ اس نے جانا ہے۔ میں نے ہی کہا تھا کہ سعدیہ لے جائے گی۔'' ماما نے کہا تو وہ اٹھ گئی۔

سعدیہ نے گاڑی گیٹ سے پار کی تو پسنجر سیٹ پر بیٹھے ہوئے ناصر جمال نے اس کی طرف دیکھا اور پھر بڑے خوشگوار موڈ میں پوچھا۔

''سعدیہ! یہ نہیں پوچھو گی کہ میں اس علاقے کا وزٹ کیوں کرنا چاہتا ہوں؟''

''آپ بتا دیں۔'' اس نے ہولے سے کہا تو ناصر نے سڑک پر دیکھتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہا۔

''اصل میں چند ماہ پہلے میرے چند عربی دوست یہاں آئے تھے۔ انہیں یہاں سے اپنی پسند کا فوڈ نہیں ملا۔ انہوں نے ایسے کسی ریستوران کو تلاش بھی کیا تھا۔ وہ واپس گئے۔ جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے آئیڈیا دیا۔ کیوں نہ یہاں ایک ریستوران بنایا جائے جہاں عربی کھانے ملیں۔''

''ریستوران کے لیے جگہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اس علاقے میں آپ کو جگہ ہی نہ ملی تو۔'' اس نے یونہی کہہ دیا۔

''جگہ فائنل ہے۔ اس علاقے میں کہیں ہے۔ میں ابھی پوچھ بھی لیتا ہوں۔ ویسے تمہارے خیال میں یہ آئیڈیا بزنس پوائنٹ آف ویو سے کیسا رہے گا؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا فون نکالا۔

''سرمایہ کاری آپ نے کرنی ہے۔ آپ کو بہتر پتہ ہونا چاہیے۔'' اس نے عدم دلچسپی سے کہا۔

''میں نے تمہارا خیال پوچھا ہے۔ ورنہ یہ تو کروڑوں کا پراجیکٹ ہے۔'' اس نے تفاخر سے کہا۔

''ہو گا۔ چاہے اربوں میں ہو۔'' اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا تو فون پر نمبر پش کرتے ہوئے وہ حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔ چند لمحے یونہی دیکھتے رہنے کے بعد کہا۔

''کیا تمہیں کوئی دلچسپی نہیں کہ یہاں اس شہر میں اتنے بڑے بجٹ کی سرمایہ کاری کر رہا ہوں۔''

''آپ تو بزنس مین ہیں، آپ تو بزنس کریں گے ہی۔'' اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے نرم انداز میں کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ مستقبل میں ہمارا کیا تعلق بن جانے والا ہے، اس حوالے سے بھی نہیں دلچسپی ہو گی؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ اس کے بارے میں کون جانتا ہے۔'' وہ آہستہ سے بولی اور سرخ بتی پر گاڑی روک دی۔

''مطلب! تمہیں کوئی شک ہے؟'' اس نے بات سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

''بات شک یا یقین کی نہیں ہے۔ مستقبل میں کیا ممکن ہے یا کیا نہیں۔ یہ تو ہم نہیں جانتے نا۔ ہمیں آج پر اسی لیے توجہ کرنی چاہیے کہ آج کیا ہے۔'' اس نے کہا اور سبز بتی پر گاڑی بڑھانا شروع کر دی۔

''مستقبل کی پلاننگ بلاشبہ آج ہی کرنا پڑتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ لیکن آج پر اسی لیے توجہ دیتے ہیں نا کہ آنے والا کل بہتر ہو جائے۔'' اس نے کہا تو لگا جیسے اس کا لہجہ تبدیل ہو گیا ہے۔

''اس طرح یقیناً آپ کا نکتہ نظر مجھ سے مختلف ہو گا کہ میں دولت کی خواہش رکھتی ہوں لیکن اس لیے کہ اس سے زندگی کو سکون ملے لیکن ایسی دولت نہیں یا ہتی جس سے زندگی بے سکون ہو جائے۔'' وہ سکون سے بولی۔

''کیا تم دنیا کے بارے میں وژن نہیں رکھتی ہو؟ وہ کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی ہے۔ کتنا کچھ بدل کر رہ گیا۔ خیر تم ایسے کرو۔ کسی اوپن ائر ریستوران میں چلو۔ ہمیں تھوڑی سی باتیں کرنا ہے۔ پھر بعد میں وہ جگہ وزٹ کر لیں گے۔'' ناصر نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہم آپ کے بتائے ہوئے علاقے میں آ گئے ہیں۔'' سعدیہ نے بتایا۔

''کوئی بات نہیں، بعد میں سہی۔ ابھی میں نے لوکیشن

بھی پوچھنا ہے۔ تم چلو کسی ریستوران میں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا تو سعدیہ نے کچھ دیر کے بعد ایک اوپن ائر ریستوران کے باہر گاڑی روک دی۔

اس وقت سورج ڈھل چکا تھا اور شہر کی بتیاں روشن ہو چکی تھیں، جب وہ اوپن ائر ریستوران میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ تب ہی سعدیہ نے ناصر جمال کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا باتیں کرنا چاہتے تھے آپ؟''

''سعدیہ یہاں آنے سے پہلے تمہارے بارے میں میر جو تصور تھا۔ وہ دوسروں کی طرف سے میرے ذہن میں بنایا گیا تھا۔ لیکن ان چند لمحوں کی ملاقات میں مجھے یوں لگا ہے جیسے تم وہ نہیں ہو، جیسا میں نے تمہیں سوچا ہے۔ تم بالکل اجنبی لگی ہو۔''

''تو......؟'' سعدیہ نے پوچھا۔

''میری ماما چاہتی ہیں کہ میری شادی تمہارے ساتھ ہو جائے۔ کیا یہ بات تم جانتی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''جانتی ہوں!'' وہ ہولے سے بولی۔

''ظاہر ہے شادی کے بعد میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا تو زندگی بھی میرے ماحول میں تمہیں گذارنا پڑے گی۔ اگر ہم دونوں ہم خیال نہیں ہوں گے تو زندگی مشکل نہیں ہو جائے گی؟''

''ہم خیال سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟'' سعدیہ نے پوچھا۔

''مثلاً۔ جیسے میں یہاں سرمایہ کاری کرنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے تمہیں اس کاروبار کو دیکھنا پڑے، لیکن تمہارا نکتہ نظر تو میرے نکتہ نظر سے بالکل متضاد ہے۔ تم دولت کمانا ہی نہیں چاہتی ہو۔ ایسے میں ہمارے درمیان ہم خیالی کیسے ہو پائے گی۔'' اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا تو سعدیہ کا چہرہ گلابی سے سرخ ہو گیا۔ اس نے دبے دبے غصے میں کہا۔

''تو آپ کو بیوی نہیں' اپنا کاروبار دیکھنے کے لیے مددگار چاہئے۔''

''تم غلط سمجھی ہو۔ اس دنیا میں رہنے کے لیے، اس کے ساتھ چلنے کے لیے دولت کی ضرورت ایک حقیقت ہے۔ بیوی تو تم میری رہو گی لیکن اگر تم دولت مند بن جاؤ تو کیا برائی ہے۔ دولت کا حصول کوئی آسان کام تو ہے نہیں کہ اس میں سکون ہو۔ جان مارنی پڑتی ہے۔ اپنا آپ وقف کرنا پڑتا ہے۔'' اس نے پُر جوش انداز میں کہا۔

''یہی بات تو میں آپ کو سمجھانا چاہ رہی ہوں۔ ایسی دولت کا کیا فائدہ جو سکون ہی نہ دے سکے۔ اس سے اچھی وہ ایک کلاس ٹیچر ہے جو اپنے بچوں کی پرورش اور تربیت کرتی ہے، بچوں کو تعلیم دیتی ہے اور پھر تھوڑے پیسوں میں سکون سے زندگی گذارتی ہے۔'' سعدیہ نے کہا۔

''کیا مقام ہوتا ہے اس ٹیچر کا اس معاشرے میں؟ کیا وہ اپنی تنخواہ میں سے اندرون ملک ہوائی سفر کر سکتی ہے۔ ضرورت پڑنے پر کسی اچھے اسپتال کے اخراجات برداشت کر سکتی ہے۔ بہت افسوس ہے سعدیہ، تمہاری سوچ تو بالکل کم درجے کی ہے۔''

''کم درجے میں اگر ضمیر مطمئن ہو تو میرا خیال ہے یہ زندگی زیادہ اچھی ہے۔ اور رہی آپ کے ماحول کی بات تو مجھے وہ قطعاً پسند نہیں ہے۔ آپ تو دوسری عورت کو اپنی بانہوں میں رکھنا قابل فخر گردان سکتے ہیں لیکن کیا آپ پسند کریں گے کہ آپ کی بیوی کسی غیر مرد کی بانہوں میں ناچتی پھرے۔'' سعدیہ نے انتہائی تلخی سے کہا۔

''میں پھر تم پر افسوس کروں گا سعدیہ! تم پتہ نہیں کس طبقے کی بات کر رہی ہو۔ یہ تو مڈل کلاس لوگوں کی سوچ ہے۔ میرے ماحول اور طبقے میں روشن خیالی ہے۔ وہاں ایسی فضولیات پر دھیان نہیں دیا جاتا۔ ایسی گھٹن اور چھوٹی سوچ کی گنجائش نہیں ہے۔ جسے تم لیے بیٹھی ہو۔'' ناصر نے یوں کہا جیسے اس کے سامنے کوئی پچھلی صدی کی عورت بیٹھی ہوئی ہے۔

''ہم کون ہیں، ہماری روایات کیا ہیں؟ ایک عورت کی عزت واحترام کیا ہوتا ہے؟ اس کی آپ کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''میں فرسودہ خیالات کو اپنے ذہن میں جگہ نہیں دیتا۔ آج کی روایات کیا ہیں۔ مجھے یہ دیکھنا ہے۔ باقی رہی عزت واحترام کی بات۔ جب تم گلے میں ہیروں کا ہار پہن کر مہنگے لباس میں، مہنگی گاڑی پر سفر کرو گی تو سب ہی تمہارا احترام کریں گے۔ یہی دنیا کی روایات ہے۔ یہاں اسی کو جھک کر سلام کیا جاتا ہے کہ جس کے پاس قوت ہوتی

ہے۔تمہارے جیسی مڈل کلاس طبقے سے تعلق رکھنے والی۔سوری تمہارا خاندان مڈل کلاس سے تعلق نہیں رکھتا، لیکن تمہاری سوچ ایسی ہے۔خیر تم وہ خواب بھی نہیں دیکھ سکتی، جو ہمارا معمول ہیں۔ایک شاندار زندگی ہے ہماری۔ اور اسے برقرار رکھنے کے لیے وقت تو دینا پڑتا ہے۔کیا مڈل کلاس کے لوگ محنت نہیں کرتے۔ان کی زندگی میں کس قدر سکون ہوتا ہے۔ان سے پوچھو دولت کی اہمیت کیا ہے۔'' ناصر اپنے خیالات کی وضاحت میں جذباتی ہو گیا تھا۔

''ٹھیک ہے آپ اپنے خیالات جو بھی رکھیں۔یہ آپ کا حق ہے،لیکن کسی دوسرے کو حق نہیں دیتے کہ وہ اپنی رائے جیسی بھی رکھے۔آپ اس سے نفرت نہیں کر سکتے اور نہ ہی اسے کم درجے کا کہہ سکتے ہیں۔اس کا آپ کو کوئی حق نہیں۔'' سعدیہ نے واضح انداز میں کہا۔

''تم ابھی عملی زندگی میں نہیں آئی ہو۔اس لیے تمہیں اس کے تقاضوں کا اندازہ نہیں ہے۔ہمارے طبقے میں کسی کو اس کی ذات پات کے حوالے سے نہیں، اس کے بنک بیلنس سے پہچانا جاتا ہے۔اس لیے مجھے حیرت ہوتی ہے کہ تمہارے ذہن میں ایسے خیالات کیوں ہیں۔'' وہ لمحہ بھر توقف کے بعد نفرت سے بولا۔''اوکے۔یہ تو اچھا ہوا کہ ہم نے تھوڑی سی گفتگو میں کم از کم ایک دوسرے کے بارے میں اندازہ تو لگایا۔تمہیں اپنے خیالات پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔میرا تمہیں یہی مشورہ ہے۔'' ناصر نے طنزیہ لہجے میں کہا

''مجھے آپ کے مشورے کی ضرورت نہیں۔میں سمجھتی ہوں کہ میرے لیے کیا اچھا ہے اور کیا اچھا نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے بھی چند لمحے توقف کیا اور پھر بولی۔''ہم چلیں یا ابھی کوئی بات رہتی ہے۔''

''میرے خیال میں تو اب مجھے اپنے خیالات پر نظر ثانی کرنا پڑے گی۔'' اس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے کیجیے۔آپ کو کس نے روکا ہے۔میں چونکہ آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتی، اس لیے۔'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔تب ناصر نے اس کی جانب گہری نگاہوں سے دیکھا اور اٹھتے ہوئے بولا۔

''آؤ چلیں۔''

وہ جیسے ان دو لفظوں ہی کے انتظار میں تھی۔اس لیے فوراً اٹھ گئی۔وہ دونوں خاموشی سے پارکنگ تک آئے۔گاڑی میں بیٹھے تو سعدیہ نے پوچھا۔

''آپ نے وہ لوکیشن پوچھی ہی نہیں۔''

''بعد میں دیکھیں گے،ابھی گھر چلو۔'' ناصر نے کہا اور خاموشی سے باہر کی جانب دیکھنے لگا۔سعدیہ مسکرا دی اور گھر کی طرف جانے کے لیے گاڑی بڑھا دی۔اندھیرا گہرا ہوتا چلا گیا تھا۔

❀......❀......❀

اس دن شبانہ کو کیمپس میں کوئی کام نہیں تھا اور نہ ہی کوئی کلاس تھی۔لیکن اس نے سعدیہ سے وعدہ کر رکھا تھا۔اس لیے وہ جانا چاہتی تھی چاہے کچھ دیر بعد ہی اسے واپس آنا پڑے۔وہ تیار ہو چکی تھی اور باہر جانے کے لیے نقاب اُوڑھ چکی تھی۔انہی لمحات میں اسے زرق شاہ کی کال آ گئی۔وہ اسکرین پر نمبر دیکھ رہی تھی اور تیزی سے سوچ رہی تھی کہ اس کا فون ریسیو کرے یا نہیں۔وہ چند لمحے دیکھتی رہی، پھر فون اٹھاتے ہوئے کال ریسیو کر لی۔

''جی فرمائیں۔'' یہ کہتے ہوئے یک بارگی اس کا دل دھڑک اٹھا تھا۔

''اُو!میں نے سوچا آپ اس وقت مصروف ہوں گی جو فون نہیں اٹھا رہی ہیں۔'' زرق شاہ نے یوں کہا جیسے اس کا لہجہ معذرت خواہانہ ہو۔

''نہیں بس میں کیمپس جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی، فرمائیں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''کچھ نہیں، میں ویسے ہی پوچھنا چاہ رہا تھا کہ اگر آج آپ اسٹوڈیو کی طرف آئیں تو۔'' زرق شاہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''نہیں!فی الحال تو نہیں، میں فون پر رابطے میں ہوں۔دو چار دن بعد جانے کا ارادہ ہے۔جب میرا کام مکمل ہو جائے گا۔اتنا وقت نہیں ہوتا کہ میں روزانہ وہاں جاؤں۔''

''ٹھیک ہے۔بس میں نے یہی معلوم کرنا تھا۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔وہ چند لمحے اپنے سیل فون کو گھورتی رہی پھر سوچنے لگی کہ آخر اس نے یوں کیوں پوچھا اس خیال کے ساتھ ہی اسے کل والی ملاقات یاد آ گئی۔

اس وقت اسے زرق شاہ بہت اچھا لگا تھا، جب اس نے بہت اچھے انداز میں معذرت کی تھی۔پہلی ملاقات میں جو اس کا انداز اور لب ولہجہ تھا اس سے تو یہی لگتا تھا کہ وہ بہت مغرور اور خود پسند سا انسان ہے۔وہ کبھی بھی اس طرح معذرت نہیں کرے گا۔یہ اس قدر تبدیلی کیوں؟ آخر ایسی کون سی بات تھی جس نے اسے معذرت کرنے پر مجبور کر دیا؟ وہ ان سوالوں پر جتنا بھی سوچتی، اسے کچھ سمجھ نہیں آنے والا تھا۔اس کا جواب تو وہی دے سکتا تھا۔اس نے یہ سوچنا کسی اور وقت پر اُٹھا رکھا اور کیمپس جانے کے لیے نکل پڑی۔تمام راستے وہ یہی سوچتی رہی اور مختلف جواب اس کے ذہن میں آتے چلے گئے۔

گاڑی پارک کرنے کے بعد وہ اپنا پرس اور فائلیں اٹھائے ڈیپارٹمنٹ کی جانب بڑھی تو اسے دور سے سعدیہ سیڑھیوں پر بیٹھی دکھائی دی۔ہلکے پیازی رنگ کے سوٹ پر میرون رنگ کا سوتی کام تھا۔حسب معمول ہاف سلیو میں سے گورے بازو چھلک رہے تھے۔ڈوپٹہ گلے میں ڈالا ہوا تھا اور میرون رنگ کے چپل میں سے گورے پاؤں دمک رہے تھے۔وہ اسی طرف دیکھ رہی تھی۔شبانہ کو لگا جیسے معمول سے ہٹ کر آج وہ خاصی خوشگوار دکھائی دے رہی ہے۔وہ اسے دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی۔قریب آنے پر بڑی گرم جوشی سے ملی اور پر جوش انداز میں بولی۔

''میں آج بہت خوش ہوں۔''

''اللہ تمہیں ہر طرح سے خوش رکھے۔کیا خوشی کی وجہ پوچھ سکتی ہوں۔'' شبانہ نے خوشگوار انداز سے کہا۔

''آؤ تنہائی میں بیٹھتے ہیں پھر ساری بات بتاتی ہوں۔'' سعدیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر لان کی جانب لے جاتے ہوئے کہا۔وہ دونوں ادھر بڑھ گئیں۔تب سعدیہ نے کل شام کی پوری روداد سناتے ہوئے کہا۔''یقین جانو شبانہ۔زندگی میں پہلی بار یہ احساس ہوا ہے کہ اگر آپ کے منہ میں زبان ہے اور آپ کو اپنے خیالات پر درست ہونے کا یقین ہے تو اظہار میں کس قدر سکون ہے۔''

''اس کا ردعمل کیا ہے؟'' شبانہ نے پوچھا

''صرف اس کا نہیں، سب نے اپنا ردعمل دکھانا ہے اور میں اس کا سامنا کروں گی۔اب مجھ میں بہت ہمت آ گئی ہے۔ایک لائف سٹائل مجھے پسند نہیں ہے۔کیوں مجھے اس کی جانب دھکیلا جا رہا ہے۔'' سعدیہ نے اعتماد سے کہا تو شبانہ چند لمحے اس کے چہرے پر دیکھتی رہی، پھر بولی۔

''سعدیہ!کبھی تم نے یہ سوچا کہ جو لائف اسٹائل ناصر جمال کا ہے، وہ تمہیں کیوں اچھا نہیں لگتا؟''

''اس لیے شبانہ کہ میں اس میں عورت کی تذلیل محسوس کرتی ہوں۔عورت کی نسوانیت کا تو احترام نہیں، لذت کا ایک ذریعہ بن جاتی ہے۔یہ کیسی مردانگی ہے کہ میرا شوہر ہی مجھے کسی کی بانہوں میں جھولتا ہوا دیکھے اور ذرا بھی غیرت محسوس نہ کرے۔'' وہ نفرت سے بولی۔

''یہ تمہارے اندر کے احساسات ہیں لیکن یہ نہیں سمجھتی ہو کہ آخر یہ لائف اسٹائل ہے کن کا؟'' وہ بولی۔

''کسی کا بھی ہو۔غرض اس سے نہیں ہے۔دیکھنا یہ ہے کہ انسان اور انسانیت کا احترام کہاں پر ہے۔عورت کو تعظیم کہاں ملتی ہے۔یورپ کا معاشرہ ہو یا ہمارا مشرقی معاشرہ، ہر جگہ عورت کا استحصال کیا جاتا ہے۔انداز مختلف ہیں۔اب میں نے اپنے دل کی بات کہی۔جو میں چاہتی ہوں، اس بارے میں اظہار کیا ہے تو میں یہ بھی محسوس کر رہی ہوں کہ مجھے خوفناک ردعمل کا سامنا کرنا پڑے گا۔سچائی کو اہمیت نہیں دی جائے گی۔'' سعدیہ نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

''سعدیہ!میں اب تک یہ نہیں سمجھ پائی ہوں کہ آخر تم چاہتی کیا ہو؟'' شبانہ نے پوچھا۔

ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ

سلو پوائزن

شاہدہ صدیقی

دو سے ڈھائی سطروں میں مکمل یہ کہانیاں آپ کی رگ و پے میں یکدم شاید سرایت نہ کریں، ان کا اثر اچانک اور تھوڑی دیر بعد ایک خوفناک جھٹکے سے جسم پر لرزہ طاری کردیتا ہے. یہ کیفیت ماہ و سال پر محیط نہیں، جب بھی آپ کو کہانی یاد آئے دوبارہ عودکر آتی ہے.

ماں

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے۔ ماں نچلی منزل سے آپ کو پکارتی ہے آپ سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگتے ہیں تو ماں الماری سے سرنکال کر کہتی ہے۔

"ضرورت نہیں بیٹا آواز میں نے بھی سن لی ہے۔"

خواب

آخری چیز جو میں نے دیکھی وہ میرا الارم جو 12:07 پر فلیش کر رہا تھا اور وہ اپنے لمبے اور غلیظ ناخنوں والے پنجوں کو میرے سینے میں گاڑ رہی تھی، دوسرا ہاتھ میرے منہ کو دبائے میری چیخوں کو روک رہا تھا۔ میں چیختا ہوا اٹھا اور میں نے دیکھا کہ میرا الارم 12:06 پر فلیش کر رہا ہے اور میرا دروازہ ایک چرچراہٹ کے ساتھ کھل رہا ہے۔

تعاقب

اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی مستقل اس کا پیچھا کر رہا ہو، لیکن ایک دن یہ احساس ہونا بند ہوگیا۔ شاید یہ اتفاق ہی ہو کہ اسی دن اسے اپنی الماری میں ایک لاش ملی تھی۔

کیمرا

اس نے جاگنے کے بعد اپنے موبائل فون کو دیکھا تو اس میں اس کی سوتے ہوئے تصویریں نظر آئیں۔ وہ تنہا رہتی تھی۔

بستر

میں بیٹے کو بیڈ پر سلا کر لحاف اڑھا رہا تھا تو وہ مجھے بتانے لگا، "ڈیڈی، میرے بیڈ کے نیچے دیکھیے عفریت تو نہیں ہے۔"

"میں نے اسے خوش کرنے کے لئے نیچے جھانکا اور وہاں وہ لیٹا ہوا تھا، میرا ہی بیٹا، سکڑتے سمٹتے مجھ سے سرگوشی کر رہا تھا،

"ڈیڈی! اوپر میرے بیڈ پر کوئی ہے۔"

تابوت

میں ہل نہیں سکتا نہ سانس لے سکتا ہوں اور نہ ہی بول یا سن سکتا ہوں، ہر وقت مکمل تاریکی رہتی ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میں اس قدر تنہا ہوں گا تو میں خود کو نذر آتش کروانے کو ترجیح دیتا۔

سایہ

وہ حیران تھی کہ اسے دیوار پر اپنے دو سائے کیوں نظر آ رہے ہیں۔ کمرے میں تو ایک ہی بلب جل رہا تھا۔

وہ

اس کا بانچھیں کھلا چہرہ مجھے اپنے بیڈروم کی کھڑکی کے باہر سے گھور رہا تھا۔ میں چودھویں منزل پر رہتا ہوں۔

ماچس

وہ اندھیرے میں اکیلا بیٹھا تھا، خوفزدہ، کسی نے اس کے ہاتھ میں ماچس رکھ دی تھی۔

خیالی دوست

کل میرے والدین نے مجھ سے کہا کہ اب میں بڑا ہو گیا ہوں اس لیے خیالی دوست سے باتیں کرنا چھوڑ دوں۔ آج صبح انہیں میرے دوست کی لاش ملی۔

فرشتے

کہتے ہیں کہ سوتے ہوئے لوگوں کو فرشتے مردے کی طرح اٹھائے رہتے ہیں، لیکن کبھی کبھی وہ ان کے ہاتھوں سے گر بھی جاتے ہیں۔ کبھی آپ اس احساس کے ساتھ جاگے ہیں کہ جیسے گر رہے ہوں؟

ہمارے ساتھ

کئی سال پہلے ہمارے تہہ خانے کے عین درمیان ایک کرسی پڑی ملی، کتنی ہی بار میں نے اسے کونے میں رکھدیا وہ پھر واپس وہیں درمیان میں پہنچ گئی۔ ہمیں یہ سمجھنے میں ایک طویل عرصہ لگ گیا کہ وہ کرسی ہمارے کھانے کے کمرے کے عین نیچے رکھی رہتی تھی جیسے کوئی کھانے کی میز پر ہم سب کے ساتھ بیٹھتا ہو۔

بے بی مانیٹر

میں اپنے بچے کے مانیٹر کی آواز سے اٹھا تھا، وہ جاگ گیا تھا اور ایک آواز اسے بہلا رہی تھی۔ میں نے کروٹ لی تو میرا بازو میری بیوی سے ٹکرایا جو میرے برابر میں نیند میں مدہوش پڑی تھی۔

آدھا بٹن

انجم فاروق ساحلی

وہ خوب صورت اور جوان ہونے کے ساتھ ساتھ خوب سیرت بھی تھا لیکن اس کی یہی خوبیاں اس کے لیے وبال جان بن گئی تھیں.

ان لوگوں کی روداد' جو انسان ہوتے ہوئے بھی اندر سے بھیڑیے بن چکے تھے۔

جرم و سزا کے موضوع پر ایک خوب صورت تحریر.

کرن نے بجھے بجھے انداز میں سہ پہر کے وقت فارم ہاؤس کی عمارت کی ایک کھڑکی سے باغیچے میں جھانکا' سرسبز و شاداب پردوں اور رنگ برنگ کے کھلے ہوئے پھولوں سے اس کی نگاہ گزرتی ہوئی سامنے جامن کے بڑے درخت کی ایک شاخ پر جا کر اٹک گئی۔

وہاں ایک بڑی سی چڑیا اپنے بچوں کو دانہ کھلاتی اور پیار کرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ کرن کے ننھے منے منہ سے ایک سرد آہ سی نکل گئی' اس کی سورج خان سے شادی کو ہوئے پانچ سال گزر چکے تھے' لیکن وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھے' اس نے اپنے بیڈروم میں خوبصورت بچوں کی تصاویر بھی لگا رکھی تھیں' جو ممتا کے جذبات کا ایک خارجی عکس ان تصویروں میں لڑکے لڑکیاں دونوں ہی بڑے معصوم اور پیارے دکھائی دے رہے تھے۔

اس کا خاوند سورج خان ایک امیر آدمی تھا' رائے ونڈ روڈ پر واقع زرعی فارم کے علاوہ شہر میں ایک ہوٹل بھی تھا' جس سے معقول آمدنی اسے ہر ماہ حاصل ہو جایا کرتی تھی۔ سورج خان نے اسے اس خوبصورت پر فضا اور دلکش ماحول میں زندگی کے تمام لوازم فراہم کیے تھے لیکن اولاد کی کمی سے وہ بجھ سی جاتی' زندگی کے سارے رنگ پھیکے پڑ جاتے تھے' باغیچے کی رونق اڑتی' تتلیاں' فوارے کا فضا میں بلند ہوتا ہوا پانی' سبھی خوشنما مناظر بے زار کن معلوم ہونے لگتے تھے' ظاہر بات ہے دل کی شگفتگی لب نشاط بہار ہوتی ہے۔

جس طرح وہ حسین و جمیل تھی اسی طرح سورج خان بھی خوبصورت' سڈول اور روشن چہرہ انسان تھا' دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کرنے کے بعد لو میرج کر لی تھی۔ اس کا اپنا تعلق غریب گھرانے سے تھا' جہاں کرن غربت کے اندھیرے میں ڈوبی رہتی تھی۔ اب وہ اپنے والدین کی کچھ نہ کچھ مدد کر دیا کرتی تھی۔ سورج خان کو شہر کا شور شرابہ' ہاؤ ہو پسند نہیں تھا اس لیے شادی سے قبل ہی وہ یہ زرعی فارم خرید چکا تھا' جہاں کسان اور مالی سبزیاں اگا کر مالی منعفت پہنچا رہے تھے۔ فارم سے عمارت میں آنے والے مالی' دودھ لانے والا گوالہ اور اس کا رکھا ہوا ملازم لڑکا چاند خان جسے وہ چاند بابو کہا کرتی تھی سب ہی باادب اور بااخلاق تھے۔ چاند خان بڑا خوبصورت' ہنس مکھ اور زندہ دل نوجوان تھا جسے اس نے خود گھر کے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے پانچ سال قبل ملازم رکھا تھا۔ اس کے والدین بچپن میں ہی گزر گئے تھے' وہ اسے اپنی ماں ہی سمجھتا تھا۔ جب وہ ملازم ہوا تو تیرہ برس کا تھا اور اب اٹھارہ کا ہو گیا تھا۔

بے اولادی کے علاوہ شک کا ایک کانٹا بھی کبھی اس کے دل میں چبھنے لگتا تھا' اس کا شوہر سورج خان کبھی کبھی چاند خان پر برس پڑتا تھا' وہ چاند کے اور اس کے ماں بیٹے جیسے تعلق کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اپنے شوہر کی یہ حرکت اسے بڑی ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ وہ شادی سے قبل میاں بیوی کے رشتے کو مضبوط تصور کرتی تھی لیکن اب اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ مرد کی ذات اندر سے کھوکھلی ہوتی ہے۔ صرف ظاہری خول ہی مضبوط معلوم ہوتا ہے۔

چاند خان ان کے فارم سے کچھ فاصلے پر مین روڈ کی طرف جانے والے راستے پر ایک ٹیلے پر رہنے والے کارپینٹر سے اس کے لیے لکڑی کی خوبصورت میزیں اور کرسیاں بھی اپنی تنخواہ میں سے خرید کر لایا تھا۔ جس کی اجرت اس نے

ضد کر کے اس کی جیب میں ڈال دی تھی۔ سورج خان کو ایسی ہی باتوں سے جلن ہوتی تھی کہ کہیں وہ اس کی بیوی کو نہ پھسلا لے۔ اس کی تنہائی کا ساتھی نہ بن جائے۔ حالانکہ اس نے خود مسز سورج ہونے کے حوالے سے ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔ چاند خان کے خوبصورت ہونے کا یہ ہرگز مطلب نہیں تھا کہ جنسی جذبات جگا لیے جائیں۔ وہ اس کے لیے ملازم ہی تھا' صرف ماں کی ممتا سے محروم تھا۔ اس لیے اس کے ساتھ خوش ہو کر ہنس اور بول لیا کرتا تھا۔

اس کا خاوند بھی اس کے لیے ایک اچھا جیون ساتھی تھا۔ وہ خاوند سے ہر لحاظ سے خوش تھی۔ اولاد نہ تھی تو اس میں اس کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔ سورج خان اور وہ دونوں اپنا طبی معائنہ کروا چکے تھے لیکن کوئی بھی نقص سامنے نہیں آیا تھا۔ لہٰذا خدا کے ہاں سے ہی مہمان کے آنے میں دیر تھی۔ سورج خان کو تازہ گلاب کے سرخ پھول بڑے اچھے لگتے تھے' لہٰذا وہ خود اپنے ہاتھ سے سورج خان کے بیڈروم اور ڈائننگ ہال جس میں وہ اس وقت صوفے پر بیٹھ چکی تھی' گلدان میں بڑے بڑے سرخ پھول سجائے تھے۔ سورج خان گھر لوٹنے والا تھا وہ گھڑی دیکھتی ہوئی اس کی منتظر تھی۔ وہ آج شام کافی دنوں کے بعد شاہ رخ خان کی فلم دیکھنے کا پروگرام بنا چکے تھے۔ ڈائننگ ہال کے کونے میں لگی کھانے کی میز پر گرم کھانا برتنوں میں ڈھکا ہوا تھا' کرن نے رخ موڑ کر دائیں جانب دیوار پر نصب ایل سی ڈی اسکرین پر کیبل کا ایک چینل لگایا تو ایک انگریزی فلم کا المیہ سین دکھائی دے رہا تھا۔

ایک نوجوان بستر مرگ پر تڑپ رہا تھا۔ ڈاکٹر نفی میں سر ہلاتے ہوئے دور ہٹ چکے تھے لڑکے کی ماں لڑکے سے لپٹ کر رو رہی تھی' لڑکا خوبصورت اور نوخیز تھا ماں کی زندگی کا واحد سہارا' جب اس نے آخری ہچکی لی تو اس کی ماں صدمے سے بے ہوش ہو گئی۔ جسے نرس نے اٹھا کر گھسیٹتے ہوئے کرسی پر بٹھا دیا۔

عین اسی وقت کرن کی محویت ٹوٹ گئی۔ اس لمحے باغ سے کسی پرندے کی دردناک آواز سنائی دی۔ ایک لمحے کے لیے اس کی توجہ کھڑکی کی راہ سے باغ کی جانب ہوئی پھر اطلاعی گھنٹی کی جلترنگ نے اسے صوفے سے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی راہ داری میں داخل ہو کر خارجی راستے کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کا خاوند سورج خان اپنی لمبی کار میں دروازے پر اس کا منتظر تھا۔ اس کا خاوند یہ چاہتا تھا کہ اس کے لیے بیرونی گیٹ ملازم کی بجائے اس کی بیوی کھولا کرے' اس نے یہ ڈیوٹی بخوشی اپنے ذمے لے لی تھی۔ چنانچہ وہ لمبی روش پر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی گیٹ کی جانب بڑھتی چلی گئی۔ روش کے دونوں جانب خوشنما پودوں کی شاخوں پر رنگا رنگ پھول ہوا میں جھومتے مسکرا رہے تھے۔ آج اس نے چلتے ہوئے پھولوں کی شادابی اور رنگینی پر نگاہ ڈالی تو خلاف معمول اسے خوشی نہ ہوئی اداسی اور اضمحلال کی ایک کیفیت نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ اس کے دل کی دھڑکن نہ معلوم کیوں تیز سی ہو گئی۔ شاید فلم کا منظر اور باغ میں تڑپتے پرندے کی راہ اس کے دل میں اتر گئی تھی۔ اس نے گیٹ کھولا' ایک طرف ہٹی' سورج خان کی نئی ٹیوٹا کرولا بڑی شان سے اندر داخل ہوئی' کرن نے گیٹ بند کیا' مڑ کر گاڑی کے قریب آئی' سورج خان نے دروازہ کھولا' باہر نکلا تو کرن دھک سے رہ گئی۔ سورج خان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ خوف اور باطنی ہیجان سے اس کی بری حالت ہو رہی تھی۔ پھیلی ہوئی آنکھوں میں دہشت سمٹی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں موجود گلابی رنگ کا پیکٹ پھسل کر نیچے فرش پر گر پڑا۔ وہ گردن جھکا کر دو قدم چل کر نڈھال سا پھٹی پھٹی نظروں سے کرن کو دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹ تھرتھرائے پھر مضمحل سی آواز نکلی۔

''وہ......وہ......'' جملہ ادھورا رہ گیا۔

''وہ کیا؟'' کرن نے خاوند کے قریب جا کر غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں......میں کیسے بتاؤں کیا ہو گیا؟''

''ہوا کیا ہے؟'' کرن نے سورج کا بازو تھام کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''وہ......وہ؟'' اس نے پھر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''آخر بات کیا ہے۔'' کرن نے ٹھوکر مار کر پیکٹ کو کچھ دور دھکیل کر پوچھا۔

''ظلم ہو گیا' ظلم۔'' سورج نے پھٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر سر تھام لیا۔ کرن کا ہاتھ اس کے کندھے پر آ گیا۔

''میرے سرتاج آخر کیا ہوا ہے جو آپ اس قدر پریشان نڈھال اور خوف زدہ سے ہیں۔'' کرن نے بے چین ہو کر پوچھا۔

''تمہیں دکھ ہوگا میں تمہیں کس طرح بتاؤں؟ ذرا دل کو مضبوط کر لو' بات ہی کچھ ایسی ہے۔''

''آخر معاملہ کیا ہے؟'' کرن نے دھڑکتے دل کے ساتھ پھر دریافت کیا۔

''تو پھر سن لو' چاند نے بتایا تھا کہ وہ سہ پہر کے وقت شہر والے اپنے دوست کو فارم کی سیر کروانا چاہتا ہے' وہ اسے ساتھ لے کر آئے گا اور اسے فارم دکھائے گا' اس کا دوست ہم سے سبزیاں اور پھل خریدنا چاہتا ہے لیکن......'' سورج خان پھر رک گیا۔

''لیکن کیا ہوا؟'' کرن نے اب کی بار چلا کر پوچھا۔

''کسی ظالم نے چاند کو قتل کر دیا ہے' میں راستے میں اس کی لاش دیکھ کر آ رہا ہوں۔ میں نے جھاڑیوں کی طرف ایک سیاہ سایہ بھی غائب ہوتے دیکھا ہے۔''

''چاند کا قتل' چاند کا قتل' چاند کا قتل۔'' وہ غم سے بڑبڑاتی ہوئی سسک اٹھی۔

''تم اس کی لاش تو لے آتے۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو پولیس کے آنے تک لاش اس تالاب کے کنارے ہی پڑی رہے گی جس کے پانی میں اس کا خون شامل ہو رہا ہے۔ تالاب کے قریب جھاڑیاں پگڈنڈی کے دوسری جانب بکھری ہوئی ہیں۔ وہاں ایک خون آلود خنجر پڑا ہے۔ جب میں لاش دیکھ کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا تو میری نگاہ اس خون آلود چاقو پر پڑ گئی۔ لیکن میں خوفزدہ ہو گیا اور اس کے قریب نہیں گیا۔'' سورج نے رک رک کر بتایا۔ پھر جھک کر پیکٹ اٹھایا اور اسے پھاڑ کر نیا لیڈیز سوٹ اسے دکھایا جو اس کے لیے خرید کر لایا تھا۔ کرن نے پیکٹ پھر ایک طرف بے دلی سے پھینک دیا۔ چاند کا خوشنما معصوم چہرہ' چاند کی شوخیاں' چاند کی دلچسپ باتیں' چاند کی یادیں ایک فلم کی صورت اسے دکھائی دینے لگیں۔ گرم گرم آنسو اس کی آنکھوں سے گرتے گالوں پر بہنے لگے' سورج خان اپنے رومال سے ان موتیوں کو جذب کرنے لگا۔

''چلو چلیں اسے دیکھیں' وہ مجھے ماں سمجھتا تھا۔'' کرن نے ہذیانی لہجے میں کہا۔

''ذرا ٹھہرو میں نے پولیس کو اطلاع کر دی ہے' پولیس آ کر موبائل فون پر مجھ سے رابطہ قائم کرے گی پھر ہم دونوں چلیں گے۔'' سورج خان نے واپس گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا کرن اسے خالی خالی نظروں سے دیکھتی منجمد سی ہو کر رہ گئی۔ سورج خان نے گاڑی کو موڑ کر کھڑا کر دیا۔ روش کے آگے گیٹ کے پاس کافی بڑا چکور ٹکڑا فرش کی صورت پھیلا ہوا تا۔ سورج خان پھر گاڑی سے نکل کر اس کے پاس چلا آیا۔

''اس کا تو کوئی دشمن نہیں تھا کوئی رقیب بھی نہیں تو پھر آخر کس نے اسے؟'' کرن نے ہتھیلی پر مکا مارتے ہوئے کہا۔

''وہ تو بڑا معصوم' بے ضرر اور کام آنے والا لڑکا تھا۔ اف اس نوجوانی میں موت وہ بھی بھیانک قتل کی صورت میں۔'' کرن بڑبڑانے لگی۔ اس کی آنکھوں میں پھر نمی تیرنے لگی۔

''اب کیا بتاؤں؟'' سورج خان نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

''اس کا ایک دشمن پیدا ہو چکا تھا۔''

''وہ کون تھا؟'' کرن نے جلدی سے پوچھا۔

''وہی کارپینٹر ادھیڑ عمر شخص' وہ مکار اور کینہ توز آدمی ہے اور سنا ہے کہ سزا یافتہ بھی ہے یہ مجھے ہوٹل میں معلوم ہوا تھا۔ اس کی بیوی دو ایک بار تالاب پر چاند خان سے ملنے آئی تھی۔ کارپینٹر چنگیزی اپنے نام ہی کی طرح سنگدل بھی ہوگا اس نے چاند کا اپنی بیوی سے ملنا برداشت نہ کیا ہوگا' اور شاید......'' سورج خان نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''کیا اس نے کبھی شکایت کی تھی چاند کے متعلق۔'' کرن نے پوچھا۔

''ہاں۔'' سورج خان نے تھکے تھکے لہجے میں جواب دیا۔ ''ایک بار اس نے مجھے باہر روک کر کہا تھا کہ اپنے آوارہ نوکر کو لگام ڈال لیے اور اپنی بیوی کو تو میں نے پابند کر دیا ہے کہ گھر سے باہر نہ نکلے۔''

''وہ تو ایسا نہیں تھا' ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔'' کرن نے بے اعتباری سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اسی وقت پولیس کی کال سورج خان نے اٹینڈ کی اور دونوں گاڑی میں جا بیٹھے۔ سورج نے ملازم کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کر دیا۔ کار تیزی سے جائے وقوعہ کی طرف بڑھنے لگی۔ اس سڑک کی مرمت خود سورج خان نے کروائی تھی تاکہ آنے جانے میں دقت نہ ہو کیونکہ راستہ جگہ جگہ سے خراب ہو چکا تھا۔ اور بارش کے موسم میں جگہ جگہ پانی بھرنے سے سفر مخدوش ہو کر رہ جاتا تھا۔ سورج خان ساکت وصامت سا بے تاثر گاڑی

ڈرائیو کررہا تھا اور کرن چاند خان کی موت کے صدمے سے نڈھال ہوکر ہونٹ چباتے ہوئے اس کے کندھے سے سر ٹیک کر سامنے خلا میں گھور رہی تھی وہ اس راستے پر بے شمار دفعہ چاند کو گھر واپس آتا ہوا دیکھ چکی تھی۔ وہ پلکیں جھپکنا بھول گئی اس کی آنکھیں جیسے پتھرا سی گئی تھیں۔

اچانک سڑک سے ایک سیاہ رنگ کی بلی تیزی سے راستہ کاٹتی چلی گئی۔ سورج خان نے جلدی سے بریک لگائی تاکہ کہیں وہ گاڑی کے پہیوں کے نیچے آ کر کچلی نہ جائے۔ کرن کی محویت ٹوٹ گئی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ جائے واردات پر کھڑی پولیس کی کار کے پاس اپنی گاڑی سے اتر رہے تھے۔ انسپکٹر عمران اپنے تین سپاہیوں کے ساتھ ان کا منتظر تھا۔ لاش تالاب کے کنارے پڑی تھی۔

''اف میرے خدا'' کرن کے منہ سے نکلا اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے چاند کی لاش کو دیکھتی آگے بڑھنے لگی۔

''دیکھیے لاش کو ہاتھ نہ لگایئے گا۔'' انسپکٹر عمران نے کرن کی جذباتی کیفیت دیکھ کر خبردار کیا۔

''میرے بیٹے نے کسی کا کیا بگاڑا تھا یہ تو معصوم تھا' بے ضرر تھا ہر کسی کے کام آنے والا تھا' دکھ درد بانٹنے والا تھا۔'' کرن بڑبڑاتی ہوئی چاند کے سراپا کو دیکھنے لگی پھر اسے چاند کے سینے سے دہکتا ہوا خون دیکھ کر جھرجھری سی آ گئی جواب بھی بہتا ہوا تالاب کے پانی میں شامل ہورہا تھا۔

''آپ کی بیوی کا ان سے کیا رشتہ ہے؟'' انسپکٹر عمران نے معاملے کو بھانپتے ہوئے آہستہ لہجے میں سورج خان سے پوچھا۔ سورج خان نے کرن پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''اسے آج سے پانچ سال قبل میری بیوی نے یتیم اور لاوارث جان کر ملازم رکھا تھا' یہ اس دنیا میں تنہا تھا' یہ میری بیوی کا بڑا فرماں بردار ملازم تھا۔ میری بیوی اسے اپنا بیٹا ہی تصور کرتی تھی۔ کیونکہ جب یہ ملازم بنا اس کی عمر تیرہ برس تھی۔ اب اٹھارہ کا ہوچکا تھا یہ میرے گھر کے سارے کام بھاگ بھاگ کر کیا کرتا تھا۔ مجھے اپنی بیوی پر کامل اعتماد ہے۔ اس لیے میں کبھی شک شبہ میں مبتلا نہیں ہوا۔'' سورج خان نے پھر کرن پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

اب انسپکٹر عمران آگے بڑھا۔ اس نے لاش پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر سورج خان کے اشارے پر تالاب کے بائیں جانب سڑک کے پار بکھری جھاڑیوں میں دکھائی دیتے چاقو کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ سورج خان نے انسپکٹر عمران کو قتل کی اطلاع دے کر بتایا تھا کہ لاش دیکھ کر وہ اٹھا تو اس کی نگاہ اتفاقیہ طور پر ایک خون آلود چاقو پر پڑی جسے شاید قاتل جلدی یا بوکھلاہٹ میں پھینک کر بھاگ نکلا تھا۔

سورج خان انسپکٹر عمران کے ساتھ چاقو کے قریب چلا آیا۔ چوڑے پھل اور مضبوط دستے والا لمبا چاقو تھا جس کے دستے پر چھوٹے چھوٹے سرخ و سفید موتی جڑے ہوئے جگمگا رہے تھے۔ چاقو کے دستے کو سورج خان غور سے دیکھ کر بڑے زور سے اچھلا۔ پھل خون آلود تھا۔

''میں سمجھ گیا میں سمجھ گیا۔'' وہ جوش کے عالم میں چلا اٹھا۔

''آپ کیا سمجھے؟'' انسپکٹر عمران نے سورج خان کے چہرے پر تیز نظریں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

''انسپکٹر عمران یہ چاقو......'' سورج خان نے ہکلا کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''کیا یہ چاقو آپ کا ہے؟'' انسپکٹر عمران نے کچھ سوچ کر اچانک پوچھا۔

''نہیں' نہیں انسپکٹر صاحب میرا نہیں یہ تو میں نے یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک ٹیلے پر واقع مکان میں رہنے والے کارپینٹر کے پاس دیکھا تھا۔ اس نے اس چاقو سے میرے لیے پھل کاٹ کر پلیٹ میں رکھے تھے' میں نے اس سے ایک الماری خریدی تھی اور میری بیوی کے لیے چاند اس سے خوبصورت میز کرسیاں اور شوکیس بھی اپنی تنخواہ سے خرید کرلایا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ یہ قتل کارپینٹر نے کیا ہے؟'' انسپکٹر عمران نے جلدی سے پوچھا۔

''اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''لیکن اسے آپ کے ملازم کو قتل کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟''

''جناب یہ معلوم کرنا تو آپ کا کام ہے۔'' سورج خان نے جواب دیا۔''البتہ ایک بات میرے ذہن میں کانٹے کی مانند چبھ رہی ہے۔''

''وہ کیا جلدی بتایئے۔'' انسپکٹر عمران نے تیز لہجے میں

پوچھا۔

''وہ کارپینٹر جس کا نام چنگیزی ہے چاند خان سے ناراض اور خفا تھا اس نے مجھ سے چاند کی شکایت بھی کی تھی۔ چاند خوبصورت اور پرکشش لڑکا تھا اس کی بیوی دو ایک بار تالاب پر چاند خان سے ملنے آئی تھی۔ جس کی چنگیزی کو خبر مل گئی تھی وہ بڑے طیش کے عالم میں مجھ سے یہ کہہ کر گیا تھا کہ اپنے ملازم کو لگام ڈالیے ورنہ ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا اور جناب! سنا ہے کہ وہ ڈکیتی وغیرہ کے جرم میں سزا یافتہ مجرم ہے۔'' سورج خان کی آواز میں سراسیمگی تھی۔

اسی وقت فنگر پرنٹ کے عملے کے دو آدمی چاقو پر ایکسپوزر پاؤڈر چھڑ کے سامنے آئے۔

''انسپکٹر صاحب! چاقو پر انگلیوں کے نشانات موجود نہیں۔ قاتل دستانے پہنے ہوئے تھا۔'' انسپکٹر عمران نے چاقو ان سے لے کر ایک مومی لفافے میں ڈال کر لفافہ پولیس بیگ میں محفوظ کرلیا۔ اب انسپکٹر عمران لاش کے اردگرد کا ماحول دیکھتا ہوا سڑک اور گھاس والی زمین کا جائزہ لینے لگا۔ سڑک پر چاند خان کی پرانی موٹر سائیکل الٹی پڑی تھی۔ انسپکٹر عمران نے اپنے اسسٹنٹ فرحان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔''معاملہ کچھ الجھا ہوا ہے' موٹر سائیکل جس انداز سے الٹی پڑی ہے اور اس کی چھوٹی بتیاں جس طرح ٹوٹی ہوئی ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسکی بائیک کو ایک زور کا جھٹکا لگا ہے جس سے وہ سڑک کے کنارے گرا تھا۔ سڑک سے اٹھتے ہی قاتل اس کے سامنے چلا آیا۔ یہاں خفیف سی گرد پر قدموں کے مٹے مٹے مکس اپ نشانات موجود ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاتل اور مقتول میں ہاتھا پائی اور زور آزمائی ہوئی ہے۔ جس کے دوران قاتل نے موقع پا کر چاقو چاند کے سینے میں اتار دیا۔ چاند ڈگمگاتا ہوا چند قدم چل کر تالاب کے کنارے جا کر ڈھیر ہوگیا اور قاتل جلدی میں شاید کسی کے اس طرف آنے پر چاقو جھاڑیوں میں پھینک کر بھاگ نکلا۔

کرن جو اس وقت بھی لاش کے اردگرد افسردہ' ملول اور رنجیدہ سی ٹہل رہی تھی چاند پر ایک گہری نگاہ ڈال کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے لگی۔ اس وقت اچانک چلتے چلتے اسے سڑک کے اوپر پھیل جانے والی گھاس میں ایک آدھا ٹوٹا ہوا بٹن دکھائی دیا جس پر خون جما ہوا تھا' کرن نے اسے جھک

کر اٹھالیا کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ انسپکٹر عمران اس کا شوہر موٹر بائیک کے پاس کھڑے باتیں کررہے تھے اور سپاہی اور فنگر پرنٹ ماہر لاش سے کچھ فاصلے پر کھڑے لاش کی تصاویر وغیرہ لے رہے تھے۔

کرن نے پہلے سوچا کہ فوراً انسپکٹر عمران کے پاس جا کر خون آلود ٹوٹا ہوا بٹن اس کے حوالے کردے جو ایک اہم کلیو ہوسکتا ہے لیکن پھر اس کے اندر کی جاسوسی کی حس بیدار ہوگئی وہ شادی سے قبل جاسوسی ناول اور ڈائجسٹوں میں کرائم کہانیاں کثرت سے پڑھا کرتی تھی چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ فی الحال وہ یہ خون آلود بٹن اپنے پاس ہی رکھے اور خود بھی حالات واقعات پر غور کرتے ہوئے قاتل کو بے نقاب کرنے کی جدوجہد کرے اور اگر سراغ نہ ملا تو پھر بٹن انسپکٹر عمران کے حوالے کردے۔ وہ خود کو ایک جاسوس اور سراغ رساں محسوس کرنے لگی۔ اسے کرسٹا نا برانڈ کی ایک کہانی کی جاسوس عورت بھی یاد آگئی جس نے بالآخر قاتل کو پھانسی کے پھندے تک پہنچادیا تھا۔

⊙......⊙

مختصر سا سفر طے کرکے انسپکٹر عمران سپاہی اور سورج خان ٹیلے پر بنے مکان کے سامنے پہنچے تو باہر نکلتے چنگیزی کا رنگ اڑ گیا' انسپکٹر عمران کو دیکھ کر اس کے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔ وہ انسپکٹر عمران کی ذہانت اور کارناموں سے اچھی طرح واقف تھا۔ انسپکٹر عمران مجرموں کے لیے ہوا تھا۔

''آپ......آپ انسپکٹر عمران صاحب۔'' اس کے منہ سے گھبرائے ہوئے لہجے میں نکلا۔

''اندر چلو۔'' انسپکٹر عمران نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ وہ جلدی سے حیران پریشان ششدر سا اندر چلا آیا صحن میں سیب کے گھنے درخت کے نیچے میز کے گرد چند کرسیاں پڑی تھیں۔ میز پر اخبار اور رسائل بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ فاصلے پر تیار ہونے والی میزیں اور کرسیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ جن پر چنگیزی کی بیوی برش پکڑے سیاہ پینٹ کررہی تھی۔

انسپکٹر عمران نے چنگیزی کو اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ ہانپتا کانپتا ڈھیر ہوگیا۔ سورج خان انسپکٹر عمران کے ساتھ براجمان ہوا۔ سپاہی کھڑے ہوکر ادھر ادھر ماحول پر نگاہ دوڑانے لگے۔ عورت چونک کر برش رکھتے ہوئے پولیس کو گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔

انسپکٹر عمران نے اپنی تیز نظریں چنگیزی پر جما کر اس کا سرتاپا جائزہ لیا پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

''چنگیزی کیا تم اپنی پرانی روش بدل چکے ہو یا اسی راستے پر گامزن ہو۔''

''انسپکٹر صاحب! میں چوری ڈکیتی چھوڑ چکا ہوں' اور جیل میں سزا کاٹنے کے بعد اب شرافت کی زندگی گزار رہا ہوں۔ میں اور میری بیوی اس جگہ لکڑی کی میزیں اور کرسیاں بنا کر فروخت کرتے ہوئے گزر بسر کررہے ہیں۔ میرا ایک ہی بیٹا تھا جو میرے جیل جاتے ہی بیمار ہوکر چل بسا تھا۔'' چنگیزی نے احوال سنایا۔

''اچھا چنگیزی ایسا کرو۔'' انسپکٹر عمران نے دلچسپ لہجے میں کہا۔ ''اس سیب کے درخت سے دو سیب اتارو اور اپنے چاقو سے انہیں کاٹ کر پلیٹ میں سجادو۔''

''ضرور ضرور کیوں نہیں سرکار' میں چائے پانی کا بھی بندوبست کرتا ہوں۔'' پھر اپنی بیوی کو اشارے سے قریب بلا کر چائے بنانے کا کہہ کر کرسی پر کھڑا ہوکر سیب اتارنے لگا۔ سیب میز پر رکھ کر وہ چند قدم چل کر ایک چھوٹے سے درخت کے پاس گیا' اس کی ایک شاخ سے ایک سیاہ رنگ کا چاقو کا خول لٹک رہا تھا' لیکن جیسے ہی چنگیزی نے خول میں ہاتھ ڈالا اس کا ہاتھ اٹک کر رہ گیا۔ وہ بڑے زور سے اچھلا پھر اس کی آنکھوں میں خوف سمٹ آیا' وہ گھبراہٹ میں اپنی بیوی کے پاس گیا سرگوشی میں کچھ پوچھا۔ اس کی بیوی نے نفی میں سر ہلایا چنگیزی ٹھٹکا سا گیا' الجھن کے عالم میں واپس میز کی طرف آیا اور پھٹی پھٹی نظروں سے سب کو دیکھنے لگا۔

''کیا ہوا؟ کیوں بدحواس ہوگئے؟'' انسپکٹر عمران نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''جناب......جناب......وہ......وہ''

چنگیزی انسپکٹر عمران کی طرف مڑتے ہوئے اٹک اٹک کر بولا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور خوف کے ملے جلے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔

''آخر بات کیا ہے؟'' انسپکٹر عمران نے کرسی سے اٹھ کر آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

''جناب......وہ......وہ'' اس نے پھر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ انسپکٹر عمران نے اس کے قریب پہنچ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''گھبراؤ مت اور اپنی الجھن سے آگاہ کرو۔''

''انسپکٹر صاحب وہ چاقو اپنے خول سے غائب ہے میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے کی خبر دے رہی ہے۔'' چنگیزی نے فکرمند لہجے میں کہا' وہ اب بھی چھوٹے درخت سے لٹکتے چاقو کے خول کو گھور رہا تھا۔

''تم اس چاقو سے کیا کام لیتے ہو؟'' انسپکٹر عمران نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

''انسپکٹر صاحب' میں اس لمبے تیز دھار چاقو سے لکڑیوں کی چھوٹی موٹی تراش خراش کا کام لیتا ہوں اس کے علاوہ پھل وغیرہ کاٹنے کے لیے بھی استعمال میں آجاتا ہے۔''

''اپنی بیوی سے ہو گھر میں چاقو کو تلاش کرنے شاید تم کہیں رکھ کے بھول گئے ہو۔'' انسپکٹر عمران نے مشورہ دیا۔

''انسپکٹر صاحب وہ روزانہ گھر کی صفائی ستھرائی کرتی ہے اس نے گھر کے اندر چاقو نہیں دیکھا ہوتا تو بتا دیتی' وہ اپنے استعمال کے لیے دوسری چھریاں استعمال کرتی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ چاقو کے قریب بھی نہیں گئی۔ وہ گئی عام ملازمہ جو میری بکریاں چرانے کے لیے باہر جاتی ہے یا باہر سے سودا سلف لانا اس کی ڈیوٹی میں شامل ہے وہ آج چھٹی پر ہے۔''

انسپکٹر عمران چند لمحے اسے ٹکٹکی باندھے بغور دیکھتا رہا جیسے اس کی تیز نظریں اس کی کیفیات کا عکس لے رہی ہوں۔ پھر محویت ختم کرکے اسے میز کے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چنگیزی متفکر انداز میں تھکے تھکے قدم اٹھا کر کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ وہ نڈھال سا تھا وہ جانتا تھا انسپکٹر عمران کی آمد بلاسبب تو نہیں ہوسکتی ضرور کچھ گڑبڑ ہوچکی ہے۔

''کیا یہی وہ چاقو ہے۔'' انسپکٹر عمران نے تیزی سے پولیس بیگ سے چاقو نکال کر چنگیزی کے سامنے ڈال دیا۔ چنگیزی یہ دیکھ کر اچھلا اور پھر پھٹی پھٹی نظروں سے چاقو کو گھورنے لگا۔ جس پر لگا ہوا خون ابھی پوری طرح سیاہ نہیں ہوا تھا۔ چنگیزی ایک دم کانپ اٹھا اور اپنی آرام کرسی پر توازن کھو کر بمشکل سنبھلا۔

''یہ......یہ آپ کو کہاں سے ملا؟'' اس نے اٹک اٹک کر پوچھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور پھیلی ہوئی آنکھیں خنجر پر مرتکز تھیں۔

''یہ ہمیں جائے واردات سے ملا ہے جہاں تالاب کے کنارے مسٹر سورج خان کے ملازم چاند خان کو اس چاقو سے قتل کرکے چاقو سامنے جھاڑیوں میں پھینک دیا گیا تھا۔'' انسپکٹر عمران نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا۔ وہ چونکا اور سہم گیا۔ وہ انسپکٹر عمران سے بہت ڈرتا تھا۔

''جائے واردات' قتل' میرا خنجر۔'' وہ بڑبڑا کر پھر اچانک ہی سنبھلا اور سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''انسپکٹر صاحب میرا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں' کسی نے شاید میرا چاقو چرا کر مجھے پھنسانے کے لیے یہ چکر چلایا ہے۔''

''تم خود بھی تو قاتل ہوسکتے ہو' تم نے سورج خان کو دھمکی دی تھی کہ اپنے نوکر کو لگام ڈالیے ورنہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا۔'' انسپکٹر عمران نے اسے سرد لہجے میں گھورتے ہوئے کہا۔

چنگیزی سرد آہ بھر کر سورج خان پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالتا ہوا ٹہلتے ہوئے بولا۔

''انسپکٹر صاحب اصل معاملہ کچھ یوں ہے کہ سورج خان صاحب سے میری کوئی پرانی یا ذاتی رنجش نہیں' ان کا نوکر چاند خان خوبصورت' شوخ اور عورتوں پر بری نگاہ رکھنے والا لڑکا تھا۔ اس نے میری بیوی کو بھی پھسلانے کی کوشش کی تھی لہٰذا میں نے غصے کے عالم میں یہ الفاظ کہے ضرور تھے لیکن خدا کی قسم میں بے گناہ ہوں' میں نے اسے نہیں مارا۔ اگر میں قتل کا مرتکب ہوتا تو چاقو کیوں جائے وقوعہ پر پھینک آتا۔'' چنگیزی نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''انسپکٹر صاحب!'' اب سورج خان چلا اٹھا۔ ''یہ شخص جھوٹا مکار اور قاتل ہے اسی نے میرے معصوم نوکر کا خون بہایا ہے۔ یہ اس کے خون کا پیاسا ہورہا تھا۔ ڈورے اس کی بیوی نے ڈالے تھے اور یہ دشمن میرے ملازم کا بن گیا۔ میرے خیال میں جب اس نے چاند کے سینے میں خنجر اتارا تو اس نے دور سے مجھے گاڑی میں آتے دیکھا اور بدحواس ہوکر چاقو پھینک کر بھاگ نکلا۔ میں نے ایک سیاہ سایہ سا جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپتے بھی دیکھا تھا۔ میں اپنے تحریری بیان میں لکھ چکا ہوں اور چنگیزی اس وقت سیاہ لباس ہی پہنے ہوئے ہے۔'' سورج خان نے زہر خند لہجے میں ایک جلتی نگاہ چنگیزی پر ڈالی۔

''جناب والا یہ صرف اور صرف سازش ہے۔'' چنگیزی ہذیانی لہجے میں بولا' اس کی بیوی بھی نزاکت بھانپ کر قریب

چلی آئی۔ انسپکٹر عمران کچھ سوچ کر چنگیزی کی بیوی کی طرف مڑتے ہوئے مخاطب ہوا۔

"آپ کا نام!"

"میرا نام شبانہ چنگیزی ہے۔" عورت نے گھبرائے بغیر جواب دیا۔ انسپکٹر عمران نے محسوس کیا کہ عورت اعتماد سے بھرپور اور مضبوط اعصاب کی مالک ہے۔ گھبراہٹ کی کوئی شکن اس کے چہرے پر موجود نہیں۔

"مسز چنگیزی آپ کے شوہر صبح سے لے کر اب تک گھر میں ہی کام کرتے رہے ہیں یا یہ باہر بھی گئے تھے کوئی ایک گھنٹہ قبل۔" انسپکٹر عمران نے اپنی تیز نظریں عورت پر مرتکز کردیں۔ عورت نے چنگیزی کی طرف دیکھا پھر خفیف سا اشارہ پا کر بولی

"ہاں یہ کچھ دیر کے لیے ایک گھنٹہ قبل اپنی چرنے والی بکریوں کو گھر لانے کے لیے باہر گئے تھے اور انہیں لے کر ہی واپس آگئے تھے کیونکہ ملازمہ آج چھٹی پر ہے۔ بکریوں کا دودھ انہیں بچپن سے پسند ہے اس لیے انہوں نے بکریاں پال رکھی ہیں۔" مسز چنگیزی نے بڑی روانی سے بیان دیا۔ انسپکٹر عمران خاموش ہو کر ٹہلتے ہوئے صورت حال کا تجزیہ کرنے لگا۔ پھر رک کر دوبارہ مسز چنگیزی سے مخاطب ہوا۔

"خاتون آپ شادی شدہ ہونے کے باوجود کیوں اس لڑکے کی طرف متوجہ ہوئیں یا کیا اس نے آپ پر ڈورے ڈالنے شروع کردیے تھے۔ معاف فرمایئے یہ ایک نجی سوال ہے لیکن قتل کی سنگین واردات کے پیش نظر میں سارا پس منظر معلوم کرنا چاہتا ہوں۔" انسپکٹر عمران نے شستہ لہجے میں پوچھا۔

عورت نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر جلتی نگاہ اپنے شوہر اور پھر سورج خان پر ڈالی پھر اس کے لب متحرک ہوئے۔

"انسپکٹر صاحب! یہ صرف اور صرف ایک غلط فہمی ہے ایک الزام ہے کہ میں اس لڑکے کی محبت میں گرفتار ہوگئی تھی حالانکہ اصل قصہ صرف یہ ہے کہ اس لڑکے چاند خان کی شکل وصورت میرے مرحوم بھائی سے کچھ حد تک ملتی جلتی تھی اس لیے میں کبھی کبھار اس لڑکے سے ہنس بول لیا کرتی تھی اس کے علاوہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا' میرا خاوند بھی بدظن ہوا اور مجھے مار پیٹ کا نشانہ بھی بنایا بہرحال میرے خاوند کا جو حق تھا وہ اس نے استعمال کیا۔"

"آپ خاص طور پر اس لڑکے سے تالاب کے کنارے کیوں ملنے جایا کرتی تھیں؟" انسپکٹر عمران نے پوچھا۔

"انسپکٹر صاحب خاص طور پر نہیں' تالاب میں مچھلیاں موجود ہیں اور مجھے مچھلیاں پکڑنے کا بہت شوق ہے میں فارغ وقت میں مچھلیاں پکڑنے کی بنسی تالاب میں ڈال کر کنارے بیٹھ جاتی تھی۔ چاند اپنی مالکن کے سلسلے میں اس طرف سے گزرتا تھا اور کیوں نہ گزرتا' آنے جانے کا ایک وہی واحد راستہ ہے' جو آگے جا کر مین رائے ونڈ روڈ سے جا کر مل جاتا ہے۔"

"کیا آپ نے اپنے خاوند کو اس دلچسپی سے آگاہ کیا تھا کہ چاند کی شکل آپ کے مرحوم بھائی سے ملتی جلتی ہے۔" انسپکٹر عمران نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔

"ہاں انسپکٹر صاحب!" مسز چنگیزی ہنکارہ بھرتی ہوئی بولی۔ "میں نے انہیں آگاہ کیا تھا لیکن انہوں نے مجھے سختی سے ڈانٹا کہ جو کچھ بھی ہے غیر لڑکے سے تمہارا ملنا مجھے گوارا نہیں لیکن میں چونکہ ماضی میں ایک ٹی وی آرٹسٹ رہ چکی ہوں اور چھوٹی چھوٹی پابندیوں کی قائل نہیں اس لیے چنگیزی کی مار پیٹ کے باوجود ملتی رہی۔"

"ایک چور' ڈکیت' مجرم سے ایک ٹی وی آرٹسٹ کی شادی کیسے ہوئی کیا یہ ایک عجیب سا ملاپ نہیں۔" انسپکٹر عمران نے اسے مزید کریدا۔

"انسپکٹر صاحب! آپ تو بالکل ہی ذاتیات پر اتر آئے حالانکہ ان باتوں کا موجودہ معاملے سے کوئی تعلق نہیں' بہرحال میں پھر بھی بتاؤں گی' میرے خاوند چنگیزی نے میری اداکاری کو ایک ڈرامے میں بہت پسند کیا تھا۔ یہ مجھ سے ملنے آئے تھے۔ میں ڈائننگ ہال میں اترنے والی سیڑھیوں کے اوپر بیڈروم سے نکل کر نمودار ہوئی' اچانک میرا پاؤں پھسلا' چنگیزی صاحب پھولوں کا گلدستہ لیے میرے استقبال کے لیے آگے بڑھے اور زینے پر قدم رکھتے ہوئے اوپر آنے لگے' ہماری موبائل پر گفتگو ہوچکی تھی۔ میرے پیروں سے زینہ نکل چکا تھا' میں چیخ مار کر نیچے گری' چنگیزی صاحب نے مجھے اس انداز سے بروقت دونوں ہاتھوں سے تھام لیا کہ میں موت کے منہ سے نکل کر ان کی بانہوں میں جھول گئی۔"

مسز چنگیزی نے خاوند کی طرف دیکھتے ہوئے

کہا۔ چنگیزی اپنی تعریف سن کر دھیرے سے مسکرایا۔

"کیا چاقو پر میری انگلیوں کے نشانات موجود ہیں۔" چنگیزی نے اہم سوال اٹھایا۔

"نہیں تمہاری انگلیوں کے نشانات نہیں ملے' کسی اور کے بھی نہیں پائے گئے لیکن قاتل دستانے استعمال کرسکتا ہے۔" انسپکٹر عمران نے اسے گھورتے ہوئے جواب دیا۔

"اس نے بے حد سیاہ لباس پہن رکھا ہے۔ میں نے بھی ایسے ہی لباس کی جھلک دیکھی تھی جو آدمی جھاڑیوں میں چھپ کر غائب ہوگیا تھا۔" سورج خان نے ناپسندیدگی سے چنگیزی کو گھورتے ہوئے اشارہ کیا۔

"یہ خواہ مخواہ کی الزام تراشی ہے جو سورج صاحب پہلے بھی کرچکے ہیں' کیا سیاہ لباس کوئی دوسرا شخص نہیں پہن سکتا۔ انسپکٹر صاحب میں آج گھر سے باہر نکلا تھا لیکن اپنی بکریوں کو لے کر واپس لوٹ آیا تھا۔" انسپکٹر عمران چند لمحے چنگیزی کو سرتاپا دیکھتا رہا پھر اس سے مخاطب ہوا۔

"فی الحال قتل کا واضح شبہ تمہاری طرف ہی جارہا ہے' تمہارے پاس قتل کا اشتہا انگیز جواز موجود تھا تم اس لڑکے کو اپنی ازدواجی زندگی کے لیے خطرہ محسوس کرتے تھے لیکن میں جلد بازی کا قائل نہیں ہوں۔ یہ بات الجھن پیدا کررہی ہے کہ آلہ قتل جائے واردات کے قریب ہی مل گیا اور درخت کی شاخ پر چاقو کا خول بھی بدستور موجود ہے۔ یہ نکتہ تمہارے حق میں جاتا ہے لیکن تم کسی حال میں بھی یہاں سے بھاگنے یا روپوش ہونے کی کوشش نہ کرنا ورنہ تم خود اپنے مجرم ہونے کا ثبوت دو گے۔ بس اب ہم چلتے ہیں" انسپکٹر عمران نے سورج خان کو داخلی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ سورج خان کینہ توز نظروں سے مڑ مڑ کر چنگیزی کی طرف دیکھتا ہوا انسپکٹر عمران کے پیچھے ہولیا۔ چنگیزی بھی سورج خان کے تیور بھانپ کر اسے شعلہ بار نظروں سے گویا للکارنے لگا۔

⊙......⊙

انسپکٹر عمران سورج خان کے ساتھ چاند کی سفید چادر سے ڈھکی میت کے پاس سے گزر کر کرن کے سامنے پہنچا تو اس کی آنکھوں میں اس وقت بھی آنسو لرز رہے تھے۔

"ایک ملازم کی موت کا اتنا صدمہ پہلی بار دیکھا ہے۔" انسپکٹر عمران نے دانستہ ایسا کہا۔

"ملازم نہیں انسپکٹر صاحب! بیٹا کہیے میں اسے اپنا بیٹا ہی سمجھتی تھی' اپنا خون' اپنا لخت جگر۔"

"کیا یہ منطقی پہلو سے درست ہے؟" انسپکٹر عمران نے کرن کی غم زدہ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں یہ درست ہے' بعض رشتے بدنی وخونی نہ ہونے کے باوجود بھی بڑے محکم ہوتے ہیں۔ کیا دوست دوستوں سے محبت نہیں کرتے' کیا وہ ان کے لیے جان ومال کی قربانیاں نہیں دیتے' کیا آفیسرز اپنے بعض ماتحتوں کو اپنے بھائیوں جیسا خیال نہیں کرتے' پھر کیوں ایک عورت اپنے پالے ہوئے ملازم کو اپنا بیٹا تصور نہیں کرسکتی جبکہ وہ اس کے ہر معیار پر پورا اترا ہو' جس نے اپنے آپ کو شرافت' اخلاق اور خدمت کی حدوں کے اندر ہی مقید رکھا ہو۔ میں نے تو اس کے لیے لڑکی بھی دیکھ رکھی تھی۔"

"میں آپ کے جذبات سے اختلاف نہیں کرتا لیکن ایک نوجوان لڑکے سے زیادہ جذباتی وابستگی آپ کے خاوند کے لیے کسی نہ کسی طور میرے خیال میں تکلیف دہ ہوسکتی تھی۔" انسپکٹر عمران نے اس دفعہ دونوں میاں بیوی کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"انسپکٹر صاحب! آپ سراغ رساں ہیں' آپ بھی اپنی کوشش کیجیے' اور میں بھی قاتل کو بے نقاب کرنے کی پوری جدوجہد کروں گی میرے کلیجے میں ٹھنڈک تو اسی طرح پڑے گی۔" کرن نے پرعزم لہجے میں کہا۔

دونوں کو میت کے پاس چھوڑ کر انسپکٹر عمران زرعی رقبے کی طرف نکل آیا' اے ایس آئی فرحان اس کے ساتھ تھا۔ تمام ملازموں اور کسانوں کو جمع کر کے ان سے الگ الگ کچھ سوالات کیے گئے لیکن سب نے یہی بیان دیا کہ مالکن اور چاند کے تعلقات ماں اور بیٹے جیسے تھے۔ اس میں کبھی عشق' ہوس یا جنسیت کو محسوس نہیں کیا گیا۔ ملازموں سے فارغ ہو کر انسپکٹر عمران عمارت کے عقبی حصے میں آیا' جہاں دوسری منزل پر ایک خوبصورت کمرا چاند کو دیا گیا تھا۔ اس کمرے کی کھڑکیاں فارم اور باغ کی طرف کھلتی تھیں۔ باہر کے مناظر خوشنما تھے' باغ کا فوارہ بھی یہاں سے سبزہ زار کے بیچ دکھائی دے رہا تھا۔ چاند خان کے کمرے کی چھت پر کبوتروں کا باڑہ تھا جس سے کبوتر اڑ اڑ کر باہر فضا میں چکراتے پھر رہے تھے' ملازم نے انسپکٹر عمران کو بتایا کہ کبوتر چاند سے اتنے مانوس تھے

کہ اس نے کبھی باڑے کو بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ انسپکٹر عمران نے کمرے کی بڑی کھڑکی سے دور کے منظر میں دیکھا کچھ لوگ اطلاع پاکر چاند خان کی میت دیکھنے آرہے تھے' انہیں ملازم ڈائننگ ہال میں رہنمائی کرتے ہوئے لے جارہے تھے۔

اب انسپکٹر عمران چاند خان کے کمرے کے سامان کی طرف متوجہ ہوا جو ایک ایزل' آرام دہ بستر' لکڑی کے دو صندوقچوں' چند کپڑوں' ایک الماری اور ایک میز کے گرد دو کرسیوں پر مشتمل تھا۔ انسپکٹر عمران نے ماہرانہ انداز سے کمرے کی تلاشی لی لیکن کوئی قابل ذکر چیز نہ ملی جس سے کہیں پھر کچھ روشنی پڑتی معلوم ہوتی۔ انسپکٹر عمران کی گھومتی ہوئی نگاہ اچانک چاند کے ایزل پر جاکر رک گئی' ایزل کے سامنے ایک گول اسٹول موجود تھا جس پر بیٹھ کر لڑکے چاند نے تصویر مکمل صورت میں اپنے فن مصوری کے نمونے کے طور پر بنا چھوڑی تھی۔ انسپکٹر عمران نے مختلف رنگوں سے بنی ہوئی تصویر کے منظر کا بغور جائزہ لیا' ایک عورت اور لڑکا ایک دوسرے کی طرف پسندیدگی سے دیکھ کر مسکرا رہے تھے' لیکن ان دونوں کی طرف ہوا میں اڑتا ہوا ایک تیر قریب آتا دکھائی دے رہا تھا۔ انسپکٹر عمران نظر کو دیکھ کر سمجھتا رہا پھر مسکرایا۔ تصویر محبت اور رقابت کا پرتو تھی۔ تصویر میں دکھائی دینے والا تیر ہی چاند خان کا قاتل تھا۔ کچھ سوچ کر انسپکٹر عمران آگے بڑھا اور اس نے چاند کا بستر الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ بیڈ شیٹ کی ایک سائیڈ پر چھپی ڈائری اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ ڈائری میں چند تحریریں موجود تھیں جو یقیناً چاند خان ہی کی لکھی ہوئی تھیں۔ مثلاً ایک عبارت کئی بار لکھی گئی تھی۔

''مالک مجھ سے ناراض ناراض رہتا ہے' یہ بات صاحب ظاہر نہیں کرتے لیکن دوسرے ملازم اور ان کے دوست مجھ سے دبے لفظوں میں کہہ چکے ہیں کہ میں یہ ملازمت چھوڑ دوں' میں جوان ہو چکا ہوں اب مالکن کے گرد میرا رہنا ٹھیک نہیں۔ یہ بہت ہی بڑی غلط فہمی ہے' مالکن میں تو مجھے اپنی ماں کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ وہ بھی مجھے اپنا بیٹا تصور کرتے ہوئے خوش اخلاقی اور محبت سے پیش آتی ہے۔ میں نے کئی بار کوشش کی کہ رات کی تاریکی میں کہیں چلا جاؤں لیکن قدم دروازے سے واپس لوٹ آتے ہیں۔ میں مالکن کو دکھ نہیں دے سکتا۔ کیونکہ مالکن نے مجھے کہا تھا کہ وہ اسے کبھی چھوڑ کر نہ جائے۔ وہ تنہا رہ جائے گی' صاحب تو اپنے مشاغل میں مگن رہتے ہیں' وہ کسی اور ہی تتلی کے چکر میں رہتے ہیں۔ وہ گھر کے باہر کے ماحول میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔''

ڈائری میں چند اور بھی عبارتیں تھیں' جو انسپکٹر عمران کے لیے لائق توجہ نہیں تھیں۔ البتہ ڈائری کے ایک گلابی رنگ کے خوشنما صفحے پر چند رومانوی جملے' چاندنی رات' تنہائی' اور تالاب کے کنارے مسز چنگیزی کے اس کی طرف ملتفت ہونے کا احوال درج تھا۔ دلچسپی مسز چنگیزی نے ہی اس میں محسوس کی تھی اس کی شکل وصورت اور مسکراہٹ میں اسے اپنے مرحوم بھائی کا چہرہ دکھائی دیتا تھا ایک اور جملہ انسپکٹر عمران کی توجہ اور دلچسپی کا سبب بنا۔

''مالکن نے میرے لیے یونس مالی کی لڑکی پسند کررکھی ہے' لڑکی اچھی خوش اخلاق' خوبصورت اور میری طرح دراز قد ہے۔ ہمارا آمنا سامنا بھی فارم کے مختلف مقامات پر ہوتا رہتا ہے۔ بس لڑکی کی تعلیم مکمل ہونے کی دیر ہے۔'' اگلے اوراق خالی تھے۔ انسپکٹر عمران نے غمگین سے انداز سے ڈائری کو بند کرتے ہوئے اپنی پتلون کی جیب میں محفوظ کرلیا' اسے نوجوان لڑکے کی موت کا کافی دکھ ہوا تھا۔ وہ زندگی کی سختیاں جھیلتا رہا تھا اور جب جوانی کا لطف اٹھانے کا موقع آیا تو اس سے زندگی کو چھین لیا گیا۔ انسپکٹر عمران نے کمرے پر ایک گھومتی ہوئی نگاہ ڈالی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ کمرے کے باہر خانساماں ادب سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس وقت سارجنٹ فرحان ہیڈ مالی کرم دین کو لے کر ان کے سامنے آ پہنچا۔ انسپکٹر عمران نے سر سے پاؤں تک اس پر نگاہ ڈالی وہ کچھ شرمندہ شرمندہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ انسپکٹر عمران سے نظریں ملانے میں اسے جھجک محسوس ہورہی تھی۔

''سر' دوران تفتیش اس نے آپ سے کوئی اہم بات چھپائی تھی لیکن ضمیر کی خلش نے اسے مجبور کردیا ہے کہ وہ اطلاع آپ تک پہنچادے۔'' سارجنٹ فرحان نے اس کی آمد سے آگاہ کیا

''فرمایئے کیا بات ہے' گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں کوئی نہ کوئی کمی کوتاہی انسان سے سرزد ہو ہی جاتی ہے۔'' انسپکٹر عمران نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

''انسپکٹر صاحب! جب آپ نے مجھ سے سوالات کرتے ہوئے کسی اہم واقعہ کے بارے میں دریافت کیا تھا

کہ جس سے چاند خان کی موت پر کچھ روشنی پڑسکتی ہو تو وقتی طور پر میں نے اس واقعے کو آپ سے چھپایا کہ کہیں مالک ناراض نہ ہوجائے لیکن پھر میرے ضمیر نے مجھے ملامت کی کہ یہ قتل کا کیس ہے' جس میں کوئی اہم بات قانون سے پوشیدہ نہیں رکھنی چاہیے ہوسکتا ہے اس واقعہ سے آپ کوئی نتیجہ اخذ کرہی لیں۔'' کرم دین سانس لینے کے لیے رکا۔

''ہاں...... ہاں کہو کیا بات ہے؟'' انسپکٹر عمران نے جلدی سے پوچھا۔

''جناب والا یہ کوئی پندرہ بیس دن پہلے کا واقعہ ہے۔ صاحب مالکن کو صبح صبح گھڑ سواری کی عادت ہے یہ ان کا سالہا سال پرانا معمول ہے۔ انہوں نے ایک مرتبہ صبح ہی صبح اصطبل سے گھوڑا نکلواتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ اپنی ایک ہم نام لڑکی کو ایک فلم میں گھوڑا دوڑاتے دیکھ کر ان کے اندر بھی یہ شوق اور جذبہ پیدا ہوگیا ہے۔ اس دن فارم کی دیوار کے ساتھ بنے ہموار راستے پر گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے اچانک گھوڑے کا پاؤں کسی ملازم کے بچے کے پھینکے گئے کیلے کے چھلکوں سے پھسل گیا' کرن صاحبہ گھوڑا الٹنے پر اچھل کر زور سے پلاٹ میں گریں جہاں مچھلیوں کے پرانے حوض کے اکھاڑے ہوئے پتھروں سے ان کا سر ٹکرا کر پھٹ گیا۔ وہ بے ہوش ہوگئیں' وہ جس جگہ گری تھیں وہ ٹریک سے قدرے نشیب میں واقع تھی۔ یہ منظر چاند خان نے صبح کی سیر کرتے ہوئے سب سے پہلے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں موجود پھولوں کا گلدستہ پھینک کر مالکن مالکن پکارتا ہوا بے تحاشا بھاگا اور مالکن کو زخمی اور بے ہوش دیکھ کر انہیں کندھے پر اٹھا کر بھاگتا ہوا کوٹھی کے بیڈروم میں لے گیا۔ مالی اور ملازم بھی یہ منظر دیکھ کر بیڈروم کے باہر جمع ہوگئے۔ خوش قسمتی سے فارم کے قریب ہی ایک بوڑھا ڈاکٹر رہائش پزیر ہے جو صاحب کے دوستوں میں سے ہے۔ چاند خان نے فوراً اسے فون پر صورت حال سے آگاہ کیا' ڈاکٹر اپنا داؤں کا بکس لے کر اپنی کار میں دوڑا چلا آیا۔ اس نے ابتدائی طبی امداد بہم پہنچائی اور یہ خوش خبری سنائی کہ زخم زیادہ گہرا نہیں ڈریسنگ کرکے انجکشن دے دیے ہیں انہیں ایک گھنٹے میں ہوش آجائے گا۔'' انسپکٹر عمران جلدی سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ مطلب سمجھ کر کرم دین فوراً بول اٹھا۔

''جناب سورج خان صاحب اس وقت کراچی گئے ہوئے تھے وہ یہاں موجود نہیں تھے لہٰذا بیگم صاحبہ کی دیکھ بھال' علاج معالجہ کے سلسلہ میں چاند خان نے اپنے آپ کو پیش پیش رکھا' ان کی دوا' خوراک' آرام ہر چیز کے متعلق بڑی ہی ذمہ داری اور محنت سے کام کیا۔ تین دن بعد صاحب کراچی سے واپس لوٹ آئے۔ اور صاحب......'' کرم دین ہچکچانے لگا۔

''اور کیا......؟ بتاؤ گھبراؤ مت۔'' انسپکٹر عمران نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

''انسپکٹر صاحب بظاہر تو صاحب نے چاند کی خدمت کو بہت سراہا لیکن اندر ہی اندر مالکن سے چاند کی قربت انہیں پسند نہ آئی۔ میں نے انہیں بڑبڑاتے ہوئے سنا تھا۔ ''یہ لڑکا اور میری بیوی' میں اب کیسے برداشت کروں' یہ ہمارے بیڈروم میں بھی داخل ہوچکا ہے۔ یہ سلسلہ ٹھیک نہیں۔'' انسپکٹر صاحب وہ غصے میں تھے۔ وہ اپنے دائیں ہاتھ کے مکے کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مارتے ہوئے بولے۔ ''میں نے کئی بار اسے یہ سرزنش کی ہے کہ اب وہ جوان ہوگیا ہے' اب وہ ملازمت چھوڑ کر چلا جائے' بے شک مجھ سے کچھ روپے بھی لے لے لیکن وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے' کرن اسے جانے نہیں دیتی۔ میں اسے ...... میں اسے۔'' بس صاحب یہاں تک ہی صاحب کی بڑبڑاہٹ سرگوشیوں میں میں نے سنی تھی۔'' کرم دین مضطرب سے انداز میں خاموش ہوگیا۔

انسپکٹر عمران نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا عمارت کے ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔ جہاں دونوں میاں بیوی سامنے صوفے پر براجمان تھے۔ پھولوں کا گلدستہ میز سے غائب تھا۔ کرن کے چہرے پر افسردگی اور مردنی چھائی ہوئی تھی جبکہ سورج خان کا چہرہ سپاٹ اور بے تاثر سا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھاپ اڑاتی گرم چائے کا کپ تھا اور کرن کے سامنے رکھا چائے کا کپ ابھی تک ویسے ہی رکھا تھا لبالب چائے ٹھنڈی ہوچکی تھی۔

''آیئے انسپکٹر صاحب بیٹھیے۔'' سورج خان نے بالمقابل صوفے کی طرف اشارہ کیا پھر میز پر نصب گھنٹی بجا کر خانساماں کو طلب کیا اور اسے ٹھنڈی چائے گرم کرکے لانے کا اشارہ کیا۔

''کرن اپنے آپ کو نارمل رکھو تم تو بالکل گم صم ہوگئی

ہوا بھی تو زندگی کا لمبا سفر باقی ہے۔" سورج خان نے ہمدردانہ لہجے میں اپنی بیوی کے قریب کھسکتے ہوئے کہا۔

"ایک ماں کا بیٹا دنیا سے چلا گیا ہے' سنبھلنے میں وقت لگے گا۔" کرن نے اداس لہجے میں کہا' پھر انسپکٹر عمران کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"انسپکٹر صاحب کچھ پیش رفت ہوئی۔"

"ہاں کرن صاحبہ' کچھ کچھ سراغ ملا ہے لیکن ابھی میں کسی پر مکمل شبہ نہیں کر سکتا۔" انسپکٹر عمران نے ڈائری نکالتے ہوئے سورج خان کے سامنے میز پر اخبار کے اوپر ڈال دی۔

"سورج صاحب اس ڈائری کی چند عبارتیں با آواز بلند پڑھ ڈالیے۔" سورج خان نے چونک کر ڈائری کو دیکھا' پھر مضطرب لہجے میں بولا۔

"انسپکٹر صاحب یہ کس کی ڈائری ہے؟"

"آپ کے ملازم چاند کی۔" انسپکٹر عمران نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ سورج خان نے الجھن زدہ تاثرات کے ساتھ ہاتھ آگے بڑھایا' ڈائری اٹھائی اور پھر آہستہ آہستہ اس کی عبارتیں پڑھنے لگا۔ عبارتیں پڑھتے پڑھتے اس کے چہرے پر غصے' اضمحلال اور جھلاہٹ کے آثار دکھائی دینے لگے۔ کرن مسلسل اپنے خاوند کو گھورنے لگی۔

"انسپکٹر صاحب! یہ سب اس بے وقوف کے اپنے منفی خیالات ہیں جو اس نے ڈائری میں درج کر دیئے تھے۔ میں ایک جوان لڑکے کو اپنی بیوی سے دور ہٹانے میں حق بجانب ہوں۔ میں اب اس کے اس گھر میں رہنے کو مناسب نہیں سمجھتا تھا' شیطان کسی بھی انسان کو بہکا سکتا ہے' لیکن میں نے کبھی کرن یا اس کے کردار پر شک و شبہ نہیں کیا۔ میں نے اس کی کارکردگی کی ہمیشہ تعریف کی ہے۔ جب میری بیوی گھوڑے سے گر کر زخمی ہوئی تو میں کراچی میں تھا' میری عدم موجودگی میں چاند نے میری بیوی کی انتہائی خدمت اور دیکھ بھال کی تھی میں نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا اور کچھ انعام بھی دینا چاہتا تھا لیکن اس نے انعام لینے سے انکار کر دیا تھا۔"

سورج خان نے ڈائری کا آخری صفحہ دیکھ کر ڈائری کو میز پر پھینک دیا۔

انسپکٹر عمران نے ڈائری کو میز سے اٹھاتے ہوئے ڈرامائی لہجے میں کہا۔ "مسٹر سورج خان صاحب انسان کے ظاہر اور باطن میں تضاد بھی تو ہو سکتا ہے۔ جب آپ کراچی سے واپس لوٹے تو بظاہر آپ چاند کی خدمت سے خوش ہوئے لیکن آپ کی اس کے متعلق بڑبڑاہٹ غصے اور نفرت پر مشتمل تھی۔ جو سن لی گئی ہے۔"

"وہ بڑبڑاہٹ آپ کو کس نے سنائی؟ یہ بالکل جھوٹا الزام ہے' شاید کوئی ناراض ملازم پولیس کو میرے خلاف بھڑکانا چاہتا ہے' آپ جانتے ہی ہوں گے کہ مہربان سے مہربان مالک کے خلاف بھی نوکر دل میں نفرت کا جذبہ رکھ لیتے ہیں۔ انہیں کبھی کبھی کسی کوتاہی پر ڈانٹنا تو پڑتا ہی ہے۔"

"میں آپ پر براہ راست الزام تو عائد نہیں کر رہا لیکن آپ شک و شبہ سے باہر بھی نہیں ہیں۔" انسپکٹر عمران نے سورج خان پر ایک گہری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"آپ قاتل کیخلاف ثبوت تلاش کیجیے' میں بھی اسے بے نقاب کرنے کی کوشش کروں گی۔ میں نے ارادہ کر رکھا ہے۔" کرن نے صوفے سے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے انسپکٹر عمران کی طرف رخ موڑا۔

"ضرور......ضرور کیوں نہیں' آپ بھی اپنی کوشش کر سکتی ہیں لیکن اگر آپ لوگ چاہتے ہیں کہ قاتل کو ہم جلد از جلد گرفتار کر لیں تو میں آپ کے فارم کے وسطی مقام پر واقع شکاری کیبن میں رہائش اختیار کر لیتا ہوں۔"

انسپکٹر عمران نے دونوں میاں بیوی کو اپنی تجویز سے آگاہ کیا۔

"ضرور......ضرور کیوں نہیں۔" دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا لیکن کرن کا لہجہ پرجوش تھا۔ اس وقت ملازم چائے اور بسکٹ کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا اور سورج خان کے اشارے پر ٹرے انسپکٹر عمران کے سامنے میز پر رکھ دی گئی۔ اس وقت سارجنٹ فرحان اور ان کے دوسرے ماتحت سپاہی اسرار اور رؤف بھی اندر داخل ہوئے۔ انسپکٹر عمران نے انہیں چائے کے لیے بلا لیا۔

⊙......⊙

چائے سے فارغ ہو کر انسپکٹر عمران نے سارجنٹ فرحان' اسرار اور رؤف کو کچھ ہدایات دیں وہ منتشر ہو کر فارم کی طرف نکل گئے۔ انہیں ادھر ادھر آڑ میں کھڑے ہو کر ماحول پر نگاہ رکھنی تھی۔ خود انسپکٹر عمران تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا عمارت کے مختلف مقامات سے گزر کر خارجی دروازے سے باہر نکل آیا۔ دروازے پر متعین گارڈ نے انسپکٹر عمران کو جھک کر سلام کے لیے پر عقیدت انداز سے ہاتھ اٹھا دیا۔

انسپکٹر عمران سلام کا جواب دینے کے بعد تیز تیز چلتا ہوا پگڈنڈی پر آگے بڑھنے لگا۔ کچھ دور جا کر اس نے گلے میں جھولتی ہوئی دوربین اٹھائی اور ماحول کا جائزہ لینے کے بعد پگڈنڈی سے اتر کر ایک دوسرے شارٹ کٹ راستے پر ہولیا۔ وہ چنگیزی کے مکان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ پتلا سا راستہ جھاڑیوں اور خودرو پھولدار پودوں کے درمیان سے ہو کر نکلتا جا رہا تھا۔ انسپکٹر عمران مشینی انداز سے چلتا ہوا چنگیزی کے مکان کے عقبی حصے میں آ کر رک گیا۔ اس نے ماحول پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ اردگرد ماحول پر سکوت طاری تھا اور بشر کیا کسی جانور تک کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

انسپکٹر عمران مکان کی عقبی دیوار کے ایک سرے سے شروع ہو کر دوسرے کنارے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ کسی انسان کے اس طرف آنے کے آثار ڈھونڈ رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک خودرو جنگلی درخت کے قریب آ کر رک گیا۔ درخت زیادہ بڑا اور گھنا نہیں تھا۔ اس کے پیشتر پتے جھڑ چکے تھے' لیکن اسے دیوار پھلانگنے کے لیے بڑی آسانی سے استعمال کیا جا سکتا تھا اور پھر اس کی سراغ رساں نگاہوں نے درخت کے تنے کے پاس گھاس پر کیچڑ آلود جوتوں کے نشانات دیکھ لیے۔ قریب ہی گھاس پر جوتے رگڑ رگڑ کر صاف کرنے کے بعد واپس پیش قدمی کی گئی تھی۔ انسپکٹر عمران نے قریب جا کر فیتے سے جوتے کے نشانات کی پیمائش کی اور اسے ڈائری میں درج کر لیا۔ پھر کچھ سوچ کر جیب سے موبائل فون نکالا اور جوتے کے نشانات کے دو تین فوٹو بھی لے لیے۔ اس وقت اچانک اس کی نگاہ ایک اور پگڈنڈی پر پڑی جس پر کسی کے اس طرف آنے کی نسوانی سی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔

انسپکٹر عمران تیزی سے درخت کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔

جب وہ وجود سامنے آیا تو انسپکٹر عمران چونک پڑا وہ مسز چنگیزی تھیں' انسپکٹر عمران اس کی عقبی دیوار کی طرف پیش قدمی کو بغور دیکھتا رہا۔ ایک جگہ دیوار سے چمٹی خودرو بیلوں کے درمیان ایک دروازہ موجود تھا جسے مسز چنگیزی نے باہر سے کنڈی گرا کر کھول لیا تھا۔ انسپکٹر عمران سوچنے لگا کہ اس کا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے' اس کی جاسوسانہ حس پوری طرح بیدار ہو گئی وہ کسی بندر کی مانند پھرتی سے درخت پر چڑھ کر اس کی پھیلی ہوئی موٹی شاخ پر چلتا ہوا دیوار پر چلا آیا۔ دوسری طرف دیوار کا پلستر اکھڑنے سے کچھ رخنے بنے ہوئے تھے انسپکٹر عمران ان رخنوں میں پاؤں جما کر بڑی آسانی سے نیچے زمین پر اتر گیا۔ اس کی پہلی نگاہ مسز چنگیزی پر پڑی جو تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی باغ کی روش پر آگے بڑھتی ہوئی عمارتی حصے کی طرف جا رہی تھی۔ دوسری نگاہ میں اس نے دیوار کے پاس کھودی گئی کیاری کے کنارے کیچڑ آلود جوتے کے نشان دیکھے۔ کیاری میں کیچڑ تھا۔ اس طرف سے دیوار پھلانگنے والے کے قدم لمبی کیاری کے درمیان سے گزرے تھے چنانچہ جوتوں پر کیچڑ لگ گیا تھا۔ انسپکٹر عمران جوتوں کے نشانات کی پیمائش لے چکا تھا' لہٰذا وہ متجسس ہو کے تیز تیز چلتا ہوا جھاڑیوں اور پودوں کی آڑ لے کر مسز چنگیزی کے قریب تر ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک ایک غراہٹ کے ساتھ جھاڑیوں سے چنگیزی کا چوڑے جبڑے والا خوفناک کتا بالکل سامنے آ گیا۔ انسپکٹر عمران نے بڑے اطمینان سے اپنے ہاتھ میں موجود پستول سے کلوروفارم ملے پانی کی پھوار پھینکی' کتا ہلکی سی غراہٹ کی ساتھ چکراتا ہوا بیٹھ کر بے سدھ ہو گیا۔ انسپکٹر عمران نے آگے بڑھ کر اسے ایک ہلکی سی ٹھوکر لگائی وہ بے ہوش تھا۔ جلدی جلدی عقبی برآمدے میں داخل ہونے والی مسز چنگیزی نے کتے کی غراہٹ کو نظر انداز کر دیا تھا وہ بے حد عجلت میں تھی۔ برآمدے میں پہنچ کر مسز چنگیزی نے اندر داخل ہونے کے بعد دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

انسپکٹر عمران کچھ سوچ کر پیچھے ہٹ آیا اور برآمدے کے ساتھ کمروں کے باہر کی جانب کھلنے والی کھڑکیوں پر نگاہ ڈالتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اچانک ہلکی سی آواز نے اس کے اندر جوش سا بھر دیا وہ جلدی سے چوتھی کھڑکی کے پاس چلا آیا۔ وہ کان لگائے اندر ہونے والی گفتگو سننے لگا۔ پہلی آواز چنگیزی کی تھی جس میں غصہ اور درشتگی تھی۔

"میں نے تمہیں اکیلے گھر سے باہر نکلنے سے منع کیا تھا' لیکن تم بے حد ڈھیٹ عورت ہو دو مرتبہ پٹائی کروانے کے بعد پھر باز نہیں آئی۔ میں واپس آنے پر تمہیں تلاش کرتا ہوا نڈھال سا ہو کر اس کمرے میں کرسی پر آ کر گرا تو تم دوسرے دروازے سے اندر داخل ہوئی ہو۔ تم کہاں گئی تھیں؟" چنگیزی نے بے حد تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

"میں اپنے بھائی کا آخری دیدار کرنے گئی تھی اور یہ کوئی

جرم نہیں ہے۔'' مسز چنگیزی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''وہ قتل ہوگیا ہے دنیا سے رخصت ہوچکا ہے پھر بھی تمہاری جان کو چین نہیں۔''

''صاحب مجھے اپنے مرحوم بیٹے کی قسم وہ ہو بہو میرا بھائی ہی لگتا تھا' وہ جو دل میں اتر جائے وہ پھر کیسے نکل سکتا ہے موت بھی یادوں کو دلوں سے نہیں مٹا سکتی ہے۔'' مسز چنگیزی نے دلیری سے بول رہی تھی۔

''ٹھہر تو سہی تیری یہ جرات کہ اتنی زبان......'' چنگیزی غصے سے دہاڑا لیکن پھر آواز رک گئی۔ انسپکٹر عمران نے کھڑکی کے راستے اندر جھانکا اس نے شفاف شیشے سے چنگیزی کو دل تھامے لڑکھڑاتے دیکھا۔

''اف میرے خدا یہ کیا ہوگیا؟'' مسز چنگیزی چلائی اور بھاگ کر اپنے گرتے خاوند کو سہارا دے کر قریبی آرام کرسی پر ڈال دیا وہ ٹھہرے ٹھہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ اس کے جسم میں کپکپاہٹ سی تھی۔ مسز چنگیزی نے خاوند کی جیب میں ہاتھ ڈال کر زبان کے نیچے رکھنے والی گولی نکالی اور چنگیزی کا منہ کھلنے پر زبان کے نیچے رکھ دی۔

''شکریہ......'' چنگیزی نے کمزور لہجے میں بیوی کا ہاتھ تھام لیا۔ ''میاں اور بیوی گاڑی کے دو پہیے ہیں اور دونوں کو ایک دوسرے کا احترام کرنا چاہیے۔'' مسز چنگیزی کی آخری سرگوشی انسپکٹر عمران نے سنی اور پھر ہٹ گیا۔

انسپکٹر عمران سورج خان کے فارم میں وسطی مقام پر واقع شکاری کیبن میں رہائش اختیار کرچکا تھا۔ کیبن کے سامنے سے ایک راستہ کھلے جنگلی علاقے کی طرف نکلتا تھا۔ سورج خان اور اس کے دوست کیبن میں کھانے پینے اور پروگرام مرتب کرنے کے بعد شکار کے لیے نکل جایا کرتے تھے۔ انسپکٹر عمران نے یہاں اپنی ناقدانہ نگاہوں سے گاہے گاہے ایسے آثار دیکھے تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہاں شراب نوشی' سگریٹ نوشی' تاش کے کھیل اور عیاشی بھی ہوتی رہی ہے۔

انسپکٹر عمران نے کیبن میں آکر لباس بدلا' غسل کیا اور پھر کیبن سے باہر نکل کر عمارت کی طرف چلنے لگا۔ وہ دونوں میاں بیوی سے تفتیش کی غرض سے عمارت کے کسی بھی حصے میں مداخلت کی اجازت حاصل کرچکا تھا۔ عقبی برآمدے سے اندر کاریڈور میں داخل ہوکر مختلف مقامات سے گزر کر وہ سورج خان کے بیڈ روم میں داخل ہوا۔

سورج خان اس وقت عمارت سے باہر جاچکا تھا۔ اس کی لمبی کار شہر کی طرف جانے والے راستے پر گامزن تھی۔ اسے اسرار سے اطلاع مل چکی تھی جسے انسپکٹر عمران نے اس پر نگاہ رکھنے پر مامور کیا تھا' کرن اس وقت اپنے بیڈ روم میں آرام کررہی تھی۔ نوکر بھی اپنے اپنے کاموں میں مگن تھے۔

انسپکٹر عمران نے سورج خان کے کمرے پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی' کمرہ ہر لحاظ سے خوبصورت اور جاذب نظر تھا۔ انسپکٹر عمران کے قدم جوتوں کے ریک کی طرف اٹھنے لگے۔ اس نے تیزی سے سورج خان کے تمام جوتے ریک سے نکال کر فرش پر پھیلا دیئے۔ جوتوں کے سائز کا جائزہ لیا' ڈائری میں درج شدہ اندراج نو انچ لمبائی اور مناسب چوڑائی پر مشتمل تھا۔ یہ تمام جوتے بھی نو انچ سائز کے تھے لیکن یہ تو اتفاق بھی ہوسکتا تھا' اکثر لوگوں کے جوتوں کا سائز تقریباً نو انچ ہی ہوتا ہے لیکن جو نشانات کیچڑ پر موجود تھے ان نشانات کی بناوٹ (ڈیزائن) والا کوئی جوتا سورج خان کے ریک میں موجود نہیں تھا۔

اچانک ہلکی سی آہٹ سنائی دی' انسپکٹر عمران نے چونک کر مڑتے ہوئے دروازے اور کھڑکی کی طرف دیکھا' اس کی چھٹی حس بیدار ہوگئی' وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکا باہر نکلا تو راہداری سنسان پڑی تھی وہ سمجھ چکا تھا کہ کوئی باہر سے اس کی حرکات دیکھ رہا تھا۔

ایک نوجوان لڑکی نے واش روم میں آکر موبائل آن کیا اور انسپکٹر عمران کی کارروائی سے کسی کو آگاہ کرنے لگی۔

رات کے وقت انسپکٹر عمران کیبن میں موجود تھا اس کے سامنے میز پر اس کے دونوں موبائل اور ایک وائرلیس سیٹ رکھا ہوا تھا۔ سورج خان کے ٹھوکر نیاز بیگ بازار میں واقع ہوٹل کے قریب بھی سادہ لباس والے مقرر کردیئے گئے تھے' پولیس کے دو نوجوان ملازم لڑکے چنگیزی کی نگرانی پر بھی مامور تھے' دونوں کی نقل وحرکت کی رپورٹ اسے وقفے وقفے سے موصول ہورہی تھی۔ سردی کا موسم تھا کیبن کا دروازہ اور کھڑکیاں بند کردی گئی تھیں۔ انسپکٹر عمران کبھی کبھی صوفے

سے اٹھ کر کیبن میں ٹہلتے ہوئے کیس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگتا۔ آتش دان میں مالی آگ سلگا گیا تھا اس لیے کمرے کا ماحول گرم تھا۔ مطلع ابر آلود تھا اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے شائیں شائیں کا شور مچاتے ہوئے کھڑکیوں سے ٹکراتے تو خاموشی کی روح لرز جاتی۔ رات کے دو بجے انسپکٹر عمران کو صوفے پر بیٹھے بیٹھے ہی اونگھ آگئی۔ چائے کا تھرماس اور خالی کپ اس کے سامنے میز پر پڑے تھے' ایش ٹرے میں سگریٹ کے کئی ٹکڑے تھے۔ وہ کیس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتا ہوا سو گیا۔

اچانک کمرے کا درجہ حرارت بڑھنے لگا۔ انسپکٹر عمران کھانستا ہوا کچی نیند سے بیدار ہوگیا جب اس نے کمرے کی کھڑکیوں پر نگاہ ڈالی تو ایک خوفناک منظر دکھائی دیا وہ پسینے میں نہایا ہوا تھا' باہر آگ کے شعلے بھیانک رقص کررہے تھے' کیبن بری طرح آگ کی زد میں تھا' کمرے کا درجہ حرارت لحہ بہ لحہ بڑھنے لگا۔ انسپکٹر عمران بھاگ کر دروازے کے قریب پہنچا لیکن دروازہ عین اس لمحے دھڑام سے خاکستر ہوکر اندر آگرا' انسپکٹر عمران کو تیزی سے ایک طرف ہٹ کر بچنا پڑا۔ باہر آگ کا سیلاب سا بہہ رہا تھا۔ وہ باہر نہیں کود سکتا تھا۔ اب انسپکٹر عمران کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ کیبن کے اردگرد خشک گھاس اور جھاڑیاں کثرت سے موجود ہیں' کسی نے دانستہ آگ بھڑکائی ہے یا کسی کی غلطی سے خشک جھاڑیوں اور گھاس پھونس نے آگ پکڑی ہے۔ انسپکٹر عمران نے بھاگ کر میز سے موبائل اٹھا کر سارجنٹ فرحان' اسرار اور رؤف کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ پسینے میں تربتر ہوچکا تھا اور تپش بھی اب کافی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ تینوں خود ہی آگ کا سیلاب دیکھ کر اس طرف بھاگتے ہوئے آنے لگے۔ فائر بریگیڈ کے عملے کو فون کردیا گیا لیکن وہ فوراً کیسے آسکتے تھے۔

عین اسی وقت خدا کی قدرت جوش میں آگئی اور آسمان پر پھیلے بادل موسلا دھار بارش کی صورت میں برسے اور آگ دیکھتے ہی دیکھتے بجھتی چلی گئی۔ موقع پاتے ہی انسپکٹر عمران نے وائرلیس اور موبائل اٹھا کر دروازے سے باہر چھلانگ لگادی۔ آگ کے کچھ شعلے کمرے کے اندر داخل ہوکر پھیلنے لگے تھے۔ انسپکٹر عمران کے کپڑے کہیں کہیں سے جھلس گئے لیکن وہ موت کے منہ سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ انسپکٹر عمران نے ماحول پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی' کچھ دور اسے ایک سیاہ سایہ بھاگتا ہوا دکھائی دیا جو سرسبز پودوں اور خودرو جھاڑیوں سے گزرتا ہوا عمارت کی طرف دوڑا چلا جارہا تھا۔ انسپکٹر عمران پوری قوت سے بھاگنے لگا اور بھاگتے بھاگتے چھوٹے موٹے پودے کچلتے ہوئے اس نے عمارت کے عقبی حصے کے سامنے اس سیاہ سائے کو جالیا۔ سایہ مڑا اور پھٹی پھٹی نظروں سے انسپکٹر عمران کو دیکھنے لگا۔ انسپکٹر عمران نے اس کا سرتاپا جائزہ لیا یہ ایک خوبصورت نوجوان اور پھرتیلی لڑکی تھی' حسن وشباب کا حسین پیکر۔

''آپ......آپ......شاید مالی یونس کی لڑکی ہیں۔'' انسپکٹر عمران نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''ہاں جناب آپ کا خیال ٹھیک ہے میرے اندازے کے مطابق آپ ہی انسپکٹر عمران ہیں۔''

''آپ کا خیال درست ہے ابھی ابھی مجھے کیبن میں زندہ جلانے کی کوشش کی گئی ہے اور آپ اس مقام سے بھاگ کر اس طرف آرہی ہیں کیوں جبکہ آپ کی رہائش مالیوں کے عمارتی حصے میں ہے۔'' انسپکٹر عمران نے انگلی سے دور کے منظر کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا لہجہ سخت اور درشت تھا۔ لڑکی ساکت سی ہوگئی۔ اس کی آنکھیں جھک گئیں' پھر کچھ لمحے بعد اس کے لب حرکت میں آئے۔

''انسپکٹر صاحب میں چاند کی یاد میں دیوانی ہوکر اب راتوں کو باغیچے میں گھومتی رہتی ہوں۔ میں نے دور سے ایک سیاہ سائے کو کیبن کے اردگرد منڈلا کر بھاگتے دیکھا تھا' اس وقت تک آگ کے شعلے بلند ہوچکے تھے جن کو میں خوف اور سراسیمگی سے دیکھ رہی تھی۔ میں ایتھلیٹ ہوں' کھیلوں میں حصہ لیتی ہوں' تیز بھاگ سکتی ہوں' پھر فطرتاً دلیری بھی مجھ میں موجود ہے۔ اس پر مستزاد جاسوسی کہانیاں بھی ڈائجسٹوں میں پڑھنے کی شوقین ہوں' میں آپ ہی کے مجرم کو پکڑنے کے لیے بھاگی تھی۔'' لڑکی لمبی وضاحت کے بعد خاموش ہوکر انسپکٹر عمران کو بغور دیکھنے لگی۔ انسپکٹر عمران بھی اس کی گفتگو کے دوران مسلسل اس کے بشرے کی کیفیتوں کا جائزہ لے کر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ لڑکی شمع سچ بول رہی ہے بناوٹ کا شائبہ تک نہیں محسوس ہوتا۔

''آپ دونوں کی شادی ہونے والی تھی' یعنی چاند خان اور آپ کی۔'' انسپکٹر عمران نے استفسار کیا۔

"ہاں انسپکٹر صاحب' یہ رشتہ مالکن کرن صاحبہ نے میرے والد صاحب کے ساتھ طے کیا تا۔ لیکن کسی سنگدل درندے نے چاند خان کو مار ڈالا کاش میں اس حرامزادے کی بوٹی بوٹی الگ کر سکتی۔" لڑکی کے چہرے پر جوش غصے اور اضمحلال کے آثار تھے۔ اس کا خوبصورت چہرہ بگڑ کر خوفناک سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس وقت سارجنٹ فرحان رؤف اور اسرار قریب آ کر انسپکٹر عمران کو زندہ سلامت دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھے اور آگے بڑھ کر لپٹ گئے۔

"اس کی ذات سب سے بڑی ہے۔" انسپکٹر عمران نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ ورنہ قاتل نے بڑی چالاکی سے موت کا جال پھیلایا تھا۔"

صبح کے وقت انسپکٹر عمران کرن کے بیڈ روم میں موجود تھا۔ اسے رات ہی کو سورج خان نے عقبی برآمدے کے پاس ایک کمرہ رہائش کے لیے دے دیا تھا۔ اس نے افسوس کا اظہار بھی کیا کہ آپ پر شاید قاتلانہ وار کیا گیا ہے لیکن ممکن ہے کسی مالی وغیرہ کی غفلت سے آگ بھڑک اٹھی ہو۔

مسز کرن کی طبیعت کچھ بگڑ گئی تھی۔ سر کے زخم میں تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر باقر رضوی ان کے پاس موجود تھا۔ وہ گولیاں نگل چکی تھیں۔ ڈاکٹر انہیں اپنے ذہن اور اعصاب کو پرسکون رکھنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ سورج خان نے بھی ڈاکٹر کی تائید میں کرن کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ ہونے والی بات ہو چکی اب چاند کا غم چھوڑ دے آخر وہ ......" اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا لیکن کرن کا چہرہ اس بات کا غماز تھا کہ وہ چاند کے غم سے پیچھا نہیں چھڑا سکی۔ اب ڈاکٹر باقر نے کرن کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ "بیٹی یقین کرو مجھے بھی اس کی موت کا افسوس ہے مگر اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب آپ اسے اچھا سمجھتے تھے یا برا؟" اچانک کرن نے تیز لہجے میں سوال کیا۔

"میں ...... میں ...... اسے" ڈاکٹر گڑبڑا سا گیا۔ انسپکٹر عمران چونک اٹھا یہ ایک نئی صورت حال تھی۔

"وہ ...... وہ ...... دراصل ...... میری بیوی اور ......" ڈاکٹر پھر ہکلا کر خاموش ہو گیا۔

"ڈاکٹر کھل کر بتائیے' وہ آپ کو کیسا لگتا تھا۔" کرن نے پھر سوال دہرایا۔

"ہاں ڈاکٹر صاحب بتائیے آخر ہرج کیا ہے۔" انسپکٹر عمران نے اپنی تیز نگاہیں ڈاکٹر کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"وہ دراصل بات یہ ہے" ڈاکٹر نے تھکے تھکے لہجے میں کہنا شروع کیا لمحہ بھر کو رکا پھر بولا۔

"وہ لڑکا خوبصورت' حسین' فرمانبردار تھا لیکن وہ عورتوں کے لیے فتنہ تھا' میری بیوی اور کرن صاحبہ آپس میں سہیلیاں ہیں۔ میری بیوی نیلم نے اسے کرن کے پاس دیکھا تو بہانے بہانے سے اس سے سودا سلف منگوانے کے لیے گھر بلوانے لگی۔ مجھے اس کی یہ حرکت ناگوار گزری۔ میں نے اسے منع کیا جھاڑا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا پھر مجھے غصہ تو بہت آیا مگر میں غصہ پی گیا۔

"آپ غصہ پی گئے شاید نہیں۔" کرن نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "چاند نے مجھے بتایا تھا کہ ایک مرتبہ ڈاکٹر کے گھر سے واپس لوٹتے وقت رائفل کی دو گولیاں اس کے دائیں بائیں سے گزری تھیں اور ڈاکٹر باقر صاحب آپ کے کمرے میں رائفل لٹکتی تو میں خود دیکھ چکی ہوں۔ چاند کو میں مروتاً اپنی سہیلی نیلم کی مدد کے لیے بھیجا کرتی تھی لیکن آپ ...... آپ ......" کرن کا چہرہ سرخ اور درشت سا ہو گیا۔ ڈاکٹر کمرے سے نکل گیا۔ انسپکٹر عمران کیس کی اس نئی کڑی پر غور کرنے لگا۔ پھر اس نے تیزی سے باہر نکل کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے ڈاکٹر کو کندھے پر ہاتھ رکھ کر روک لیا۔

"ڈاکٹر صاحب ذرا رکیے۔" ڈاکٹر چونک کر ناگواری سے انسپکٹر عمران کو دیکھنے لگا۔

"انسپکٹر صاحب آپ بھی اس وہمی عورت کی باتوں میں آ گئے۔ میرا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں۔"

"آپ نے رائفل سے چاند کی طرف فائر کیے تھے یا نہیں۔" انسپکٹر عمران نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"ہاں غصے کے عالم میں ایسا ہوا تھا لیکن میں صرف اسے ڈرانا' خوفزدہ کرنا چاہتا تھا' میں نے جان بوجھ کر گولیاں اس کے ادھر ادھر سے گزاری تھیں ورنہ میں چاہتا تو ایک ہی گولی ......" ڈاکٹر نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
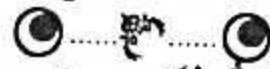
یونس مالی کی لڑکی شمع انسپکٹر عمران کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ "کوئی خاص بات؟" انسپکٹر عمران نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں انسپکٹر صاحب ایک خاص بات تو میں آپ کو بتانا بھول ہی گئی تھی جیسے ہی مجھے اس کا خیال آیا میں اپنے گھر سے نکلی اور آپ کو ادھر ادھر تلاش کرنے کے بعد اب آپ کو ڈھونڈ نکالا ہے۔"

"فرمایئے۔" انسپکٹر عمران نے مسکراتے ہوئے سگریٹ کو راکھ دان میں مسل کر بجھا دیا۔

"انسپکٹر صاحب! چاند خان کا ایک رقیب رحمت مالی کا لڑکا بھی ہے۔ جو چاند سے حسد اور بغض رکھتا تھا۔ چاند کا اور میرا ملنا اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ اس نے مجھ پر ڈورے ڈالنے کی بہت کوشش کی لیکن میں نے' کمینے کو بری طرح دھتکار دیا تھا۔ کہاں وہ زمین کا چاند اور کہاں یہ کالا کلوٹا کوارا جو چاند کے مقابل تو توا ہی معلوم ہوتا تھا۔ میرے دھتکارنے کے بعد وہ مجھ سے دور دور ہی رہتا تھا لیکن اس کے دل میں چاند خان کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ دو بار جان بوجھ کر اس سے الجھ چکا تھا۔ وہ الگ بات ہے کہ چاند کے گھونسوں نے اسے ادھ موا کر دیا اور وہ دو دن گھر سے باہر نہیں نکل سکا تھا۔ پھر وہ صرف چاند خان کو دور سے ہی غصے اور نفرت سے گھور کر رہ جاتا تھا۔ انسپکٹر صاحب آپ نامور سراغ رساں ہیں اس لڑکے کو بھی شامل تفتیش کریں شاید کیس آگے بڑھنے میں کچھ مدد مل سکے۔" شمع نے رحمت مالی کے سیاہ فام لڑکے راجو پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر اس کے متعلق نفرت کے آثار تھے۔

"شکریہ آپ نے مجھے ایک اور رقیب سے آگاہ کیا ہم ضرور اسے بھی چیک کریں گے۔" انسپکٹر عمران نے پراخلاق لہجے میں کہا اور پھر موبائل کی بیل بجنے پر فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

پری پیکر شمع جس کے چہرے پر نقرئی چمک اور شمع جیسی آب و تاب دکھائی دیتی تھی' جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور سلام کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔
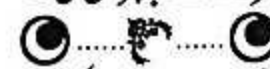
چنگیزی صبح کی سیر کرتا ہوا آج دور نکل آیا تھا۔ ڈاکٹر نے دل کے امراض اور جسم کے مائل بہ موٹاپا ہونے کی وجہ سے سیر کو اس کے لیے ناگزیر قرار دیا تھا۔ صبح کا موسم خوشگوار تھا وہ سبز سبز جھاڑیوں' پھولوں کے تختوں اور چھوٹی سی نہر پر بنے پل سے گزرتا ہوا دور نکلتا چلا آیا تھا۔ کچھ دور ایک تالاب میں سفید سفید بطخیں تیرتی ہوئی خوشنما منظر پیش کر رہی تھیں۔ دو بڑی جسامت والی بطخیں تالاب کے کنارے ایک بڑے سی جنگلی مرغی پر جھپٹ رہی تھیں' چنگیزی اس نظارے سے لطف اندوز ہوا' ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جن میں جنگلی پھولوں کی باس ملی ہوئی تھی' اس کی سانس کے راستے روح تک میں اترتے چلے گئے۔ وہ پرندوں کی چہچہاہٹ سے لطف اندوز ہو کر کچھ سوچتے ہوئے سورج خان کے فارم سے ملے ہوئے پرانے قبرستان کی حدود میں چلا آیا۔ یہاں اس کی والدہ مرحومہ کی پختہ قبر موجود تھی۔ قبرستان زرعی فارم بننے سے کافی عرصہ پہلے ہی یہاں موجود تھا۔ یہاں لکڑی کے چکور ٹکڑے گاڑھ کر خاردار تاریں لگا دی گئی تھیں۔ گورکن وغیرہ اس وسیع قبرستان کے دوسرے سرے پر واقع کوارٹرز میں رہائش پذیر تھے۔

چنگیزی صبح کی سیر کے بعد کبھی کبھی اپنی والدہ کی قبر پر حاضری دیا کرتا تھا۔ آج بھی وہ حسب معمول پھول قبرستان کے باہر ایک پودے سے نوچ کر لے آیا تھا۔ وہ والدہ کی پختہ قبر پر جھکا ہوا کچھ غمگین اور افسردہ سا تھا۔ فاتحہ پڑھی' دعا مانگی' پھول قبر پر پھیلائے اس وقت اس کی گھومتی ہوئی نگاہ قریب ہی نئی بننے والی قبر پر جم کر رہ گئی۔ جس کو بڑے خوبصورت انداز میں عمدہ ٹائلوں سے پختہ کیا گیا تھا اور قبر پر رنگ رنگ کے بہت سے پھول چادر کی صورت میں بکھرے ہوئے تھے۔ سرخ سرخ پھول دیکھ کر چنگیزی کے دل میں آگ سی لگ گئی۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے قبر کے سرہانے لگی خوبصورت سنگ مرمر کی تختی کو دیکھنے لگا۔ جیسے اس کی نظر کسی سانپ پر گئی ہو' وہ غصے سے سرخ سا ہو گیا' پھر آگے بڑھا' قبر کی تختی پر چاند خان کا نام لکھا دیکھ کر وہ طیش سے بڑبڑاتا ہوا قبر کے قریب چلا گیا۔

"کیسی وی آئی پی قبر بنی ہے سالے کی' عورتوں کا عاشق تھا۔ اچھا ہوا اس سے جان چھوٹ گئی۔ یہ میری بیوی کو ورغلا رہا تھا اور وہ میرے سامنے اسے بھائی سے مشابہ کہہ رہی ہے۔" وہ زہر خند لہجے میں کہہ کر قبر پر تھوکتے ہوئے واپس مڑا۔ عین اس وقت سامنے قریبی درخت کی آڑ سے نکل کر انسپکٹر عمران سگار پیتا ہوا باوقار انداز سے چلتا ہوا اس کے

مقابل آ کر رک گیا۔ پھر اس نے سرد لہجے میں چنگیزی کو گھورتے ہوئے کہا۔

"انسان کو اتنا گھٹیا اور کمینہ پن ظاہر نہیں کرنا چاہیے' کسی کی قبر پر نفرت سے تھوکنا حد درجہ گری ہوئی حرکت ہے۔"

"وہ میری بیوی کو ورغلا رہا تھا۔ میرا غصہ فطری عمل پر مشتمل ہے۔" چنگیزی نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"کیوں شک کے کانٹوں سے اپنے آپ کو لہولہان کر رہے ہو۔ اس کی خوبصورتی میں اس کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ ہر آدمی خواہ مخواہ ہی اس بے چارے کے متعلق دل میں خار رکھتا تھا۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے۔" چنگیزی نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"تم جا سکتے ہو لیکن گھر سے بھاگنے کی کوشش نہ کرنا چاند کے سب سے بڑے حریف تم ہی ہو جس نے واشگاف الفاظ میں سورج خان کو دھمکی دی تھی کہ اپنے لڑکے کو روک لیں ورنہ میرے ہاتھ سے مارا جائے گا۔" انسپکٹر عمران نے اسے جھاڑتے ہوئے کہا۔

"یہ میرے خلاف کوئی ثبوت تو نہیں' غصے میں انسان اپنے حواس اکثر کھو بیٹھتا ہے۔ میں اپنے گھر سے باہر ضرور نکلا تھا لیکن میں اپنی بکریوں کو ہانک کر گھر کے باڑے کی طرف لاتے ہوئے واپس لوٹ آیا تھا۔" چنگیزی نے صفائی پیش کی۔

"لیکن تم تالاب کی طرف بھی گئے تھے۔ آخر کیوں؟" انسپکٹر عمران نے اچانک چابک سا برسایا۔

چنگیزی ایک لمحے کے لیے لرز کر رہ گیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔ "جناب میں تالاب کی طرف بکریوں کو باڑے میں بند کرنے کے بعد اس لیے گیا تھا کہ میرا پرس کہیں گر گیا تھا میں اسے ہی ڈھونڈنے کے لیے دوبارہ ادھر نکلا تھا۔"

"لیکن تم نے یہ بات مجھ سے کیوں چھپائی' تمہاری یہ پیش قدمی ہم نے خود معلوم کی ہے۔ ایک چرواہی نے بیان دیا ہے کہ تم تالاب کی طرف جاتے ہوئے دیکھے گئے تھے اور یہ قتل کا واقعہ پیش آنے کے قریب قریب کا ہی وقت تھا۔" انسپکٹر عمران نے سخت لہجے میں کہا۔ چنگیزی ہل کر رہ گیا۔

"نہیں...... نہیں...... انسپکٹر صاحب مجھے میری مری ہوئی ماں کی قسم میں نے چاند کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔"

"ابھی تو تم جا سکتے ہو لیکن جیسے ہی ثبوت ملا تم جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہو گے۔ تمہارے سنگدل ہونے میں کیا شبہ ہے۔" چنگیزی خوف اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں آگے بڑھ گیا۔ انسپکٹر عمران نے اس کے گھر سے باہر نکلتے ہی اسے اپنی نظروں کے حصار میں لے لیا تھا۔

اب انسپکٹر عمران نے موبائل فون پر اسرار کو ہدایت کی کہ اپنی جگہ چھوڑ کر چنگیزی کے گھر کے باہر چھپ کر نگرانی شروع کر دے۔

"ویری ویل سر۔" اسرار نے ادب سے جواب دیا اور فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ انسپکٹر عمران تیز تیز قدموں سے عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔

اچانک کچھ دور انسپکٹر عمران نے رحمت مالی کے لڑکے راجو کو ایک اور نوجوان کے ساتھ پھولوں کی ایک بڑی گول کیاری کے گرد ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ اس نے کچھ سوچ کر اپنا رخ تبدیل کر لیا۔ وہ درختوں اور پودوں کی آڑ لے کر ان کی طرف بڑھنے لگا۔ دونوں اس وقت کیاری کے پاس موجود ٹیوب ویل کے حوض کے پاس کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ انسپکٹر عمران کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔ وہ بے آواز چلتا ہوا ٹیوب ویل کی عمارت کی طرف سے ہو کر قریبی دیوار کی آڑ میں آ کر رک گیا۔ یہاں سے ان دونوں کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ دونوں اس وقت سگریٹ سلگا چکے تھے اور ناگوار بو سے انسپکٹر عمران نے اندازہ لگایا کہ چرس سے بھرے ہوئے ہیں۔

"یار بس اس خطرناک انسپکٹر کے جانے کا انتظار ہے' پھر شمع کا یہ پروانہ اسے حاصل کر کے رہے گا۔" راجو نے سگریٹ کا لمبا کش کھینچتے ہوئے ساتھی لڑکے سے کہا۔

"یار تمہاری پسند ہے تو بڑی زبردست مگر وہ نہ تمہیں اچھا سمجھتی ہے نہ اس نے کبھی میری طرف اچھی نظروں سے دیکھا ہے۔" راجو کے ساتھی لڑکے نے سرد آہ بھرتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"یار رامو اب وہ رقیب چاند موت کی نیند سو چکا ہے۔ میں اسے اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کروں گا' اگر وہ رضامند نہ ہوئی تو......" راجو نے جارحانہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"تو کیا؟" رامو نے حیرت سے اس کا منہ غور سے دیکھا۔

"تو مجھے زبردستی کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ میں ہر صورت اپنے دل کا ارمان پورا کرنا چاہتا ہوں۔" راجو نے جیب سے چاقو نکال کر چومتے ہوئے کہا۔ پھر وہ کسی بڑے کی آواز سن کر کوارٹر کی طرف نکل گئے۔ انسپکٹر عمران نے جیب میں موجود چھوٹے سے جدید ٹیپ ریکارڈر میں ان کی گفتگو ریکارڈ کر لی۔ انسپکٹر عمران نے غور سے دیکھا تھا کہ راجو کا چاقو بھی بڑے سائز کا چمکدار پھل والا خنجر تھا' جس کی نوک پر خون بھی جما ہوا سیاہ نظر آ رہا تھا۔ انسپکٹر عمران کیس کی کڑیاں جوڑنے لگا۔

آج اتوار کا دن تھا اور سورج خان کی سالگرہ کی تیاری ہو رہی تھی۔ عمارت کے عقب میں واقع باغ میں شامیانے' کیٹرنگ کا سامان رنگین روشنیاں' نصب کرنے والے متعلقہ افراد اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ باغ کے ایک سرے پر شہر کے بہترین باورچی عمدہ کھانے تیار کرنے میں مصروف تھے۔

سورج خان اور ان کی بیگم کرن انتظامات کو دیکھتے ہوئے مزید ہدایات واحکامات جاری کر رہے تھے۔ خوش آمدید کا ایک خوبصورت روشنیوں سے جلنے والا بورڈ بھی منگوایا گیا تھا۔ شام چھ بجے کا وقت تھا۔ مہمانوں کی آمد سہ پہر کے وقت شروع ہو گئی تھی۔ میوزیکل گروپ بھی بلوایا گیا تھا۔ جو باغ میں ایک اسٹیج پر اپنے سریلے نغمے فضا میں بکھیر رہا تھا۔

باغ کے وسطی مقام پر لمبی میز پر چالیس پونڈ وزنی کیک ڈھکا ہوا تھا جس کے اردگرد خوشنما سانچوں میں شام ہوتے ہی موم بتیاں روشن کر دی گئی تھیں اس میز کے کنارے سنہری شیروانی اور سنہری کھسہ پہنے آنکھوں پر سنہری کمانی والی عینک لگائے سورج خان جگمگا رہا تھا۔ کرن بھی خوبصورت نارنجی لباس میں ملبوس تھی۔ سورج خان تھینک یو کہتا ہوا مہمانوں سے مسکراتا ہوا تحائف وصول کر کے انہیں نشست گاہ کی طرف بڑھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ خواتین کی بھی کافی تعداد تھی' بعض لڑکیاں سورج خان سے خاصی بے تکلفی سے ملیں' شیک ہینڈ بھی کیا۔ کرن نے انہیں ناپسندیدگی سے دیکھا۔ وہ سورج خان کی رنگین مزاجی اور آوارگی سے اچھی طرح واقف تھی۔

کچھ دور انسپکٹر عمران اور اس کے ساتھی مہمانوں اور سورج خان کے ملنے جلنے والوں پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔

خوبصورت نغموں' رنگین روشنیوں اور عورتوں کے کھنکتے قہقہوں میں سالگرہ کا کیک کٹا موم بتیاں بجھائی گئیں۔ کھانے کا دور چلا پھر مہمان رخصت ہونے لگے۔

اچانک موبائل کان سے لگائے سورج خان' کرن سے دور ہٹ کر ایک درخت کی آڑ میں چلا آیا۔ اس کے چہرے پر الجھن تشویش اور اضطراب کے ملے جلے آثار تھے۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ اسے نظروں میں رکھے ہوئے انسپکٹر عمران اس درخت کے چوڑے گول تنے کے دوسری طرف موجود ہے اور اس کی گفتگو سن رہا ہے۔ سورج خان تیز تیز چلتا ہوا باغ کے آخری سرے کی طرف چلنے لگا۔ انسپکٹر عمران اس کے تعاقب میں تھا۔

کرن اپنے گارڈ کے ساتھ رحمت مالی کے لڑکے راجو کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"مالکن آپ......" وہ ہکلایا۔ "مجھے بلایا ہوتا میں خادم غلام" وہ عجز وانکسار سے سر جھکا کر بولا۔

"وہ لمبا چاقو کہاں ہے جو اکثر تمہارے پاس رہتا ہے۔" کرن نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"وہ......وہ مالکن۔" راجو گڑبڑا سا گیا۔

"ہاں کہاں ہے وہ۔" کرن کا لہجہ کرخت تھا۔

"وہ......یہیں کہیں ہو گا مگر......"

"وہ جہاں بھی ہے نکال کر گارڈ کے حوالے کرو۔" راجو گڑبڑا کر ادھر ادھر ڈھونڈنے لگا پھر بولا۔

"مالکن کہیں رکھ کر بھول گیا ہوں لیکن ڈھونڈ کر حاضر کر دوں گا مگر کس لیے؟"

"یہ تمہیں بعد میں معلوم ہو جائے گا۔" کرن نے سپاٹ اور سرد لہجے میں کہا پھر گارڈ اس کے اشارے سے کمرے میں لمبا چاقو تلاش کرنے لگا۔ جب گارڈ نے بستر کی پرانی بیڈ شیٹ اٹھائی تو نیچے موجود تھا' جس کے چوڑے پھل پر سیاہ خون جما ہوا تھا۔ گارڈ نے رومال سے چاقو اٹھا لیا۔ کرن نے خشمگیں نگاہوں سے راجو کو گھورا۔

"مم......مم...... مالکن میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ سنا ہے کارپینٹر چنگیزی نے چاند بابو کو......"

راجو نے ڈرتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ کرن اسے گھورتی ہوئی باہر نکل آئی۔

رات کا وقت تھا اور کرن سورج خان کی ملازمہ سے دھلوائی جانے والی خوبصورت شرٹس کو سفری بیگ میں تہ کرتے ہوئے جمع کر رہی تھی۔ وہ صبح مری سیر کرنے کے لیے روانہ ہونے والے تھے۔ سورج خان نے وہاں اپنے دوست روشن خان کے ہوٹل میں ایک خوبصورت کمرا بک کروالیا تھا۔

ان کا پروگرام کل اچانک ہی بنا تھا۔ سیر و تفریح کے علاوہ ان کے پیش نظر ایک خاص مقصد بھی تھا' بے اولاد جوڑوں کا علاج کرنے والا لندن کا مشہور ڈاکٹر ولیم کیمبل مری میں آ کر ٹھہرا ہوا تھا اور اس کا دورہ مختصر تھا۔ وہ دونوں معائنے وعلاج کے لیے اس سے رجوع کرنا چاہتے تھے۔

اچانک ایک نیلے رنگ کی شرٹ کرن کے ہاتھ میں پھیل گئی۔ اس کی نگاہ شرٹ کے ٹوٹے ہوئے نیلے بٹن پر اٹک کر رہ گئی۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے گھورتی ہوئی اپنے پرس کی اندرونی جیب میں کوئی شے تلاش کرنے لگی۔ مطلوبہ شے اس کی دو انگلیوں کے درمیان سمٹ کر سامنے آ گئی۔ اسے اپنا سانس سینے میں اٹکتا محسوس ہونے لگا۔ آنکھیں حیرت' استعجاب اور خوف سے کچھ اور پھیل گئیں۔ اس نے آہستہ آہستہ چاند کی لاش کے قریب گھاس سے اٹھایا ہوا آدھا ٹوٹا ہوا بٹن' جس پر خون جما ہوا تھا اسے سورج خان کی نیلی شرٹ کے ٹوٹے ہوئے بٹن کے ساتھ ملا کر دیکھا' دونوں ٹکڑے ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے۔ اس پر زلزلے کی کیفیت طاری ہو گئی۔ چاند کا معصوم چہرہ بار بار اس کے سامنے ابھرنے لگا۔ ایک خنجر بدست ہاتھ کھینچا تانی میں اس کی شرٹ کا آدھا ٹوٹا ہوا بٹن جو ہاتھا پائی میں تالاب کے کنارے گرتا ہے' قاتل اس سے لاعلم رہتا ہے۔ ساری حقیقت کرن پر آشکار ہو گئی۔ وہ شرٹ کو پھٹی پھٹی نظروں سے گھورتی ہوئی ساکت وصامت سی ہو کر رہ گئی۔ اس کے منہ بولے بیٹے کا قاتل اس کا خاوند ہی تھا وہ الجھ کر رہ گئی کہ کیا کرے پھر اچانک اس نے پرعزم انداز سے سر کو جھٹکا دیتے ہوئے ایک فیصلہ کرلیا۔ عین اس وقت سورج خان بیرونی دروازہ کھول کر کرن کے بیڈروم میں داخل ہوا۔ کرن نے اسے ناپسندیدہ نظروں سے گھورا اور ہاتھ میں موجود شرٹ بٹن سمیت میز پر پھیلا دی۔ کرن کی آنکھوں میں نفرت اور چہرے پر غضب کے آثار دیکھ کر سورج خان چونک کر آگے بڑھا۔

"بیگم کیا بات ہے کیوں اس طرح گھور رہی ہو جیسے مجھ سے کوئی بڑا جرم سرزد ہو گیا ہے۔" سورج خان نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

"ہاں بہت بڑا جرم' بہت ہی بڑا' آپ نے میرے منہ بولے بیٹے کو حسد اور بغض کی وجہ سے قتل کر دیا۔ ازدواجی زندگی کا کانٹا سمجھ کر' حالانکہ وہ معصوم تھا' بالکل بیٹوں جیسا۔"

"کیا بک رہی ہو ہوش میں تو ہو۔" سورج خان آگے بڑھتا ہوا گرجا۔

"ادھر آؤ۔" کرن کا لہجہ زہریلا تھا۔ سورج خان کرن کی اٹھی ہوئی انگلی کے اشارے پر میز پر بچھی نیلی شرٹ کے پاس چلا آیا۔ پھر اس کی نگاہیں پھیل گئیں' خوف اور سراسیمگی بھی سمٹ آئی۔

"میں ابھی شرٹ تہہ کر کے بیگ میں رکھ رہی تھی اس شرٹ کا آدھا نیلا بٹن ٹوٹا ہوا ہے اور اس بٹن کا آدھا ٹوٹا ہوا خون آلود حصہ مجھے چاند کی لاش کے پاس گھاس میں پڑا ہوا ملا تھا۔ میں نے وہ اٹھا لیا تھا کہ میں خود قاتل کو تلاش کروں گی۔ سو میں نے آج تلاش کرلیا۔" کرن کی آواز پگھلے ہوئے سیسے کی طرح سورج خان کے کانوں میں اترتی چلی گئی۔

"تمہیں معلوم تھا کہ وہ اپنے دوست کو فارم دکھانے کے لیے سہ پہر کے وقت لانے کے لیے جا رہا ہے تم نے فلم کا پروگرام بناڈالا' ہوٹل سے واپس آئے' تم نے شاید چنگیزی کا خنجر چرا لیا تھا۔ تم نے اس خنجر سے چاند پر حملہ کیا چاند نے مقابلہ کیا اس مقابلے میں تمہاری قمیص کا کمزور بٹن آدھا ٹوٹ کر گر پڑا۔ تم چاند کو خنجر سے قتل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تم نے دستانے پہن رکھے تھے' خنجر کو تم نے ہی سامنے جھاڑیوں میں پھینک کر پولیس کو اطلاع دے دی۔ قتل کے روز تمہاری نیلی شرٹ کی گہرے رنگوں والی پٹی میں مجھے آدھا بٹن دکھائی نہیں دیا تھا پھر میں چاند کے قتل کی خبر سے نڈھال ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ ہے کل کہانی۔" کرن کی کاٹ دار آواز نے سورج کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس کا چہرہ اتر گیا' وہ بوڑھا دکھائی دینے لگا۔

"کرن...... کرن اگر ایسا ہوا بھی ہے تو اسے بھول جاؤ اور کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا' نہ دوبارہ یہ بات دہرانا' دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ وہ تمہارا ملازم تھا اور میں تمہارا شوہر

ہوں' کچھ تو خیال کرو اگر تم نے انسپکٹر کو بتایا تو بیوہ کہلاؤ گی۔" سورج خان نے منت سماجت کی۔

"نہیں میں انسپکٹر کو بتاؤں گی۔ تم میرے شوہر ہو لیکن وہ میرا بیٹا تھا' میں اپنے بیٹے کے قاتل کو معاف نہیں کرسکتی۔ نہیں معاف کرسکتی۔" کرن چلا کر بولی۔

"پھر تو تمہیں بھی چاند کے پاس جانا پڑے گا۔" سورج پھنکارتا ہوا آگے بڑھا اس نے میز پر پھلوں کی ٹرے کے پاس رکھا ہوا چاقو اٹھا لیا۔ کرن سہم کر پیچھے ہٹی۔ سورج خان دو قدم آگے بڑھا۔ اس وقت ایک بے آواز فائر ہوا اور سورج خان کے ہاتھ سے چاقو اڑ گیا۔ وہ چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کرن سنبھل کر خوش ہوئی۔ اسی وقت انسپکٹر عمران بیڈروم کے بھاری پردے کے پیچھے سے باہر نکل آیا ان کے ہاتھ میں بھرا ہوا ریوالور تھا۔ پردے کے پیچھے کھڑکی کھلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

"ہاتھ اوپر اٹھا دو۔" انسپکٹر عمران نے سورج خان کو حکم دیا۔ اس وقت کمرے میں وسل کی آواز ہوئی۔ انسپکٹر عمران نے بیرونی دروازے پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "اندر لے آؤ۔" اسرار سورج خان کی ملازمہ نجمہ کو بازو مروڑ کے اندر لے آیا۔ نجمہ بے حد غضبناک سی تھی۔ اسرار کے ساتھ رؤف بھی تھا جس کے ہاتھ میں رومال میں لپٹا ہوا ریوالور تھا۔

"سر یہ باہر سے اندر جھانک کر آپ پر فائر کرنا چاہتی تھی اور ہم نے گرفتار کرلیا۔" اسرار نے نجمہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں یہی وہ لڑکی ہے جس نے مجھے سورج خان کے کمرے میں جوتوں کی پیمائش کرتے باہر سے دیکھا تھا پھر یہ بھاگ گئی تھی۔ یہ سورج کی جاسوس ہے جو اس نے میری نگرانی پر مقرر کی تھی اور میرے کیبن کے ارد گرد آگ بھی اسی نے سورج کے کہنے پر بھڑکائی تھی۔ جس سے قدرت نے مجھے بچا لیا تھا۔ یہ دونوں آپس میں عاشق معشوق اور آشنا ہیں۔" انسپکٹر عمران کی آواز نے سورج خان کو لرزا کر رکھ دیا۔ وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگا۔

"مسز سورج صاحبہ آپ کے جذبات قانون کے متعلق قابل قدر ہیں آپ نے بھی قاتل کو بے نقاب کیا اور میں نے بھی عین موقع پر پکڑا۔ آپ کا شوہر کئی لڑکیوں کی زندگیاں تباہ کرچکا ہے' ایسی ہی ایک لڑکی نے اسے سالگرہ کے بعد باغ کے ویران حصے میں ملاقات کے لیے بلایا تھا۔ اس نے اسے کہا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ وہ اس سے شادی کرلے اس سنگدل اور ہرجائی نے انکار کر دیا۔ لڑکی نے با آواز بلند کہا کہ وہ سب کو بتادے گی کہ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ میں اس کے تعاقب میں تھا لیکن ایک سانپ کی پھنکار نے میرا راستہ روک لیا میں سانپ کا سر کچل کر قریب پہنچا تو یہ ظالم اس لڑکی کا گلا گھونٹ کر اسے ایک گڑھے میں گرا کر اوپر جھاڑیاں پھینک چکا تھا۔" انسپکٹر عمران نے سورج خان کو گھورتے ہوئے کہا۔ پھر انسپکٹر عمران کے اشارے پر ان کا ایک ماتحت ابراہیم ایک جوتا ہاتھ میں اٹھائے اندر چلا آیا۔ انسپکٹر عمران کے اشارے پر ابراہیم سورج خان کے سامنے چلا گیا۔ "یہ ہے وہ جوتا مسٹر سورج خان جو تم نے چنگیزی کا خنجر چراتے ہوئے صبح کے وقت پہن رکھا تھا جس کے نشانات کیچڑ میں بنے ہوئے ہم نے دیکھے تھے۔ تم نے احتیاطاً یہ جوتا اسٹور روم میں کاٹھ کباڑ کے اندر دبا دیا تھا۔ تم نشانات مٹانے کے لیے رک نہیں سکتے تھے اس میں دیر ہونے اور کسی کے دیکھ لیے جانے کے امکانات تھے' تم فوراً وہاں سے بھاگے تھے' چنانچہ تم نے اس سے جان چھڑالی تھی۔ لیکن ہم نے اسے بھی تلاش کرلیا۔" سورج خان کا سر جھک گیا انسپکٹر عمران نے بتایا کہ راجو بے قصور ہے وہ اپنے چاقو سے پرندے ذبح کرتا ہے۔ واردات چنگیزی کا چاقو چرا کر سورج خان نے ہی کی تھی۔ ڈاکٹر نے بھی محض چاند کو ڈرانے کے لیے فائر کیے تھے۔

سورج خان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں' اسرار اسے کمرے سے باہر لے جانے لگا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا' انسپکٹر عمران' رؤف اور ابراہیم کرن کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئے۔

کرن نے اداسی سے سر جھکا لیا۔ اس کا سورج سیاہ بادلوں کی اوٹ میں چھپ چکا تھا۔

سوشل میڈیا پر نادیہ احمد نے نئے افق 'آنچل' حجاب فین گروپ تشکیل دے رکھا ہے جس کے ممبران کی تعداد اس وقت سیکڑوں میں ہے۔ نادیہ احمد نے دوستوں اور ادارہ کے مشورے سے "ایک شعر ایک کہانی" کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا ہے جس کے تحت معروف ججز کا پینل تین مختصر افسانے منتخب کر کے ماہنامہ نئے افق کو ارسال کرتا ہے۔ اس ماہ کا شعر تھا۔

چڑھتے سورج کے بچاری ذرا سن لیں
سورج کسی سر پر کبھی سایہ نہیں کرتا

اس ماہ کے منتخب افسانے حاضر ہیں۔ تینوں افسانہ نگاروں کو اس ماہ کا نئے افق بھجوایا جا رہا ہے۔

قارئین! ان افسانوں کو پڑھ کر اپنی رائے سے ضرور آگاہ کریں۔

(پہلی پوزیشن)

صباحت رفیق

ایک شعر ایک کہانی

چڑھتے سورج کے بچاری ذرا سن لیں
سورج کسی سر پر کبھی سایہ نہیں کرتا

مغرب کی طرف پھیلی ہوئی پہاڑیوں کے اوپر سورج ڈوب رہا تھا، آفتابی گولے کا آدھا حصہ پہاڑ کی چوٹی کے نیچے جا چکا تھا، تھوڑی دیر بعد پورا سورج اُبھری ہوئی پہاڑیوں کے پیچھے ڈوب گیا، اب چاروں طرف اندھیرا چھانے لگا، سورج دھیرے دھیرے اپنا اُجالا سمیٹتا جا رہا تھا بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا ماحول گہری تاریکی میں ڈوب جائے گا مگر عین اس وقت جب یہ عمل ہو رہا تھا آسمان پر دوسری طرف ایک اور روشنی ظاہر ہونا شروع ہوئی، یہ بارھویں کا چاند تھا جو سورج کے چھپنے کے بعد اُس کی مخالف سمت سے چمکنے لگا اور کچھ دیر بعد ہر طرف چاند کی روشنی پھیل گئی'' کچھ دیر چاند کی روشنی میں رُک کے اُس کی ٹھنڈک محسوس کر کے تو دیکھو۔' ماہتاب کے طلوع ہوتے ہی اُسے اندر کی جانب قدم بڑھاتا دیکھ کے عائشہ بولیں تو وہ رُک گئی اور مڑ کے اُن کی طرف دیکھا جو ایک بازو ریلنگ پر ٹکائے نجانے کب سے اُس کے ساتھ آ کے کھڑی تھی، اُس کے متوجہ ہونے پر عائشہ نے اپنی بات جاری رکھی، 'خود غرض لوگ یہ ظاہر کرتے ہیں جیسے وہ ہمارے ہمدرد ہیں، لیکن اصل میں وہ ہمارے ہمدرد نہیں ہوتے بلکہ ہمدردی کا دکھاوا کر رہے ہوتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے سورج روشنی تو دیتا ہے لیکن سایہ نہیں دیتا اور اپنا مطلب نکل جانے کے بعد ان لوگوں کی ہمدردی بھی ایسے ختم ہو جاتی ہے جیسے سورج غروب ہوتے ہی اُس کی روشنی کا وجود یوں مٹ جاتا جیسے کبھی تھا ہی نہیں، حسن نے بھی تمہیں ایسے ہی چھوڑ دینا تھا۔' 'انہوں نے ایسے نہیں کرنا تھا' اُس نے دھیرے سے لب کشائی کرتے ہوئے اُس کی سائیڈ لینے کی کوشش کی تو عائشہ بولیں 'اچھا پہلے تو اُس نے تمہیں شادی کے خواب دکھا کے تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھی اور پھر کاروبار کے میدان میں لاکھوں کا کنٹریکٹ جیتنے کے لیے تمہاری قیمت لگا دی، وہ تو اچھا ہوا اُس ڈرائیور خان کا جس نے تمہیں بروقت آگاہ کر دیا کہ تمہیں صرف فائل پر سائن کروانے کے لیے نہیں بلکہ رات گزارنے کے لیے بھیجا جا رہا ہے، اور اگر ڈرائیور خان تمہیں آگاہ نہ کرتے اور تم اُس رات اُس کے دوست کے پاس چلی جاتیں جس نے لاکھوں کے عوض ایک رات کا سودا کیا تھا وہ تمہیں باعزت آنے دیتا؟ اور پھر اگلی صبح جب تم آتیں تو تمہیں لگتا کہ حسن تب بھی تم سے شادی کے فیصلے پر قائم رہتا؟' عائشہ نے اُسے آئینہ دکھایا تو اُس کے پاس بولنے کے لیے کچھ بھی نہ بچا، 'میری بچی میری بات مانو تو اُس کی خواہش چھوڑ دو، ریزائن پیپر سائن کر کے بھجوا دو، کہیں اور جاب کر لینا اللہ کم تنخواہ میں بھی برکت ڈال دیں گے، ایسے ہی جیسے چاند کی کم روشنی میں بھی اللہ نے ٹھنڈک رکھی ہے۔' عائشہ نے کہا تو عینی کے لبوں نے جنبش کی، 'امی میں ریزائن پیپر سائن کر دوں گی۔''

(دوسری پوزیشن)

وجیھہ سحر

ایک شعر ایک کہانی

چڑھتے سورج کے بچاری ذرا سن لیں
سورج کسی سر پر کبھی سایہ نہیں کرتا

ٹھیکیدار رب نواز نے سڑک پر بیٹھے اس بوڑھے خستہ حال فقیر پر ایک تحقیر آمیز نظر ڈالی جس کی عجیب و غریب نظروں سے اب اسے الجھن ہونے لگی تھی اور پھر سے چوہدری کے انتظار میں اضطراری انداز میں ٹہلنے لگا جو نظروں کے سامنے بڑی شان سے کھڑی ملک سرفراز کی پرشکوہ کوٹھی کے اندر گیا تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کے اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اوپر سے وہ منحوس فقیر اپنی پراسرار نگاہوں سے اسے مزید ہراساں کر رہا تھا۔

ٹھیکیدار رب نواز جدی پشتی ''چمچہ گیر'' تھا۔ جسے چوہدریوں کے منظور نظر بننے کی خاص بیماری تھی جس کے لیے اس نے ان چوہدریوں کے ایما پر ہر جائز ناجائز کام کیا اور ان کی جوتیاں سیدھی کیں۔

فی زمانہ ٹھیکیدار رب نواز چوہدری نثار کا خاص بندہ اور منظور نظر تھا اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے کو ہر وقت تیار رہتا تھا...... یہاں تک کہ چوہدری کو خوش کرنے کے لیے اس کی دیکھا دیکھی وہ ان غریب لوگوں کو بھی کیڑے

ملوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا جو چودھری نثار کی نظر میں حقیر اور ذلیل تھے...... کیونکہ چودھری کی جی حضوری میں کسی بھی قسم کی کوتاہی وہ گناہ کبیرہ سمجھتا تھا۔

''اللہ کے نام پر کچھ دے دو۔''

پریشانی سے ٹہلتا ٹھیکیدار چونک کر اس نحیف آواز پر پلٹا۔ وہی خستہ حال فقیر ٹھیکیدار کے سامنے اپنا میلا کچیلا اور نقاہت کے باعث کانپتا ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔ ٹھیکیدار کو بے اختیار کراہیت محسوس ہوئی۔

''جاؤ بابا معاف کرو۔'' اس نے لہجے میں شدید نفرت اور حقارت سمو کر اسے دھتکارا۔

''جل جائے گا، بھسم ہو جائے گا...... خاک ہو جائے گا، نہ کر۔''

اپنی تھکی ہوئی نگاہیں اس پر جمائے آسمان کی طرف انگلی اٹھائے فقیر کے تنبیہی انداز پر ٹھیکیدار چونک کر مڑا...... ایسی نفرت بھری فہمائش کے جواب میں فقیر کی ناقابلِ فہم قسم کی بکواس سن کر مستری کا دماغ گھوم گیا۔ وہ مزید کوئی دل شکن جملہ بول کر اس گندے فقیر کا دماغ درست کرنا چاہتا تھا کہ معاً اس کی نگاہ دور سے آتے چوہدری نثار اور اس کے اسلحہ بردار کارندوں پر پڑی...... وہ لپک کر ان کی طرف بڑھا اور جاتے جاتے اپنے جسم کی پوری قوت لگا کر اس فقیر کو پیچھے کی طرف دھکا دیا۔ بوڑھا فقیر جو پہلے ہی بھوک اور افلاس کے ہاتھوں نیم جاں تھا۔ اچھل کر فٹ پاتھ پر جا گرا اور وہیں پڑے کا پڑا رہ گیا اور اس سے پہلے کہ ٹھیکیدار چوہدری نثار کے قریب پہنچتا، چوہدری کے کارندے نے آگے بڑھ کے اپنی رائفل کا بٹ پوری قوت سے ٹھیکیدار کے پیٹ میں دے مارا۔ درد کی شدت سے بے حال فٹ پاتھ پر گرتا ٹھیکیدار حیرت کی زیادتی سے کراہنا بھی بھول گیا۔ تکلیف سے نڈھال ہوتے ہوئے اس نے شدید حیرت اور درد بھرے تاثرات کے ساتھ چوہدری نثار کو دیکھا تو اس کے چہرے پر موجود غیظ و غضب اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر گئے۔ ایسی نازک صورت حال اور تکلیف کے باوجود بھی سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ٹھیکیدار سمجھ گیا کہ اس کی ''وفاداری'' کا پول پر کھل چکا ہے جو اس نے کچھ عرصہ قبل چوہدری سے ایک عناد کے سلسلے میں اس کے حریف ملک سرفراز کے ساتھ نبھائی تھی اور آج اسی شک کو یقین میں بدلنے کے لیے چوہدری کی ملک سرفراز کے ساتھ میٹنگ تھی کیونکہ کچھ عرصہ کے اختلاف کے بعد وہ دونوں پھر سے آپس میں شیر و شکر ہو چکے تھے اور آج جب چوہدری نثار ٹھیکیدار کو لے کر ملک سرفراز کے ساتھ میٹنگ کرنے آ رہا تھا تو مستری کو باہر ٹہلتے ہوئے یہی خوف گھن کی طرح اندر ہی اندر کھا رہا تھا کہ اگر اس کا پول چوہدری پر آج کھل گیا تو اس کا کیا انجام ہوگا اور چونکہ اس کے دل میں چور تھا اس لیے وہ فوراً ہی چوہدری کے تیور اور اس کے غیظ کا پس منظر بھانپ گیا...... صاحب اقتدار طبقہ کا منظور نظر بننے کی بیماری آج مستری رب نواز کو کسی انجام تک پہنچانے والی تھی اس کا اندازہ وہیں فٹ پاتھ پر پڑے پڑے ہی اس کو ہو گیا۔ مفلسوں، مجبوروں اور غریبوں سے نفرت اور ایک طاقتور کی کمزوری دوسرے طاقتور کے ہاتھ میں دینے کی ''وفاداریاں'' ٹھیکیدار کو کون سے رنگ دکھانے والی تھیں، وہ وہیں پڑے پڑے سارے حساب لگا رہا تھا......

''اس سالے کو اٹھا کر گاڑی میں پھینک دو، اسے اتنی آسانی سے نہیں ماروں گا میں...... کتے کی موت مرے گا یہ کتے کی موت۔''

اپنے کارندوں سے مخاطب چوہدری نثار کی آنکھوں سے لپکتے نفرت کے شرارے ٹھیکیدار کو بھسم کیے دے رہے تھے...... اچانک وہ کراہتے ہوئے اٹھا اور لپک کر چوہدری کے قدموں میں جا گرا۔

''چوہدری صاحب مجھے معاف کر دیں...... آپ کو اللہ کا واسطہ مجھے معاف کر دے...... مجھ سے غلطی ہو گئی جو میں نے آپ سے نمک حرامی کی لیکن میں توبہ کرتا ہوں کہ دوبارہ ایسی غلطی کبھی نہیں کرونگا...... چوہدری کے قدموں میں گرا وہ بری طرح آہ و زاریاں کر رہا تھا......

''آئندہ غلطی کی نوبت تو تب آئے گی جب تو زندہ رہے گا سالے۔'' پاؤں کی ٹھوکر سے اسے دور اچھالتے ہوئے چوہدری نفرت سے پھنکارا......

''اٹھا کہ گاڑی میں ڈالو اس نمک حرام کتے کو، اس کو کیسی موت دینی ہے اس کا فیصلہ میں بعد میں کروں گا۔'' رعونت بھرے لہجے میں پھنکارتا ہوا چوہدری اپنے کارندوں سے مخاطب ہوا جو لپک کر ٹھیکیدار کی طرف بڑھے اور اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈالنے لگے...... اس کی فریادیں، آہ و بکا اور رحم کی اپیلیں سب بے کار تھیں کیونکہ معافی کا لفظ چوہدری نثار کی لغت میں تھا ہی نہیں...... ظلم و

جور کی عملی تفسیر بنا چوہدری نثار پورے کروفر کے ساتھ دوسری گاڑی میں جا بیٹھا جس کا دروازہ اس کے کارندے نے فوراً اس کے لیے کھول دیا تھا...... گاڑی چل پڑی تھی......

ٹھیکیدار کا کیا انجام ہونے والا تھا یہ بتانا غیر ضروری ہے......

فٹ پاتھ پر گرا بوڑھا فقیر ابھی تک وہیں پڑا تھا جس کی خالی خالی نظروں کا رخ اب آسمان کی جانب تھا......

(تیسری پوزیشن)

شبینہ گل

ایک شعر ایک کہانی

چڑھتے سورج کے پجاری ذرا سن لیں
سورج کسی سر پر کبھی سایہ نہیں کرتا

شاہانہ اسم بامسمی تھی۔ حسن اس کا توبہ شکن تو مادہ پرستی توبہ استغفار۔ اس کی جانچ کے پلڑے میں مادیت پرستی ہوتی اور اس کا پلڑا تب ہی اوپر اٹھا جب دوسرے پلڑے میں اویس راجپوت کی خصوصیات بھاری پڑ گئیں۔

وہ ڈگریوں اور سرٹیفکیٹس کے انبار کی مالکہ پر اعتماد لڑکی تھی سو اویس نے اسے اس ہائی پروفائل جاب کے لیے اوکے کر دیا۔ وہ کردار کی مضبوط تھی اور اویس سنجیدہ، سو ان کا شادی کرنا یقینی تھا۔

انفرادی طور پر دونوں ہی اپنی کامیابیوں اور ٹیلنٹ کی وجہ سے ملکی سطح پر مقبول تھے اور پھر اس بندھن میں بندھے تو مقبولیت کا گراف دنوں میں فلک بوس کر آیا۔ دعوتیں اور انٹرویوز میں ان کو ایک دوسرے کے لیے ٹائم شاذ ہی ملتا لیکن وہ خوش تھے، کیونکہ وہ بے حسی کی حد تک پریکٹیکل تھے۔

علیزہ نے آ کر انہیں دو سے تین کیا تو اویس کو ہوش آیا لیکن شاہانہ ہنوز مادہ پرستی کے ہنڈولے میں غرق تھی۔ اختلافات کے سمندر میں جوار بھاٹے اٹھنے لگے۔ شاہانہ مر کر دوبارہ بھی پیدا ہو جاتی تب بھی روایتی بیوی اور ماں نہیں بن سکتی تھی۔ وہ شاہانہ تھی، جھکنا نہیں جانتی تھی۔ وہ خود مختار تھی اور دنیا کو خاک برابر سمجھتی تھی سو محض دو سالوں میں ان کے راستے جدا ہو گئے۔ طلاق نہ اویس نے دی نہ اس نے مانگی، اسے کون سا دوبارہ ایسا طوق گلے میں ڈالنا تھا جو وہ طلاق کے لیے تڑپتی۔ بیٹی کو اویس نے اس پر عدم اعتماد ظاہر کر کے اپنے پاس رکھ لیا اور اس نے محض کندھے اچکا دیے۔

پھر شاہانہ نے ذاتی بزنس سیٹ کیا اور علیحدگی کے معاملے میں سکینڈلائز ہونے کے باوجود دن دگنی رات چوگنی ترقی کی، کیونکہ وہ پارس تھی لیکن پارس بہرحال پتھر ہی ہوتا ہے۔

گزرتا وقت اس کے مزاج میں پتھر بھرتا گیا اور تکبر اور تلخی کے ملاپ کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ سورج جب اپنی آب و تاب دکھا کر تپش کی آخری رمق بھی لٹا دیتا ہے تو پھر اس کا مقدر بھی غروب ہونا ہے۔ شاہانہ کی تابنا کی بھی اپنی آخری کرن لٹا چکی تھی، اس کی تپش کی تاب نہ لا کر ساتھی اسے چھوڑتے گئے پیسہ ڈوبتا گیا اس کے پجاری رستہ بدلتے گئے اور وہ مداری سے بندر بن بیٹھی۔ اسے اپنی گود کا ستھرا چاند یاد آ رہا تھا لیکن کیا وہ چاند اسے اپنی ٹھنڈک دے گا؟ یہ سوالیہ نشان لیے وہ اپنے وجود کے اس گم گشتہ ٹکڑے کے آگے ہاتھ جوڑے اشکبار کھڑی تھی۔

''میری ماں ہمیشہ کہتی تھی شانی پتر سورج چمکتا دکھتا تو بہت بھلا ہے پر اسے چھونے کی چاہ صرف وجود جلاتی ہے، اس آگ کی پرستش سے بچنا اور دیکھو میں جل گئی ہوں میں نے اپنی ماں کی نہیں مانی تھی۔''

آنکھوں میں سرد مہری لیے علیزہ بولی۔

''میرا باپ ہمیشہ کہتا تھا لیزا بیٹا چڑھتے سورج کے پجاری تو سبھی بن جاتے ہیں، تم ڈھلتے سورج سے رعنائی لے کر کندن بننا اور میں ان کی ہر بات مانتی ہوں۔''

☺

قربانی

ریاض بٹ

جاگیرداری نظام کا تعلق دیہات سے ہوتا ہے' جہاں کے لوگ سادہ دل اور محبت کرنے والے ہوتے ہیں' جو دماغ سے نہیں دل سے سوچتے ہیں لیکن یہ بھی اپنی جگہ سچ ہے کہ وہاں جنم لینے والی سازشیں بہت خطرناک اور زہریلی ہوتی ہیں اور لمحوں میں خاندان کے خاندان آگ و خون کی نذر ہو جاتے ہیں۔

ایک جاگیردار کا قیصہ' جس نے اپنی بیٹی کی محبت چھینتے ہوئے کئی زندگیاں اجاڑ دی تھیں۔

ماہ ستمبر 2015ء کے شمارے میں آپ نے میری تفتیشی کہانی تیسرا راستہ انہی صفحات پر پڑھی ہوگی' اس کہانی کا ذکر کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ اس میں دو کرداروں کا ذکر آیا تھا' کرداروں کے نام عجیب سے تھے' جی ہاں دیوانہ اور مستانہ۔ تیسرا راستہ کی کہانی سے ان کرداروں کا دور کا واسطہ بھی نہیں تھا' دلاور نے ہمیں بھٹکانے کی کوشش کی تھی۔

بہرحال کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مجھے توقع یا امید نہیں تھی کہ ان بندوں سے ملاقات بھی ہوگی۔

لیکن کچھ عرصے بعد ہی ان سے ملاقات ہوگئی اور یہ کوئی خوشگوار ملاقات نہیں تھی۔ بلکہ رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر تھا۔

دیوانے کی لاش آڑھت منڈی کے پچھلی طرف بہنے والے ایک گندے نالے میں پڑی تھی۔ نالے کے پانی کی رفتار اتنی نہیں تھی کہ لاش کو بہا کر لے جاتا۔

میں نے لاش کو باہر نکلوایا' ار باریک بینی سے اس کا جائزہ لینے لگا۔

اس کی گردن کسی تیز دھار آلے سے کاٹی گئی تھی اور میرا تجربہ یہ کہتا تھا کہ اسے مرے ہوئے کم از کم سات آٹھ گھنٹے گزر چکے ہیں۔ اس کا قتل کہیں اور ہوا تھا۔

اس وقت صبح کے نو بجے تھے۔ بازار آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ ابھی چند دکانیں ہی کھلی تھیں۔

ویسے بھی یہ سردیوں کے دن تھے۔ ماہ دسمبر شروع ہو چکا تھا۔ میرے ساتھ ہیڈ کانسٹیبل وزیر' اور سپاہی بشارت تھے۔ ہمیں ابتدائی تفتیش سے یہ پتہ چلا تھا کہ دیوانے اور مستانے کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔

ایک آڑھتی فیروز دین نے انہیں ازراہ ہمدردی اپنا ایک کمرے کا مکان دیا ہوا تھا۔ دونوں عرصہ پانچ سال سے منڈی میں محنت مزدوری کر رہے تھے۔

فیروز دین بھی اس وقت ہمارے پاس تھا۔ ضروری کاغذی کارروائی کے بعد میں نے قانون کے تقاضے پورے کرنے کے لیے لاش سپاہی بشارت کے ساتھ نزدیکی سول اسپتال میں بھیج دی۔

اس دوران ہیڈ کانسٹیبل وزیر ادھر ادھر سے معلومات اور سراغ لیتا رہا تھا۔

آڑھتی فیروز دین ہمیں اپنے دفتر میں لے گیا۔

دفتر کو اردگرد شیشے کی دیواروں سے بند کیا گیا تھا۔ سردی وہاں تک پہنچتے پہنچتے دم توڑ چکی تھی۔ رہی سہی کسر ابلے ہوئے انڈوں اور دودھ پتی نے پوری کر دی تھی۔ جو ہمارے منع کرنے کے باوجود فیروز دین نے منگوالی تھی۔

وہ ایک دبلا پتلا چھریرے بدن کا ایک خوبصورت بندہ تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں تھیں' چہرے کے خدوخال اسے ایک نرم مزاج اور ہمدرد انسان کے روپ میں پیش کر رہے تھے۔

ہاں تو...... فیروز دین صاحب' یہ دیوانہ اور مستانہ کیسے نام ہیں...... میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ نے جنم لیتے ہی دم توڑ دیا۔ لگتا تھا اسے دیوانے کی موت نے غمزدہ کر دیا ہے۔

وہ بولا۔ تھانیدار صاحب' یہ نام ہر کسی کو عجیب لگتے ہیں' دراصل یہ دونوں اپنے کام سے کام رکھنے والے بندے تھے...... اپنے حال میں مست' دل جمی سے محنت سے کام کرنے والے۔ شاید اسی لیے......" میں نے اسے آگے نہیں بولنے دیا۔ اس کی بات درمیان سے اچکتے ہوئے بولا۔ "آگے آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں' آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے تھا کا صیغہ کیوں استعمال کیا ہے۔ آپ کے خیال میں مستانے کو بھی کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے؟"

"تھانیدار صاحب' دیوانے کی لاش تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں' مستانہ بھی غائب ہے۔"

"کیا مطلب......؟" اب چونکنے کی میری باری تھی۔

"جناب' دونوں صبح صبح منڈی میں آ جاتے تھے۔ اڈے پر ایک ہوٹل میں حلوہ پوری کا ناشتہ کرتے تھے...... اور......" چند لمحے اس نے توقف کیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"سب سے پہلے میرے نوکر نے لاش دیکھی تھی' اس وقت بازار میں اکا دکا لوگ تھے۔ ہماری دکان کے پچھواڑے ہی وہ گھر ہے جس میں دونوں رہتے تھے۔ نوکر (اسلم) بھاگا بھاگا گیا' لیکن گھر کے دروازے پر پڑا ہوا تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا اور آپ نے دیکھ لیا کہ ابھی تک اس کا نام و نشان نہیں ہے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا تمام حالات وواقعات اسی طرف اشارہ کر رہے تھے۔

یہ حیرانگی اور ان کہی کہانی والی بات تھی۔

مستانہ کہاں اور کیوں منظر سے غائب ہو گیا تھا......؟

فیروز دین سے اور بھی بہت سی باتیں ہوئی تھیں لیکن ان میں کوئی بھی بات ایسی نہیں تھی جو ہمیں اس کیس میں آگے بڑھنے میں مدد دیتی۔

البتہ جو اس نے آخری بات کی' وہ تحریر کر دیتا ہوں۔

"تھانے دار صاحب' آپ میری طرف سے رپورٹ درج کریں' یہ نہ سمجھیں کہ وہ لاوارث تھا۔" آخر میں اس کی آواز بھرا سی گئی۔

میں نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔

"آپ بالکل فکر نہ کریں' میں پوری دل جمعی اور محنت سے تفتیش کروں گا پھر ہم وہاں سے اٹھ کر تھانے کی طرف

روانہ ہوگئے۔

''سر...... کیوں نہ اڈے کی طرف سے ہوکر جائیں۔'' اچانک کانسٹیبل وزیر نے کہا۔

''کیوں...... کوئی خاص بات......؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ویسے ہی سر' پھر اس طرف سے شارٹ کٹ ہے۔''

''ٹھیک ہے' بھئی' جیسے تمہاری مرضی۔'' میں نے اپنے قدموں کو اڈے کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔ کبھی کبھی ماتحتوں کی بات بھی مان لینی چاہیے لیکن میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اڈے کی طرف جانے سے ہمیں فائدہ ہوگا۔

جونہی ہم اڈے میں داخل ہوئے' کسی طرف سے دلاور نکل کر ہمارے سامنے آ گیا۔

اس نے گرم جوشی سے میرے ساتھ مصافحہ کیا اور کانسٹبل سے بھی ہاتھ ملانے کے بعد گویا ہوا۔

''تھانیدار صاحب' دیوانے کے قاتل کا کچھ پتہ چلا؟'' وہ باخبر لگتا تھا۔

''بھئی ابھی تو لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجی ہے۔ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔'' میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

''آپ تھانے پہنچیں' میں ابھی تھوڑی دیر میں تھانے میں آ رہا ہوں۔ ہماری بس خراب ہوگئی ہے' میں ذرا اس کا جائزہ لے کر آ رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

تھانے میں واپس پہنچ کر میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

سیٹ پر بیٹھ کر میں نے کاغذات سمیٹے اور میرا ذہن یہ سوچنے لگا کہ دلاور کس لیے تھانے میں آ رہا ہے' کیا وہ کوئی بات بتانا چاہتا ہے' دیوانے اور مستانے کے متعلق یا......؟

بہرحال پندرہ منٹ بعد وہ میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

یہاں ایک بات کی وضاحت کردوں' کہ بسوں کے اڈے سے تھانے کا فاصلہ فقط سات آٹھ منٹ کا تھا۔

اس نے آتے ہی گلہ کیا' تھانے دار صاحب آپ نے اڈے پر خدمت کا موقع نہیں دیا تھا۔

''بھئی' ایک تو میں فیروز دین سے چائے پی کر آ رہا تھا' دوسرے...... خیر جانے دو۔ تمہارے چہرے کے تاثرات بتا رہے ہیں کہ تم کوئی اہم بات بتانے آئے ہو۔'' میں نے اس کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ تو جادوگر لگتے ہیں۔''

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یہ رسمی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔''

''اوہ...... سوری' تھانے دار صاحب' دراصل باتیں دیوانے اور مستانے کے متعلق ہیں۔''

''کیسی باتیں؟'' میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔

''تھانے دار صاحب' یہ چھ سات دن پہلے کی بات ہے' میں نے مستانے اور دیوانے کو بشریٰ کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔''

''بشریٰ کے گھر میں'' میں نے زیرلب دہرایا۔ ''یہ بشریٰ کون ہے بھئی؟''

''بس یہ سمجھ لیں۔ کہ وہ کوئی اچھی عورت نہیں ہے۔''

''تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ کوئی اچھی عورت نہیں ہے۔'' میں نے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''تھانیدار صاحب' میں نے واقعی گناہوں سے توبہ کرلی ہے' ادھر ادھر سے بشریٰ کی اچھی رپورٹ نہیں ملی ہے۔''

''خیر اس کو بھی دیکھ لیں گے۔ تمہارے خیال میں بشریٰ کا قتل کے ساتھ کوئی تعلق ہوسکتا ہے۔'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''اس کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا' آپ کے گوش گزار کردیا ہے۔''

اس کے بعد وہ رخصت ہوگیا تھا لیکن مجھے ایک راستہ دکھا گیا تھا۔

پھر میں نے اے ایس آئی ابرار کو بلا کر بشریٰ کے متعلق بتایا تھا۔

اگلے دن لاش پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے ساتھ آ گئی۔ فیروز دین نے چار بندے بھیجے تھے۔ لاش لینے کے لیے۔ میں نے ضروری کارروائی کے بعد لاش ان کے حوالے کردی اور خود کاغذ کا وہ صفحہ کھول کر بیٹھ گیا جس پر پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر نے رپورٹ لکھی تھی۔ رپورٹ کے مطابق رات بارہ اور ایک بجے کے درمیان

دیوانے کو قتل کیا گیا تھا۔ کسی تیز دھار آلے' مثلاً لمبے پھل والی چھری یا خنجر سے گلا کاٹا گیا تھا۔

اس طرح گلا کاٹنا کسی عورت کے بس کی بات تو نہیں تھی لیکن جب تک حقیقت معلوم نہ ہوجاتی کوئی بات حتمی نہیں کہی جاسکتی تھی۔

میں نے وہ کمرہ بھی دیکھنا تھا' جس کو میں نے سیل کروادیا تھا' (یعنی جس میں دیوانہ اور مستانہ رہتے تھے)

مجھے مستانے کا غائب ہوجانا کھٹک رہا تھا۔

اس دن شام کو میں اور سپاہی انور کمرے کا جائزہ لے رہے تھے' یہ ایک بیٹھک نما کمرہ تھا۔ اٹیچ باتھ روم تھا' کمرے میں ہمیں کسی قسم کی چارپائی نظر نہیں آئی۔ زمین پر ہی بستر لگایا ہوا تھا۔ دو تکیے تھوڑے فاصلے پر پڑے ہوئے تھے۔

دو جستی صندوق بھی ایک طرف پڑے تھے۔ جن کو تالا نہیں لگا ہوا تھا۔ ایک صندوق کی میں نے جبکہ دوسرے صندوق کی تلاشی سپاہی انور نے لی۔ ان میں ہمیں کوئی ایسی ویسی چیز نہیں ملی جو ہمارے لیے مشعل راہ ہوتی۔ ان میں صرف کپڑے' اور دوسری استعمال کی چیزیں تھیں۔ میں نے کمرے کو دوبارہ سیل کروادیا۔

اس وقت ہم سفید کپڑوں میں تھے۔

پہلے میرا ارادہ یہ تھا کہ اے ایس آئی ابرار کی رپورٹ کے بعد بشریٰ کی طرف رخ کروں گا۔

لیکن اچانک میں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور ہم بشریٰ کے گھر کے دروازے پر پہنچ گئے۔

دستک کے جواب میں ایک جوان اور خوبصورت عورت نے دروازہ کھولا۔

میرے دل نے فوراً کہہ دیا کہ یہی بشریٰ ہے۔ میرا اندازہ بعد میں بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ اس نے ہمیں بیٹھک میں بٹھایا اور بولی۔

''آپ کو کسی نے بہت دیر سے بھیجا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیران نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں اب دھندہ چھوڑ چکی ہوں۔ اس لیے آپ کی کوئی خدمت نہیں کرسکتی۔''

''یہ انہونی کیسے ہوئی؟'' سپاہی نے اسے تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

نیا سال پرانے خواب

یہ ماہ وسال تو گزرتے چلے جاتے ہیں
ہم ہر نئے سال کی آمد پر یہ سوچا کریں گے
کہ شاید اب کے برس
جدائی کا یہ طویل موسم ختم ہوجائے گا
لیکن ہر گزرتے برس کی طرح موسم ہجر
اس بار بھی ہمارے دروازے پر دستک دے گا
اور ہم ہنستے آنسوؤں کے ساتھ
ایک بار پھر روتی ہوئی
بہاروں کو خوش آمدید کہیں گے

امبر گل...... جھڈو، سندھ

''یہ سب دیوانے اور مستانے کی وجہ سے ہوا ہے۔ لوگ ہمدردی جتانے تو بہت آتے رہے تھے لیکن آخر میں اپنا مطلب نکال کر چلتے بنتے تھے۔''

وہ ہمیں کوئی گاہک سمجھ رہی تھی لیکن جب ہم نے اپنا تعارف کروایا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

اچانک کمرے سے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ وہ ابھی آئی کہہ کر چلی گئی۔ واپسی پر اس کی گود میں ایک چار سالہ بچہ تھا۔

وہ اچانک میرے قدموں میں بیٹھ گئی اور بچے کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''تھانیدار صاحب' میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے جسم فروشی کا دھندہ چھوڑ دیا ہے اور......''

میں نے اپنے پاؤں پیچھے کرتے ہوئے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

''بی بی' مجھے گناہ گار نہ کرو' سامنے چارپائی پر بیٹھو اور اپنی کہانی سنادو۔''

کہانی سنانے سے پہلے وہ مجھے کمرے میں لے گئی اور ایک چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''یہ میرا شوہر ہے' ہیروئن کا مارا ہوا' کسی قابل نہیں رہا' میں نے دیکھا چارپائی پر ایک مدقوق سا مرد لیٹا ہوا ہے' پھر اس نے جو کہانی سنائی' وہ میں اپنی زبان میں سنادیتا ہوں۔

بشریٰ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کی شادی والدین کی مرضی سے ہوئی۔ ویسے اس کا بھی کوئی خاص آئیڈیل نہیں تھا۔

راشد پہلے اس طرح نہیں تھا...... ایک گھبرو جوان تھا' اور یہ لوگ گاؤں میں رہتے تھے' وہیں ان کی شادی ہوئی تھی۔ اب ان کی شادی کو تقریباً چھ سال ہوگئے تھے۔ شادی کے تقریباً دو سال بعد ان کے گھر میں بیٹے کی پیدائش ہوئی تھی۔

بیٹے کی پیدائش کے بعد میاں بیوی کی محبت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ مقصود پورے گھر کی آنکھوں کا تارا تھا۔ راشد گاؤں کے ایک بڑے جاگیردار کے گھر میں ملازم تھا۔ زمینوں اور باغوں کا سارا حساب کتاب اس کے ہاتھ میں تھا۔ زمیندار یا جاگیردار اس پر بھروسہ کرتا تھا۔

دن رات اسی طرح گزر رہے تھے کہ اچانک ان کی زندگی میں ایسا موڑ آ گیا جس نے انہیں ایک امتحان میں ڈال دیا۔

ہوا یوں کہ ایک شام راشد اپنے گھر کی طرف آ رہا تھا کہ اسے کھیتوں سے شور وغل سنائی دیا اس نے کھیتوں کی طرف دوڑ لگادی۔

اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا' اس کی آخری نارنجی کرنیں بھی دم توڑ چکی تھیں' درختوں پر پرندوں نے شور مچایا ہوا تھا۔

کھیتوں میں اس نے ایک خوفناک منظر دیکھا' جاگیردار کے خاص بندے ایک جوان کو کلہاڑیوں سے مار رہے تھے۔

راشد کے پہنچنے تک جوان کی چیخیں دم توڑ چکی تھیں۔ اس کے ٹکڑے ہو چکے تھے۔

راشد کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ ایک صلح جو بندہ تھا اور حتی الامکان لڑائی بھڑائی سے دور ہی رہتا تھا۔

اچانک جاگیردار کے بندوں کی نظر راشد پر پڑی تو وہ چونک پڑے یہ چار بندے تھے۔

راشد نے آگے بڑھنا چاہا تو انہوں نے اسے روک لیا۔ ایک نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ہمیں امید ہے تم نے جو کچھ دیکھا ہے' اسے ایک خواب سمجھ کر بھول جاؤ گے۔''

راشد نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے گھر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ رات نو بجے اسے جاگیردار نے بلا بھیجا۔

ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ ایک بار حویلی سے آنے کے بعد اسے دوبارہ بلایا گیا ہو۔

گھر والے پریشان ہوگئے۔ اس کی والدہ اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں' صرف والد زندہ تھے۔

بشریٰ نے اسے کہا' خیر ہو' مقصود کے ابا' جاگیردار نے اس وقت کیوں بلایا ہے؟''

راشد کو پتہ تھا کہ جاگیردار نے اسے کیوں بلایا ہے؟ لیکن اس نے بشریٰ کو جھوٹی تسلی دے کر بہلالیا' والد کو صرف اتنا بتایا کہ جاگیردار صاحب نے کسی کام سے بلایا ہے۔

بہرحال جب وہ جاگیردار کے سامنے گیا' تو اس نے کمرے کو خالی کروالیا اور راشد کو اپنے برابر پلنگ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''راشد! تمہیں پتہ تو لگ گیا ہوگا کہ میں نے تمہیں کیوں بلوایا ہے۔ پھر چند لمحے اس کی طرف دیکھنے کے بعد بولا۔

''میں تمہیں اپنا راز دار بنا رہا ہوں اور مجھے امید ہے کہ تم ہمیشہ کی طرح میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤ گے۔ میرے بندوں نے میرے کہنے پر توقیر کے ٹکڑے کیے ہیں۔ اس کی غلیظ نظریں حویلی کی عزت کی طرف اٹھی تھیں۔'' جاگیردار خاموش ہوگیا۔

راشد نے سر ہلا کر اسے یقین دلایا کہ ایسا ہی ہوگا۔ جاگیردار نے اسے کچھ نوٹ دیئے' اور اس کی پیٹھ پر تھپکی دے کر اسے رخصت کردیا۔

اسے پتہ تھا کہ جاگیردار کی جواں سال بیٹی شمشاد عرف شاداں کا چکر توقیر سے چل رہا ہے۔

توقیر گاؤں کے ایک کمہار کا بیٹا تھا۔ اپنا فرض سمجھتے ہوئے ایک دن راشد نے اسے سمجھایا تھا' کہ وہ آگ سے نہ کھیلے...... لیکن شاید نہیں یقیناً توقیر پر اس کے سمجھانے کا اثر نہیں ہوا تھا۔

گھر آ کر راشد گم صم رہا۔ اسے اپنی بیوی' معصوم بچے اور بوڑھے باپ کا خیال نہ ہوتا تو وہ تھانے میں جا کر صاف صاف وہ سب کچھ بتا دیتا جو اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا۔

لیکن وہ مجبور تھا اس کے پاؤں میں مجبوریوں نے زنجیر ڈال دی تھی۔

پھر اس کے کانوں تک یہ بات بھی پہنچی کہ توقیر کے باپ نے اپنے بیٹے کی گمشدگی کی رپورٹ بھی درج کروادی تھی۔ راشد دن رات پریشان رہنے لگا اور ایک دن بشریٰ کے پرزور اصرار پر اس نے ساری بات اسے بتادی۔

وہ سر سے پاؤں تک لرز گئی اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔

''مقصود کے ابا' خدا کے لیے اپنی زبان بند ہی رکھنا' یہ جاگیردار بڑا ظالم ہے۔''

بہرحال راشد نے بشریٰ سے کہا۔ ''میں زبان بند ہی رکھوں گا' صرف تمہاری خاطر' ننھے مقصود کی خاطر اور خاص طور پر اپنے بوڑھے باپ کی خاطر۔''

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ اس کے ابا کو تیز بخار ہوگیا اور اس بخار نے تین دن میں اس کی جان لے لی۔

اب راشد اور بھی پریشان ہوگیا' وہ پڑھا لکھا تھا۔ جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ زمینوں اور باغوں کا سارا حساب کتاب اس کے پاس ہی تھا۔

اپنے بزرگوار (والد) کے مرنے کے بعد اس کا دل اس گاؤں سے بالکل اچاٹ ہوگیا۔ کھیتوں والا منظر بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا اور قصہ مختصر وہ ایک رات' تاریکی کی چادر اوڑھ کر اس شہر میں آ گیا۔ یہاں اس کا ایک دوست رہتا تھا' اس نے اسے نہ صرف سر چھپانے کے لیے مکان کرائے پر لے کر دے دیا بلکہ ایک دفتر میں اسے کلرکی بھی دلادی۔ گاؤں کے ماحول سے نکل کر اس نے سب کچھ بھلانے کی کوشش شروع کردی۔

راشد کا دوست آفاق ایک غیر ملکی کمپنی میں ملازم تھا۔ اچانک اسے فرم کی طرف سے چار سال کے لیے باہر بھیج دیا گیا اور چھ ماہ کے بعد اس نے اپنے بیوی بچوں کو بھی اپنے پاس بلالیا۔

اب اس اجنبی شہر میں وہ بالکل اکیلا رہ گیا۔

یہاں بھی ایک مصیبت بشریٰ کی منتظر تھی۔ ایک دن اسے پتہ چلا کہ راشد کو ہیروئن کی لت پڑ چکی ہے۔

اس نے اسے سمجھایا' ایک دفعہ پھر اپنا اور بچے کا واسطہ دیا۔ لیکن پانی سر سے گزر چکا تھا۔ آخر راشد کو نوکری سے جواب مل گیا اور وہ گھر میں ہر وقت ہیروئن کے نشے میں دھت رہنے لگا۔ جمع پونجی خرچ ہوگئی۔ بشریٰ کا زیور بھی بک گیا اور نوبت فاقوں تک آ گئی۔

اس کی کہانی بظاہر ختم ہوگئی تھی لیکن میرے ذہن میں کچھ سوالات گردش کررہے تھے' میں نے اس کے سامنے وہ سوال رکھ دیے۔

لیجیے آپ بھی ملاحظہ کیجیے۔

''بشریٰ تم نے جسم فروشی کا دھندہ ہی کیوں شروع کیا؟''

''تھانیدار صاحب' میں نے پہلے ایک کوٹھی میں ہی ملازمت کی تھی۔ وہ صرف دو میاں بیوی تھے۔ اولاد ان کی نہیں تھی۔ میں ان کے کپڑے برتن اور فرش دھوتی تھی۔ مقصود میرے ساتھ ہی ہوتا تھا۔ مجبوری تھی۔ روزانہ تین چار گھنٹے کا کام ہوتا تھا۔ ایک دن صاحب کی بیوی اپنے ماں باپ سے ملنے گئی ہوئی تھی۔ وہ سالن پکا گئی تھی۔ صاحب نے مجھے کہا۔ بشریٰ دو روٹیاں بنا دو۔ میں نے ان کی خواہش پوری کردی۔

لیکن تھانیدار صاحب اس نے جب اپنی دوسری خواہش کا اظہار کیا تو میں نے انکار کردیا۔ میں بھرپور جوان ہوں' میرے بھی کچھ تقاضے ہیں۔ میرا خاوند بے کار ہوچکا ہے' کہتے ہیں جب پانی آگ کے قریب ہو تو خودبخود ابلنے لگتا ہے لیکن میں نے صبر کیا اور اپنے بیٹے کو اٹھا کر کمرے سے نکل آئی پیچھے صاحب کی آواز آئی۔ کل سے کام پر نہ آنا۔

مجھے یہی امید تھی۔

پھر ایک جگہ اور بھی ایسے ہی ہوا۔ تھانیدار صاحب یہ مردوں کا معاشرہ ہے۔''

''ہوں۔'' میں نے ہنکارا بھرا اور بولا۔ ''اب دیوانے اور مستانے کی کہانی ہوجائے۔''

''تھانیدار صاحب' ایک دن یہ دونوں گاہک کے روپ میں میرے گھر میں آئے' دونوں نے میرے ساتھ پیسے طے کیے اور اچانک کمرے سے میرے بچے کے رونے کی آواز آئی۔

میں نے ان کو انتظار کرنے کا کہا۔

بچہ کسی طرح چپ ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ آخر میں جھنجلا گئی اور اسے ایک تھپڑ رسید کردیا بچہ اور زور زور سے رونے لگا۔ میں نے دیکھا' میرا شوہر ٹس سے مس نہیں ہوا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ دیوانہ میرے پیچھے آ کھڑا ہوا ہے۔ میں نے اسے ذرا غصے سے کہا۔

'تم باہر بیٹھو میں آرہی ہوں۔ مرے کیوں جارہے ہو؟'

وہ بولا۔ ''تم ذرا بچے کو لے کر باہر آؤ۔'' نہ جانے اس کے لہجے میں کیا تھا کہ میں بچے کو لے کر باہر آگئی۔ میں نے دیکھا کہ مستانہ بھی دوسرے کمرے میں آچکا ہے' پہلے وہ برآمدے میں تھا۔

''بیٹھ جاؤ......'' انہوں نے مجھے چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور خود میرے سامنے کھڑے ہوگئے۔

''دیکھو۔'' دیوانہ بولا۔ ''ہم نے آنکھوں کے ترازو میں تول کر تمہارے حالات کا وزن کرلیا ہے۔ تمہاری مجبوریاں ہم پر عیاں ہوچکی ہیں۔ جو پیسے ہم نے تمہیں دیے ہیں' وہ رکھ لو...... میں نے اسے آگے نہیں بولنے دیا اور تڑ سے بولی۔ ''تم پیسے لے لو' اور کل آجانا' میں ایسے پیسے نہیں رکھتی۔''

''پہلے پوری بات سنو......'' وہ ذرا غصے سے بولا۔

''ایک تو تم' عورتوں کے پلے بات ہی نہیں پڑتی۔ ہم کوئی عیاش نہیں ہیں' ہمارا آگے پیچھے تو ہے کوئی نہیں' کبھی کبھی دل پشوری کرنے کے لیے بازار میں چلے جاتے تھے' تمہارا سنا' تو تمہارے پاس آگئے لیکن ہمارے دل نے کہا کہ یہ مجبور اور دکھی عورت ہے اس کی مجبوری کو نہیں خریدنا چاہیے۔ آج سے تمہارا خرچہ ہم اٹھائیں گے۔ تماش بین بن کر نہیں' بلکہ بھائی بن کر۔''

میری آنکھیں جھک گئیں۔ میری زبان گنگ ہوگئی اور بے اختیار اپنے بچے کو سینے سے لگا کر رونے لگ گئی۔

انہوں نے بیک وقت میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ہم اپنا قول نبھا کر دکھائیں گے۔ تم ہمارے ساتھ خدا کو حاضر ناظر جان کر وعدہ کرو کہ آئندہ کسی تماش بین کے قدم تمہاری دہلیز تک نہیں بڑھیں گے۔ میں نے وعدہ کرلیا' مجھے صرف سہارے کی ضرورت تھی' میرے من میں گندگی نہیں تھی۔

''اچھا...... اب آخری سوال' تم نے اپنے آپ کو گناہوں سے نکال لیا ہے' پھر تم نے ہمیں اندر کیوں آنے دیا۔ جب کہ تمہیں پتہ نہیں تھا کہ ہم کون ہیں؟''

وہ بولی۔ ''تھانیدار صاحب' یہ دنیا بڑی ظالم ہے' مجھے پتہ ہے لوگ یہی کہیں گے کہ سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی' لیکن میں نے آپ لوگوں کو صرف اس لیے بلایا کہ گلی میں

تماشہ نہ لگے۔'' وہ کچھ باتیں فالتو کرگئی تھی' بہرحال میں نے ان کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

''اس طرح کب تک چلے گا۔ تماش بین تمہارا جینا حرام کردیں گے۔''

''تھانیدار صاحب' میری خوش قسمتی بن کر آپ آ ہی گئے ہیں تو مجھے ایک بے سہارا بہن سمجھ کر میرے مسئلے کا حل نکال دیں۔'' میں واقعی صحیح وقت پر آیا تھا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے یقین دلایا کہ آج سے تم میری بہن ہو اور میں جلد ہی تمہارے مسئلے کا حل نکالوں گا۔

وہ مجھے دعائیں دینے لگی۔ قارئین ایسے لوگوں کی دعائیں ہی میری ساری سروس کا سرمایہ اور کمائی ہے اور آج تک سنبھالے ہوئے ہیں۔ بقول شاعر

نہ جانے کون دعاؤں میں یاد رکھتا ہے
میں ڈوبنے لگتا ہوں سمندر اچھال دیتا ہے

ہم تھانے میں واپس آگئے' آج بہت مصروف دن گزرا تھا۔ میں نے اپنی کرسی سنبھالتے ہی اے ایس آئی ابرار کو بلالیا اور ساری صورت حال اس کے سامنے رکھ دی۔

''سر' میرے خیال میں کانسٹیبل وزیر ہمارے لیے مفید ثابت ہوسکتا ہے۔''

''بالکل' تم نے میرے منہ کی بات چھین لی ہے۔'' میں نے اس کی تعریف کی۔ پھر کانسٹیبل وزیر اور اس کی بیوی کی مدد سے ہم نے بشریٰ اس کے بچے اور خاوند کو ایک اور مکان لے دیا...... جو ان کے گھر کے بالکل قریب تھا۔ یہ ہم سب کی خوش قسمتی تھی کہ یہ سب کچھ حسب منشا ہوگیا تھا۔

پھر اگلا مرحلہ بھی طے ہوگیا۔ کانسٹیبل وزیر کی بیوی نے بشریٰ کو ایک اچھے اور شریف گھرانے میں ملازمت دلادی اور اسے بڑے طریقے سے بتادیا کہ دیوانہ قتل ہوچکا ہے اور مستانہ غائب ہے۔

کانسٹیبل کی بیوی نے بتایا کہ وہ بہت روئی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ تھانیدار بھائی کو اس دکھیا بہن کا پیغام اور عرض پہنچادیں کہ قاتل ضرور گرفتار ہونا چاہیے اور مستانے کا سراغ بھی لگائیں۔ وہ دونوں مجھے روشنی اور صراط مستقیم کا راستہ دکھانے والے ہیں۔

اب ان میں ایک تو 'تھا' ہوگیا تھا' نہیں رہا تھا یعنی قتل ہوگیا تھا۔ بہرحال میں بھولا نہیں تھا۔ مجھے اپنی ڈیوٹی اور فرض یاد تھا۔ میرا ذہن بہت دور تک سوچ رہا تھا۔ دور کہیں ایک نقطے پر مرکوز ہوچکا تھا۔

اب بشریٰ اور اس کا خاندان گویا قانون کی چھتری کے نیچے آ گیا تھا۔

یہ بھی ہوسکتا تھا کہ کسی کو بشریٰ کا دھندہ چھوڑنا گراں گزرا ہو اور اس نے جھلا کر دیوانے کو قتل کردیا ہو...... لیکن پھر یہ سوال پھن اٹھا کر سامنے آ کھڑا ہوتا تھا کہ مستانہ کہاں گیا؟ اس کے ساتھ کیا حالات پیش آئے۔ اگلے دن صبح ہی صبح فیروز دین آڑھتی میرے پاس آیا۔

میں نے اسے عزت سے بٹھایا اور سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''تھانیدار صاحب' کچھ پتہ چلا؟'' وہ میری سوالیہ نگاہوں کے جواب میں بولا۔

''دیکھیں فیروز دین صاحب' حالات مجھے عجیب گورکھ دھندے میں لے آئے ہیں' پھر میں نے اب تک کے سارے حالات اس کے گوش گزار کردیے۔

''تھانیدار صاحب یقین کریں' بازار کی ساری رونق ہی ان دونوں کے ساتھ رخصت ہوگئی ہے۔ مجھے بھی یہ محسوس ہورہا ہے' جیسے کسی تماش بین نے دونوں کو قتل کردیا ہے اور مستانے کی لاش کہیں دور جاکر دبادی ہے۔''

وہ دور کی کوڑی لایا تھا۔ ایسا ہونا ممکن تو تھا لیکن مقصد ابھی تک سامنے نہیں آیا تھا۔ بہرحال اس پر بھی سوچا جاسکتا تھا۔

فیروز دین کے ساتھ اور بھی باتیں ہوئی تھیں۔ پھر وہ رخصت ہوگیا تھا۔ وہ واقعی دونوں کے لیے غمزدہ اور پریشان لگتا تھا۔ دس بجے کے قریب اے ایس آئی ابرار میرے سامنے بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا۔ اس سے پہلے میں اسے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کرچکا تھا۔

''سر فیروز دین کی بات میں وزن تو ہے لیکن بات وہی آجاتی ہے کہ......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اس لیکن کے پیچھے جو کہانی ہے وہی تو ہمیں معلوم کرنی ہے۔'' میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''سر...... میرے ذہن میں ایک اسکیم آئی ہے۔''

پھر اس نے مجھے اپنی اسکیم سے آگاہ کیا تھا۔

یہاں ایک بات میں آپ کے گوش گزار کردوں کہ میں

نے اے ایس آئی شاہد کو جاگیردار کے گاؤں کے متعلقہ تھانے میں بھیجا ہوا تھا۔ اس نے رازداری سے سب حالات معلوم کرنے تھے۔ میں بڑی احتیاط اور خفیہ طریقے سے توقیر کے قاتلوں تک وہاں کی پولیس کو پہنچانا چاہتا تھا' مجھے توقع یہی تھی کہ شاید ابھی تک توقیر کی لاش بھی برآمد نہ ہوئی ہو۔

ایک دن بعد ہی اے ایس آئی نے آ کر میرے اندیشوں کی تصدیق کردی۔ وہاں کی پولیس ابھی توقیر کو ڈھونڈ رہی تھی۔ ہوسکتا تھا توقیر کی لاش دریا میں بہادی گئی ہو' اور اسے مچھلیوں نے نگل لیا ہو۔ گاؤں کے پاس سے پانچ دریاؤں میں سے ایک دریا گزرتا تھا۔ یہ ابھی سب قیافے ہی تھے' اندازے ہی کہہ سکتے تھے۔

عین میری ہدایت کے مطابق ابھی تک اے ایس آئی نے وہاں کے تھانیدار کو کچھ نہیں بتایا تھا۔

دراصل میری خواہش یہ تھی کہ جاگیردار کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ آئے کہ بشریٰ نے ہمیں کچھ بتایا ہے۔ میں نے اس کے تحفظ کی ذمہ داری اٹھائی تھی۔

بشریٰ سے ہم نے یہ بات بھی معلوم کرلی تھی کہ راشد کس فرم میں ملازمت کرتا تھا۔

دو دن بعد ایک حوصلہ افزا رپورٹ مجھ تک پہنچی۔ بعض اوقات جہاں قانون بے بس ہوجاتا ہے' ہمیں بظاہر غیر قانونی طریقے بھی استعمال کرنے پڑتے ہیں۔

ہم نے شہری آبادی سے ہٹ کر ایک مکان (جو کہ سپاہی نواز کے کسی رشتے دار کا تھا) خالی کروایا اور ایک بندے کو رات کے اندھیرے میں بے ہوشی کی حالت میں وہاں پہنچادیا۔ میں نے اپنے چہرے میں تھوڑی سی تبدیلی کی اور دو ہٹے کٹے بندوں کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔

بندے کی جب تھوڑی سی مرمت کی گئی تو اس نے بہت کچھ بتادیا۔ وہ کوئی عادی مجرم یا بدمعاش نہیں تھا۔ جلد ہی وہ راہ راست پر آ گیا۔

اس سے جو کچھ معلوم ہوا' اس کا ذکر آگے آئے گا۔ نام میں یہیں بتادیتا ہوں' اس کا نام خاور تھا۔ ویسے جو کچھ اس سے معلوم ہوا وہ تو ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔

آپ بھی ذہن ٹٹولیے' اور آخر میں اپنے اندازوں کا موازنہ کرلیجیے گا۔

اس کو ہم نے رات کے اندھیرے میں اس کے گھر کے پاس پہنچادیا اور ساتھ تاکید بھی کردی کہ اپنی زبان بند رکھے ورنہ وہ قتل ہوجائے گا' یا ہم اسے پولیس کے حوالے کردیں گے...... کام تو اس نے کوئی اچھا نہیں کیا تھا...... ہمارے لیے ایک راہ متعین ہوچکی تھی۔

اگلے دن میں نے اے ایس آئی ابرار اور سپاہی بشارت کو جاگیردار کے گاؤں سے متعلقہ تھانے بھیج دیا۔

ان دنوں وہاں رانا شقافت ایس ایچ او تھا' وہ ایک ایماندار پولیس افسر تھا' لیکن اپنی نوکری اور جان کے تحفظ کے لیے جاگیرداروں اور چوہدریوں پر ہلکا ہاتھ ڈالتا تھا۔ اس میں مرعوب ہونے والی یا ڈرنے والی کوئی بات نہیں تھی۔

اب تمام باتیں ابرار نے اسے بتادی تھیں۔

یہ بات تو پتھر پر لکیر ہے کہ انسان سوچتا کچھ ہے ہوتا کچھ اور ہے۔ بہرحال حالات اس تیزی سے بدلے تھے کہ اے ایس آئی ابرار کے وہاں پہنچنے تک پانسہ پلٹ چکا تھا۔

مجھے تو سب باتیں اس وقت معلوم ہوئیں جب اے ایس آئی اور سپاہی واپس آئے۔

باقی واقعات وحالات اے ایس آئی کی زبانی سنیے۔

''سر...... جب ہم وہاں (تھانے) میں پہنچے تو حالات ہی بدلے ہوئے تھے۔ شقافت صاحب جاگیردار کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کرنے کی تیاریاں کررہے تھے۔ اس کی گردن اس طرح کٹی ہوئی تھی جس طرح دیوانے کی کٹی ہوئی تھی اور قاتل کی حیثیت سے مستانہ حوالات میں بند تھا۔ اس کے کپڑے خون کے چھینٹوں سے رنگین تھے اور یہ بھی پتہ چلا تھا کہ قاتل نے خود گرفتاری دی تھی۔

وہ صبح صبح تھانے پہنچ گیا تھا' اس کے بیان کے بعد باقی کارروائی میں اتنا وقت لگ گیا تھا کہ ہم وہاں پہنچ گئے۔ آلہ قتل ایک لمبے پھل والی چھری تھی۔ جو بیان مستانے نے دیا تھا وہ اس طرح تھا (اس بیان میں سے' میں بشریٰ کا بیان نکال رہا ہوں' وہ پہلے ہی آپ پڑھ چکے ہیں)

مستانے نے بتایا کہ انہوں نے جس دن بشریٰ کا سہارا بننے کا وعدہ کیا' اس سے تقریباً ایک ہفتہ بعد دو بندے انہیں ملے' اور کہا۔ ہم اس شہر میں نئے آئے ہیں جو مکان ہم نے لیا ہے' ہمارا سامان اس کے باہر پڑا ہے' تمہارے متعلق

ہمیں پتہ چلا ہے کہ تم یہ کام بھی کردیتے ہو۔ ہمارا سامان مکان کے اندر رکھوادو۔ ہم معقول معاوضہ دیں گے۔ وہ یہ کام بھی کردیتے تھے۔ اس وقت وہ فارغ تھے اور گھر جارہے تھے۔ انہوں نے سوچا' چار پیسے فالتو مل جائیں گے ان سے بشریٰ کو سودا سلف لے دیں گے۔

پھر وہ دو بندے انہیں ایک ایسے مکان کے دروازے پر لے گئے جس کا تالہ نکلا ہوا تھا۔ خیر یہ تو کوئی ایسی بات نہیں تھی جو انہیں کسی شک میں مبتلا کرتی اصل بات یہ تھی جس نے ان کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجادی تھیں کہ مکان کے باہر کوئی سامان نہیں تھا۔

جب انہوں نے سامان کے متعلق پوچھا تو دونوں نے ریوالور نکال لیے' اس وقت کافی اندھیرا پھیل چکا تھا اور مکان کے آس پاس کوئی نہیں تھا پھر وہ انہیں اسلحے کے زور پر مکان کے اندر لے گئے۔ اندر دو آدمی اور بھی تھے۔ یہ ایک ویران مکان لگتا تھا باقی دونوں نے دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے ڈنڈے اٹھالیے' ان میں ایک بڑی مونچھوں والا بولا۔ ''تم نے بھٹکے ہوئے لوگوں کو سدھارنے کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔''

''کیا مطلب...... دونوں نے ایک زبان ہوکر کہا۔

''بشریٰ کو سیدھی راہ تم نے دکھائی اور اس کا خرچہ بھی تم برداشت کرو گے۔''

''بالکل' ہم بہت گناہ گار بندے ہیں۔ اللہ نے ہمیں ایک نیک کام کرنے کا موقع دیا ہے تو......''

''تمہارا دانہ پانی ہم اس دنیا سے ختم کردیں گے۔ ورنہ تم' اب کبھی بشریٰ کے گھر کا رخ نہ کرنا۔''

پھر وہ کافی دیر انہیں سمجھاتے رہے تھے لیکن ان کا ایک جواب تھا کہ وہ کبھی بھی اپنے مقصد سے نہیں ہٹیں گے۔ اس کے بعد انہوں نے پشتو زبان میں آپس میں کوئی مشورہ کیا پھر ایک اردو میں بولا۔

''انہیں یہاں رسیوں سے باندھ کر قید کردو' ہم دوسرے کمرے میں چلتے ہیں۔ ان کو سوچنے کا موقع دیتے ہیں جاتے جاتے وہ یہ دھمکی بھی دے گئے کہ اگر ہم نے شور مچانے کی کوشش کی تو انہیں گولی مار کر لاشیں اسی مکان میں دفن کردی جائیں گی۔ یہ مکان آسیب زدہ ہے۔''

وہ مکان آسیب زدہ تھا کہ نہیں' مستانے نے اپنے بیان

میں لکھوایا کہ اس وقت تو وہ چاروں انہیں بھوت لگ رہے تھے۔ پھران بھوتوں نے نہ جانے کیا چکر چلایا کہ مستانے کی آنکھ کسی اور کمرے میں کھلی' یہ جاگیردار کے ڈیرے کا ایک کمرہ تھا اور یہاں یہ چاروں رہتے تھے اور انہوں نے ہی توقیر کو قتل کیا تھا اور دیوانے کو قتل کر کے مستانے کو یہاں لے آئے تھے۔ یہ سب قدرت کی طرف سے ہو رہا تھا۔ فرعون صفت جاگیردار کے لیے یہ انتظام تھا۔ یہاں پہنچ کر اے ایس آئی چند لمحوں کے لیے رکا اور دوبارہ اپنے ذہن پر زور دے کر بولا۔

''سر...... جو باتیں یا معلومات مجھ تک پہنچی ہیں' انہیں میں نے ترتیب سے بتانے کی کوشش کر رہا ہوں اور یہ صرف مستانے کا ہی بیان نہیں ہے بلکہ یہ ان چاروں کا بھی بیان ہے۔ جن کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور اس میں ایس ایچ او صاحب کی معلومات بھی شامل ہیں۔ بہرحال کچھ عرصے کے بعد مستانے کی حاضری جاگیردار کے سامنے ہوئی۔ اس نے نیچے سے اوپر تک اس کا جائزہ لیا اور بولا۔

''یہ نالائق تمہیں یہاں لے آئے ہیں' یہ ان کی غلطی ہے' انہوں نے تو یہ سوچا تھا کہ تمہارے غائب ہو جانے سے وہاں کی پولیس تمہیں قاتل سمجھ لے گی' بھلا بغیر کسی وجہ کے ایسا ہونا کیسے ممکن ہے' پولیس والے اتنے احمق نہیں ہیں' یہاں اے ایس آئی مسکرایا۔ پانی کا ایک گلاس پیا اور دوبارہ ٹوٹے ہوئے سلسلے کو جوڑتے ہوئے بولا۔

خیر تم آ گئے ہو تو ایک بات غور سے سنو اور اسے پلے باندھ لو۔ تم یہاں سے کبھی بھی جا نہیں سکو گے' اگر تم نے کوشش کی تو حویلی کے کتے تمہاری تکہ بوٹی کر دیں گے۔ اب تم میری نظروں کے سامنے رہو گے اور میرے ذاتی نوکر کے طور پر کام کرو گے۔ تمہیں کوٹھی کے کونے والا کمرہ دے دیا جائے گا۔ پھر وہ جاگیردار کے ذاتی کام کرنے لگا۔ یہ کام حویلی کے اندر کے تھے۔ رات کو وہ اپنے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہاں سے بھاگنا مشکل ہے' اس نے بڑی کوشش کی تھی کہ اسے اپنے ساتھی دیوانے کے متعلق کچھ پتہ چل جائے لیکن یہ ممکن نہیں ہوا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد ایک رات وہ اپنے کمرے میں سو رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی' پہلے تو اس نے توجہ نہیں دی' پھر اٹھ کر دروازے کے پاس آ کر بولا۔ ''کون ہے بھئی؟'' جواب میں باہر سے ایک نسوانی آواز آئی۔

''یہ میں ہوں شاداں۔ زرا دروازہ کھولو۔ میں مصیبت میں ہوں۔''

وہ شاداں سے مل چکا تھا۔ اس نے جاگیردار کی نسبت اسے نرم دل اور غریبوں کا ہمدرد پایا تھا۔

اس نے دروازہ کھول دیا۔ کمرے میں زیرو کا بلب جل رہا تھا' شاداں نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔

''بی بی دروازہ بند نہ کریں' آپ کو جو مسئلہ ہے بتا دیں۔'' مستانے نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''بیٹھو چارپائی پر اور میری باتیں غور سے سنو۔ اگر اس وقت تمہاری بہن ہوتی تو تم کیا کرتے؟''

وہ بیٹھ گیا۔ شاداں اس کے سامنے کھڑی ہو کر بولی۔

''میرا باپ بہت ظالم ہے' اس نے توقیر کو مروا دیا ہے لیکن ثبوت کوئی نہیں چھوڑا' مجھے سب کچھ پتہ چل چکا ہے۔ انہوں نے اس کی لاش کے ٹکڑے دریا میں بہا دیے ہیں۔ انہوں نے ہی تمہارے ساتھی کو بھی قتل کروایا ہے۔ اس کا گلہ کاٹ کر نہر میں پھینک دیا تھا۔ پھر تمہیں یہاں لے آئے اب کسی دن تمہیں بھی مار کر تمہاری لاش غائب کر دیں گے۔ یہ کوئی نشان نہیں چھوڑتے۔ پھر اس نے توقیر کے متعلق سب کچھ بتایا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس کے باپ کو ان کی محبت کا پتہ چل گیا تھا' وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی تو مستانہ بولا۔

''بی بی' یہ سب کچھ بتا کر آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟''

''دیکھو...... میں سیدھی اور کھری بات کروں گی' میں اگر تھانے میں جا کر یہ سب کچھ بتا دوں تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرا باپ سب ملبہ اپنے چاروں خاص بندوں پر ڈال کر سزا سے بچ جائے گا۔ کوئی اچھا سا وکیل کر کے اپنے آپ کو صاف بچا لے جائے گا۔ پھر وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا اور ساتھ میری ماں کی بھی شامت آ جائے گی۔ مجھے اپنی بالکل پروا نہیں ہے' توقیر کے بعد میں ایک زندہ لاش ہوں۔ تم اسی طرح میرے باپ کو ذبح کر دو' نہیں تو میں دریا میں کود جاؤں گی۔ توقیر کے پاس چلی جاؤں گی۔''

زیرو بلب کی ملگجی روشنی میں مستانے نے دیکھا کہ اس کا لہجہ بہت زیادہ جذباتی ہو گیا ہے۔ وہ دیوانی لگنے لگی تھی۔

اس نے سوچا۔ میرا قریبی ساتھی' جگری یار' دیوانے کو بے دردی سے ذبح کر دیا گیا' اب اگر یہ دیوانی بھی دریا میں کود گئی تو...... انہوں نے بشریٰ کو بہن بنا کر اس کا بوجھ اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن حالات ان کے موافق نہیں رہے تھے۔ اسے اپنے ساتھی کا انتقام بھی لینا تھا۔ اس لیے وہ جاگیردار کو اس کے انجام تک پہنچانے پر تیار ہو گیا۔

اس سلسلے میں شاداں نے اس کی پوری مدد کی' وہ نیم پاگل ہو چکی تھی۔ لمبے پھل والی تیز چھری اس نے مہیا کی' خواب آور دوائی اس نے لا کر دی' جس کی تھوڑی سی مقدار گیٹ پر بیٹھے چوکیدار کو بھی چائے میں ملا کر دے دی گئی اور سب سے بڑھ کر گوشت میں یہی دوائی ملا کر رکھوالی کرنے والے خونخوار کتوں کو بھی دی گئی۔ ساری پلاننگ شاداں نے بڑی ذہانت سے کی۔ اس دیوانگی میں بھی انتقام نے اس کی ذہانت کو مرنے نہیں دیا۔ مستانے نے آخر میں کہا۔ تھانیدار صاحب میں نے شاداں کی سب باتوں پر عمل کیا سوائے ایک بات کے......!

پھر وہاں کے تھانیدار کے سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔ شاداں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ جب تک زندہ ہے اس پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گی۔ وہ بالکل بے فکر ہو کر حویلی میں رہے۔''

کہتے ہیں ظلم اور زیادتی ایسے ہی جرائم کو جنم دیتی ہے۔ کیونکہ جب لاچار' مجبور اور مظلوم لوگوں کو موقع ملتا ہے تو وہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر سب کچھ کر گزرتے ہیں۔

قارئین ٹینشن نہ لیں' میں یہاں خاور کے متعلق بھی بتا دیتا ہوں۔ پھر سب کچھ یعنی جو سوال آپ کے ذہن میں رہ گئے ہیں ان کا جواب بھی آپ کو مل جائے گا۔

جیسا کہ ذکر آ چکا ہے خاور اسی فرم میں ملازمت کرتا تھا جس میں راشد ملازم ہوا تھا۔ اس کا تعلق بھی جاگیردار اور راشد کے گاؤں کے ساتھ تھا اور وہ مہینہ دو مہینے بعد گاؤں جاتا تھا۔ جاگیردار کے چاروں خاص آدمیوں کے ساتھ اس کے تعلقات تھے۔ وہ بھی شراب و کباب کا رسیا تھا۔ راشد سے غلطی یا کوتاہی یہ ہوئی کہ اس نے حفظ ماتقدم کے طور پر خاور کو سب کچھ بتا دیا اور ہاتھ جوڑ کر استدعا کی کہ اس کے متعلق کسی کو نہ بتایا جائے یہ تو بلے کو دودھ کی رکھوالی پر بٹھانے والی بات تھی۔ جب وہ گاؤں گیا تو شراب کے نشے میں اس نے راشد کے متعلق ان چاروں کو بتا دیا۔ یہ تو اندھے کے ہاتھ بٹیر آ گیا تھا۔

انہوں نے جاگیردار کو سب حالات سے آگاہ کرنے کے بعد کہا۔ جاگیردار جی یہ تو بہت خطرناک بات ہے' وہ کہیں پولیس کو نہ بتا دے' اگر آپ اجازت دیں تو شہر میں جا کر ان تینوں کو ختم کر دیں۔ تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔

جاگیردار نے ان کی باتوں کو اپنی ذہانت کی کسوٹی پر پرکھا اور حکم صادر کر دیا کہ ان کو ختم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ شہر ہے۔ وہاں تک ہماری پہنچ نہیں ہے۔ ان کو سیاست کی مار مارو۔ شہر جا کر چاروں میں سے ایک خاور سے ملا اور اسے اپنی اسکیم سے آگاہ کیا۔ اسکیم یہ تھی کہ وہ راشد کے ساتھ تعلقات بنائے اس کے گھر بھی جایا کرے۔ اس طرح وہ ان کے گھر کے حالات سے آگاہ رہے گا۔ ساتھ ہی راشد کو ہیروئن کے نشے پر لگا دے' تاکہ وہ اس قابل ہی نہ رہے کہ کبھی پولیس کو کچھ بتا سکے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ لیکن اس معاملے میں خود سامنے نہیں آیا۔ راشد اور بشریٰ اسے اپنا سچا ہمدرد سمجھنے لگے لیکن وہ تو آستین کا سانپ تھا' چونکہ وہ ان کے گھر آتا جاتا تھا اس لیے اس سے یہ بات بھی چھپی نہ رہ سکی کہ بشریٰ نے دھندا شروع کر دیا ہے۔ انہوں نے یہ سب کچھ جاگیردار کو بتایا تو وہ بہت خوش ہوا۔ نہ ہینگ لگی نہ پھٹکری اور رنگ بھی چار گنا آ گیا تھا لیکن اچانک دیوانہ اور مستانہ درمیان میں آ گئے۔ انہیں اپنی محنت رائیگاں جاتی محسوس ہوئی۔ انہوں نے جاگیردار سے مشورہ کیے بغیر دیوانے اور مستانے کو مزا چکھانے کا فیصلہ کر لیا جو انہیں اور جاگیردار کو مہنگا پڑا...... ایک بے گناہ کا خون اور قربانی ضائع نہیں ہوئی اور ظالم جاگیردار اور اس کے حواری ایک بھیانک انجام کو پہنچے۔

گراں ثواب

رضوانہ ظفر

ان لمحات کی روداد' جب انسان نیکی کر کے پچھتانے پر مجبور ہوجاتا ہے۔
ایک حسینہ پرجمال کا احوال' ایک روز اس کے دل میں اچانک نیکی کا جذبہ بیدار ہوگیا تھا۔
ترکی ادب سے انتخاب' اچھی کہانیاں پڑھنے والوں کے لیے بطور خاص۔

رات بھر برف گری تھی۔ صبح کے قریب برف باری بند ہوگئی مگر ہر چیز برف سے ڈھک گئی تھی۔ اب گھروں کے سامنے اور راستوں سے برف ہٹانے کے کام کا آغاز ہو رہا تھا۔ اس کام کے لیے مجھے سورج کے نمودار ہونے کا انتظار فضول تھا۔ برف باری کے موسم کا سورج بھی کچھ اتنا گرم نہیں ہوتا بلکہ سورج نکلنے کے ساتھ ہی سردی شدید بڑھ جاتی ہے صبح کی تیز ہوا نرم برف کو مزید ٹھوس کرتی ہے۔ اس کے بعد تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام درختوں اور مکانات نے سفید اونی کپڑے پہن لیے ہیں۔ ٹیلی فون کے تاروں پر بھی ریشمی برف لپٹ جاتی ہے ان تاروں پر جب پرندے بیٹھتے ہیں تو تاروں پر لپٹی ہوئی برف کے موتی جھڑتے ہیں اور دفاتر جانے والے لوگ سمجھتے ہیں کہ برف باری پھر شروع ہو رہی ہے۔ ٹیلی فون کے تاروں سے جھڑنے والی برف لباس بھی گندا کرتی ہے اس وجہ سے لوگ ناگواری محسوس کرتے ہیں۔

اس منظر کو ایک جوان عورت بہت دیر سے اپنے باورچی خانے کی کھڑکی سے دیکھتے ہوئے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ اس خیال سے خوش ہو رہی تھی کہ اس کے ساتھ گھر سے باہر نکلنے کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہے۔ اس کا باورچی خانہ بھی گرم تھا اور لیونگ روم کے آتش دان میں بھی انگارے دہک رہے تھے۔ لیونگ روم میں سردی کا احساس نہیں ہو رہا تھا اپنی خوش بختی پر وہ مسکرا دی۔ پھر اس نے آتش دان میں مزید کوئلہ ڈالا اور چہرے پر مسکراہٹ لیے کھڑکی کے قریب ہو کر بیٹھ گئی۔ آتش دان گرم ہونے کے باعث کھڑکی کے شیشے پر کوئی دھند نہیں رہی تھی۔ وہ کھڑکی سے باہر کا منظر واضح طور پر دیکھ سکتی تھی۔ سورج کی روشنی میں برف چمک کر ایک خوش گوار منظر پیش کر رہی تھی۔ لیکن وہ واضح طور پر محسوس کر رہی تھی کہ باہر کے لوگوں کے لیے یہ ایک ناگوار منظر ہوگا۔ لوگوں نے نہ صرف بھاری کوٹ پہن رکھے تھے بلکہ سر اور چہروں کو بھی ٹوپی اور مفلروں سے ڈھک لیا تھا ان کی آنکھیں کھلی تھیں مگر ان کے رویے سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ ان کی آنکھوں کے سامنے ایک ناگوار منظر ہے۔ اسکول جانے والے بچے بھی سرتاپا اونی کپڑوں میں لپٹے ہوئے تھے اور تیز تیز چل رہے تھے۔ ان کے لیے بھی برف باری کا موسم ناگوار تھا۔ اس شدید سردی سے ہر شخص ہی بے زار تھا۔ ماسوائے ان لوگوں کے جن کے گھروں میں آتش دان اور ہیٹر تھے۔ اس کا اپنا گھر شہر کے ایک ایسے ہی علاقے میں تھا جہاں زندگی کی ہر آسائش مہیا تھی۔ اس علاقے کے لوگوں کے پاس اپنی گاڑیاں تھیں ان کے اندر بھی حرارت کا معقول انتظام تھا۔ اس لیے اس علاقے کے لوگوں کے لیے برف باری ناگوار نہیں تھی یا پھر اس خراب موسم سے غریب طبقہ بے زار نہیں تھا۔ وہ گویا ہر قسم کے حالات سے سمجھوتہ کر چکے تھے۔ کتنے ہی غریب بچے جن کے جسم پر گرم کپڑے بھی نہیں تھے اس کی نظروں کے سامنے سے اس طرح گزرے گویا برف باری کا موسم ان کے کھیلنے کا موسم ہو، وہ اچھل کود کر رہے تھے۔ ایک لڑکے کا تو جوتا بھی پھٹا ہوا تھا۔ اسے یقین ہو رہا تھا کہ اس لڑکے کا پیر بھیگ گیا ہوگا سردی سے اکڑ رہا ہوگا۔ وہ اس احساس ہی سے کپکپا گئی مگر اس غریب لڑکے کو جیسے اپنے گیلے پیروں کی کوئی پروا نہیں تھی۔

''پتا نہیں، یہ غریب لوگ کس مٹی سے بنے ہوتے ہیں۔'' وہ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر اس کی توجہ اس گھوڑا

گاڑی نے اپنی طرف مرکوز کرلی جو راستے سے برف ہٹانے کے کام پر مامور تھی۔ گھوڑے کے نتھنوں سے دھواں سا نکل رہا تھا۔ جسے دیکھ کر اسے سردی کی شدت کا احساس ہونے لگا اور وہ افسردہ سی ہو کر سڑک سے برف ہٹانے والے مزدوروں کو دیکھنے لگی۔ ان مزدوروں کے ہاتھ اور ناک سردی سے سب سے زیادہ متاثر تھے۔ ناک تو نیلی ہو رہی تھی۔ مگر حیرت انگیز طور پر وہ سب ہی سردی سے بے نیاز معلوم ہو رہے تھے۔ وہ برف کو اپنی ٹوکری میں بھر کر گھوڑا گاڑی میں انڈیلتے ہوئے ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ ان کے مسکراتے چہروں کو دیکھتے ہوئے اس عورت کو ان کے بارے میں کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سب ہی غریب مزدور تھے اور کسی گھوڑے کی مانند ہی موسم کی شدت سے بے پروا تھے۔

''یہ سب واقعی گدھے اور گھوڑے ہیں۔'' اپنے اس خیال پر جوان عورت کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس قدر خراب موسم میں برف ڈھونے کا کام کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔

آتش دان میں ڈالے گئے کوئلے اب پوری طرح جل اٹھے تھے اور کمرے کی حرارت میں خوش گوار اضافہ کر رہے تھے۔ عورت کچھ دیر تک غربت اور امارت کا موازنہ کرتی ہوئی اپنی کرسی پر جھولتی رہی۔ پھر اونگھنے لگی۔ اس کی خواب دیدہ سی کیفیت کو ایک شرارتی سے لڑکے نے اس کے باغیچے کے دروازے کو پیٹ کر ختم کیا۔ وہ اشاروں سے اسے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کیا بات ہے۔'' وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑکی کھول کر اس لڑکے کا مدعا جاننے کی کوشش کرنے لگی۔

''کیا چاہتے ہو؟'' مگر فاصلہ ہونے کی وجہ سے وہ لڑکے کا جواب نہیں سن سکی تھی۔ کچھ سوچ کر وہ بالکونی میں آ کھڑی ہوئی۔ اس لڑکے کو اس کے رویے سے حوصلہ ہوا وہ باغیچے کا دروازہ کھول کر بالکونی کے عین نیچے آ کھڑا ہوا وہ بغور لڑکے کو دیکھنے لگی۔ اس کی عمر چودہ یا پندرہ سال رہی ہوگی وہ ٹھیک سے اندازہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے خیال میں غربت نے اس لڑکے کی عمر پر پردہ ڈال دیا تھا۔ وہ ایک میلی بوسیدہ سی قمیص پہنے ہوئے تھا جس کے بٹن بھی

ٹوٹے ہوئے تھے۔ قمیص کا گلا کھلا ہوا تھا جس سے اس کا سینہ بھی سردی سے محفوظ نہیں تھا۔ اس کی پتلون کی حالت بھی خراب تھی۔ دونوں گھٹنوں کے پاس سے پھٹی تھی جہاں سے اس کے گھٹنے باہر جھانک رہے تھے۔ وہ سرتا پا گندہ تھا اور سراپا ریشم نظر آتا تھا۔ اس کے کھچڑی بالوں سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سردی کے آغاز سے اب تک اسے نہانا نصیب نہیں ہوا۔ اس کے جوتے بھی پھٹے ہوئے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ جوتے اس نے کچرے کے ڈھیر سے حاصل کیے ہوں اسے یقیناً سردی لگ رہی تھی۔ اس کا جسم اب آہستہ آہستہ لرز رہا تھا اس کے سوال کے جواب میں وہ خاموش تھا معلوم ہوتا تھا کہ سردی کے باعث اس کی زبان بھی بند ہوگئی ہو، عورت نے نرمی اختیار کرتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

''یہاں کس لیے آئے ہو، تمہیں ہمیشہ میرا ہی دروازہ نظر آتا ہے۔''

''مجھے کچھ کھانے کو دے دو۔'' لڑکے نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

''مجھے بھوک لگی ہے میں نے کل رات سے کچھ بھی نہیں کھایا۔''

''مگر میرے پاس اس وقت کچھ بھی نہیں ہے۔''

جوان عورت نے لڑکے کو ٹالنے کی کوشش کی وہ اس وقت باورچی خانے میں جانے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھی۔

''جاؤ کوئی دوسرا دروازہ دیکھو۔''

''پلیز۔'' لڑکا روہانسا ہو کر گڑگڑانے لگا۔

''تم بہت رحم دل عورت ہو مجھے مایوس مت کرو مجھے بہت بھوک لگی ہے میں بھوک سے مرجاؤں گا، تم مجھے کچھ بھی دے دو، میں کھانے کے بدلے میں تمہارے گھر کے دروازے سے ساری برف ہٹا کر دور پھینک دوں گا۔ تم مجھ سے کام پہلے کرالو کھانا بعد میں دے دینا میں تمہارے لیے کوئلہ بھی توڑ دوں گا۔'' وہ جواب میں انکار کردینا چاہتی تھی مگر اسے لرزتے دیکھ کر آخر اس کا دل پسیج گیا اور وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اب اسے اپنے دروازے سے برف ہٹوانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ کام تو سرکاری مزدور مفت انجام دے رہے تھے اور اس کے پاس ٹوٹا ہوا کوئلہ بھی اتنی مقدار میں تھا جو دو ہفتوں کے لیے کافی تھا۔

''مجھے بہت سردی لگ رہی ہے۔'' نوجوان کے اس جملے پر اسے خود بھی ٹھنڈ کا شدید احساس ہوا اور وہ اپنے اونی نائٹ گاؤن کی بیلٹ کسنے لگی اور بولی۔

''ٹھیک ہے تم باغیچے سے گزر کر پچھواڑے کی جانب آجاؤ کوئلہ وہاں شیڈ میں رکھا ہے میں شیڈ کی چابی لے کر آتی ہوں۔'' عورت کے بالکونی سے جاتے ہی لڑکے کے چہرے پر ذومعنی سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باغیچے میں گری برف کو اپنے بوٹوں سے روندتا ہوا مکان کے عقبی جانب آگیا۔ عورت شیڈ کی چابی لیے وہاں موجود تھی۔ چابی لڑکے کے حوالے کرکے اس نے لڑکے کو کوئلے کے ٹکڑوں کے بارے میں ہدایت دی۔

''کوئلے کے زیادہ چھوٹے ٹکڑے مت کرنا۔'' اس کے بعد عورت باورچی خانے میں آگئی تاکہ اس لڑکے کے لیے کھانا گرم کردے اس لمحے وہ بہت پرجوش تھی وہ محسوس کررہی تھی کہ وہ ایک بہت اچھے دل کی مالک ہے۔ وہ فطری طور پر غریبوں کے لیے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتی تھی۔

اس کے پاس رات کا بچا ہوا چکن کارن سوپ تھا جو اب اس کے کسی کام کا نہیں تھا۔ نہ ہی اس کے شوہر کو باسی سوپ پینے کی عادت تھی نہ اس کے گھر میں کوئی ایسا فرد تھا جو رات کا بچا ہوا سوپ پیتا۔

''اس سوپ کو پھینکنے سے بہتر ہے کہ کسی غریب کے پیٹ میں چلا جائے۔'' وہ دل ہی دل میں سوچتی ہوئی سوپ گرم کرنے لگی کسی غریب کی مدد کرنے کے خیال نے اسے مسرور ہی کردیا۔

''اگر تم غریبوں کی اسی طرح مدد کرتی رہو گی تو یقیناً جنت میں جاؤ گی۔'' وہ دل ہی دل میں خود کلامی کرنے لگی۔

''خداوند ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ لڑکا کس قدر بھوکا ہوگا۔ اس نے کل رات سے کچھ بھی نہیں کھایا۔ وہ سردی سے لرز بھی رہا تھا وہ یقیناً غذائی کمی کا شکار ہے۔ اس وقت اسے ایسے ہی گرما گرم سوپ کے پیالے کی ضرورت ہے۔ سوپ اس کی کپکپاہٹ بھی دور کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ وہ خوش ہی ہوجائے گا۔'' وہ مسکرانے لگی۔

''جب میرا دل اس سخاوت پر خوش ہورہا ہے تو یقیناً

اس کا دل مجھ سے بھی زیادہ مسرور ہوگا۔ جیسے ہی وہ سوپ کا پہلا چمچ منہ میں لے کر جائے گا اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جائے گی۔ اس سے میں اندازہ کرلوں گی کہ اس کا دل میری اس ہمدردی پر کتنا خوش ہوا ہے۔''

اپنے اس خیال پر بے اختیار اس کے دل میں خواہش ہوئی کہ وہ اس لمحے خود کو آئینے میں دیکھے کہ وہ کیسی لگ رہی ہے۔ اسے یقین تھا کہ اس لمحے اس کی نیکی نور بن کر اس کے چہرے پر چمک رہی ہوگی اور وہ بہت خوب صورت نظر آرہی ہوگی۔ وہ دوڑتی ہوئی ڈریسنگ میز کے قدآور آئینے کے سامنے پہنچی۔ اس لمحے اس کے عکس نے بھی اسے بھرپور فریب دیا۔ وہ خود کو بے حد حسین نظر آرہی تھی۔ بس اس کی مسکراہٹ مکمل نہیں تھی اپنی مسکراہٹ کو اس نے ہونٹوں کے زاویے تبدیل کرکے مونالیزا کی مسکراہٹ میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ پورے طور پر اپنی مسکراہٹ سے مطمئن نہیں ہوئی۔

''میرا دل جس قدر حساس اور رحم دل ہے اس وقت جتنا خوش ہے میرے لب اسی قدر اس کا اظہار کیوں نہیں کرتے؟'' وہ مزید چند لمحے آئینے کے سامنے کھڑی رہی پھر خود کو مطمئن کرنے لگی۔

''میرا دل یقیناً میرے چہرے اور ہونٹوں سے زیادہ خوب صورت ہے۔'' اس سوچ پر سچ مچ اس کے لبوں پر ایک دل فریب سا تبسم نمودار ہوگیا۔

''میرا یہ تبسم میری نیکی کا صلہ ہے۔'' وہ مطمئن اور مسرور ہوکر باورچی خانے میں واپس لوٹی جام کی بوتل پر نظر پڑنے پر ایک لمحے کے لیے وہ سوچ میں پڑ گئی کہ اس لڑکے کو ڈبل روٹی پر جام دے یا نہ دے مگر فوراً ہی اس نے جام کی بوتل الماری میں رکھ دی۔ اسے یقین تھا کہ اس لڑکے کو اپنے گھر پر جام کھانے کو نہیں ملتا ہوگا۔ پھر وہ یہاں اسے جام کیوں دے۔ صرف سوپ کا ایک پیالہ ہی اس کے لیے بہت کافی ہے۔ پیالے میں سوپ انڈیلتے ہوئے وہ ایک بار پھر کشمکش کا شکار ہونے لگی۔

''اگر میں تھوڑا سا جام دے دوں گی تو اس سے مجھے کیا فرق پڑے گا۔ مجھے تھوڑا سا جام بھی دے دینا چاہیے وہ یقیناً میٹھا پسند کرے گا پھر میں جنت میں بھی تو جانا چاہتی ہوں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ میں اس بھوکے لڑکے

کے ساتھ اچھا سلوک کروں، میں محض ایک پیالہ سوپ دے کر جنت میں داخل نہیں ہوسکوں گی۔'' وہ جام کی بوتل الماری سے نکالتے نکالتے ایک بار پھر سوچ میں پڑ گئی۔

''میں اس لڑکے کے لیے اتنا تردد کیوں کر رہی ہوں، میں بلاوجہ ہی اتنی نیک بن رہی ہوں، جس قدر میں کر رہی ہوں اتنا ہی کافی ہے ورنہ عام طور پر تو لوگ اس قسم کے لڑکوں کو دیکھتے ہی دروازہ بند کرلیتے ہیں میرا دل تو عام عورتوں سے پھر بھی اچھا ہے۔ میں غریبوں کو کچھ تو دے دیتی ہوں، غریب بچوں کو دھتکارتی تو نہیں ہوں، یہ لڑکا خوش قسمت ہے جو اس بھوک کی حالت میں میرے دروازے پر آیا ہے۔ خداوند اس لڑکے کو میرے پاس بھیج کر شاید میرا امتحان لے رہا ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ میں نیکی سے محبت کرتی ہوں یا نہیں۔'' ان خیالات کے ساتھ ہی اس کے اندر نیکی کرنے کا جذبہ ایک انگڑائی لے کر بے دار ہوگیا اس نے فوراً ہی فیصلہ کن انداز میں جام کی بوتل اٹھائی اور تین چار چمچ جام ایک پلیٹ میں ڈالا، ڈبل روٹی کے چار سلائس پلیٹ میں رکھے اور مسکراتی ہوئی اس لڑکے کے پاس پہنچی۔

''لو...... ناشتہ کرو یہ سب کچھ تمہارے لیے ہے۔''

''شکریہ۔'' لڑکے نے جو کوئلہ توڑنے کا کام تقریباً ختم کرچکا تھا فوراً ہی اپنی میلی پتلون سے اپنے ہاتھ صاف کر کے ٹرے کی طرف لپکا اور اپنی آنکھوں میں چمک لیے ڈبل روٹی، جام اور سوپ کے پیالے کو دیکھنے لگا اور بولا۔

''آپ بہت نیک خاتون ہیں خداوند آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔''

''تم ڈبل روٹی اور جام، سوپ کے ٹھنڈا ہونے سے پہلے کھالو۔'' وہ مسکراتی ہوئی قریب ہی بیٹھ گئی۔

''سوپ ٹھنڈا ہوگیا تو تمہیں مزہ نہیں آئے گا۔''

لڑکے کی بات نے اسے بے حد خوش کردیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ لڑکے کے الفاظ گداگروں کا فارمولا نہیں ہیں جو وہ لوگوں کا دل نرم کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ الفاظ اس لڑکے کے دل سے نکلے تھے۔

''آپ بہت نیک خاتون ہیں۔ خداوند آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔'' وہ ان الفاظ کو دل ہی دل میں دہراتی ہوئی مسکراتی رہی۔ اسے یقین تھا کہ اگر اس لمحے کوئی بھی یہ الفاظ سنتا تو اسے ایسا ہی محسوس ہوتا کہ یہ الفاظ اس لڑکے کا جذباتی ردعمل ہے۔ یہ الفاظ ڈبل اور جام دیکھ کر بے اختیار اس کی زبان پر آئے ہیں۔ وہ لڑکے کو ناشتہ کرتے دیکھتی ہوئی مسکراتی رہی۔ اس کا دل پوری طرح مطمئن تھا اس کے خیال میں اطمینان قلب کی یہ کیفیت اس بات کا ثبوت تھی کہ خداوند نے اس کی نیکی کو قبول کرلیا ہے۔

لڑکے پر ہنوز سردی کا اثر غالب تھا وہ گرم سوپ پیتے ہوئے بھی کانپ رہا تھا۔ وہ چند لمحے کچھ سوچتی رہی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم یہاں سے جانا مت، میں تمہارے لیے کوئی گرم سوئٹر لاتی ہوں، تمہیں واقعی بہت سردی لگ رہی ہوگی۔''

گھر میں داخل ہوکر وہ ایک بار پھر الجھن کا شکار ہونے لگی۔ پہلے اسے خیال آیا کہ وہ لڑکے کو ایک دو پن دے کر رخصت کردے۔ پن کے ذریعے وہ اپنی قمیص کے کھلے ہوئے گریبان کو بند کرکے سردی سے بچ سکتا ہے۔

اسی اثنا میں لڑکا ناشتے سے فارغ ہوکر اس کی دہلیز پر آکر برتن واپس کرنے کے لیے اسے آواز دینے لگا۔ ٹرے میں اب کھانے کا ایک ذرہ بھی باقی نہیں تھا۔ سوپ کے پیالے کا آخری قطرہ بھی گویا اس نے چاٹ لیا تھا جام کی پلیٹ بھی چمک رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر مسکرا دی۔ ٹرے اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اچانک ہی اس کا ہاتھ لڑکے کے ہاتھ سے ٹکرایا۔ لڑکے کے ہاتھ بے حد سرد تھے وہ ایک بار پھر سوچ میں پڑنے لگی۔

''کیا تمہیں سردی لگ رہی ہے؟''

''اس سردی نے تو میری جان ہی لے لی ہے۔'' لڑکا روہانسے لہجے میں بولا۔

''اس قمیص کے علاوہ میرے پاس دوسری قمیص بھی نہیں ہے اور آپ دیکھ رہی ہیں کہ اس قمیص کے کئی بٹن بھی نہیں ہے۔'' لڑکے کے لہجے میں کچھ کرب تھا کہ اس کا دل ہی پسیج گیا پھر اسے یاد آگیا کہ اس کے صندوق میں شوہر کا ایک پرانا سوئٹر رکھا ہوا ہے جو اس کے شوہر نے کئی برس سے استعمال نہیں کیا اور اب شاید وہ کرے گا بھی نہیں شاید وہ سوئٹر آستین سے کچھ چھوٹا بھی ہوگیا تھا۔ وہ تیزی سے اندر کمرے میں گئی اور سوئٹر نکال کرلے آئی۔

''لو اسے پہن لو، یہ تمہارے فٹ آئے گا۔'' اس نے

مسکراتے ہوئے لڑکے کے سائز کا اندازہ لگایا اور سوئٹر پہننے کے لیے کہا۔

''میں آپ کے لیے مزید کیا کرسکتا ہوں۔'' لڑکے کے ہاتھ سوئٹر کی طرف فوری نہیں بڑھے۔ وہ یقیناً تذبذب کا شکار ہو رہا تھا سوئٹر پرانا تھا مگر عمدہ اون کا ہاتھ سے بنا ہوا تھا اور قیمتی تھا۔

''میں آپ کی ہر خدمت کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' وہ غلامانہ انداز میں سر جھکا کر بولا۔ ''مجھ سے کوئی کام کرالیں۔''

''نہیں...... نہیں۔'' وہ جذباتی ہوگئی۔ ''میرے بچے یہ سوئٹر میں تمہیں اپنی خوشی سے دے رہی ہوں، اس کے بدلے تمہیں کچھ بھی کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہیں کوئلہ توڑنے کی مزدوری بھی دوں گی۔ تمہیں ناشتا میں نے مزدوری کے بدلے میں تھوڑا ہی دیا ہے۔'' لڑکے کے چہرے پر اس کی باتوں کے ردعمل میں شدید مسرت تھی جو اسے مزید مسرت سے ہمکنار کر رہی تھی۔ اب اس کا لہجہ بھی مسرت آمیز تھا۔

''تم اس سوئٹر کو پہن کر دیکھو، یہ ایک بہترین گرم سوئٹر ہے میرے شوہر کا ہے اس سوئٹر کو میں نے اپنے ہاتھوں سے تیار کیا تھا۔'' وہ اس قدر جذباتی ہوگئی کہ اس نے خود ہی لڑکے کے سوئٹر پہنا دیا۔

''اوہ۔'' وہ خوشی سے چلا اٹھی۔

''یہ تو تمہارے بالکل فٹ آیا ہے۔''

''کیا یہ سوئٹر واقعی میرے لیے ہے۔'' لڑکا سوئٹر پہن کر خود بھی خوشی سے مغلوب نظر آنے لگا۔

''کیا آپ واقعی یہ سوئٹر مجھے دے دیں گی۔''

''میں یہ سوئٹر تمہیں اپنے ہاتھوں سے پہنا چکی ہوں۔'' وہ لڑکے کی آنکھوں میں اتری حیرانی پر قہقہہ لگاتی ہوئی بولی۔

''اب یہ سوئٹر تمہارا ہوگیا ہے مجھے یقین ہے کہ اب سردی سے تم ہلاک نہیں ہوگے۔''

''میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔'' وہ لڑکا سوئٹر پر ہاتھ پھیرتا ہوا مسکرانے لگا۔ پہلی بار اس کے دانت اس عورت کے سامنے نمایاں ہوئے اس کے دانت سفید اور چمکدار تھے۔

تلاش

مجھے تلاش ہے ایسی محبت کی جو
جنوری کی ٹھٹھرتی سردی میں چائے جیسی ہو۔
فروری کی خوشبو میں بسی صبح نو جیسی ہو۔
مارچ کے رنگ برنگے پھولوں جیسی ہو۔
اپریل کی پُر امید بہاروں جیسی ہو۔
مئی کی سلونی اداس شاموں جیسی ہو۔
جون کی سلگتی بے چین دوپہروں جیسی ہو۔
جولائی کی بن بادل برساتوں جیسی ہو۔
اگست کی حبس زدہ شاموں میں خوشگوار ہَوا کے جھونکے جیسی ہو۔
ستمبر کے محبت کے نام پر جاں نثار ہونے والے وطن کے پرستاروں جیسی ہو۔
اکتوبر کے زرد خزاں رسیدہ بکھرے پتوں جیسی ہو۔
نومبر کی راتوں کے دلفریب خوابوں جیسی ہو۔
دسمبر کی سرد چاندنی راتوں جیسی ہو۔
ہاں......!
''بس وہ محبت میرے جیسی ہو۔''

روبی علی...... سیدوالہ

''آپ ٹھیک کہتی ہیں مجھے بھی یقین ہے کہ اس سوئٹر کو پہن کر میں سردی سے ہلاک نہیں ہوں گا۔'' لڑکے کے پاس شاید الفاظ نہیں تھے وہ عورت کے الفاظ دہرا کر سر جھکا کر کھڑا رہا۔

''اس سوئٹر میں تم بہت اچھے نظر آتے ہو، کافی اسمارٹ لگ رہے ہو۔'' عورت نے کہا اور خود ہی جھینپ سی گئی۔

''کیا تمہیں سوئٹر پسند آیا۔''

''ہاں۔'' لڑکا اب مسلسل مسکرا رہا تھا۔

''یہ تو بہت ہی شاندار سوئٹر ہے خداوند آپ کی حفاظت کرے آپ ہمیشہ سکھی رہیں۔''

''ویل مائی بوائے۔'' عورت نے لڑکے کو جانے کے لیے کہا وہ محسوس کر رہی تھی کہ سوئٹر کو فوری لے جاتے ہوئے وہ تذبذب میں مبتلا ہے۔

''اب تم جاسکتے ہو، گڈ بائی۔''

''آپ مجھ بیلچہ دیں۔'' لڑکے نے تشکرانہ کہا۔
''میں آپ کے صحن سے برف ہٹا دیتا ہوں۔''
''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ لڑکے کو جذباتی ہوتا دیکھ کر ہنس دی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ اس کے احسان کے بوجھ تلے دب گیا ہے اور شکریہ کے طور پر کام کرنا چاہتا ہے۔
''اب تم جاؤ۔'' وہ خود بھی جذباتی سی ہو کر رہ گئی اور لڑکے کے ہاتھ تھام کر باہر نیچے کے دروازے تک لے آئی۔
''مگر......!'' وہ ہنوز مضطرب تھا۔
''مجھے صحن سے برف ہٹانے میں صرف پانچ منٹ لگیں گے۔''
''ٹھیک ہے۔'' وہ آخر کار رضامند ہوگئی اور دل ہی دل میں سوچتی رہی۔
''میں نے تو نیکی اپنے خداوند کو خوش کرنے کے لیے کی تھی مگر اب یہ لڑکا خود ہی ضد کر رہا ہے تو مجھے اس سے باغیچے کی برف صاف کرا لینی چاہیے۔''
اس نے بیلچہ لڑکے کو دیا اور وہ خوشی خوشی صحن سے برف ہٹانے میں مصروف ہوگیا اس کام میں لگ بھگ اسے آدھا گھنٹا صرف کرنا پڑا کام سے فارغ ہو کر اس نے عورت کا شکریہ ادا کیا اور مسکراتا ہوا وہاں سے رخصت ہوگیا وہ اپنے لیونگ روم میں واپس آئی اور اپنی آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر خوش گوار حرارت سے لطف اندوز ہونے لگی وہ بہت خوش اور مطمئن تھی۔ اس کے خیال میں اس نے ایک اچھا سودا کیا تھا۔ سوپ کا پیالہ، ایک پرانا سوئٹر اور چند فرینک کے بدلے اس نے لڑکے سے اچھا خاصا کام کرا لیا تھا۔ اس کے ذہن میں لڑکے کا مسکراتا چہرہ ہنوز موجود تھا وہ واقعی اس کا بے حد احسان مند تھا وہ رخصت ہوتے ہوئے جذبات سے اس قدر مغلوب تھا کہ اس کا ہاتھ بار بار چوم رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک پالتو کتا اپنے مالک کے ہاتھ چاٹتا ہے۔ وہ واقعی بہت بھوکا تھا اگر آج اسے کچھ کھانے کو نہیں ملتا تو ہو سکتا تھا کہ وہ بھوک اور سردی کے باعث کسی جانور کی مانند ہلاک ہو جاتا وہ ڈبل روٹی اور جام دیکھ کر پاگل ہی ہو گیا تھا اس کے پاس میرا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں تھے مگر اس کی معصوم مسکراہٹ شکریہ کے طور پر ہی تھی۔ اس لڑکے کے لیے یقیناً ایک رحم دل دیوی کی مانند تھی۔ میں نے اس وقت اسے کھانے کو دیا جب وہ بھوکا تھا۔ اس دیوی نے اس وقت سے سوئٹر دیا جب وہ سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔
وہ آرام دہ کرسی پر جھولتی ہوئی مسکراتی رہی سوچتی رہی۔
اس لڑکے کے خیال میں، میں یقیناً نوبل انعام کے قابل ہوں، وہ میرا اس قدر شکر گزار تھا کہ وہ میرے کسی بھی حکم سے انکار نہیں کرتا۔ وہ میرے ایک اشارے پر کچھ بھی کرنے کے لیے تیار تھا۔ وہ میرے پاس کتنا دکھی اور اداس چہرہ لیے آیا تھا اور یہاں سے رخصت ہوتے ہوئے کس قدر خوش اور مسرور نظر آ رہا تھا اس کی آنکھیں کس طرح چمک رہی تھیں یقیناً مایوسی کے بعد اسے ایک رحم دل عورت مل گئی تھی میں نے واقعی آج زبردست نیکی کی ہے۔ میں نے کل بھی ایک بھوکی بلی کو دودھ کا گرم پیالہ دے کر ایک عمدہ کام کیا تھا میرا آج کا دن بھی کل کی مانند خوش گوار ہوگا خداوند بھی ان سے محبت کرتا ہے جو اس کی مخلوق، جانور اور انسانوں سے محبت کرتے ہیں جو بھوکے کو کھانا کھلاتے ہیں اور ہمیشہ نیک بننے کی کوشش کرتے ہیں۔''
''بالکل میری طرح۔''
اس لمحے اگر عورت خود آئینے کے روبرو کرتی تو یقیناً بہت خوش ہو جاتی۔ اس لمحے اس کے لبوں پر واقعی مونالیزا کی مانند تبسم تھا۔ اس کے خیال میں اس نے ایک بھوکے انسان کا دل جیت کر ایک بہت بڑی نیکی کمائی تھی۔ اب اس کا دل مزید نیک بننے کے لیے مچل ہی اٹھا تھا۔ وہ دل ہی دل میں فیصلہ کر رہی تھی کہ وہ اپنی وصیت میں اپنی تمام دولت اور جائیداد غریب نادار بھوکے بچوں کے لیے وقف کر دے گی۔ تاکہ زندگی کے اختتام پر جب وہ اپنے خداوند کے سامنے پیش ہو تو اس کے پاس ایک نیک اور مہربان عورت ہونے کا مکمل ثبوت اس کے پاس ہو۔ ان خیالات نے اسے بے پناہ اطمینان قلب دیا اور وہ دل ہی دل میں خداوند سے یہ دعا کرتی رہی کہ وہ اس کے پاس مصیبت زدہ بھوکوں کو بھیجتا رہے۔
دوپہر کے قریب جب سردی قدرے کم ہوگئی تو یہ عورت اپنے چہرے پر مسکراہٹ لیے اپنے ذہن میں مزید نیکیاں کرنے کے خیالات کے ساتھ گھر سے باہر نکلی۔ اس

کا ارادہ سودا سلف خریدنے کا تھا۔ گوشت اور پرچون کے سامان کی خریداری کے بعد وہ ایک سبزی فروش سے سبزی خرید رہی تھی جب ہی اس کی سماعت نے ایک مانوس سی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے کان کھڑے ہوگئے۔
''علی تم نے مجھ سے پوچھا نہیں کہ یہ سوئٹر میں نے کہاں سے حاصل کیا؟'' اس آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا۔
یہ وہی غریب بھوکا لڑکا تھا جو صبح سردی میں ٹھٹھرتا ہوا اس کے دروازے پر آیا تھا مگر وہ اس وقت اسے دیکھ نہیں رہا تھا وہ اس وقت اپنے ہم عمر ایک غریب لڑکے کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔ اس وقت اس کے لہجے میں فخر نمایاں تھا۔
وہ ہمہ تن گوش بن کر اس کی بات سننے لگی۔
''سوئٹر اچھا ہے۔'' اس لڑکے نے سوئٹر پر ہاتھ پھیر کر اقرار کیا اور پوچھا۔
''یہ سوئٹر تم نے کہاں سے حاصل کیا؟''
''اسی پاگل عورت سے جس کے متعلق میں نے تمہیں بتایا تھا۔ آج اس احمق عورت نے مجھے کوئلہ توڑنے کا کام بھی دیا۔''
''اوہ......!'' دوسرے لڑکے نے بے پروائی سے کہا۔
''یہ کون سا تم نے کمال کر دیا۔ تمہیں کوئلہ توڑنے کی مزدوری کے بدلے اس حرافہ نے سوئٹر پڑخا دیا۔''
''کیا تمہارے خیال میں، میں احمق ہوں۔'' اس نے ناگوار سے انداز میں دوست کو گھور کر دیکھا اور بولا۔
''اس احمق عورت نے مجھے ناشتا بھی دیا سوپ بھی پلایا۔ کوئلہ توڑنے کی مزدوری بھی دی اور یہ سوئٹر بھی دیا۔''
''تو ایک بار اگر اس معشوق کو دیکھ لے تو تیرے منہ میں پانی آ جائے۔'' لڑکے کے یہ الفاظ اس عورت کی سماعت پر بجلی بن کر گرے۔ وہ لرز ہی گئی تھی مگر ہمہ تن گوش رہی۔ وہ لڑکا ابھی اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھا۔
''اگر تو اس عورت کو بالکونی میں کھڑا دیکھ لے تو تجھے چکر ہی آ جائے میں بھی گرتے گرتے بچا وہ اپنے اونی نائٹ گاؤن کے نیچے کچھ بھی پہنے ہوئے نہیں تھی۔ میں تو اس منظر کو دیکھ کر لرز گیا۔''
''تو مذاق کر رہا ہے۔'' دوسرا لڑکا اس منظر کشی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہنسنے لگا۔
اس کے بعد ان دونوں لڑکوں کی گفتگو مزید فحش ہوتی چلی گئی اس سے زیادہ سننے کی اس مہربان عورت کے پاس اب طاقت نہیں تھی اس کا سر جھک گیا تھا وہ وہاں سے اس طرح سر جھکاتے ہوئے رخصت ہوئی گویا اس لڑکے نے سربازار اسے برہنہ کر دیا ہو۔
اس کی سماعت میں لڑکے کے الفاظ کی گونج مسلسل جاری تھی۔
''وہ نائٹ گاؤن کے نیچے کچھ بھی پہنے ہوئے نہیں تھی۔''

گوہر نایاب

- علم کے ساتھ عمل اور دولت کے ساتھ شرافت نہ ہو تو دونوں بے کار ہیں۔
- دولت' عزت کے شوکت' حکمت کے سلطنت' عبادت کے صورت' سیرت کے اور شجاعت سخاوت کے مقابلے میں ہیچ ہے۔
- مبارک ہیں وہ لوگ جو اپنی تدبیر اس وقت بھی جاری رکھتے ہیں جب زمانہ ان کا مذاق اڑا رہا ہوتا ہے۔
- محنت کرو حسد نہ کرو حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے لکڑی کو آگ۔
- اگر کسی کو دینا چاہتے ہو تو کوئی اچھی دعا دو۔

رابعہ ساحر محمد حنیف...... جہانیاں منڈی

ہنی مون

ذوالفقار احمد

شادی کے صرف ایک گھنٹے بعد کار حادثے کا شکار ہونے والے ایک جوڑے کا قصہ۔
اس شخص کی جدوجہد جسے ایک حسینہ کی معصوم مسکراہٹ پر پیار آگیا تھا۔
درندوں کی بستی سے ایک انسان کی فقیدالمثال کہانی۔

ناشتے کی میز پر جارج نے روزنامہ امریکن میں وہ انتہائی روح فرسا اور المناک خبر پڑھی کہ کس طرح نوخیز ایلس اور اس کا نیا نویلہ دلہا رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے صرف ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں انسپائریشن پوائنٹ کی چوٹی سے گر کر ہلاک ہوگئے اور خبر پڑھتے پڑھتے نوالہ اس کے حلق میں پھنس گیا ایلس سڑک کے اس پار ایک گیراج اپارٹمنٹ میں رہتی تھی اور ہرچند کہ پچھلے اٹھارہ ماہ کے دوران اسے دیکھ کر محض رسمی طور پر سر ہلانے کے سوا اس نے اس سے کوئی گفتگو نہیں کی تاہم وہ من موہنی اور بھولی بھالی سی نوخیز لڑکی اسے بہت اچھی لگتی تھی وہ اس سے یک گونہ تعلق خاطر محسوس کرتا تھا یوں جیسے ان کے درمیان کوئی خونی رشتہ ہو جیسے وہ اس کی بیٹی یا بھتیجی ہو۔ دونوں اپنی اپنی جگہ بالکل یک و تنہا تھے۔ جارج کئی سال پہلے اپنی عزیز از جان بیوی لوسی کی موت کے بعد اس بھری دنیا میں تنہا رہ گیا تھا اور اس نے تازہ تازہ عملی زندگی میں قدم رکھا تھا۔ جارج، مسز گراہم کے حوالے سے ایلس کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا مسز گراہم نے اس لڑکی کو اپنا اپارٹمنٹ کرائے پر دے رکھا تھا اور اسی نے جارج سے اس کا غائبانہ تعارف کرایا تھا مثلاً وہ یہ جانتا تھا کہ لڑکی یتیم تھی اور کنساس سٹی کے ایک ہائی اسکول سے فارغ التحصیل ہوتے ہی ایک کمپنی بورگ اینڈ وارنر، میں براہ راست ملازمت حاصل کر کے اس شہر میں وارد ہوئی تھی اور پچھلے اٹھارہ ماہ سے ہر پہلو سے ایک بے حد پروقار زندگی گزارتی آئی تھی۔ اپارٹمنٹ کا کرایہ ہر ماہ بے حد پابندی سے پہلی تاریخ کو ادا کر دیا کرتی تھی اور بہت کم لوگوں سے ملتی جلتی تھی ایک طرح سے کم آمیز تھی۔ لیکن بے حد خوش طبع، خوش مزاج، ملنسار اور خوش اطوار واقع ہوئی تھی۔ اپارٹمنٹ کرائے پر حاصل کرنے کے چند ماہ بعد اس نے پانچ سال پرانے ماڈل کی ایک کار خرید لی تھی۔ وہ صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا خود پکاتی تھی اور دوپہر کا کھانا اپنے ساتھ دفتر لے جاتی تھی۔ مسز گراہم کے علم کے مطابق اس کی واحد تفریح ہفتے میں ایک بار فلم بینی تھی یا پھر کام سے فارغ ہونے کے بعد تھوڑے سے سیر سپاٹے پر نکل جاتی جو شہر سے بیس میل دور، مشرق کی سمت واقع انسپائریشن پوائنٹ تک محدود تھا جہاں سے وہ غروب آفتاب کے دلکش اور روح پرور منظر کا نظارہ کرتی۔ الغرض وہ بے حد دلکش مسکراہٹ کی مالک، ایک بہت ہی جاذب نظر اور پرکشش نوخیز دوشیزہ تھی اور منفرد انداز میں زندگی گزارتی تھی۔

اس کے بارے میں یہ سب کچھ سوچتے ہوئے جارج نے ناشتے کی میز پر اتنے زور سے مکا مارا کہ مگ میں رکھی ہوئی کافی چھلک پڑی۔

''لعنت ہو۔'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ اسی وقت گیراج اپارٹمنٹ کی مالکہ مسز گراہم سے ملنے روانہ ہوگیا۔

❁......❁❁......❁

''اس کا دلہا ہنری ٹینز کس قسم کا انسان تھا؟'' اس نے مسز گراہم کے آنسوؤں میں کمی واقع ہونے پر پوچھا۔

''میرے خیال میں خاصا شریف لڑکا تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو ایلس اس سے کبھی شادی نہ کرتی میری اس لڑکے سے صرف ایک یا دو بار گفتگو ہوئی تھی۔ اس نے تقریباً تین ماہ پیشتر ایلس کے پاس آنا شروع کیا تھا پہلی ڈیٹ کے موقع پر وہ اسے لے کر میرے پاس آئی تھی اور مجھ سے تعارف کرایا تھا یوں جیسے میں اس کی ماں تھی لڑکا مجھے پسند آیا تھا لیکن اس میں صرف ایک خامی تھی۔''

''وہ کیا؟''

''وہ پستہ قد تھا اور اس کی مونچھیں بے حد باریک تھیں۔ اس کے چہرے سے کچھ کچھ زنانہ پن ٹپکتا تھا لیکن میں دیکھ رہی تھی کہ ایلس اس پر فدا تھی غریب لڑکی مجھے یقین ہے کہ وہ اس کا پہلا محبوب تھا۔ تم میرے شوہر فریڈ کو جانتے ہو کہ وہ کتنا تنومند جسیم اور تندرست و توانا تھا اس کے بازو کتنے مضبوط تھے میں ہمیشہ سے تنومند جسیم مردوں کو پسند کرتی آئی ہوں میرے سارے بچوں کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا ہے۔ تمہاری بیوی لوسی بھی قد آور مردوں کو پسند کرتی تھی اور ہم دونوں اس بات پر فخر کیا کرتے تھے کہ ہمارے شوہر کتنے قوی الجثہ ہیں۔ لوسی کو میں اپنی بیٹی سمجھتی تھی جب تم دونوں کی شادی ہوئی تھی تو میں نے اسے ایک ماں کی نظر سے دیکھا تھا۔ اسی طرح ایلس کو بھی میں اپنی بیٹی سمجھتی تھی۔'' وہ دوبارہ رونے لگی۔

جارج خاموشی سے اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھ گیا پھر یکایک مڑ کر پوچھا۔

''کار کس کی تھی؟''

''ایلس کی تھی اسے اپنی اس چھوٹی سی کار سے بے حد محبت تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کار خریدی تھی اور حال ہی میں اس کی قیمت ادا کی تھی۔''

''مسز گراہم ایسے موقع پر میں تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ بتاؤ کہ ہنری کہاں کام کرتا تھا۔ اس کا ذریعہ معاش کیا تھا؟''

''میں نہیں جانتی ایلس نے کبھی مجھے یہ نہیں بتایا میرا خیال ہے کہ وہ مضافات کے کسی اسٹور میں ملازم تھا لیکن میں یہ نہیں جانتی کہ وہ اسٹور کہاں واقع ہے؟''

''کیا تم نے شادی میں شرکت کی تھی؟''

''نہیں میں تو یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ اس لڑکے سے شادی کرنے والی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ میں شادی کے موقع پر چیخ چیخ کر روؤں وہ کہا کرتی تھی کہ شادی کے موقع پر وہ دلہا، پادری اور دو گواہوں کے علاوہ اور کسی کی بھی شرکت کی متمنی نہیں میں اسے مذاق سمجھتی تھی لیکن اب جانا کہ وہ قطعی سنجیدہ تھی دیکھ لو، اخبار میں کیا لکھا ہے اور ذرا سوچو دونوں کی لاشیں دریافت کیے جانے تک دن بھر پہاڑوں میں پڑی رہیں۔''

جارج اپنے گھر واپس آ کر لان کی گھاس کاٹنے لگا۔ آج اس نے سوچا تھا کہ اپنی بوٹ ٹریلر پر لاد کر بذریعہ کار جھیل کا رخ کرے گا لیکن اس بے چاری ایلس کی حادثاتی موت کی المناک خبر نے اس کے دماغ کی چولیں ہلا دی تھیں۔ اس کے علاوہ اس کے ذہن میں کوئی بات کھٹک رہی تھی۔

پولیس کی تیس سالہ ملازمت کے بعد کوئی شخص آسانی کے ساتھ اپنی عادت سے چھٹکارا حاصل نہیں کرسکتا جبکہ اس نے تیس سال میں سے دس سال چیف سراغ رساں کی حیثیت سے گزارے تھے۔ اس کی نگاہوں میں بھولی بھالی ایلس کی تصویر جھلک رہی تھی وہ ہمیشہ اسے دیکھ کر مسکرایا کرتی تھی کتنی پیاری اور من موہنی تھی وہ سڑک کے اس پار رہتی تھی اور کوئی بھی نہیں جو اس کی موت کی تحقیقات کرکے یہ جاننے کی کوشش کرے کہ حادثہ کس طرح پیش آیا لہٰذا اب یہ اس کا فرض ہے کہ وہ کم از کم اس معاملے کو تھوڑی بہت تفتیش کرکے کسی بات کا سراغ لگانے کی کوشش تو کرے اس کا دل بار بار گواہی دے رہا تھا کہ اس سانحے میں کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ ایک نوخیز نو بیاہتا جوڑے کا صرف ایک گھنٹے کے اندر ہلاک ہوجانا بلا سبب نہیں اور ایلس کا مسز گراہم سے اپنی شادی مخفی رکھنے اور اسے لڑکے کے ذریعہ معاش سے آگاہ نہ کرنے کا بھی کوئی نہ کوئی سبب ہوگا جبکہ بقول مسز گراہم وہ ایلس کو اپنی بیٹی سمجھتی تھی اور بیٹیاں عموماً اپنی ماؤں پر اعتماد کرتی ہیں۔

اگلے روز وہ ایلس کے جنازے میں شریک ہوا جنازے میں معدودے چند افراد شریک تھے مسز گراہم ایک دو پڑوسی اور ایلس کی کمپنی کے تقریباً ایک درجن ملازم، مسز کیتھرائن فشر، جنازے میں شریک ہونے والی واحد رشتہ دار تھی۔ جارج اسے خبر کے حوالے سے پہچان گیا اور اس کا قریبی جائزہ لینے لگا۔ وہ مسز گراہم کے ساتھ بیٹھی رومال منہ پر رکھے رو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سیاہ باریک نقاب پڑا ہوا تھا پھر تابوت کا ڈھکن بند کردیا گیا جارج مردہ خانے کے باہر جا کھڑا ہوا جنازے پر پھولوں کی چادر چڑھائی جانے لگی اور جنازے کو قبرستان لے جانے کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ مسز گراہم اپنے دوستوں کے ہمراہ قبرستان کار پر روانہ ہورہی تھی لہٰذا جارج نے قبرستان جانے کی ضرورت محسوس نہ کی جنازے کی روانگی کے وقت اس نے مسز فشر کو تنہا اپنی کار میں سوار ہوتے دیکھا۔ وہ سنہری زلفوں اور بے حد پرکشش جسم کی مالک ایک نوجوان خاتون تھی اور جب اس کی کار جنازے کے جلوس میں شامل ہوئی تو جارج اس کار کو پہچان گیا۔ یہ کار وہی تھی جو ایلس کے ہاں ہنری کی آمد و رفت کے دوران ایک شام اسے مسز گراہم کے اپارٹمنٹ کے سامنے کھڑی نظر آئی تھی یہ 1964ء ماڈل کی شیورلیٹ سیڈان تھی جارج نے اس کا نمبر ذہن نشین کرلیا اور پولیس اسٹیشن کی جانب گامزن ہوگیا۔

پولیس اسٹیشن پہنچنے پر اسے اس اندوہناک حادثے کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہوئیں ایلس کی کار انسپائریشن پوائنٹ کا جنگلہ توڑتی ہوئی تقریباً دو سو فٹ گہری کھائی میں اچھلتی کودتی، لڑھکتی، قلابازیاں کھاتی بالآخر ایک تناور درخت سے ٹکرا کر الٹ گئی تھی۔ ہنری نصف راستے ہی میں کار سے نکل کر دور جا گرا تھا جبکہ ایلس آخری وقت تک کار کے اندر ہی رہی کار کو آگ نہیں لگی تھی دونوں موقع پر ہی ہلاک ہوگئے تھے۔ دونوں کے جسم پر متعدد گہرے زخم آئے تھے اور دونوں کی کھوپڑیوں کے ساتھ ہی جسم کی کئی ہڈیاں بھی ٹوٹ گئی تھیں۔ کورونر نے جس ڈاکٹر کو پوسٹ مارٹم کے لیے طلب کیا تھا اس کے خیال میں پوسٹ مارٹم ضروری نہیں تھا۔ دونوں کی موت دماغی چوٹ سے واقع ہوئی تھی۔ لاشیں شادی کے اگلے روز سہ پہر کے قریب بوائے اسکاؤٹس کے ایک گروپ نے دریافت کی تھیں جو سیاحت کی غرض سے وہاں گئے تھے شادی ایک روز قبل رات کے آٹھ بجے شہر کے مشرقی حصے میں واقع جسٹس آف پیس ریمنڈ کلارک کے گھر پر انجام پائی تھی پولیس کے دو حکام اور علاقے کے ڈپٹی شرف نے حادثے کی تحقیق کرکے اپنی رپورٹ میں اسٹیشن کو پیش کردی تھی اور پھر حادثے میں ہلاک ہونے والے دلہا ہنری کی جیب سے برآمد ہونے والے شناختی کارڈ کے ذریعہ اس کی بہن مسز کیتھرائن فشر کو حادثے کی اطلاع دے دی تھی۔ اسی کی زبانی یہ معلوم ہوا تھا کہ ان کی شادی کو ایک گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا اور یہ نو بیاہتا جوڑا ہنی مون منانے کے لیے روانہ ہورہا تھا۔ متوفی ہنری کی جیب سے برآمد ہونے والے پرس میں سے صرف پچیس ڈالر ملے تھے اور ایلس کے پرس

میں سے ڈیڑھ سو ڈالر برآمد ہوئے تھے۔ مسز فشر کا بیان تھا کہ دونوں مختصر سے ہنی مون کے لیے شاید ہاٹ اسپرنگ جا رہے تھے اور چند ہی دنوں میں ان کی واپسی متوقع تھی۔ ہنری بھی کبھار کام کرلیا کرتا تھا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ کہاں جب وہ شہر میں ہوتا تو اس کے گھر قیام کرتا۔ ہنی مون سے واپسی پر وہ سینٹ لوئیس جانے کا ارادہ رکھتا تھا جہاں اس کے خیال میں اسے کوئی اچھی سی ملازمت مل سکتی تھی۔ دونوں انسپائریشن پوائنٹ اس لیے گئے تھے کہ ایلس کو وہ جگہ بے حد پسند تھی اور وہ پہلے بھی ہنری کے ساتھ رات کے وقت وہاں جاتی رہی تھی۔

’’ایک نو بیاہتا جوڑا، فقط ایک سو پچھتر ڈالر سے ہنی مون منانے جا رہا تھا نوجوان شوہر بے روزگار تھا اور پانچ سال پرانی کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ جارج نے یہ سوچتے ہوئے ایک گہری سانس لی اور اسے اپنی شادی یاد آگئی جب اس نے اور اس کی بیوی لوسی نے پولیس کی اسی ڈالر ماہوار تنخواہ سے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا تھا اور اسے ہنی مون منانے کے لیے صرف دو روز کی چھٹی ملی تھی۔

اس نے کار کے لائسنس نمبر کے بارے میں چھان بین کی تو وہ درست نکلا۔ لائسنس جیمز فشر نامی شخص کو جاری کیا گیا تھا اور اس کا پتا درج تھا اس نے جیمز فشر کے بارے میں تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ وہ مضافات میں فرنیچر کی ایک دکان میں ملازم تھا۔

’’میں بھی کتنا احمق ہوں۔‘‘ اس نے انسپائریشن پوائنٹ جاتے ہوئے راہ میں سوچا۔

’’بہت بڑا احمق۔‘‘ اب وہ پولیس آفیسر نہیں تھا اور اسے ایسے معاملات میں اپنی موٹی اور لمبی ناک گھسیڑنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی جن سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ خدا کے لیے اس غریب بچی اور اس کے شوہر کو قبر میں سکون سے سونے دو، اس نے خود کو تلقین کی۔ اب اس معاملے میں مین میکھ نکالنے اور کیوں، کیا اور کیسے کا جواب تلاش کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ گڑے مردے اکھاڑنے کا کیا فائدہ؟ وہ راستے بھر انہی خیالات میں الجھا ہوا ڈرائیو کرتا رہا اور جب خیالات سے ابھرا تو منزل آچکی تھی۔

وہاں کئی کاریں موجود تھیں۔ لوگ باگ پوائنٹ کے گرد بنے ہوئے جنگلے کے اوپر سے گردن ابھار ابھار کر دو سو فٹ نشیب میں درختوں کے درمیان پڑی ہوئی تباہ شدہ کار کے ڈھانچے کو دیکھ رہے تھے۔ جارج نے اپنی کار ریلنگ کے قریب کھڑی کی اور اتر کر اس جگہ واپس آیا جہاں سے کار نشیب میں لڑھکی تھی اور اس کے منہ سے بے اختیار سیٹی نکل گئی ریاستی پولیس کی رپورٹ میں کار کے پہیوں کے گھسٹنے کا کوئی ذکر نہیں تھا اور واقعی اس مقام پر ایسا کوئی نشان نظر نہیں آرہا تھا پختہ سڑک یا فٹ پاتھ پر بھی پہیوں کا کوئی نشان نہیں تھا نہ ہی تیز رفتاری سے موڑ کاٹتے وقت پہیے مٹی میں دھنسے تھے حالانکہ سڑک سے نشیب میں لڑھکتے وقت ریلنگ اور نشیب کے درمیان اور پھر نشیب کے بالائی حصے پر ٹائر کے گہرے نشانات موجود ہونے چاہیے تھے جارج کو یہ واقعہ کسی زاویے سے سچ مچ کا حادثہ معلوم نہیں ہوا چنانچہ وہ اپنے شک کو رفع کرنے کی غرض سے نشیب میں اترنے لگا ایسے میں اسے اپنا دو سو پچاس پونڈ وزنی جسم سنبھالنا مشکل ہورہا تھا کیونکہ ڈھلوان عمودی اور خطرناک تھی بلندی سے تقریباً پچیس فٹ نشیب میں کار ایک درخت سے ٹکرائی تھی اور درخت کے تنے میں شگاف پیدا کرنے کے ساتھ ہی وہاں کی زمین پر ایک گڑھا سا بنا دیا تھا اس کے بعد وہ چٹانوں پر لڑھکتی انہیں اپنی جگہ سے اکھاڑتی مختلف درختوں سے ٹکراتی، پتھروں پر گہرے نشانات ڈالتی چلی گئی۔ جارج، پھسلتا، سنبھلتا، ہانپتا اور خود کو کوستا ہوا بالآخر تباہ شدہ کار کے ڈھانچے کے قریب پہنچ گیا۔ اچانک ایک درخت کے عقب سے ایک شخص نمودار ہوا۔

’’اوہ، جارج یہ تم ہو میں سمجھا کوئی ریچھ نیچے اتر رہا ہے۔‘‘ اس نے پر مزاح لہجے میں کہا وہ ڈپٹی کانسٹیبل ہولڈن تھا۔

’’تم یہاں کیا کررہے ہو؟‘‘ جارج نے پوچھا۔

’’پہرہ دے رہا ہوں اور انشورنس کمپنی کے تفتیش کار یہاں پہنچنے تک دیتا رہوں گا۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’انشورنس انہوں نے کتنے کا انشورنس کرایا تھا؟‘‘ جارج نے پوچھا۔

’’میں نہیں جانتا لیکن میرے خیال میں خطیر رقم کا انشورنس کرایا ہوگا؟‘‘

’’کس کمپنی سے؟‘‘

’’ایکمے اوورسی پبلک انشورنس کمپنی سے۔‘‘

''اگر میں ان چیزوں کو چھیڑوں تو تم کچھ خیال تو نہیں کرو گے؟''

''انشورنس والے نہیں چاہتے کہ کوئی ان چیزوں کو ہاتھ لگائے۔'' ہولڈن نے آگاہ کیا۔

''اچھا میں کسی شے کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔'' اس نے جواب دیا اور کار کے اندر جھانکا وہاں دو سوٹ کیس تھے ایک سوٹ کیس پوری طرح کھلا ہوا تھا اور زنانہ ریشمی کپڑے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ عقبی نشست پر ان کپڑوں کے درمیان ایک چھوٹی سی انجیل بھی تھی۔ جارج کو اپنے حلق میں ایک گولہ سا پھنستا ہوا محسوس ہوا۔ سارے کے سارے عروسی جوڑے تھے اس کی سانس الجھنے لگی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ بڑی مشکل سے چڑھائی چڑھتا اور رک رک کر سانس لیتا ہوا اپنی کار میں واپس آ گیا انشورنس کیا انشورنس کس کا انشورنس اس کے دماغ میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ وہ نئی نسل سے زیادہ واقف نہیں تھا لیکن جب وہ نوجوان تھا اور شادی کرنے والا تھا تو اس وقت اس نے یا لوسی نے کسی انشورنس کے بارے میں نہیں سوچا تھا لیکن پہلے بچے کی پیدائش کے بعد اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور اس نے حقیقت سے آنکھیں چار کرتے ہوئے پہلی بار سوچا تھا کہ اب اسے ایک ذمہ دار باپ کا کردار ادا کرنا ہے۔

وہ کافی دیر تک اس جگہ بیٹھا ہرے بھرے درختوں اور سر سبز وادیوں کو گھورتا اور سوچتا رہا۔ انشورنس، کتنے کا انشورنس؟ ایک ہزار ڈالر کا؟ یہ جوڑا اپنی ازدواجی زندگی کے آغاز ہی میں خاصی معقولیت کا ثبوت دینے لگا تھا لیکن اگر یہ انشورنس خطیر رقم کا ہے تو وہ کون سی بات ہے جو حادثے کی طرح اس کے ذہن میں کھٹک رہی ہے؟

❁......❁❁......❁

اگلی صبح وہ مچھلی کے شکار پر روانہ ہونے کی غرض سے گھر سے نکلا اور اپنی ماہی گیر بوٹ پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا ساری چیزیں تیار تھیں۔ اسے صرف بنسی، چارے کی تھیلی برف کے پانی کا جگ اور سینڈوچ کی تھیلی اپنے ٹریلر میں رکھ کر جھیل کی جانب روانہ ہو جانا تھا لیکن اس بچی کی دلکش مسکراہٹ اس کی نگاہوں میں تیرنے لگی وہ ہمیشہ اسے دیکھ کر مسکراتی تھی اور کہتی تھی۔

''صبح بخیر۔'' مسٹر جارج آج کا دن بہت اچھا گزرے گا ہے نا؟'' یا پھر ''شام بخیر مسٹر جارج آپ نے بہت اچھا دن گزارا ہو گا۔''

جارج کا دل بھر آیا اور ساتھ ہی ذہن چیخ اٹھا۔ وہ خاموشی سے مڑ کر اپنی کار میں جا بیٹھا اور مضافات کی جانب روانہ ہو گیا۔ ہائی وے پر ایک کولڈ اسپاٹ کے سامنے رک کر اس نے آئس کریم کھائی اور وہاں موجود لوگوں سے تھوڑی بہت گپ شپ کرنے کے بعد اس کی طبیعت قدرے بحال ہو گئی۔ وہ وہاں سے روانہ ہو کر ایکمے انشورنس ایجنسی پہنچا۔ کمپنی کے مقامی ایجنٹ فریڈ نے اسے مسٹر چارلی سے متعارف کرایا جو ایجنسی کے نیو یارک دفتر کا خصوصی تفتیش کار تھا اور چند ہی لمحے پیشتر شہر میں وارد ہوا تھا اور ساتھ ہی بولا۔

''آپ مسٹر جارج کے سامنے گفتگو کر سکتے ہیں۔ یہ ہمارے محکمے پولیس میں عرصے تک چیف سراغ رساں کے عہدے پر فائز رہے ہیں۔''

''وہ بچی ایلس میری پڑوسن تھی۔'' جارج نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے میں اس سلسلے میں آپ کی مدد کر سکوں۔''

''وہ کس قسم کی لڑکی تھی؟'' چارلی نے پوچھا۔

''اتنی اچھی لڑکی میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔'' جارج نے جواب دیا۔ ''وہ اٹھارہ ماہ تک میرے پڑوس میں رہی لیکن میں نے اس عرصے میں کبھی اسے کوئی غلط حرکت کرتے نہیں دیکھا۔''

''اور ہنری ٹیٹز کیسا آدمی تھا؟''

''میں اسے نہیں جانتا، ہاں اکثر اس کی کار سڑک کے اس پار کھڑی نظر آتی تھی وہ غالباً اس کی بہن مسز فشر کی کار تھی۔''

''اور یہ مسز فشر کیسی عورت ہے؟''

''میں نے اسے پہلی بار تجہیز و تکفین کے موقع پر دیکھا تھا۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''کیا یہ امر آپ کو تعجب خیز نہیں لگتا کہ ایلس نے پچیس ہزار ڈالر کا بیمہ کرایا تھا اور یہ رقم اس کی موت پر اس کے ہونے والے شوہر یا شوہر کی بہن کو واجب الادا تھی اور حادثاتی موت کی صورت میں ہم تلافی نقصان کے معاہدے کی شق کے مطابق انہیں دگنی رقم ادا کرنے کے پابند تھے۔''

جارج کے کان کھڑے ہو گئے چارلی نے اپنی بات جاری رکھی۔

''اور کیا یہ امر آپ کو عجیب نہیں لگتا کہ ہنری جیسے متین اور بردبار شخص نے اپنی شادی سے چند ہی روز پہلے ری پبلک کمپنی کے ذریعے پچیس ہزار ڈالر کا بیمہ کرایا تھا اور یہ رقم بھی اس کی حادثاتی موت کی صورت میں اس کی ہونے والی دلہن اور دلہن کی موت کی صورت میں اس کی بہن مسز فشر کو دگنی واجب الادا ہوتی۔''

جارج کی نگاہوں میں ایلس کا دلکش اور معصوم چہرہ تیرنے لگا۔ چارلی کہہ رہا تھا۔

''انہوں نے پالیسی خریدی تھی اور پہلا پریمیم بھی ادا کیا تھا ہماری کمپنی کو یہ رقم ادا......!''

''آپ مجھے شامل کر لیں۔'' جارج بول پڑا۔ ''مجھ سے آپ کی جتنی مدد ہو سکے گی کروں گا۔''

''ان دونوں پر یقیناً کسی ایسے شخص کا دباؤ ہو گا جو اس کیس میں دلچسپی رکھتا تھا مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ مسز فشر کے سوا کوئی اور نہیں۔''

''جہاں تک انشورنس کا تعلق ہے وہ آپ کا معاملہ ہے لیکن اگر وہ بچی قتل کی گئی ہے تو پھر یہ میرا معاملہ ہے۔''

''آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔'' چارلی نے کہا۔

''کیا آپ جائے حادثہ کا معائنہ کرنے تشریف لے جائیں گے۔''

''ہاں چند منٹ میں روانہ ہو جاؤں گا۔''

''وہاں سڑک یا فٹ پاتھ پر کار کے پہیوں کا یا ریلنگ سے کار کے ٹکرانے کا کوئی نشان نہیں ہے۔'' جارج نے آگاہ کیا۔

''دلچسپ امر ہے۔'' چارلی نے معنی خیز انداز میں سر کو جنبش دی۔

❁......❁❁......❁

جارج وہاں سے رخصت ہو کر برادر فرنیچر اسٹور پہنچا، وہ جیمز فشر سے تھوڑی بہت گفتگو کرنا چاہتا تھا لیکن اسٹور کے منیجر نے اسے بتایا کہ فشر ایک ہفتہ قبل ملازمت چھوڑ کر جا چکا تھا۔

''وہ ایک اچھا سیلز مین تھا۔'' اس نے کہا۔

''یہاں چھ ماہ سے کام کر رہا تھا۔ سینٹ لوئیس سے آیا تھا اچھا خاصا کمیشن بنا لیتا تھا ملازمت کے دو ماہ بعد اس نے شادی کر لی تھی اور اگر آپ میری رائے سننا چاہتے ہیں تو میں یہی کہوں گا کہ اس نے غلطی کی تھی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ میں اس خاتون کے بارے میں کچھ نہیں جانتا جس سے اس نے شادی کی تھی لیکن وہ ہر ماہ تنخواہ کے روز یہاں آ دھمکتی اور اس سے ساری رقم بٹور کر لے جاتی تھی میں نہیں سمجھتا کہ وہ اسے یومیہ ایک ڈالر سے زیادہ خرچ کرنے کی اجازت دیتی ہو گی۔ میرے خیال میں وہی اس کی ملازمت چھوڑ جانے کی ذمہ دار ہے۔ شاید وہ اسے سینٹ لوئیس واپس لے جانا چاہتی تھی۔''

''کیا آپ جانتے ہیں اس کا سالا ہنری انسپائریشن پوائنٹ حادثے میں ہلاک ہو گیا ہے۔''

''ہاں جانتا ہوں بے حد افسوس ناک سانحہ ہے۔''

''مجھے یقین ہے کہ جیمز کو اس حادثے کی خبر نہیں ہے۔ وہ، اس کی بیوی کیتھرائن شادی کے موقع پر بطور گواہ موجود تھے لیکن وہ شادی کی رسم کی ادائیگی کے فوراً بعد سینٹ لوئیس روانہ ہو گیا ہو گا کیونکہ جنازے میں شریک نہیں تھا۔ کیا آپ ہنری کو جانتے تھے۔''

''ہاں میں نے اسے ایک بار دیکھا تھا۔ وہ سیاہ بالوں والا پستہ قامت لڑکا تھا۔ اس کی مونچھیں بے حد باریک تھیں شاید کیتھرائن کے ہمراہ تنخواہ کے روز آیا تھا۔''

''کیا جیمز کے دوسرے رشتہ دار بھی تھے۔''

''نہیں، بیوی کے سوا دنیا میں اس کا کوئی نہیں تھا یتیم تھا سینٹ لوئیس کے یتیم خانے میں پرورش پائی تھی۔''

''تو یہ بات ہے؟'' جارج نے معنی خیز انداز میں سر ہلا دیا۔

''آخر ماجرا کیا ہے؟''

''ایلس بھی یتیم تھی معلوم ہوتا ہے ہنری اور اس کی بہن کیتھرائن کو یتیموں سے بڑی محبت تھی۔'' اس نے جواب دیا اور کار پر سوار ہو کر واپس آ گیا اب اس کے کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا کیونکہ انشورنس کمپنی کا تفتیش کار معاملے کی چھان بین کر رہا تھا اس نے اپنی کار سے اتر کر مسز گراہم کی اطلاعی گھنٹی بجائی کافی انتظار کے بعد دروازہ کھلا۔

''تو یہ تم ہو؟'' مسز گراہم کا سراپا نمودار ہوا۔

''مسز گراہم اگر میں ایلس کے گھر کی تلاشی لینا چاہوں تو تم کو ناگوار تو نہیں گزرے گا۔ ہو سکتا ہے ہمیں کسی بات کا سراغ مل جائے ہمارے لیے کارآمد ثابت ہو۔''

مسز گراہم نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اس کی رہنمائی کرتی ہوئی خواب گاہ میں پہنچی وہاں سے اس نے ایک میز کی دراز سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا اور گیراج اپارٹمنٹ کی جانب گامزن ہوگئی۔ اپارٹمنٹ بے حد نفیس تھا اور ایلس کی نفاست پسند طبیعت کا عکاس تھا۔ ہر شے اپنی جگہ قرینے سے رکھی تھی۔ ڈرائنگ روم کی سجاوٹ قابل دید تھی۔ کچن بھی بے حد صاف ستھرا تھا۔ خواب گاہ کی ہر شے سفید تھی۔ ایک طرف اسٹینڈ پر سیاہ بالوں، سیاہ آنکھوں اور باریک مونچھوں کے مالک ایک نوجوان لڑکے کی مسکراتی ہوئی تصویر تھی۔ جارج پہچان گیا کہ یہی ہنری تھا "یہ ہنری ہے۔" مسز گراہم نے تصویر کی جانب سر سے اشارہ کرکے بتایا۔ "جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا تھا وہ چھوٹے قد کا مالک تھا۔ اس کے رخسار پر پڑنے والے گڑھوں پر غور کرو، میرے خیال میں لڑکا ٹھیک ٹھاک ہی تھا لیکن ایلس کی جگہ اگر میں ہوتی تو اسے کبھی پسند نہ کرتی۔"

دونوں ڈرائنگ روم میں واپس آئے ایک جانب دیوان کے دوسرے سرے پر چھوٹا سا بک شیلف تھا اور اس پر مصنوعی پھولوں کا ایک گلدان رکھا ہوا تھا اور گلدان کے پاس ہی ایک البم پڑا تھا۔ جارج نے البم اٹھالیا اور اس کے اوراق پلٹنے لگے۔ البم میں ایلس اور ہنری کی پکنک کے موقعوں کی تصویریں تھیں ایک دو تصویریں انسپائریشن پوائنٹ پر بھی کھینچی گئی تھیں ان تصویروں کے علاوہ ایک تصویر، ہنری اور اس کی بہن کیتھرائن کی تھی اور دوسری تصویر ہنری، مسز فشر اور ایک دوسرے شخص کی تھی صفحے کے ذیل میں اس شخص کا نام جیمز فشر تحریر تھا جو کیتھرائن کا شوہر تھا۔

مسز گراہم، میں یہ البم اپنے ساتھ لے جارہا ہوں، بعد میں واپس کردوں گا۔" جارج نے کہا۔

❁……❁❁……❁
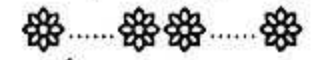
اس روز سہ پہر میں جارج ایک ڈرگ اسٹور میں آئس کریم کھاتے ہوئے اس معاملے پر از سر نو غور کرنے اور واقعات کی بے ترتیب تصویروں کو ذہن میں ترتیب سے سجانے لگا۔ پہلی واضح تصویر مسز فشر کی تھی اور اس کے شوہر جیمز فشر کی تصویر کو اس کے ساتھ رکھا جاسکتا تھا جو شادی کے فوراً بعد پراسرار طور پر غائب ہوگیا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ بالکل بے گناہ ہو، واقعی ملازمت کی تلاش میں سینٹ لوئیس روانہ ہوگیا ہو اور اسے اس حادثے کا کوئی علم نہ ہو، لیکن ممکن ہے یہ بات نہ ہو، ایلس اور ہنری کی موت سے مسز فشر کو ایک لاکھ ڈالر کا فائدہ پہنچنے کی امید تھی کیا یہ ممکن نہیں کہ اس رقم کے حصول کے لیے انہیں انتہائی سفاکی سے قتل کردیا گیا ہو اگر اس مفروضے کو ایک لمحے کے لیے درست تسلیم کرلیا جائے تو اس کیس میں صرف دو افراد ملوث ہوتے ہیں کیتھرائن فشر اور اس کا شوہر جیمز فشر۔

کوئی کار، سڑک یا فٹ پاتھ پر ٹائروں کا نشان چھوڑے بغیر دو سو فٹ گہرائی میں لڑھکتی نہیں چلی جاتی اور پھر اس صورت میں جبکہ اس کے اندر دو افراد موجود ہوں کیا وہ اطمینان سے کار میں بیٹھ کر کار کو نشیب میں لڑھکا دیں گے تاکہ ان کی موت سے دولہے کی بہن کو انشورنس کمپنی کی جانب سے ایک لاکھ ڈالر مل جائیں اور یہ جیمز فشر کون ہے؟ فرنیچر کی دکان والے بھی اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے لیکن اوہ...... کاؤنٹی کلرک کو اس کے بارے میں ضرور معلومات ہوں گی۔ جارج نے سوچا اور جلدی سے اپنی کار میں بیٹھ کر کاؤنٹی بلڈنگ کی جانب روانہ ہوگیا۔

کاؤنٹی کلرک اسمتھ نے شادی کے لائسنس کا رجسٹر کھنگالنے کے بعد اسے یہ اطلاعات فراہم کیں۔ "جیمز فشر، عمر پچیس سال جائے پیدائش سینٹ لوئیس، کیتھرائن این، عمر چوبیس سال جائے پیدائش ٹالبورٹ اوکلاہاما، شادی کا لائسنس انہیں تین ماہ قبل جاری کیا گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے ہنری ٹیز اور ایلس ہووارڈ کے لائسنس کا جائزہ لیا جس کی روشنائی بھی خشک نہیں ہوئی تھی لکھا تھا۔ "ایلس ہووارڈ، عمر انیس سال جائے پیدائش کنساس سٹی، ہنری ٹیز عمر پچیس سال جائے پیدائش سینٹ لوئیس۔"

"بہت خوب، جارج نے دل میں کہا لیکن اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ صرف یہی کہ ہنری ہنی مون سے واپس آنے کے بعد ملازمت کے حصول کی خاطر اپنے آبائی شہر واپس جانا چاہتا تھا لیکن اگر کیتھرائن فشر کی جائے پیدائش ٹالبوٹ ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ دونوں سوتیلے بہن بھائی تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ شادی اور علیحدگی جیسے واقعات بہت تیزی سے رونما ہوئے تھے۔ اتنی تیزی سے گویا اس کے پیچھے کوئی خاص مقصد کار فرما ہو لیکن کہیں نہ کہیں کوئی سقم ضرور رہ گیا تھا جو دعوت تفتیش دیتا تھا۔

❁……❁❁……❁

ٹالبوٹ وہاں سے پچاس میل دور مغرب کی جانب واقع تھا اور اس کی آبادی فقط ساڑھے تین ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ جارج کو امید تھی کہ وہ اس مقام سے تھوڑی بہت معلومات حاصل کرسکے گا۔ اس کے چند ہی گھنٹے بعد وہ ٹالبوٹ کے ایک ڈرگ اسٹور پر کھڑا آئس کریم کھا رہا تھا آئس کریم کھاتے اور ڈرگ اسٹور کے مالک مسٹر کونارڈ سے اِدھر اُدھر کی گپ شپ لڑانے کے بعد اس نے پہلا پتا پھینکا۔ سب سے پہلے اس نے کیتھرائن جیمز اور ہنری کا حلیہ بیان کیا اور پھر بولا۔ "اس خاتون کا کہنا ہے کہ وہ ٹالبوٹ میں پیدا ہوئی تھی آپ تو اسے نہیں جانتے ہوں گے یا کہ جانتے ہیں؟"

"بے شک جانتا ہوں، اس کا پورا نام کیتھرائن ہے، یہیں پیدا ہوئی، جوان ہوئی اور دو سال قبل تک یہیں زندگی گزاری، ہنری اس کا بھائی تھا۔ ان دونوں کے یہاں سے دفع ہونے کے بعد ہم لوگوں نے سکون کی سانس لی تھی۔"

"ہنری اس کا بھائی تھا؟" جارج نے پوچھا۔

"ہاں، میں کئی موقعوں پر اسے اپنے ڈرگ اسٹور سے مار کر بھگا چکا ہوں، کیش سے رقم چرالیا کرتا تھا کیتھرائن بھی اس سے بہتر نہیں تھی۔"

"عجیب بات ہے فورٹ مینڈرس میں وہ ہنری ٹیز کے نام سے مشہور ہے۔"

"اگر آپ ان لوگوں سے واقف ہوتے تو ایسی بات نہ کہتے۔ آپ اس خاندان سے کس بات کی توقع رکھتے ہیں۔ پورا خاندان چور، اوباش تھا پیسے کی خاطر سب کچھ کرنے پر آمادہ رہتا تھا۔ کیتھرائن ہی کو لے لیں اس شہر میں اس سے بڑا بلیک میلر پیدا نہیں ہوا۔ اس نے بڑی گندگی پھیلا رکھی تھی۔ وہ لڑکے جو اس کے پیچھے لگے رہتے تھے۔ انہیں مجبوراً یہ جگہ چھوڑنی پڑی۔ اس کا باپ قمار خانوں سے غنڈہ ٹیکس وصول کیا کرتا تھا۔ ہنری نے بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی لیکن منہ کی کھائی۔ کئی موقعوں پر بری طرح مار کھائی، انتہائی ذلیل اور کمینہ لڑکا تھا لیکن مسٹر جارج انہیں کیا ہوا، کیا انہوں نے وہاں بھی کوئی مصیبت کھڑی کردی ہے؟"

"کوئی خاص بات نہیں ہے میں صرف انشورنس کے سلسلے میں تھوڑی بہت تفتیش کررہا ہوں۔"

"اوہو، پھر تو بات صاف ہوگئی، ہنری نے یہاں بھی ایسا ہی ایک چکر چلانے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہوسکا وہ ہمیشہ لمبا ہاتھ مارنے کی سوچتا تھا یہاں سے اس نے سینٹ لوئیس کا رخ کیا تھا لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ یا کیتھی آپ کے شہر میں موجود ہے۔"

جارج وہاں سے اپنے شہر فورٹ مینڈرس روانہ ہوگیا۔ اس کی کار میانہ روی سے فاصلہ طے کررہی تھی لیکن ذہن بہت تیزی سے کام کررہا تھا۔ وہ اس معاملے پر جتنا غور کرتا صورت حال اتنی ہی واضح ہوتی چلی جاتی، نصف فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے کار سڑک کے کنارے کھڑی کردی اور پہلے سے زیادہ شدت سے غور و خوض کرنے لگا۔ ایک نو بیاہتا جوڑا ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں بلندی سے گر کر ہلاک ہوگیا اور دونوں فی کس پچاس ہزار ڈالر بیمہ کی رقم دولہا کی بہن کے لیے چھوڑ گئے۔ دولہا کی یہ بہن ایک بلیک میلر ہے اور گھٹیا خاندان سے تعلق رکھتی ہے، دولہا نے ہنری ٹیز کے نام سے شادی کی جبکہ اس کا پورا نام ہنری این لو ہے، دولہا چور تھا اس نے انشورنس میں بھی بدعنوانی کی کوشش کی تھی اور وہ اپنی دلہن کے ساتھ تحت الثریٰ میں پہنچ گیا۔ جارج نے یکایک کار اسٹارٹ کردی اور سیدھا ادارہ تجہیز و تکفین کے ڈائریکٹر کے گھر پہنچ گیا۔ ڈائریکٹر نے اس کے ایک سوال کے جواب میں نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں متوفی ہنری ٹیز ہی تھا اس کی بہن نے اس کی لاش شناخت کی تھی اور یہ بات تم بھی جانتے ہو، آخر ماجرا کیا ہے؟"

جارج نے ہنری کی تصویر اپنی جیب میں رکھ لی۔ "اس وقت میں کچھ نہیں بتا سکتا۔" اس نے جواب دیا۔ "لیکن میں جلد ہی تمہارے پاس واپس آؤں گا۔"

اس نے اپنے پرانے ریڈیو کے ذریعے پولیس اسٹیشن سے رابطہ قائم کرکے جج بروک مین اور وکیل استغاثہ رچرڈ کو ان کے دفتر میں رکنے کا پیغام بھجوایا اور اس کے پندرہ ہی منٹ بعد اس کے ہاتھ میں ہنری کی لاش کھود کر نکالے جانے کا حکم نامہ تھا۔

"تم خوب جانتے ہو کہ کیا کرنے جارہے ہو؟" جج نے مشکوک لہجے میں کہا۔

''لوگ اس قسم کے معاملات میں بڑے جذباتی ہوتے ہیں وہ لاشوں کو چھیڑنا پسند نہیں کرتے لیکن اگر تمہیں کسی گڑ بڑ کا یقین ہے تو کوئی بات نہیں میری دعائیں تمہارے شامل حال ہیں۔''

''یہ میرا دردِ سر ہے۔'' جارج نے جواب دیا۔ ''میں نے اپنی تجہیز و تکفین کا بندوبست کرلیا ہے۔''

اسی شام ہنری کی لاش قبر کھود کر نکالی گئی اور فرنیچر کی دکان کے مالک مینڈرس نے ہنری کی لاش کو جیمز فشر کی لاش کی حیثیت سے شناخت کرلیا۔ اس کے ایک گھنٹے کے اندر اندر اس لاش کے پوسٹ مارٹم کے احکامات ساتھ ہی ایلس کی لاش قبر سے نکال کر اس کے پوسٹ مارٹم کے احکامات بھی جاری کردیے گئے اور کیتھرائن فشر کو قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا اور پولیس نے اس پر دباؤ ڈالا تو اس نے ایلس اور اپنے شوہر جیمز فشر کے قتل کا اقرار کرلیا۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ پولیس اس کے بھائی ہنری کو تلسا سے گرفتار کرسکتی ہے۔ اس نے اپنے بیان میں کہا کہ ہنری نے طے شدہ منصوبے کے تحت ایلس کے سر پر ایک سلاخ سے ضرب لگا کر اس وقت ہلاک کیا تھا جب وہ خوشی سے سرشار انسپائریشن پوائنٹ سے طلوع ہوتے ہوئے چاند کے سحر انگیز منظر سے لطف اندوز ہورہی تھی۔ وہ اور اس کا شوہر جیمز اس کے تھوڑی دیر بعد ہی انسپائریشن پوائنٹ پہنچے تھے جہاں بھائی بہن کو اپنے منصوبے کے تحت دوسرا قتل کر کے اس مقتول جوڑے کو خدا حافظ کہہ کر اپنے سفر پر روانہ ہوجانا تھا۔ جب یہ دونوں میاں بیوی اس مقام پر پہنچے تو ہنری پہلے ہی ایلس کی لاش کار کے اندر چھپا چکا تھا ان کے پہنچنے پر اس نے ان دو کا استقبال کیا اور جیمز سے کہا کہ کار کے عقبی پہیے میں کچھ گڑ بڑ ہوگئی ہے جیمز اس کی بات سن کر عقبی پہیے کی جانب جھکا اسی لمحے ہنری اور کیتھرائن دونوں نے پیچھے سے اس کے سر پر اس سلاخ سے ضرب لگائی جو انہوں نے کار کی سیٹ کے نیچے چھپا رکھی تھی اور پھر تابڑ توڑ ضرب لگاتے گئے تاکہ اس کی ہلاکت میں کوئی شبہ باقی نہ رہے۔ اس کے بعد دونوں بھائی بہن نے اس کی لاش اٹھا کر کار کے اندر رکھی اور کار ریلنگ کے دوسرے سرے تک لے گئے پھر انجن کو نیوٹرل میں کر کے اس کے بریک ریلز کردیے اور کار سے اتر پڑے پھر ہنری نے کار کو دھکا دیا اور کار نشیب میں لڑھکتی چلی گئی۔ دونوں بھائی بہن اطمینان سے مڑے اور شہر واپس آگئے اور ہنری بذریعہ بس تلسا سٹی روانہ ہوگیا۔

''ہم شروع سے دولت حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔'' کیتھرائن نے کہا ''ہم نے جیمز اور ایلس کا انتخاب اس وجہ سے کیا تھا کیونکہ دونوں یتیم تھے اور ان کا کوئی رشتہ دار نہیں تھا جو ہمارے لیے پریشانی کا باعث بنتا۔ ہم نے سمجھا تھا کہ ان کی موت کے بعد کوئی بھی کسی قسم کا ہنگامہ کھڑا نہیں کرے گا۔

جنازے میں شریک ہونے والے لوگ جم سے ناواقف تھے اور ہنری کو بھی شہر کے چار یا پانچ افراد سے زیادہ کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ ہم نے تجہیز و تکفین کے ادارے کو سختی سے ہدایت کی تھی کہ کسی کو بھی لاشوں کے چہرے نہ دکھائے جائیں ہم نہیں سمجھتے تھے کہ ہم انشورنس کی رقم حاصل کرنے میں ناکام رہیں گے۔ لاشوں کے پوسٹ مارٹم سے دماغی چوٹ کے سوا کچھ بھی ثابت نہیں کیا جاسکتا تھا۔

❁......❁❁......❁

''دونوں بہن بھائی بے شک کامیاب رہتے۔'' انشورنس کمپنی کا تفتیش کار چارلی کہہ رہا تھا۔ ''لیکن میں شروع ہی سے سمجھ رہا تھا کہ یہ حادثہ نہیں بلکہ قتل ہے تاہم ان لوگوں نے بے حد شاندار منصوبہ تیار کیا تھا اور اگر اپنے اس منصوبے میں کامیاب ہوجاتے تو نہ جانے آئندہ اور بھی کیسے کیسے جرائم کا ارتکاب کرتے لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ایلس کی دلکش مسکراہٹ نے مسٹر جارج کا دل جیت لیا تھا جو اس کے پڑوس میں رہتے تھے۔'' اس نے مسکرا کر جارج کا شانہ تھپ تھپایا۔ ''مسٹر جارج، یہ آپ کا کارنامہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ انشورنس کمپنی نہ صرف آپ کی حد درجہ شکر گزار و ممنون ہوگی بلکہ آپ کو خوش کرنے کا اہتمام بھی کرے گی۔''

جارج اس کی یہ بات سن کر مسکرا دیا اور سوچنے لگا اگر انشورنس کمپنی نے اسے رقم پیش کی تو انعامی رقم کسی یتیم خانے کے حوالے کردے گا۔

فن پارے

دیس بدیس نئے اور پرانے لکھاریوں کی رنگارنگ تحریریں جو آپ کے دل کو چھولیں گی

راکشش

مہر افروز

مہر افروز کا تعلق بھارت کی ریاست کرناٹک سے ہے اور آپ بھارت کی متعدد ادبی انجمنوں سے وابستہ ہیں اور اردو ادب کو زندہ رکھے ہوئے ہیں. وہ کرناٹک میں ایک بڑی این جی او ھدیٰ فاؤنڈیشن کی سرپرستی کرنے کے علاوہ ایک ادبی جریدے خرمن انٹرنیشنل کی مدیرہ بھی ہیں اور بھارت کی متعدد زبانوں کی ادیبہ ہیں. یہ نئے افق کے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ انہوں نے اپنی تحریریں ہمیں ارسال کیں.

''شاہد اور کتنا بھٹکیں گے میں تھک رہی ہوں۔''

''تھوڑی دیر اور صبر کرلو دو ایک گھر اور پھر واپس چلیں گے۔''

وہ دونوں میاں بیوی شہر میں گھر کی تلاش میں نکلے تھے۔ یہ شہر انہوں نے اپنی مرضی سے چنا تھا۔ قریئے میں نوکری کرتے ان کے پانچ سال گزر چکے تھے ان کی شادی کو بھی تین سال پورے ہو رہے تھے۔

شاہد کوٹ قلعہ دیہات کے اکلوتے پوسٹ آفس کا پوسٹ ماسٹر اور وہ قریہ کے اکلوتے سرکاری اسکول کی استانی تھی۔ روزانہ کا آنا جانا ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانا ایک سال تک جاری رہا پھر انہوں نے اپنے والدین کی رضامندی سے شادی کرلی...... دو سال قریہ کا پرسکون ماحول اور زندگی بہت خوبصورت ہوگئی تھی۔ قریہ کے قدرتی نظارے ہر قسم کے نفری زہر سے پاک تھے۔ سماج کے تقریباً سب لوگ آپس میں مل جل کر رہتے۔ حالانکہ یہاں بھی بھی چھوٹی بڑی ذاتوں کے محلے الگ الگ ہی تھے مگر انسانیت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

وہ دونوں اس قریہ کی زندگی اور ہر ذات کے لوگوں اور سماج کا اٹوٹ حصہ تھے۔ وہ شہر سے رابطے اور پوسٹ اور اخبار لانے کا واحد ذریعہ اور یہ قریہ کے ہر بچے کو انگریزی زبان پڑھانے والی اور علم بانٹنے والی پیاری سی معلمہ سب لوگ دونوں سے بہت خوش تھے یوں کہیں تو وہ پورے گاؤں کی چاہتوں کا مرکز تھے۔ اس لیے کہ سب لوگوں کی بنیادی ضرورتیں ان دونوں سے جڑی ہوئی تھیں۔ جب انہوں نے وہاں سے نکلنے اور شہر جا کر بسنے کی بات کی تو سارا قریہ مخالفت پر اتر آیا۔ کوئی بھی ان دونوں کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔

مگر شاہد بہت حساب کتاب والا بندہ اور منصوبہ ساز ذہن کا مالک تھا۔ اس کا خیال تھا فیملی شروع کرنے سے پہلے ان کا شہر منتقل ہونا بہت ضروری تھا تاکہ اپنے ہونے والے بچے کے لیے تمام سہولتیں میسر ہوں۔ اس لیے اس نے کوششیں شروع کردیں۔

الگ الگ محکموں سے تبادلہ لینا وہ بھی ایک ہی شہر میں آسان نہ تھا...... مگر شاہد جیسے زیرک شخص نے مشکل کام کو ممکن کر دکھایا اور ان دونوں کا تبادلہ قریبی شہر میں ہوگیا۔

اب رہائش کے لیے مکان کی تلاش شروع کردی ایجنٹ کو کمیشن دیا اور وہ ہر اتوار کوئی نہ کوئی اطلاع دیتا اور یہ دونوں اپنی بائیک پر شہر آتے کہ مکان دیکھ سکیں اور ہر بار یہی سننے کو ملتا۔

''مسلمان کو گھر نہیں دیں گے۔''

''مسلمانوں کو گھر دینا منع ہے۔''

''گوشت کھانے والوں کو گھر نہیں دیا جاتا۔''

''سوری اس محلے میں مسلمانوں کو گھر دینا منع ہے سوری ہم اس میں وشواس تو نہیں رکھتے مگر کیا کریں محلے والوں سے دشمنی تو نہیں لے سکتے۔'' یہ سیکولر کہلانے والوں کا جواز ہوتا۔

برہمنی، مرہٹی، جینی، لنگایت، سب محلوں میں مسلمانوں کو گھر دینا منع تھا۔

وہ مسلمانوں کے محلے پہنچے گندی تنگ گلیاں ننگ دھڑنگ پھرتے گالیاں بکتے بچے ایک دوسرے سے لڑتی عورتیں بیڑیاں پھونکتے چوک پر بیٹھے بوڑھے زردہ پان کھا کر پیک تھوکتے آنے جانے والوں پر فقرے کستے تاکتے اور مذاق اڑاتے نوجوان۔

مرتا کیا نہ کرتا ایک دو گھر وہاں بھی دیکھے، ایک بیڈروم کا گھر پانچ ہزار کرایہ اور ایک لاکھ ایڈوانس۔

''ایں یہ کیا ہے؟ ہم مسلمان ہی تو ہیں۔'' انہوں نے دلیل دی۔

''مسلمان ہیں تو کیا ہوا دونوں سرکاری ملازم بھی تو ہیں! اچھی خاصی تنخواہ ہوگی دونوں کی۔''

دلیل کی جوابی دلیل بہت شاندار تھی، گویا سرکاری ملازم ہونا گناہ ہوگیا۔ وہ جہاں بھی گھر دیکھنے جاتے، لوگ ان کو اس طرح دیکھتے جیسے، ذبح سے پہلے قصائی جانور کو دیکھتا ہے کہ کتنا گوشت نکلے گا۔

ان دنوں عذرا کے دن چڑھ گئے تھے شام تک مکان کی تلاش میں مسلسل بھٹکنے تک وہ تھک جاتی اور شاہد پر چڑ جاتی۔

''تم سے کس نے کہا تھا کہ تبادلہ کروالو اور شہر آؤ وہیں پڑے رہتے سب تو کتنے اچھے ہیں۔''

''ارے کیا اس ماحول میں اپنا بچہ جنمے گا؟ مجھے اسے آئی اے ایس بنانا ہے آئی اے ایس......!

اس کے لیے شہر کا ماحول ضروری ہے۔ تم نہیں سمجھو گی۔

شاہد کی اپنی منطق تھی، وہ جانے کن خوابوں کو دیکھ رہا تھا۔

''رہو گے کہاں؟ گھر تو نہیں دے رہا کوئی مسلمان کو۔''

''اطمینان رکھو مل جائے گا۔ بہت بڑا شہر ہے سب تعصب پرست نہیں ہیں۔ کہیں نہ کہیں کوئی انسان تو ضرور ہوگا۔''

کسی خوش آئند خواب سے اس کی سیاہ گہری آنکھیں ہمیشہ دمکتیں اور اس کے اس یقین کے سامنے وہ بے بس اور بے زبان ہو جاتی۔

آخر ان کو مکان مل ہی گیا اور انہوں نے منتقلی کی ٹھان لی ایک پوسٹ آفس میں کام کرنے والے دلت بھائی نے جس کا تبادلہ دوسرے شہر ہوگیا تھا اپنا مکان شاہد کو پانچ سال تک کے لیے کرایہ پر اٹھا دیا۔

جب وہ اپنا سارا سامان ٹرک میں بھر کر گاؤں سے نکلے تو ان کو الوداع کہنے سارا گاؤں امڈ آیا سب اسے ایسے وداع کر رہے تھے جیسے ان کے گاؤں سے ان کی بیٹی جا رہی تھی۔ دونوں طرف آنکھیں نم تھیں...... گاؤں سے باہر آکر وہ بلک بلک کر رو پڑی۔

دلت بھائی ویریندر چوآن کے گھر میں انہوں نے اپنی زندگی کی پہلی رات گزاری شاہد بہت خوش تھا اسے لگا، اس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا معرکہ سر کرلیا۔ دونوں نے نئے جوش سے اپنا سنسار شروع کیا۔

شہر کے مشہور گائناکالوجسٹ سریش کلکرنی سے انہوں نے رابطہ قائم کیا تاکہ بچہ محفوظ ہاتھوں میں پیدا ہو۔ ہر ہفتہ باقاعدہ چیک اپ کے لیے جاتے جیسے جیسے دن بھرتے گئے شاہد کے سپنے گہرے ہوتے گئے۔

آخری ہفتے کی اس کی ننگ کے دوران ڈاکٹر نے کہا سرجری کرنی ہوگی بچہ ابھی تک گھوما نہیں ہے اب بھی سر اوپر اور

پیر نیچے ہیں دن بھر گئے ہیں بچہ اور زیادہ دن تک رحم میں نہیں رکھ سکتے پیدائش کا وقت قریب تھا۔

شاہد تذبذب میں تھا۔ اس نئی افتاد نے اسے بوکھلا دیا وہ چاہتا تھا ڈلیوری نارمل ہو اور بچہ بھی نارمل ہو اس کے لیے اس نے سارے ڈاکٹری مشوروں پر عمل کیا تھا عذرا کا بہت خیال رکھا تھا...... ناں ناں کرتے کرتے شاہد کو سرجری کے پیپرز پر دستخط کرنے پڑے عذرا آپریشن تھیٹر میں تھی اور وہ ہاتھ جوڑے پہلی جنوری کی سرد رات میں بے چینی سے باہر ٹہل رہا تھا۔ نرس بوکھلائی ہوئی باہر آئی۔

''لڑکی ہوئی ہے پر رو نہیں رہی ہے۔'' اس اطلاع پر شاہد بنچ پر بیٹھ گیا نرس شاید کسی اور طرف نکل گئی تھی۔

آکسیجن سلنڈر گھسیٹ کر آتی نرس کو دیکھ کر وہ اٹھا۔

''لڑکی ہی ہوئی ہے۔'' اس نے تصدیق چاہی۔

''ہاں ہاں لڑکی ہی ہوئی ہے۔'' نرس دروازے کے پار غایب ہوگئی۔

شاہد کی مایوسیاں بڑھ گئیں اس نے بادل ناخواستہ کوائن باکس والے فون میں سکہ ڈالا اور نمبر لگائے۔

''اماں کو لے کر آجائیں عذرا کی سرجری ہوئی ہے لڑکی ہوئی ہے۔''

اس نے اپنے والد کو اطلاع دی۔

رات کے دو بجے ایک ننھی سی جان اس کے حوالے کی گئی۔ اس نے اسے گود میں لے کر ہلکے سے سینے سے لگایا عجیب سی ہمک جاگی اور لگا یہ میرا ہی حصہ ہے پھر وہ بھول گیا وہ لڑکی تھی......''

عذرا اندر ہی تھی کچھ پیچیدگیاں ہوگئی تھیں۔

صبح صبح بچی کو قے شروع ہوگئی۔ وہ ڈاکٹر کے پاس بھاگا۔

''ارے اسے تو فٹس آیا ہے۔''

''فٹس! کیوں! کیسے؟'' وہ مجسم سوال تھا۔

''کل جب یہ روئی نہیں تو ڈاکٹر نے اس کی گردن پر زور سے تھپکی دی تھی جو شاید کچھ زیادہ لگ گئی ہے۔'' نرس بے خیالی میں بول گئی۔

بچی کو انٹینسیو کیئر میں لے جایا گیا اس کی ناک سے حلق میں نلی ڈالی جا رہی تھی فیڈنگ کے لیے وہ دیکھ نہیں سکا باہر نکل آیا۔

''اللہ یہ میرے ساتھ ہی کیوں؟'' ہاتھوں میں چہرہ چھپائے وہ رو پڑا۔

شام کو نئی بری خبر منتظر تھی۔

''بچی کی قے میں خون آرہا ہے۔''

''کیوں کیا ہوا۔''

''حلق میں نلی ڈالتے وقت کہیں رپچر ہوگیا ہے۔'' نرس کی غلطی ہے۔

اب بولنے کی باری ڈاکٹر کی تھی جو نرس پر برس رہا تھا۔

وہ باہر سے دوسرے پیڈیاٹرک کو لے آیا۔

''اپنا خون چیک کروائیں شاید بچی کو خون دینا پڑے۔'' بچوں کے ڈاکٹر سبھاش بھٹ نے کہا جسے وہ لے آیا تھا۔

عذرا کو پرائیویٹ وارڈ میں شفٹ کیا گیا۔

اس نے اپنا خون دیا دو دن کے اندر بچی کو ایک بوتل خون دیا گیا۔ بچی بہت سیریس تھی سانس چل رہی تھی۔

عذرا اپنے کمرے میں دعائیں مانگ رہی تھی پہلا بچہ اور یہ کیسا امتحان ہے اللہ وہ ساس کے گلے لگ کر رو پڑی۔

ستائیس دن عذاب گزرے بچی انٹینسیو کیئر میں اور وہ تنہا کمرے میں جنوری کی سرد راتیں بڑی سخت اور ظالم تھیں۔

اٹھائیسویں دن سوا لاکھ کا بل بھر کر وہ دونوں کو گھر لے آیا گویا اس نے دو جانوں کی قیمت چکائی تھی۔

چھ مہینے گزر گئے بچی صحت یاب ہوگئی وہ دونوں بچی کو دیکھ کر جیتے۔

مگر عذرا نے ایک بات نوٹ کی بچی کبھی اس کو دیکھ کر مسکراتی نہیں تھی اسے دیکھتے ہی ماتھے پر بل ڈالتی اور زبان باہر نکالتی مگر جب اس کی آواز سنتی تو مسکراتی اور آوازیں نکالتی جو بھی بچی کو دیکھتا یہی کہتا ارے اتنی سنجیدہ بچی یہ مسکراتی کیوں نہیں۔

پھر وہ سبھاش بھٹ کے پاس گئے۔ اپنا مسئلہ۔ کران کے لیے وہی خدا تھا جس نے بچی کو نیا جنم دیا تھا۔

اس نے پھر سے بچی کا معائنہ کیا اور کہا۔

''مجھے لگتا ہے یہ دیکھ نہیں پاتی۔''

''کیا دیکھ نہیں پاتی؟ کیسے؟ کیوں؟'' ان کے سروں پر دوسرا پہاڑ ٹوٹا تھا۔

''ایک تو لڑکی اور وہ بھی دیکھ نہیں پاتی۔'' شاہد سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''آپ کے گھر میں کوئی اس طرح کا ہے۔'' ڈاکٹر سبھاش بھٹ ان سے سوال کر رہا تھا۔

''نہیں بالکل نہیں دس پشتوں میں بھی نہیں نہ میرے نہ اس کے۔'' وہ چیخ پڑا۔

''تحمل رکھیں ہوتا ہے کبھی کبھی کسی پچھلے جنم کا قرض چکانا پڑتا ہے۔'' یہ ایک ڈاکٹر بول رہا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب میں جنموں میں یقین نہیں رکھتا ایک ہی جنم کافی ہے سپنوں کا قرض چکانے۔ وہ رو پڑا۔

''یہ آنکھوں کے مشہور ڈاکٹر ہیں ان کو میں نے یہ خط لکھ دیا ہے کل کا اپائنٹمنٹ ہے وہ معائنہ کر کے بتا دیں گے وجہ کیا ہے اور کرنا کیا ہے آگے۔ آپ حوصلہ رکھیں۔'' وہ شاہد کی پیٹھ تھپ تھپا رہا تھا۔

وہ بڑی امید لیکر دوسرے ناخدا کے پاس پہنچے کہ شاید وہ کوئی اچھی نوید دے۔

''یہ تو یقینی ہے کہ یہ دیکھ نہیں سکتی اس کی آپٹک نروڈ تیمج ہے۔

اس کی بصارتی عصبیہ مجروح ہے جس کی وجہ خون دماغ سے آنکھوں تک نہیں پہنچتا اور اس کو بچوں کا موتیا بند ہوگیا ہے اور اس کا عدسہ مر گیا ہے آپریشن کرنا ہوگا............ وہ تفصیل سے ڈایگرام خاکہ نکال کر سمجھا رہا تھا۔

''کیا وجہ ہوئی یہ کہیں سے گر گئی تھی کیا اس کے چھوٹے دماغ پر چوٹ کا اثر ہے۔''

اور شاہد کے دماغ میں پوری فلم گھوم گئی۔

''کل جب یہ روئی نہیں تو ڈاکٹر نے اس کی گردن پر تھپکی دی تھی جو شاید زور سے لگی تھی۔'' نرس کی آواز گونجی اور وہ ہوش میں آیا اور اس نے ڈاکٹر کو تفصیل بتائی۔

''اوہ سن کر افسوس ہوا ہو جاتا ہے کبھی کبھی ڈاکٹر انسان ہی ہیں بھگوان نہیں۔'' کچھ نہیں کر سکتے آگے کی سوچیں بس ایک ہی راستہ ہے آپریشن کروالیں اس کے لیے آپ کو چین جانا پڑے گا۔''

''چین؟ کیوں۔''

''کیونکہ شاہد صاحب اتنے چھوٹے بچے کا آنکھوں کا آپریشن کرنا یہاں ممکن نہیں اتنی سہولیات کا کوئی اسپتال قریب میں موجود نہیں ہے۔''

ایک اور نیا خط اور نئے بھگوان کا نام انہیں بھا دیا گیا جو ان کی بچی کو بینائی دے سکتا تھا۔

بچی کی پیدائش، عذرا کا مسلسل چھٹی پر رہنا تنخواہ کا نہ ملنا وہ کافی پریشان تھے ان کی مالیات بہت خستہ ہوگئی تھی اور اب یہ تیسری افتاد تھی۔

ان کو چین ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ جانا پڑا سارے ڈیپازٹ، لائف انشورنس، فنڈز سے ان کو رقم نکالنی پڑی حتیٰ کہ وہ مقروض ہوگئے۔

شاہد کے تمام تر سپنے خون آگیں تھے کسی نے اس کے معصوم خوابوں کا خون کر دیا تھا۔

ڈاکٹر گوپال کرشن ان کو سمجھا رہا تھا۔

''دیکھیں آپریشن کے دوران بچی پوری طرح نابینا بھی ہوسکتی ہے یا ففٹی پرسینٹ دیکھ بھی سکتی ہے دونوں چانسیس ففٹی ففٹی آپ اس پر دستخط کر دیں۔'' ناخدا اپنی کمزوریوں کے جواز سے آگاہ کر رہا تھا۔

اللہ کا نام لے کر اس نے ساری ہمتیں سمیٹیں اور دستخط کر دیے۔

جب اس کی آنکھوں کی پٹی کھلی تو وہ پہلی بار مسکرائی اس کی مسکراہٹ ان کی زندگی کا سب سے بڑا انعام تھی۔

''امی ابو۔'' اس نے ان کو دیکھ کر پہلی مرتبہ پکارا اور ان دونوں کی بینائی دھندلا گئی اور وہ دونوں اس سے لپٹ کر رو پڑے۔

''یہ بینائی صرف ففٹی پرسینٹ ہے دس فٹ سے زیادہ دور یہ کچھ نہیں دیکھ پائے گی۔ ہر وقت اس کو آپ کے سہارے کی ضرورت رہے گی بہت زیادہ خیال رکھیں۔'' وہ اپنی خوشیاں سمیٹے لوٹ آئے۔

بچی کے پانچویں سال ان کو اس کے اسکول کی فکر ہوئی اس نے وہ سارے اسکول چھان ڈالے جہاں مخصوص بچوں کی تعلیم ہوتی ہو آفس میں کسی نے صلح دی ایسے بچوں کے لیے شبھا کلکرنی کا اسکول بہت اچھا ہے۔

دونوں بڑی امیدیں لیکر وہاں پہنچے اسکول دیکھا وہاں موجود بچوں کو دیکھا۔ سب سے بات کی کچھ تو معصوم بول نہیں پاتے تھے کچھ سن نہیں پاتے کچھ لنگڑے لولے...... آدھے اندھے اور ادھورے معصوم سے پھول کھلکھلا رہے تھے...... اس کی آنکھیں ان ادھورے کھلے پھولوں کو دیکھ کر بھر آئیں...... وہ دونوں اپنا غم بھول گئے...... مگر ایک بات عذرا کو کھٹکی تھی سارے کے سارے بچے یا تو مسلمان تھے۔ عیسائی تھے یا پھر دلت تھے...... صرف دو بچے اونچی ذات کے تھے جو ذہنی معذور تھے۔

وہ دونوں پورا اسکول دیکھ کر آفس میں داخل ہوئے تاکہ بچی کا داخلہ کروالیں۔

گھومتی کرسی پر بہت خوبصورت پرنسپل بجی سنوری مسکراہٹ سجائے ان کا استقبال کر رہی تھی اس کی کرسی کے پیچھے ایک بڑی سی تصویر لگی تھی جس میں ڈاکٹر سبھاش کلکرنی شہر کے مشہور گائنا کالوجسٹ سفید شرٹ اور خاکی چڈی پہنے کیسری جھنڈے کو سلامی دیتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ عذرا نے گھبرا کر پوچھا۔

''یہ...... یہ...... یہ کون ہیں؟''

''یہ...... یہ...... میرے ہسبنڈ ہیں سبھاش کلکرنی۔'' شبھا کلکرنی کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''ان کو مخصوص بچوں سے بہت محبت ہے اور اتفاق سے یہ سارے کے سارے انہی کے اسپتال میں جنمے ہیں۔'' وہ تفصیل سے بتا رہی تھی۔

وہ جھٹکے سے اٹھی بچی کو سینے سے لگایا اور تیزی سے باہر نکلتی ہوئی ہذیانی انداز میں چیختی ہوئی باہر کو دوڑی جیسے اس نے کسی بچہ کھانے والے راکشش کو دیکھ لیا ہوا۔

''شاہد باہر آؤ باہر آؤ میں یہاں اپنی بچی کو نہیں ڈالوں گی۔''

☆......☆☆☆......☆

ڈھائی سو روپلی کا مجاھد

تحریر: امین صدرالدین بھایانی

امین صدرالدین بھایانی ملک کے ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ وہ جب بھی قلم اٹھاتے ہیں ان کا قلم عشق و محبت کے نغمے بیکھیرنے کے بجائے نشتر بن کر معاشرے کا آپریشن کرنے لگاتا ہے۔

ایک سپاہی کا قصہ' وہ ملک و قوم کی خاطر محض اس لیے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کو تیار تھا کہ اس کے وطن کی بیٹیاں اور بیٹے امن و سکون کی زندگی جی سکیں مگر اس وطن کے زردار معصوم لوگوں کی زندگیوں' غزتوں سے کھیل کر قانون کا' اس ملک کے آئین کا مذاق اڑانے پر تلے ہوئے ہیں۔

''ارے بھئی شمشاد ذرا اِدھر تو آنا۔'' میں نے نیوز روم کے دروازے کے عین ساتھ اسٹول پر بیٹھے سینے سے سر لگا کر سوتے چپراسی کو زور سے آواز دیتے ہوئے کہا۔ میری آواز کی گھن گھرج سے بیچارے نے گھبرا کر ٹھوڑی اٹھائی اور نیند کے خُمار میں ڈوبی ہوئی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

''ارے بھئی شمشاد ذرا جلدی اِدھر آؤ۔'' میں نے ایک بار پھر اسے اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا اور وہ ایک جھینپی ہوئی مسکراہٹ اپنے چہرے پر سجائے تیزی سے میری میز کی طرف دوڑا۔

''دیکھو یہ فولڈر فوری طور پر آفاقی صاحب کے پاس لے جاؤ اور ان سے کہنا کہ اِس میں ایک خط ہے اور میں نے آخر میں اپنا نوٹ بھی درج کیا ہے، اسے فوری طور پر پڑھ لیں۔ بہت اہم بات ہے۔'' شمشاد نے میرے ہاتھ سے فولڈر لیا اور خاموشی سے سر ہلاتا ہوا آفاقی کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ فوری طور پر اپنے خودکار میکانکی نظام کے زیرِ اثر بند ہوگیا۔ میں مسلسل بند دروازے کو گھورے چلا جا رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ کاش میری آنکھوں کی بینائی اِس قدر تیز ہوتی کہ میں دروازے کے پار جھانک کر یہ دیکھ لیتا کہ اس خط کو پڑھتے ہوئے آفاقی کے چہرے پر کیا تاثرات نمودار ہو رہے ہیں۔ ہمارے اخبار کے نیوز روم کے عین درمیان ایک بڑی سی بیضوی میز لگی ہوئی ہے جس کے گرد کوئی آٹھ دس کے قریب مختلف شعبہ جاتی نیوز ایڈیٹر، مقامی، اندرون و بیرونی ممالک کے نمائندگان و نامہ نگاران کی ارسال کردہ خبروں اور رپورٹوں کی ایڈیٹنگ کرتے ہیں۔ نیوز روم کے اندر ہی ہارڈ بورڈ کی دیواریں کھڑی کر کے بنائے گئے دو کمروں میں سے ایک میں تو چیف نیوز ایڈیٹر شوکت آفندی اور دوسرے میں ادارتی صفحہ کا انچارج منہاج آفاقی بیٹھتا ہے۔ میری میز کونے میں قدرے الگ تھلگ سی ہے کیونکہ میں ادارتی صفحہ پر شائع ہونے والے کمپوز شدہ مضامین کی پروف ریڈنگ کے علاوہ ایڈیٹر کے نام خطوط اور اخبار کے ہفت روزہ میگزین کے لیے موصول ہونے والے مضامین کو پڑھنے کے بعد ضروری کانٹ چھانٹ کر کے انہیں اشاعت کے قابل بنا کر اپنے آگے رکھے آؤٹ باکس میں ڈال دیا کرتا ہوں جسے کمپوزنگ سیکشن سے کوئی نہ کوئی آکر لے جاتا ہے۔ اِس سارے دفتر میں آفاقی ہی تو ہے جس سے میں کھل کر بات چیت کر لیتا ہوں۔ گو کہ وہ عمر میں مجھ سے کوئی پندرہ بیس سال چھوٹا ہے لیکن نہ صرف عہدے میں سینئر ہے بلکہ جب آج سے دس سال پہلے میں اپنی فوج کی نوکری سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد نوکری کا اشتہار پڑھ کر انٹرویو دینے کی غرض سے آیا تھا تو انٹرویو منہاج آفاقی ہی نے لیا تھا۔ جب اس نے یہ سنا کہ میں

فوج سے ریٹائرڈ ہوا ہوں تو پہلے وہ بڑا حیران ہوا اور پھر بولا۔

''بھلا کہاں فوج اور کہاں اخبار کے شعبہِ ادارت کی ملازمت......؟''

''دراصل مجھے اردو ادب اور صحافت سے بے حد گہری و دیرینہ دلچسپی ہے۔'' میرا جواب سن کر آفاقی کے چہرے پر ایک ہلکی سے مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ اپنی عینک کے شیشوں کے پیچھے سے میری آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔

''چلیں تو پھر ایسا کیے لیتے ہیں کہ آپ ایک عدد مضمون یہاں میرے دفتر میں ہی لکھ کر دکھائیں۔ عنوان ہوگا ''پاکستانی ادب وصحافت کا ایک مختصر جائزہ'' اس طرح سے نہ صرف آپ کی اردو کی جانچ ہوجائے گی بلکہ یہ بھی پتہ لگ جائے گا کہ آپ اِس ملازمت کے لیے موزوں امیدوار ہیں کہ نہیں۔ آپ کے پاس اس کام کے لیے تین گھنٹے ہیں۔''

خیر صاحب، مجھے اِس دفتر میں کام کرتا دیکھ آپ سمجھ تو گئے ہی ہوں گے کہ میرا لکھا وہ مضمون آفاقی کو پسند آگیا۔ اس نے فوری طور پر میری تقرری کا خط جاری کروا دیا اور میرا وہ مضمون اخبار کے میگزین کی اگلی اشاعت میں شائع بھی کردیا۔ میں آفاقی کی عزت محض اس لیے نہیں کرتا کہ اس نے مجھے اِس عہدہ کے لیے منتخب کیا تھا۔ دراصل اِس کا سبب اِس کی غیر معمولی قابلیت اور اردو ادب اور فنِ صحافت سے اِس کا غیر معمولی لگاؤ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اِن دس سالوں میں، میں نے آفاقی سے شبعہِ صحافت کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔ میری نظریں ابھی تک دروازے پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ اچانک دروازہ کھلا اور میری توقع کے عین مطابق شمشاد سیدھا میری میز کی طرف آیا اور بولا۔

''آپ کو آفاقی صاحب بلا رہے ہیں۔''

''جی نجم صاحب آئیں، تشریف رکھیں۔'' آفاقی نے مجھے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''یہ خط کہاں سے آیا ہے؟'' آفاقی نے خط ہوا میں لہراتے ہوئے دریافت کیا۔

''یہ آج کی ڈاک سے موصول ہوا ہے۔''

''لیکن نجم صاحب، یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک مقتول جو کہ اب اِس دنیا میں موجود ہی نہیں، خط لکھے۔ یہ تو کسی کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔''

''خیر اب اِسے شرارت تو نہ کہیں آپ۔ یہ خط ایک بے حد گمبیھر داستان بیان کر رہا ہے۔ میرے خیال سے ہماری بھرپور توجہ کا متقاضی بھی ہے۔ آپ نے میرا نوٹ تو پڑھ ہی لیا ہوگا۔ یہ ایڈیٹر کے نام موصول ہوا ہے۔ ویسے تو آپ نے ہی میری صوابدید ٹھہرائی ہے کہ میں جس خط کو چاہے شائع کروں لیکن اِس خط کی غیر معمولی نوعیت کے سبب میں نے آپ سے اِسے ایڈیٹر کی ڈاک میں شائع کرنے کی اجازت طلب کی ہے۔''

''لیکن بھلا اِسے کیسے شائع کیا جاسکتا ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ کسی نے مقتول کا نام استعمال کرکے یہ خط لکھا ہے۔''

''جی آپ درست فرما رہے ہیں۔ لیکن یہ بھی تو دیکھیں نا کہ اِس خط کے مندرجات کس قدر اہم، اِس میں اٹھائے گئے نکات کتنے بامعنیٰ اور وزن دار ہیں۔''

''لیکن کیا اِس کی اشاعت سے شور نہیں مچے گا؟ ایسا خط جس کا لکھنے والا کب کا قتل کیا جاچکا ہو اور بنا یہ جانے کہ اِسے کس نے لکھا ہے، اِس کی اشاعت سے اخبار کی ساکھ پر منفی اثر نہ پڑے گا؟''

''میں نہیں سمجھتا کہ ایسا کچھ ہوگا۔ بلکہ اِس کی اشاعت سے تو ہمارے قارئین پر یہ واضح ہوجائے گا کہ صرف ہمارے اخبار کا نام ہی انصاف کی آواز نہیں بلکہ ہم انصاف کا ساتھ دینے والوں میں سے بھی ہیں۔ ویسے آپ نے بغور اسے پڑھ تو لیا ہے نا؟''

''میں نے آفاقی کے سامنے پڑے خط کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں پڑھ تو لیا ہے لیکن ایسا کریں کہ آپ اِسے ایک بار آوازِ بلند پڑھیں اور پھر ہم اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ مقتول سے منسوب کرکے اِسے ہمارے اخبار کو ارسال کرنے کا آخر مقصد کیا ہوسکتا ہے؟'' آفاقی کے کہنے پر میں نے خط کو قدرے بلند آواز میں پڑھنا شروع کیا۔

جناب ایڈیٹر صاحب روزنامہ انصاف کی آواز میرا نام شاہ زیب ہے! جی ہاں، وہی شاہ زیب خان جس کا قاتل وڈیرے کا بیٹا، چھوٹا وڈیرا سائیں اُسے بیگناہ قتل کردینے کی پاداش میں سزاِ موت کے اعلان والے دن فخریہ انداز میں مسکراتے ہوئے اپنی انگلیوں سے وکٹری کا نشان بناتا ہوا کمرہِ عدالت سے برآمد ہوا۔ جی ہاں، وہی شاہ زیب خان جس کے قاتل کا چہرے سزا کے اعلان پر یوں دمک رہا تھا کہ جیسے اسے عدالت نے سزائے موت نہیں بلکہ تمغہِ شجاعت سے نوازا ہو۔ جی ہاں، وہی شاہ زیب خان جس کے قاتل کا بھائی، منجھلا وڈیرا سائیں احاطہِ عدالت میں اچھل اچھل کر یہ نعرے لگا رہا تھا۔ ''ہم جیت گئے۔'' ہم جیت گئے۔ ہم جیت گئے۔ جی ہاں، وہی شاہ زیب خان جس کے قاتل کو اُس کا باپ بڑا وڈیرا سائیں، احاطہِ عدالت میں یوں گلے لگا کر اس کا ماتھا چوم رہا تھا جیسے وہ حج کرکے یا سرحدوں پر دشمنانِ وطن کو جہنم واصل کرکے غازی بن کر لوٹا ہو۔ عین انصاف کے گھر اور انصاف فراہم کرنے کے ذمہ داران کے نرغے میں یہ دلخراش مناظر ملک بھر کے بچے بچے نے براہ راست دیکھے۔ احاطہِ عدالت میں میرے قاتل کی سرشاریاں، محافظانِ قانون کی دلداریاں، قاتل کے چہرے کی سرخیاں، فخر واطمینان اور لواحقین کے رعونت زدہ چہروں سے خلقِ خدا نے اِسی لمحے انصاف کی بولی اور اس سے کھیلی جانے والی ہولی کی بُو سونگھ لی تھی اور پھر وہی ہوا کہ جس کا مجھے ڈر تھا۔ سزا کے اعلان کے محض اگلے ہی دن میرے والدین نے ایک پریس کانفرنس میں ایک کروڑ کے خون بہا کی ادائیگی کے عوض میرے قاتل کو میرا خون معاف کردیا۔ کاش کہ کوئی اُس وقت میرے والدین کے زرد دہشت زدہ اور میرے قاتل اور اُس کے لواحقین کے سُرخ دمکتے چہرے دیکھتا تو اُس پر معاف کیئے میرے خُون کی حقیقت ضرور آشکار ہو جاتی۔ یاد رکھیں۔ اگر آج یہ معاملہ معافی تلافی کرکے یونہی رفع دفع کردیا گیا تو گزرے کل، میں۔ شاہ زیب خان قتل ہوا تھا۔ آنے والے کل گھر گھر شاہ زیب قتل ہوگا اور ہر قتل ہوتے شاہ زیب کے ساتھ ساتھ اُس کا خون اس قدر ارزاں ہوتا چلا جائے گا کہ قصاص میں کروڑ تو کیا شاید ہزار بھی نہ ملیں۔ اِس امید کے ساتھ کہ میرا یہ خط آپ اپنے اخبار میں ضرور شائع کریں گے۔ مقتول شاہ زیب خان

خط پڑھ کر میں نے ایک گہری سانس لی اور پھر آفاقی کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھنے لگا۔

''آپ یہ خط میرے پاس ہی چھوڑ جائیں۔ میں ذرا سوچ لوں پھر دیکھتے ہیں کہ اِس کا کیا کرنا ہے۔'' آفاقی کی بات سن کر میں کرسی سے اٹھا اور مڑ کر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اچانک پیچھے سے آفاقی کی اجنبی لہجے میں قدرے دھیمی سی آواز سنائی دی۔

''نجم صاحب، ذرا سنیئے گا۔'' میں ابھی ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولنے ہی والا تھا کہ آفاقی کی آواز سن کر چونکا اور اُس کے نزدیک آکر اس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھنے لگا۔

''نجم صاحب، اگر بُرا نا مانیں تو ایک بات کہوں۔''

''جی ضرور۔''

''نجم رحمانی صاحب، آپ تو فوج میں رہے ہیں، آپ اتنے بزدل کب سے ہوگئے کہ آپ کو اپنی بات کہنے کے لیے ایک جعلی خط کا سہارا لینا پڑ گیا؟'' آفاقی کی دھیمے لہجے میں کہی بات میرے حواس پر تیر کی طرح لگی۔ کچھ دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کو بس خاموشی سے تکتے رہے۔

’’تو آپ کو پتہ لگ گیا کہ یہ خط میرا ہی تحریر کردہ ہے۔‘‘

’’نجم صاحب۔ میں آپ کو پچھلے دس سالوں سے جانتا ہوں۔ آپ کے خیالات اور سوچ سے بھی بخوبی آگاہ ہوں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اتنی سی بات سمجھ نہ پاؤں۔ ویسے تو مجھے اِسے پڑھتے ہی شک سا ہوگیا تھا اور میں نے آپ کو اِسی لیے اِسے پڑھنے کو کہا تھا۔ اِسے پڑھتے ہوئے آپ کی آنکھوں کی نمی، لہجے کی کسک اور چہرے کی سُرخی نے ساری بات عیاں کردی۔‘‘

’’جی میں نے کسی خوف یا ڈر کے سبب ایسا نہیں کیا بلکہ میرا خیال تھا کہ اگر یہ خط مقتول کے نام سے ہی شائع ہوجائے تو شاید زیادہ اثر انگیز ثابت ہو۔‘‘

’’تو آپ بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ صلح نامہ انصاف کا قتل ہے۔‘‘

’’جی ہاں بات کچھ ایسی ہی ہے۔‘‘

’’لیکن کیوں؟‘‘

’’آفاقی۔‘‘ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اپنی بات کا آغاز کیا۔

’’آج سے لگ بھگ چالیس سال پہلے فوج میں بطور سپاہی ڈھائی سو روپے ماہوار کی تنخواہ پر بھرتی ہوا۔ میری پوسٹنگ ایک ایسی سرحدی چوکی پر ہوگئی جہاں ہر وقت سرحد پار سے گولہ باری ہوتی۔ ایک روز رات کے وقت اچانک داغے جانے والا گولہ عین ہماری چوکی پر آن گرا۔ اس وقت وہاں مجھ سمیت چار سپاہی متعین تھے، سب شدید زخمی ہوئے۔ اسپتال پہنچتے پہنچتے دو سپاہی شہید ہوگئے۔ صرف ہم دو سپاہی جانبر ہوسکے۔ لیکن اس قدر زخمی ہوگئے تھے کہ کئی ماہ تک اسپتال میں ہی پڑے رہے اور پھر کسی قدر صحتیاب ہونے پر چھ ماہ کی رخصت پر بھیج دیا گیا۔‘‘

’’اوہ...... آپ نے پہلے کبھی ذکر نہیں کیا۔‘‘

’’آج بھی نہ کرتا بس یوں سمجھ لیں کہ ضرورتاً کررہا ہوں۔‘‘

’’ضرورتاً!‘‘

’’جی ہاں ضرورتاً۔ جب میں کچھ دن بعد اِس قابل ہوا کہ تھوڑا اِدھر اُدھر چل پھر سکوں اور گھر میں پڑے پڑے اکتانے لگا تو پٹیوں میں لپٹے جسم کو بیساکھیوں کی مدد سے گھسیٹ گھسیٹ کر گھر سے باہر نکل آتا۔ یوں تو لوگ فوجی اور سرحد پر زخمی ہونے کی وجہ سے میرا احترام کرتے لیکن کئی لوگ مجھ پر آوازے اور پھبتیاں بھی کستے۔ مجھے دیکھتے ہی نعرہ بازی کرنے لگتے کہ دیکھو وہ جارہا ہے ڈھائی سو روپلی کا مجاہد۔‘‘

’’ڈھائی سو روپلی کا مجاہد؟‘‘

’’ہاں ان کا خیال تھا کہ میں نرا بُغد ہوں کہ محض ڈھائی سو روپے کی نوکری کی خاطر اپنی جان جوکھم میں ڈال رکھی ہے۔‘‘

’’آپ کو تو بہت غصہ آتا ہوگا؟‘‘

’’شروع شروع میں تو نظر انداز کرتا رہا لیکن ایک دن میرے صبر کا پیمانہ بس چھلک ہی پڑا اور چلا کر بولا۔ اگر میں اور مجھ جیسے ڈھائی سو روپلی کے مجاہد اور ڈھائی سو روپلی کے شہید سرحدوں پر زخمی نہ ہوں یا اپنی جان نہ دیں تو یاد رکھو کہ تم اور ملک بھر کے لوگ ان کی اولادیں، ماں، بہن اور بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں سکون کی نیند کے ایک ایک پل کو ترسیں۔‘‘

’’واہ کیا سولہ آنے کھری بات کہی آپ نے۔‘‘

’’ہاں......!‘‘ میں ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے دور خلاؤں میں گھورتا ہوا بولا۔

’’میری کہی ہوئی وہ بات اس وقت تو ضرور سولہ آنے درست تھی لیکن نہیں جانتا کہ اب یہ بات سولہ تو کیا دو آنے

بھی درست ہے یا نہیں؟‘‘

’’کیا مطلب......؟‘‘

’’آپ کے خیال میں ہم لوگوں نے وہاں سرحد پر فقط ان ڈھائی سو روپلی کی خاطر گولے کھائے تھے یا آج کی تاریخ میں سرحد پر متعین سپاہی چند ہزار کی نوکری کی خاطر اپنی کروڑوں کی جان دشمن کی ڈھائی روپلی کی گولی کھا کر دے دیتا ہے؟‘‘

’’نہیں خیر اب ایسی بھی بات نہیں۔‘‘

’’ہر انسان کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔ جان کی قیمت ڈھائی سو روپلی تو کیا ڈھائی ہزار، ڈھائی لاکھ بلکہ ڈھائی کروڑ سے بھی کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن فقط ڈھائی روپلی کی وہ حقیری گولی سپاہی اِس آس میں کھاتا ہے کہ یہ گولی کھا کر نہ جانے کتنے ہی معصوم و بے گناہ ہم وطنوں کی قیمتی جانیں دشمن کی ہزاروں اور لاکھوں گولیوں سے محفوظ رہ سکیں گی۔‘‘

’’بیشک، درست کہہ رہے ہیں آپ۔‘‘

’’کیا خاک درست کہہ رہا ہوں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میں شاید واقعی چغد تھا کہ محض ڈھائی سو روپلی کی خاطر سرحد پر دشمن کا گولہ کھا کر لوگوں کی پھبتیاں سہی اور ڈھائی سو روپلی کا مجاہد کہلایا۔ میرے وہ ساتھی جو شہید ہوئے ان کی جانیں محض ڈھائی سو روپلی کی خاطر رائیگاں چلی گئیں۔‘‘

’’یہ کہتے کہتے میری آواز شدتِ جذبات سے بھرا گئی اور میری آنکھیں جو کہ آنسوؤں سے بھر آئی تھیں، ان کا بوجھ مزید سہار نہ سکیں اور چھلک پڑیں۔ میری یہ حالت دیکھ کر آفاقی تیزی سے اپنی کرسی سے اٹھا اور میز پر رکھا پانی کا گلاس لے کر میری طرف بڑھا اور گلاس مجھے پکڑا دیا جسے میں نے ایک ہی سانس میں خالی کردیا۔ خالی گلاس میرے ہاتھ سے لے کر اس نے مجھے کرسی پر بٹھایا اور بولا۔

’’ارے نجم صاحب، آپ تو جذباتی ہوگئے۔‘‘

’’جذباتی...... جذباتی نہ ہوں تو کیا کروں۔ کیا میں نے سرحدوں پر گولے کھا کر اپنا تن بدن اِس لیے چھلنی کرایا تھا؟ کیا میرے ساتھیوں نے جامِ شہادت اِس لیے نوش کیا تھا کہ وہ وڈیرے کا بیٹا، اپنی سزائے موت کے حکم پر وکٹری کا نشان بنا بنا کر ملک و قوم، اِس کے قانون دان و قانون پسند بانی، بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح، ملک کے آئین و دستور، قانون و عدلیہ کے رکھوالوں اور ملکی قوانین پر عمل کرنے والی عوام کے منہ پر مسلسل تھوکتا چلا جائے؟ اس کی مذموم اور قابلِ نفرت حرکات پر اسے روکنے والے کوئی محض اِس لیے نہ ہو کہ وہ ایک کروڑ پتی وڈیرے سائیں کا بیٹا ہے جس کا اثر و رسوخ حکومت کے اعلیٰ سے اعلیٰ ایوانوں تک ہے۔ اب تو اِسے مقتول کے والدین کی طرف سے معافی نامہ بھی مل گیا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اِس واقعہ کے بعد ملک کے لیے گولی کھا کر جان دینے والا ہر سپاہی خواہ وہ میری طرح ڈھائی سو روپلی کی اوقات والا سپاہی ہو یا پھر چند ہزار والا، اپنی اپنی لحد میں ضرور تڑپ تڑپ گیا ہوگا اور اپنی قیمتی جان کو اس قدر سستے میں گنوانے پر ضرور افسوس کررہا ہوگا۔‘‘

اتنا کہنے کے بعد میں خود پر قابو نہ رکھ سکا اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

’’ارے آپ مایوس کیوں ہوتے ہیں؟‘‘ آفاقی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

’’مایوس...... آج ہر وہ سپاہی مایوس ہوگا جس نے محض اِس آس میں ڈھائی سو روپلی کی گولی کھا کر جان دی کہ میری ایک جان کے بدلے انگنت جانیں محفوظ ہوگئی ہیں۔ مگر یہاں تو ان تمام خونی درندوں اور اِس قبیل کے جنگلی بھیڑیوں کو معصوم و بیگناہ لوگوں کی جانوں سے کھیلنے کا لائسنس جاری کردیا گیا ہے۔ ہاں مگر دوسرے لائسنسوں کی طرح انہیں اِس

لائسنس کی کچھ قیمت چکانا پڑتی ہے۔ جس کی ان کے پاس کوئی کمی نہیں۔''

''جی ہاں کہتے تو سچ ہیں آپ۔''

''ایک سچ اور بھی سن لو کہ ہر شہید کو جس نے ملک وقوم کے لیے جان دی، اپنی قربانی ضائع ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی ہوگی اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگا کہ اُس نے تو اپنی جان اِس لیے دی تھی کہ اِس ملک کے سارے شاہ زیبوں کی جانیں محفوظ ہو جائیں لیکن آج اگر مر رہا ہے تو وہی معصوم شاہ زیب خان اور اگر کوئی زندہ ہے اور شاید زندہ بھی رہے گا تو اس کا قاتل۔ وڈیرے کا بیٹا، چھوٹا وڈیرا سائیں اور اِسی قماش کے دیگر لوگ۔''

''بس نجم صاحب اب اس بات کو جانے دیں، دیکھیں آپ کے حواس پر بھی اِس کا بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ، اللہ بہتر کرے گا اور ہاں ایسا کریں کہ یہ خط دو کالمی سرخی میں اِس کیپشن کے ساتھ کہ یہ جس نے بھی تحریر کیا ہے ادارہ اس کے مندرجات سے متفق ہے، کل کی اشاعت میں ادارتی صفحے پر نمایاں طور پر شائع کرنے کے لیے فوری طور پر کمپوزنگ کے لیے بھیج دیں۔''

یہ کہتے ہوئے آفاقی نے وہ خط مجھے پکڑا دیا۔

☆......☆☆☆......☆

روزن زنداں

صدف اقبال

محترمہ صدف اقبال کا تعلق بھارتی ریاست بہار کے شہر ''گیا'' سے ہے' آپ وہاں اردو ادب کے ایک ستون کے طور پر جانی جاتی ہیں. زیر نظر افسانے کا شمار ان کے شاہ کار افسانوں میں ہوتا ہے' اس افسانے میں انہوں نے ایسا موضوع چنا ہے جس کے بارے میں ہمارے ہاں کی خواتین افسانہ نگار سوچنا بھی گناہ سمجھتی ہیں. انہیں پڑھ کر آپ کو سعادت حسن منٹو کی یاد آجائے گی.

نانی ماں کی زبانی اس نے ایک خانہ بدوش کی کہانی سنی تھی کہ کسی زمانے میں ایک خانہ بدوش تھا، جس کی بیوی نہایت ہی حسین وجمیل تھی۔ وہ اسے ساری دنیا کی نظروں سے چھپا کر ایک بکس میں بند کر کے رکھتا اور نگر نگر اپنے سر پر بکس رکھ کر گھومتا، مگر جب وہ سو جاتا تو اس کی بیوی چپکے سے بکس کھولتی اور باہر نکل کر کسی مرد کو تلاش کر کے اس کے ساتھ وقت گزارتی اور نشانی کے طور پر اس مرد کی ایک انگوٹھی مانگ لیتی۔ جب اس کے پاس سو انگوٹھیاں جمع ہو گئیں تو اس نے ایک دن اپنے شوہر کے سامنے ساری انگوٹھیاں خاموشی سے رکھ دیں۔ اس کا شوہر ان انگوٹھیوں کو دیکھتے ہی مر گیا۔

اسے لگتا کہ اسی خانہ بدوش نے اس کے شوہر روی کی شکل میں دوسرا جنم لیا ہے۔ شادی کی پہلی رات اس نے اس کے حسن کے قصیدے پڑھنے کے بجائے کسی دیرینہ عاشق کا پتہ پوچھا تھا۔ اُس رات زبان پہ جو چپ کی مہر لگی تو دو برس ہونے کو آئے یہ چپی نہ ٹوٹی۔ دو سالوں سے زندگی جیسے تھم سی گئی تھی۔ ہر وقت وہ کسی خادمہ کی طرح مستعد رہتی۔ وہ آفس جاتا تو گھر کو لاک کر کے جاتا۔ دروازے میں چابی گھومنے کی آواز سے ایک اضمحلال طاری ہو جاتا۔ وہ سارا دن بستر پہ پڑے پڑے سوچتی رہتی۔ کبھی دل زیادہ گھبراتا تو وہ بھگوان کے آگے ماتھا ٹیک دیتی۔ نہ گھر میں کوئی آتا اور نہ اسے کہیں

جانے کی اجازت تھی۔ بس ایک بلڈنگ کا چوکیدار ہی تھا جسے کبھی کبھار اس کا شوہر ضرورت کے تحت گھر بلا لیتا۔ بدشکل میلے دانتوں اور کیچ بھری آنکھوں والے چوکیدار سے شاید اُسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ چوکیدار سے وہ تھوڑی بہت بات کر کے خوش ہو لیتی۔ اسے اس کا کبھی کبھار آنا بہار کے تازہ جھونکے کی طرح محسوس ہوتا۔

کئی دنوں سے وہ اپنے وجود میں بیقراری سی محسوس کر رہی تھی۔ ایک اضطراب اور سنسنی سی تھی۔ ان دنوں وہ ساری رات چھت کو تاکتے ہوئے گزار دیتی، یا پھر کروٹ بدل کر اپنے شوہر کو دیکھتی رہتی جو اس کے جسم سے لطف اندوز ہونے کے بعد گہری نیند سو یا رہتا، پھر کئی دنوں کے شدید انتظار کے بعد ایک دن چوکیدار نے اس کے ہاتھوں میں اس کی مطلوبہ شئے تھما دی۔ ایک بجلی سی اس کے وجود میں کوند گئی۔ شوہر کے آفس جانے کے بعد اس نے نہا کر نیا لباس زیب تن کیا۔ اپنے پور پور کو سجایا اور چوکیدار کی دی ہوئی گھر کی ڈوپلیکیٹ چابی کو ہتھیلی پہ رکھ کر دیکھا اور مسکرا دی۔

''روی اب میں تمہیں بھی جلد ہی سو عدد تحائف دوں گی۔''

☆......☆☆☆......☆

رشتے

محمد خالد جاوید

کل دفتر سے گھر کے لیے نکلا گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ارے یہ کون خاتون ہے جو مجھے رکنے کا اشارہ کر رہی ہے؟ حیرت اور شش و پنج کی کیفیت تھی کہ گاڑی روکوں یا نکل جاؤں کئی اندیشے تھے کہ کسی اجنبی کو کسی صورت لفٹ نہیں دینی (کئی دفعہ ہمدردی میں لٹنے کے بعد میرا خود ساختہ اصول) مگر پھر اپنے ہی اصول کو ایک خاتون کے لیے توڑتے ہوئے (مرد ہوتا تو توڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا) گاڑی روک دی۔ میلے کچیلے کپڑے ہاتھ میں ایک پوٹلی سرخ وسفید رنگت چہرے پر خاندانی وجاہت کے آثار عمر پچاس' پچپن کے لگ بھگ رہی ہوگی ایک مدبرانہ مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئیں۔

''بیٹا! مجھے شاداب نگر تک جانا ہے۔ موسم بہت خراب ہے کافی دیر سے کوئی گاڑی نہیں آئی اگر مجھے آپ......!'' فقرہ مکمل نہیں کیا اور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ چند لمحے سوچا اور پھر ہاں کر دی۔ بیٹھتے ہی بولیں بیٹا! کہاں جانا ہے؟ پہلے سوچا بتا دوں پھر خیال آیا نہیں اپنے متعلق کیوں بتاؤں۔

''میرا مطلب ہے کہ کہاں رہتے ہیں؟''

''جی شہر میں۔'' میں اس کے تاثرات پیچھے نہ دیکھ سکا بہر حال پھر خاموشی۔ ''کسی اچھے گھرانے سے معلوم ہوتے ہو بیٹا جی۔'' پھر شاداب نگر تک خاموشی۔ ''جی آپ کو کہاں اتاروں؟''

''بس بیٹا! تھوڑا آگے ڈاکخانے کے پاس۔''

''جی لیجے ڈاکخانہ آگیا۔'' انتظار کہ خاتون ابھی اترتی ہیں...... مگر آواز آئی۔ ''بیٹا! گاڑی سائیڈ پہ کھڑی کر دو۔'' خوف کی ایک لہر سنسناتی ہوئی...... ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی (سوچا یہ ابھی کوئی پسٹل وغیرہ نکالے گی اور کہے گی جو کچھ ہے میرے حوالے کر دو لیکن اگر اس نے ایسا کرنا ہوتا تو راستے میں شہر کی نسبت زیادہ موقع تھا۔ ''بیٹا! برا نہ ماننا میں اپنی سہیلی سے کچھ رقم لائی ہوں اگر آپ مجھے میرے گھر تک چھوڑ دیں تو مجھے

خوف نہیں ہوگا۔'' اسی دوران آندھی اور موسلا دھار بارش شروع ہوگئی...... ''نہیں نہیں میں آپ کے ساتھ نہیں جاسکتا آپ نیچے اتریں۔'' مگر وہ کسی صورت نیچے اترنے کو تیار نہ تھی شدید پریشانی کا عالم تھا آخر یہ چاہتی کیا ہے؟ یہ اس قبیلے کی عورت بھی نہیں لگتی کہ اس طریقے سے گاہکوں کو گھر لے جائے یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ ہوسکتا ہے یہ کسی اغواء برائے تاوان کے گروہ سے تعلق رکھتی ہو اندیشے، وسوسے...... سوچ لیا کہ آج تمہیں اغوا ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر چکے ہو۔ شدید پریشانی میں مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق اس کے ساتھ ہولیا دوگلیاں بارش میں عبور کرتے ہوئے ایک خستہ سے مکان کے سامنے آکر رکنے تک کپڑے پانی سے شرابور ہو چکے تھے۔ دروازہ کھٹکھٹایا اندر کہیں دور سے آواز آئی۔

''کون؟'' خاتون نے بڑا عجیب سا جواب دیا۔ ''مہمان آئے ہیں میرا شک یقین میں بدل گیا کہ یہ کام کوئی دو نمبر ہی ہے دروازہ کھلا...... میں نے آج تک اتنی خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی جو دروازے پر آئی۔ ہاں ہاں یہ کوئی قحبہ خانہ چلاتی ہے۔ اب سمجھ آئی کیونکہ جب فٹ چوڑی اینٹوں کی لگائی ہوئی کچے صحن میں پگڈنڈی پر چل کر آئے تو اندر لڑکیاں اور بھی تھیں جو عمر میں اس لڑکی سے چھوٹی لگ رہی تھیں جائزہ لیا ایک ہی طرف لمبائی میں کمرے آگے برآمدہ کچے صحن کے ایک کونے میں ایک چھوٹا سا کمرہ جو شاید باورچی خانہ تھا...... خاتون ایک کمرے میں چلی گئی......

''جی آپ بیٹھیے۔'' پیچھے سے اسی لڑکی کی آواز آئی۔

''جی نہیں میں چلتا ہوں۔''

''آپ چائے پیے بغیر کیسے جاسکتے ہیں؟ (اگر سچ کی آخری حدوں کو بھی چھولوں تو مانوں گا کہ اب میں جانا چاہتا بھی تھا اور نہیں بھی) پھر خیال آیا کہ ہوسکتا ہے یہ لوگ چائے میں کچھ ملا کر مجھے بیہوش کر دیں اور پھر کہیں دور دراز علاقے میں شفٹ کر دیا جاؤں۔ چائے پیتے ہوئے کئی بار سوچا کہ ابھی سر بھاری ہونا شروع ہو جائے گا مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ اتنے میں وہ خاتون کپڑے بدل کر میرے سامنے برآمدے میں دوسری چارپائی پر بیٹھ گئی میں کھڑا ہوگیا۔

''جی اب اجازت ہے؟''

''بیٹا! میری بات سنتے جاؤ میرا نام زرینہ ہے۔ ہم سید خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ میری تین بیٹیاں ہیں چھ سال ہوئے خاوند فوت ہوگیا۔ ہم بہت خوشحال تھے مگر خاوند کی وفات کے بعد حالات خراب ہوتے گئے میرے دیور نے مجھ سے ناجائز تعلق قائم کرنا چاہا مگر میں نے سختی سے منع کر دیا۔ اس نے مجھے اور میری بیٹیوں کو سارے محلے میں بدنام کر دیا...... میری بیٹی کی عمر تجاوز کر رہی ہے مگر اس کی کہیں شادی نہیں ہونے دیتے جو بھی رشتہ دیکھنے آتا ہے اس کو ہمارے خلاف باتیں کر کے بھگا دیتے ہیں۔ بیٹا! میں آپ کو بھی گھر نہ لاتی مجھے آپ بہت نیک اور اچھے خاندان کے لگے ہو۔ بیٹا! آپ میری مدد کرو۔ کوئی سیّد خاندان میں اچھا رشتہ ہو تو مجھے بتاؤ۔ میں چاہتی تھی کہ آپ میری بیٹیوں سے مل لیں تاکہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ یہ ماشاللہ بہت سلجھی ہوئی اور موں متھے لگتی ہیں اس کی بات سن کر میں خود شرم سے پانی پانی ہوگیا۔ میں نے کیا سوچا؟ دماغ میں باہر سے زیادہ اندر آندھیاں چل رہی تھیں۔

☆......☆☆☆......☆

آپا جی

ڈاکٹر درخشاں انجم

مئی کی تپتی سلگتی دوپہر کو جب منشی خیر دین کے دروازے پر چاچا طفیل کا تانگہ آکر رکا تو پاس نہر میں نہاتے ہوئے ننگ دھڑنگ بچے آپا جی...... آگئیں آپا جی آگئیں کہتے باہر آگئے اور تانگے کے آگے پیچھے چکر لگانے لگے۔ انہیں آپا جی کے آنے سے زیادہ واپسی پر تانگے پر بیٹھ کر کچی سڑک سے پکی سڑک پر جانے کی زیادہ خوشی ہوتی ادھر قصبے یا شہر جو بھی سواری آتی تھی وہ یہی کرتے تھے۔ بڑا مزا آتا تھا انہیں مگر پکی سڑک پر پہنچ کر جب طفیل چاچا بچوں کو اتار کر ٹھینگا دکھاتے ہوئے آگے کی راہ لیتے یہ بادل نخواستہ نیچے آتے اور کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے واپسی کی راہ پکڑتے۔

اب بھی وہ اسی انتظار میں تھے۔ اس دفعہ آپا جی خالی خولی نہیں ڈھیر سارے سازوسامان کے ساتھ آئی تھیں' ٹرنک' بیگ' اٹیچی اور نہ جانے کیا الم غلم تھا کہ اتارتے ہوئے کافی دیر لگ رہی تھی وہ کود کو نیچے اتریں اور بھڑا ہوا دروازہ دھڑام سے کھول کر اماں جی کے کمرے میں داخل ہوگئیں۔ لٹھ مار انداز میں سلام کرتی ہوئی ان کے سامنے پڑی ہوئی چارپائی پر پیر چڑھا کر بیٹھ گئی یہ بھی دیکھنا گوارا نہیں کیا کہ طفیل چاچا اور بچوں نے مل کر ان کا سامان اتار کر صحن میں رکھا بھی یا نہیں...... بس یونہی پھولی سوجی سی شکایتی نظروں سے ماں کو تکے جا رہی تھی۔ تب ہی فضیلت بی بی کی نظر کھڑکی سے ہوتی ہوئی صحن میں سامان رکھتے ہوئے بچوں پر پڑی۔

''کی گل اے پتر کلے آئی اے'' انہوں نے مڑ کر کھوجتی نظروں سے پوچھا۔

''جی ماں جی!'' اس کا جھکا ہوا سر کچھ اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔ ان کا دل ایک لمحے کو دھڑکا......!

''کیا بات ہے؟ فیقا نہیں آیا تیرے ساتھ...... اور...... یہ سارا سامان؟'' ان کی نظروں میں سوال ہی سوال تھے اور ندرت بی بی سے اس وقت فوری تو کوئی جواب بن نہیں پڑا' بس خشک زبان سے اتنا ہی کہا۔

''میں کچھ دنوں کے لیے رہنے آئی ہوں۔''

''وہ تو تو پہلے بھی آتی رہی ہے مگر اتنے سازوسامان کے ساتھ تو نہیں۔ پیچھے سے بھاوج صاحبہ جانے کہاں سے آٹپکی مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس بار ندرت بی بی آئیں تو گلی سنسان پڑی تھی۔ نہ کھڑکیوں کے پردے ہٹے تھے' نہ دروازے کی درازوں سے کوئی جھانکا تھا' کیونکہ یہ معمول بن چکا تھا' وہ ہر ماہ دو ماہ بعد یونہی بھولی سوجی تن فن کرتی ٹپک پڑتی تھی۔ لوگ عادی ہو چکے تھے۔ پہلی بار تو تقریباً پورے کا پورا گاؤں ان کی اس طرح آمد پر بھاگا آیا تھا۔

''اوے منشی دی دھی روس کے آگئی اے'' (منشی کی بیٹی روٹھ کر آگئی ہے) ہائے ندرت یہ کیا کیا تو نے' سب نے مل کر اسے سمجھا بجھا کر دو چار روز کے بعد اس کے گھر چھوڑ آئے' اس کے سسرال کے ہر فرد کو اس سے شکایتیں تھیں۔ مگر اسے اس بات کا کوئی غم نہیں تھا۔ پھر یہ سلسلہ ہی چل نکلا ادھر ذرا سی کوئی بات ہوئی ادھر انہوں نے اپنے بیگ میں چند جوڑے ڈالے اور طفیل چاچا کو آواز دے دی جو اس کے گاؤں ہی کے تھے۔ پہلے تو لوگ سمجھاتے اسے پھر آہستہ آہستہ دور ہونے لگے اب صرف کھڑکیوں کے پیچھے اور دروازے کی درزوں سے عورتیں جھانک لیا کرتیں۔ کچھ دنوں کے بعد یہ سلسلہ بھی تقریباً بند ہی ہوگیا اور آج تو کسی آدم زاد نے اتنا سامان اترتے دیکھ کر بھی

کچھ پوچھنا گوارا نہیں کیا' پہلے پہل تو ایک دو روز پھولی سوجی خاموش خاموش سی رہتیں پھر کسی کے پوچھنے پر شکایتوں کا پٹارہ کھول کر بیٹھ جاتیں' ماں باپ کا دماغ چاٹ کر پھر بھائی پر نشانہ باندھتیں کہ وہ بھی اپنی بیوی کو اس کے میکے چھوڑ آئے۔ وٹے سٹے کی شادی کا مسئلہ نہیں ہوتا تو فضل دین ندرت بی بی کو ہمیشہ کے لیے اس کے گھر چھوڑ آتا چونکہ اس کی بہن اس کی بھابی یعنی ندرت کے بھائی کی بیوی تھی ادھر وہ کوئی قدم اٹھاتا ادھر فضل دین صفیہ کو چلتا کر دیتا۔ یہی تو وٹے سٹے کی شادیوں کی قباحت تھی کسی کے ناکردہ گناہوں کی سزا کسی اور کو بھگتنا پڑتی۔

ندرت کی گز بھر کی زبان اور سیلانی فطرت سے تنگ آ چکا تھا' بات بات پر جھگڑنا' چیخ و پکار کر کے محلے والوں کو اکٹھا کر لینا اس کا شیوہ تھا۔ اماں نے کتنی دفعہ سمجھایا تھا اس طرح لڑنا جھگڑنا اچھے لوگوں کا کام نہیں ہوتا' اس کے گھر والوں نے تو یہی سوچ کر اس کا رشتہ لیا تھا کہ اس کا باپ گاؤں کا منشی ہے کچھ پڑھا لکھا بھی ہے اس کا بھائی بھی ماشاء اللہ دسویں جماعت پاس تھا۔ وہ بھی تہذیب یافتہ سگھڑ ہوگی' اس کی بہن صفیہ نے دبے لفظوں میں منع بھی کیا تھا' مگر سب کا خیال تھا کہ شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا مگر کچھ بھی تو ٹھیک نہیں ہوا۔ وہ اسی طرح پھوہڑ' بدزبان' نالائق ہی رہی' ادھر اس کی والدہ فضیلت بی بی نے کہہ رکھا تھا کہ ان کی نازوں پلی بیٹی کے ساتھ اگر کچھ ایسا ویسا ہوا تو وہ صفیہ سے اس زیادتی کا بدلہ لیں گی۔ جس کی وجہ سے ندرت کو اکیلے آتے دیکھتے ہی صفیہ کا دل بیٹھنے لگتا اور جب ندرت رو رو کر اپنی داستان سناتی تو فضیلت بی بی کا بس نہیں چلتا کہ اسے چٹیا سے پکڑ کر اس کے گھر کا راستہ بتا دیں' لیکن اس معاملے میں اس کا بھائی ذرا سخت تھا وہ اپنی بیوی سے بہت پیار کرتا تھا' جب ہی ماں کی بات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتا اور فضیلت بی بی ہائے میری معصوم دھی کہہ کر ٹھنڈی آہیں بھرتیں اور بیٹے کو جھولیاں بھر بھر کر بددعائیں دیتیں۔

اتنے ساز و سامان کے ساتھ بیٹی کو آتے دیکھ کر فضیلت بی بی کا ماتھا تو ٹھنکا تھا مگر ابھی اتنی جلدی کچھ پوچھنا بھی مناسب نہیں تھا ادھر صفیہ کا دل ہولا جا رہا تھا مگر اس بار ندرت بھی زیادہ خاموش نہیں رہ سکی کیونکہ گھر والوں کی سوالیہ نظریں اس کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ اسی شام اس نے سب کے سامنے ہی صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اب ہمیشہ کے لیے یہاں آ گئی ہے' اب دوبارہ اسے وہاں نہیں جانا۔

''کیا؟'' حقے کے کش لیتا منشی کرم دین...... یکدم سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بھائی بھی سکتے میں آ گئی اور فضیلت بی بی کے کاٹو تو لہو نہیں وہ بھی شوہر کی تقلید میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کیا کہہ رہی ہے تو......؟'' اس کی آواز کانپ رہی تھی اور پھر سختی سے نرمی سے سارے اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئے مگر اس کی ایک ہی ضد رہی کہ اب وہاں نہیں جانا' تم لوگ بھی صفیہ کو فارغ کر دو۔

''مگر اس میں صفیہ کا کیا قصور ہے۔'' بھائی نے دبے دبے لفظوں میں ان کا ذکر دیا جس پر دونوں ماں بیٹیوں کے پتنگے لگ گئے' منشی کے سامنے کچھ کہہ نہیں سکیں کیونکہ وہ بھی اپنی بیٹی کی حرکت سے واقف تھا۔

اگلے ہی روز منشی کرم دین اور فضیلت بی بی دونوں صورت حال معلوم کرنے کے لیے ندرت کی سسرال پہنچے' راستے ہی میں لوگ انہیں عجیب نظروں سے دیکھتے ملے۔ کچھ نظریں تاسف بھری تھیں اور کچھ طنزیہ' انہیں کچھ انہونی کا احساس ہو رہا تھا اور پھر وہاں پہنچ کر تو جیسے کچھ باقی ہی نہیں رہا' سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ جیسا کہ گھر والوں نے بتایا۔ وہ سارے گھر پر اپنی چلانا چاہتی تھی' خود سارا سارا دن چوہدرانیوں کی طرح چارپائی توڑتی رہتی یا الھڑ لڑکیوں کی طرح پنڈ میں چکر لگاتی رہتی' اور اس دن تو حد ہی ہو گئی' کسی بات پر اس نے فیقے کو چمٹا پھینک کر مارا تھا جس سے اس کی پنڈلی زخمی ہو گئی پھر تو اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور تابڑ توڑ اسے بالوں سے پکڑ کر تین چار تھپڑ جڑ دیے پھر تو

ندرت بی بی نے وہ شور شرابہ کیا کہ اللہ کی پناہ اور اس کی ضد پر طلاق کے تین بول دے کر اپنی جان چھڑالی' سارا پنڈ گواہ تھا۔ وہ بس بیٹی کو کوستے سر جھکائے واپس چلے آئے اور صفیہ کو اس کے گھر چلتا کر دیا۔ عبدالغنی کچھ بھی نہ کر پایا۔ منشی کرم دین بیوی کو مورد الزام ٹھہرا رہا تھا۔ ندرت کو بگاڑنے میں اس کا ہی ہاتھ تھا' اگر اس نے شروع سے اسے نکیل ڈالی ہوتی تو آج ایسا نہیں ہوتا۔ وہ اپنے تین بھائیوں کی اکلوتی اور بڑی بہن تھی۔ سب انہیں آپا جی کہتے تھے۔ یہاں تک محلے کے سارے بچے بھی انہیں آپا جی ہی کہتے تھے۔ گھر میں اکلوتی بیٹی ہونے کا کافی فائدہ اس نے اٹھایا تھا۔ خاص کر ماں نے تو اسے اتنا سر چڑھا دیا کہ ہاتھوں سے نکل گئی۔ جلد باز بھی اتنی ہی بھوک کی کچی' لڑائی میں بی جمالو کا کردار ادا کرنے والی۔ اب وہ پچھتا رہی تھیں مگر اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔ کاش انہوں نے اس وقت ہی اسے روکا ہوتا' جب وہ سارے گاؤں میں کڈکڑیاں لگاتے پھرتی تھی۔ ساری ساری دوپہر گاؤں کے بچوں تو کیا بڑے بڑے لونڈوں کے ساتھ کھیلتی تھی' زبان سے جو کچھ نکالا ماں باپ دونوں نے اس کے آگے ڈھیر لگا دیا' یہ...... دیا تھا اس کا صلہ اس نے اپنا ہنستا بستا گھر برباد کیا تو کیا ان کے بیٹے کا گھر بھی اجاڑ دیا۔ وہ جب بھی عبدالغنی کو اداس دیکھتیں ان کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی۔ کتنا بدل گیا تھا وہ کملا کر رہ گیا تھا ان چند دنوں میں وہ۔ ندرت اگر ان کی بیٹی تھی تو وہ اس کا بیٹا تھا۔

دن مہینے' مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ عبدالغنی دلبرداشتہ ہو کر نوکری کے بہانے شہر چلا گیا۔ دوسرے نے بھی اس کی تقلید کی' البتہ سب سے چھوٹا عبدالرحیم ان کی دیکھ بھال کے لیے رہ گیا۔ ندرت بی بی جو پانچ جماعتیں پڑھ کر اپنے آپ کو ملکہ حسن سمجھتی رہیں ان کا خیال تھا پھر کوئی شہزادہ انہیں دھوم دھام سے بیاہنے آ جائے گا۔ مگر یہ ان کی خام خیالی ہی رہی' سارا پنڈ ان کی حرکتوں سے واقف تھا۔ فیقے جیسی غلطی کون دوبارہ کرتا۔ البتہ ایک دن گاؤں کی کسی شادی میں فیقے کو دیکھا گود میں پیارے سے بچے کو اٹھائے ایک خوبصورت سی لڑکی کے ساتھ لڑکی نے بھی ایک بچی کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ اسے سمجھتے دیر نہیں لگی کہ یہ اس کی بیوی اور دونوں اس کے بچے تھے۔ دل میں ایک چھناکا سا ہوا تھا۔ پھر وہ وہاں رکی نہیں...... ہر گزرتا وقت اسے پچھتاؤں کا احساس دلاتا رہا۔ بالوں میں جگہ جگہ چاندی کے تار چمکنے لگے تھے۔ منشی کرم دین تو کب کا گزر چکا تھا اسے اس دن کے بعد سے بیٹی کے صدموں نے خوش نہیں رہنے دیا تھا' ایک دن جان کی بازی ہار گیا۔

فضیلت بی بی اب کچھ زیادہ عبدالرحیم کو بہن کی دیکھ بھال کا احساس دلانے لگی تھیں کیونکہ اب ان کی صحت بھی گر چکی تھی۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں رہا تھا۔ اس روز بھی عبدالرحیم شام ڈھلے کھیتوں میں دیکھ بھال سے فارغ ہو کر واپس آیا ہی چاہتا تھا' پرندے اپنے اپنے بسیروں کی طرف محو پرواز تھے' دن بھر اپنی تمازتیں بکھیرتا ہوا سورج تھک ہار کر اپنی نارنجی شعاعوں کے ساتھ دور افق پر مغرب کی جانب گم ہو رہا تھا۔ شام کے ملگجے سے اندھیرے میں ایک یار بھاگتا ہوا اس کی جانب بڑھا۔

''رحیمے...... رحیمے جلدی گھر چل تیری اماں جی کی طبیعت بڑی خراب ہے۔'' اس نے پھولی سانسوں کے درمیان کہا۔ اسے تو دوڑ لگ گئی۔ بھاگم بھاگ پہنچا' وہ آخری سانسیں گن رہی تھی۔ سینے سے گھر گھر کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

''عبدالرحیم'' اس نے بمشکل اٹک اٹک کر اس کا نام لیا۔

''جی اماں جی' میں آ گیا ہوں۔ چل تجھے شہر لے چلتا ہوں' میں نے تانگہ بلانے کو آدمی بھیج دیا ہے۔'' اس نے جلدی سے انہیں تیار کرنے کو کہا...... مگر انہوں نے ہچکی لیتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے رکنے کا اشارہ کرتے

ہوئے انہیں اپنے قریب آنے کو کہا۔ ندرت پہلے ہی پاس کھڑی تھی' پھر ندرت کا ہاتھ پکڑ کر پاس آ کر کھڑے ہوئے عبدالرحیم کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے آخری ہچکی لی......

''اماں جی......اماں جی......!!'' دونوں پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے اب تو وہ مکمل طور پر ان کی ذمہ داری بن گئی۔

وقت کا کام ہوتا ہے گزرنا اور وہ اپنے ساتھ مہ و سال لیے تیزی سے گزرتا رہا۔ ندرت پہلے پہل تو محلے کی تقریبات وغیرہ میں شرکت کرتی رہی مگر لوگ انہیں دیکھ کر منہ بنا لیتے' کسی کی آنکھوں میں اس کے لیے پیار اور ہمدردی نہیں ہوتی بلکہ دبے دبے لفظوں میں بھائی کے شادی نہ کرنے کا الزام بھی انہیں کے سر ڈال دیتیں' بڑی بوڑھیاں آپس میں کھسر پھسر کرتی نظر آتیں نہ اپنا گھر بساتی نہ بھائی کو بیاہ رہی ہے۔ اے ہے بھائی کی شادی کردے گی تو عیش کہاں سے کرے گی۔

بھائی تو بھاوج کا ہو جائے گا' ایسی بہت ساری باتیں سنتے سنتے تنگ آ کر پہلے تو ایسی جگہوں پر آنا جانا بند کیا پھر بھائی کے لیے سوچنے لگی' بھاوج آ جائے گی بچے ہوں گے' بھائی کی محبت تو تقسیم ہو جائے گی' ہمارا کیا بنے گا' مگر شادی کرنا بھی ضروری تھی ورنہ لوگ کہاں چھوڑنے والے تھے۔

بہت دنوں تک وہ لڑکی تلاش کرتی رہیں۔ ایسی لڑکی جس کا والی وارث نہ ہو' جنہیں وہ اپنے اشاروں پر چلا سکیں۔ آخر بڑی تگ و دو کے بعد ان کی نگاہ انتخاب سفینہ پر پڑی' عمر میں عبدالرحیم سے بڑی تھی۔ پیچھے ایک بھائی بھابی کے کوئی نہیں تھا۔ وہ بیچاری سارا دن بھابی کی خدمت کیا کرتی تھی' کام کاج الگ' جب عبدالرحیم کا رشتہ اس کے لیے آیا بھائی کو تو کوئی اعتراض نہیں ہوا البتہ بھابی صاحبہ کے تیور بگڑ گئے۔ مفت کی نوکرانی جو ملی ہوئی تھی' اس نے اس شادی کو ختم کرنے کی بڑی کوششیں کیں لیکن بھائی اور ندرت بی بی کے سامنے اس کی ایک نہ چلی' اور ایک دن ہزاروں خواب آنکھوں میں سجائے عبدالرحیم کی دلہن بن کر ان کے آنگن میں قدم رکھا۔ انہیں شاید یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کا واسطہ ندرت بی بی سے پڑا ہے' پہلی ہی رات ان کے ارمانوں پر ندرت بی بی نے شب خون مار دیا۔ عین اس وقت جب وہ حجلہ عروسی میں داخل ہوا چاہتے تھے' انہوں نے انہیں اپنے کمرے میں بلا لیا۔

''عبدالرحیم سفینہ کو آرام کرنے دو' گاؤں کے حکیم جی نے اسے بڑی خطرناک بیماری بتائی ہے۔ ایسے میں مرد عورت کا اکٹھے رہنا اچھا نہیں' کچھ دن اسے کھانے پینے آرام کرنے دو۔''

''پھر......آپ نے...... اس سے میری شادی......'' وہ کہتے کہتے رک گئے۔ شاید بہن کا احترام غالب آ گیا تھا۔

''پہلے ہمیں اس بات کا پتہ نہیں تھا وہ تو بھلا ہو حکیم جی کا' میں دوائی لینے گئی تو اس نے بتایا تھا۔'' اس کے چہرے سے مکاری عیاں تھی۔ مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ احترام کے علاوہ اماں سے آخری لمحوں میں کیا ہوا وعدہ بھی نبھانا تھا۔ ادھر سفینہ کے کمرے میں جا کر اس کی حیثیت یاد دلاتے ہوئے اسے ہمیشہ عبدالرحیم سے دور رہنے کو کہہ دیا۔ آرزوؤں اور تمناؤں والی رات شمع کی مانند قطرہ قطرہ پگھلتی رہی۔ وہ دونوں علیحدہ علیحدہ کمروں میں اپنے ارمانوں کی قبر پر مصلحتوں کی چادر چڑھاتے رہے۔ دونوں کی اپنی اپنی مجبوریاں تھیں۔ ایک ماں کے ساتھ کیا ہوا وعدہ نبھا رہا تھا کہ بہن کا ہمیشہ خیال رکھنا اور دوسری ایک جہنم سے نکل کر دوسرے جہنم میں آ گئی تھی بس اتنا فرق تھا کہ وہ یہاں کسی سے منسوب تو تھی۔ اس کی جانب انگلیاں اٹھانے والا تو کوئی نہیں تھا' وہاں تو اس کی اپنی بھاوج اسے ہر روز کسی نہ کسی کے ساتھ منسوب کرتی رہتی تھی۔ اب کسی کو کچھ بتا کر اس سائبان کو کھونا نہیں چاہتی اس کا مقدر تو

کھوٹا ہی ٹھہرا تھا۔ بس چپ چاپ آپا جی کا حکم بجا لاتی رہی۔ ندرت کو وہ عبدالرحیم کی طرح آپا جی ہی کہتی تھی۔ آپا طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے ہر روز ان کے کمرے میں آ کر چارپائی ڈال لیتیں اور یہ خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتے۔ حسرتوں' خواہشوں کو دفناتے دفناتے سفینہ بی بی خود کو روگ لگا بیٹھی۔ پہلے ہی حالات نے ان کے کس بل کس نکالے ہوئے تھے۔ اب تو خواب کا موسم بھی گزر چکا تھا۔ جب ہمسفر ہی کو سفر کی صعوبتوں کا احساس نہیں تھا تو شکایت کس سے کرتیں۔ سفینہ تو جب سے اس گھر میں آئی تھی ندرت کو ہل کر پانی پینا بھی گوارا نہیں تھا۔ اب جب سفینہ کام میں ذرا سست ہوئی تو ان کی تیوری پر بل پڑنے لگے۔ بڑی مشکل سے آہستہ آہستہ کام وغیرہ نبٹا کر جب ذرا آرام کے لیے اپنے کمرے میں آتی ندرت کے منہ سے مغلظات کا طوفان ابل پڑتا۔

''اپنے گھر میں سارا دن بھائیوں کی غلامی کرتی تھی تو روگ نہیں لگا تھا' یہاں آ کر سونخرے دکھا رہی ہے' کام کر ٹھیک سے ورنہ چٹیا پکڑ کر بھائی کے گھر چھوڑ آؤں گی۔ کرتی رہنا ان کی غلامی۔'' مگر اتنا کچھ اس کے بس کا نہیں تھا۔ سارا دن کھانستی اور کراہتی رہتی۔ اس دن پہلی بار ندرت کے بگڑنے پر عبدالرحیم کو سخت غصہ آیا تھا۔

''آپا جی! اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' دیکھیں کتنی کمزور ہو گئی ہے' وہ جانے کب سے اسے اس طرح ٹوٹتا بکھرتا دیکھ رہا تھا۔ ان کا اس کی حمایت میں بولنا ندرت کو اور بھی تاؤ دلا گیا۔ پہلے پہل تو چونکیں اور سوالیہ نظروں سے بھائی کی طرف دیکھا مگر وہاں سوائے ندامت اور پریشانی کے کچھ بھی نہیں تھا۔ یعنی ایسی ویسی کوئی بات نہیں تھی۔

''کل میں اسے شہر لے جاؤں گا۔'' گویا انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ کہہ کر بڑے اطمینان سے صحن کے کنارے برگد کے نیچے چارپائی پر بیٹھ گئے۔ وہ بل کھا کر رہ گئی۔ آج پہلی بار بھائی نے ان کے حکم کا انتظار کیے بغیر فیصلہ کر لیا تھا۔

اگلے دن بھائی کو اکیلے شہر سے واپس آتے دیکھ کر انہیں بڑی مایوسی ہوئی۔

''کیا ہوا رحیم؟ سفینہ نہیں آئی' آخر بڑی دیر کے بعد انہوں نے پوچھا۔

''آپا جی......سفینہ کو میں شہر کے سرکاری ہاسپٹل میں داخل کروا دیا ہے۔''

''کیوں؟ کیا ہوا ہے اسے؟'' انہوں نے بیزاری سے پوچھا۔

''ٹی بی......ہو گئی ہے اسے۔'' کہتے ہوئے عبدالرحیم کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''توبہ......توبہ......توبہ انہیں تو جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ ہائے یہ جراثیمی بیماری ہے......انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

''اب اسے گھر نہ لانا رحیم......''

''پھر کہاں لے جانا ہے؟'' عبدالرحیم کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''اس کے گھر چھوڑنا......''

''یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی آپا جی......وہ میری زنانی ہے......میری ذمہ داری اور یہ گھر اس کا بھی تو ہے......'' آج نہ جانے کہاں سے اس میں اتنی ہمت آ گئی تی جس نے ندرت کو حیرانگی کے ساتھ ساتھ غصہ بھی دلا دیا تھا۔

''تو بھی......تو بھی اس کے ساتھ ساتھ مل کر کھانستے رہنا۔''

عبدالرحیم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے' سفینہ ہاسپٹل سے فارغ ہو کر کہاں جائے گی۔ اب تو پچھتاؤں نے آن گھیرا تھا۔ سب کچھ ان کی وجہ سے تو ہوا تھا۔ نہ وہ اس کی طرف سے یوں غفلت برتتے نہ ایسا ہوتا۔ وہ ان کی بیوی تھی' اس کا حق تھا ان پر...... جب وہ پاس تھی تو کبھی اس کا خیال نہیں آیا۔ سارا دن جانوروں کی طرح کام میں

لگی رہتی۔ گھر بار مال مویشیوں سے لے کر ان کی آپا کی خدمت گزاریاں آج جب وہ پاس نہیں تھی یادیں اسے تڑپا رہی تھیں۔

''نہیں......اب ایسا نہیں ہوگا......؟ اب میں اس کے سارے حقوق ادا کروں گا۔ اسے کسی کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑوں گا۔'' دل میں عہد تو کرلیا تھا۔ مگر طرح طرح کے واہمے' اندیشے انہیں لرزا رہے تھے' ایک اس کی بے بسی اور دوسری آپا جی کی ہٹ دھرمی عجیب دوراہا تھا۔

کتنے ہی دن سے عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ سفینہ کو ہسپتال میں داخل ہوئے یہ دوسرا مہینہ تھا۔ آج تو کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کئی دنوں سے اس کے پاس جانے کا سوچ رہا تھا۔

خزاں کی اداس سی شام تھی۔ ہر طرف سوکھے پتے فضاؤں میں بکھرے ہوئے نظر آرہے تھے۔ بعض درخت تو بالکل ہی لنڈ منڈ پڑے تھے اور بعض میں چند گنے چنے پیلے پیلے پتے کسی وقت بھی بکھرا چاہتے تھے۔ دھندلی سی خنکی لیے شام جب وہ کھیتوں سے آرہا تھا تب ہی کاکا چھندے کی دکان پر ان کا بلاوا آیا' ان دنوں موبائل فون تو دور کی بات لینڈ لائن فون بھی کہیں کہیں ہوا کرتے تھے اور یہ تو گاؤں تھا۔ یہاں صرف ایک نمبردار اور کاکا چھندے کے یہاں ہی فون تھے۔ سارا پنڈ ادھر ہی آکر فون کرتے اور سنا کرتے تھے۔ وہ بھاگم بھاگ وہاں پہنچا تو پتہ لگا شہر سے اس کا فون آیا تھا۔ سفینہ گزر گئی تھی۔ وہ دل تھام کر رہ گیا۔ پھر اسے کچھ یاد نہیں' وہ کس طرح اپنی سسرال پہنچا۔ میت اس کے بھائی نے ہی وصول کی تھی۔

وہ تھکے تھکے سے نڈھال قدموں سے وہاں پہنچے۔ محلے والے انہیں عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کے بھائی نے تو انہیں دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا وہ خود ہی سب کے سنگ سفینہ کو منوں مٹی تلے دبا آئے۔ رات وہاں گزار کر یہاں دوپہر آگئی تھی ان کے آتے آتے...... یہاں بھی لوگوں کا ہجوم تھا۔ سب ندرت سے افسوس کرنے آرہے تھے۔ اور وہ درمیان میں بیٹھی مگر مچھ کے آنسو بہا رہی تھی۔ کیا بھونڈا مذاق تھا۔ دل نے سوچا جب وہ زندہ تھی تو کبھی اس سے ہمدردی کے دو بول نہیں بولے۔ سارا دن جانوروں کی طرح اس سے کام لیتی رہیں' ان سے ہمیشہ دور رکھا' تنہائیوں کی مار مارتی رہی اسے۔ اور آج جب وہ نارسائیوں کا کرب سہہ کر مر گئی تو اب ٹسوے بہا رہی تھیں۔

واہ ری عورت' آج پہلی بار انہیں اپنی اس ماں جائی سے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ مگر اب حاصل کیا ہونا تھا۔ سفینہ کے گھر آنے کے بعد ندرت نے گھر کے کاموں میں ہاتھ لگانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ بیٹھ بیٹھ کر کھانے اور حکم چلانے کی عادت ہوگئی تھی' انہیں آرام طلبی نے ان کے جسم کو گوشت پوست کا پہاڑ بنا دیا۔ پہلے تو بیماری کا بہانہ بنا بنا کر آرام کیا کرتی تھیں' اب بیٹھ بیٹھ کر پوری کی پوری گوشت کا پہاڑ بن کر بیمار رہنے لگی تھیں۔ بلڈ پریشر شوگر اور نہ جانے کون کون سی بیماریاں چمٹ کر رہ گئی تھیں انہیں۔ چلنا پھرنا مشکل ہوگیا تھا۔ کام کا بوجھ سر پر آیا تو دن میں تارے نظر آگئے۔ اب عبدالرحیم پر دوسری شادی کے لیے دباؤ ڈالنے لگیں۔ اس دفعہ انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ ایک کے حق حقوق کی تو پاسداری نہیں کرسکا اب مزید کسی پر ظلم کرکے اپنے گناہوں کا بوجھ نہیں بڑھانا چاہتا۔

''لو یہ کیا بات ہوئی۔ کس نے کہا تھا' حق' حقوق سے دستبردار ہونے کو' تم ہی لوگوں کو ایک دوسرے سے ملنے کا شوق نہیں تھا۔ الٹا اس نے ان دونوں ہی کو مورد الزام ٹھہرا دیا۔

''کوئی خامی ہوگی نا کسی میں......اب وہ کیا کہتے بڑی بہن تھی منہ نہیں لگنا چاہتے تھے' سوچپ ہوگئے۔ اب تو سارا سارا دن گھر سے غائب رہنا' بلکہ کئی کئی راتوں تک اس کا پتہ بھی نہ ملتا۔

ندرت بھی بستر کی ہوکر رہ گئی۔ محلے والے حق ہمسائیگی ادا کرتے ہوئے' دو ٹائم کی روٹی اپنی اپنی باری سے

پہنچاتے رہے' گھر کا سامان کچھ کچھ غائب ہوتا رہا وہ کیا کرسکتی تھی معذور عورت' عبدالرحیم کا زیادہ وقت نہر کے اس پار خانقاہ میں بسر ہوتا۔

آج ندرت بی بی پچھتاؤں کی آگ میں جلنے لگیں۔ یہ کیا کیا انہوں نے۔ بھابی کو بے موت مار کر بھائی کا گھر اجاڑنے کا احساس تو علیحدہ آفت جاں بنا ہوا تھا اس پر ستم کہ انہیں کبھی آپس میں یکجا ہونے ہی نہیں دیا اور پھر بے اولادی کا الزام بھی رکھ چھوڑا تھا......اب وہ تھی اور پچھتاؤں کے ناگ' جو انہیں وقت بے وقت ڈستے رہتے تھے۔

ان کے درمیان فاصلے نہ پیدا کرتیں تو کم از کم آج انہیں ایک گلاس پانی دینے والا تو ہوتا کوئی' وہ اس جان لیوا تنہائی کا شکار تو نہیں ہوتیں۔ ان کے لڑکھڑاتے میں تھامنے والا تو کوئی ہوتا۔ اپنے ساتھ ساتھ اپنے دو بھائیوں کا گھر اجاڑا انہیں کی وجہ سے عبدالغنی کو صفیہ سے دستبردار ہونا پڑا تھا۔ اب اپنے وجود سے کراہیت محسوس ہونے لگی تھی۔ ہر وقت خدا سے معافی مانگتی نظر آتی۔ وہی بات تھی...... کی اس نے میرے قتل کے بعد جفا سے توبہ......

تنہائیوں کا عفریت جب انہیں دبوچنے لگتا تو ساری انگنائی میں لاٹھی کے سہارے بولائی بولائی سی پھرتیں' کبھی کبھی تو کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر بھی پڑتیں' لاٹھی کہیں اور جا پڑتی اور یہ کہیں اور پڑی ہوتیں۔ محلے والے آکر اٹھاتے' کبھی اسی طرح لڑکھڑاتے گرتے پڑتے نہر کے کنارے بنی پلیا پر جا بیٹھتیں۔

کتنی یادیں بکھری پڑی تھیں یہاں...... ان کا بچپن تو زیادہ تر ادھر ہی گزرا تھا۔ نہر میں ڈبکیاں لگانا' سنگی سہیلیوں کے ساتھ کاغذ کی کشتی بنا کر نہر میں بہانا' دونوں ہاتھوں کے جال بنا کر کنارے بیٹھ کر چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پکڑنا' وہ گرمیوں کی چلچلاتی دوپہریں ہوں یا بہار کی گل رنگ شامیں وہ یہاں آنا نہیں بھولتی' گھنٹوں تتلیوں کے پیچھے بھاگنا' پرندوں کے گیت سننا' رنگ برنگے پھول توڑنا ان کا مشغلہ تھا۔ اب وہ انہیں یاد کرکے یہاں آہیں بھرتی رہتی اور آتے جاتے لوگوں کو دیکھتی رہتیں' ان میں سے کچھ انہیں جانتے بھی تھے مگر کنی کترا کر گزر جاتے' کسی کو اتنی فرصت تھی کسی کا حال پوچھنے کی سب کی اپنی اپنی دنیا تھی' بال بچوں میں مگن ان کی طرح کوئی اپنا گھر اجاڑ کر تو نہیں بیٹھا تھا۔

اس دن شام ہی سے کالے کالے بادل گھر آئے تھے۔ بالکل رات جیسا اندھیرا ہو رہا تھا۔ دن کے وقت نمبردار کے گھر سے نیاز کے چاول آئے ہوئے تھے۔ ایسا کھانا تو اب قسمت ہی سے نصیب ہوتا تھا' انہیں عبدالرحیم کا انتظار تھا' کئی دنوں سے وہ آیا بھی نہیں تھا۔ چلو کسی سے بلوانے کی کوشش کرتی ہوں۔ وہ بھی کھالے گا آکر یہی سوچ کر آہستہ آہستہ لاٹھی ٹیکتی ہوئی باہر نکل آئیں۔ کسی کی تلاش میں چلتے چلتے نہر کے پاس آپہنچیں۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا' بارش کسی دم بھی ہوا چاہتی تھی۔ دور دور تک کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ دور پہاڑی پر خانقاہ کا سبز گنبد اندھیرے میں سیاہ دھبے کی مانند نظر آرہا تھا۔ ایک دم سے جیسے بادل برسنا شروع ہوگئے' تیز رفتار آندھی بارش اور کڑکتے بادلوں نے تو اوسان خطا کر دیئے۔ اب جائیں تو کدھر......؟ اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہوگیا وہ تنکے کی مانند ادھر ادھر ڈولنے لگیں۔ رات بھر بارش برستی رہی' صبح نور کے تڑکے بارش کا زور ٹوٹا' لوگ اپنے اپنے کاموں پہ نکلے تو انہیں نہر کے کنارے جھاڑیوں میں اٹکی ہوئی کوئی چیز نظر آئی کچھ اور لوگوں کو ساتھ لے کر وہاں پہنچے تو اس وجود پر نظر پڑتے ہی ایک دم سے سب کی زبان سے نکلا۔ ''آپا جی'' نہ جانے رات کے کس پہر وہ تیز طوفانی لہروں کے ساتھ بہہ کر نہر میں جا گری تھیں اور جھاڑیوں میں الجھ کر اپنی جان گنوا بیٹھیں۔

......☆☆☆......

ذوق آگہی

سباس گل

(اس ماہ کا انعام یافتہ اقتباس)

خالی پن

کچھ لوگ دنیا سے اور دنیا کے کاموں سے اتنے بھرے ہوتے ہیں کہ انہیں دیکھ کے ترس آتا ہے۔ ان کے اندر کوئی خلد کوئی کونہ خالی ہی نہیں ہوتا۔ جو شخص اتنا بھرا ہوا ہو اتنا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو وہ آزاد کس طرح سے ہو سکتا ہے۔ جس کے اندر ذرا سی بھی جگہ موجود نہ ہو اس کے اندر خدا کہاں سے آ سکتا ہے اور کیسے سما سکتا ہے۔ دیکھو آزادی کے لیے اندر جگہ چاہیے باہر نہیں۔

میں تو اکثر یہ بھی کہتا ہوں کہ اپنے آپ کو خدا سے بھی نہ بھرو۔ بس خالی جگہ چھوڑ دو۔ وہ خود بخود سما جائے گا تمہیں کوشش نہیں کرنی پڑے گی۔ جب بارش ہوتی ہے تو خالی گڑھے باران رحمت سے خود بخود بھر جاتے ہیں اور موٹے موٹے اونچے ٹیلے ویسے کے ویسے سوکھے ہی رہ جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو خالی رکھو کیونکہ خالی جھولی ہی بھری جاتی ہے۔

(بابا صاحب سے اقتباس)

مسکان احزم......فیصل آباد

جذبات

جذبہ ایک ایسی قوت ہے جو آپکو ناممکن کو بھی ممکن بنا نے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہی جذبہ تو ہمیں زندگی بخشتا ہے۔ پہاڑوں کا سینہ چیرنے پر اکساتا ہے، دریاوں کا رخ بدل دیتا ہے۔ ہوا میں اڑنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ دوسروں کی مدد پر اکساتا ہے۔ یہ جذبہ ہی تو ہے جو انسان کو زندہ رکھتا ہے۔

میاں صداقت علی......شور کوٹ

جذبات کی جائے پیدائش انسانی سلطنت قلب ہے۔ اس ریاست دل کو فتح کرنے کے لئے جذبات کی دو عظیم طاقتیں محبت اور نفرت آپس میں برسر پیکار رہتی ہیں۔ نفرت اپنی ابلیسی و طاغوتی طاقت اور بشری کمزریوں کی بناء پر اکثر و بیشتر قابض رہتی ہے لیکن جب انسان کا فطری جذبہ محبت اپنی طاقت اصل عشق حقیقی کو پا کر خوف الہی کے جھنڈے مضبوطی سے گاڑ دیتا ہے تب نفرت، حسد، مکاری، ریاکاری جیسے جذبوں کو مات دے کر آدمی کو اشرف المخلوقات کے مقام پر فائز کرتا ہے۔

عزی جان

جذبہ پیار و محبت یا ہو یا جذبہ جنون و عشق، نفرت و دشمنی کا ہو۔ انسان کی زندگی میں ہر جذبہ اپنا رد عمل اثر پذیر کرتا ہے۔ جذبہ انسان کے اندر ہونے والے تغیرات کا حامل مجموعہ ہے۔ یہی جذبے انسان کو کبھی انبساط و سرشار رکھتے ہیں، روحانی تسکین کا باعث بنتے ہی۔ شعور سے نوازتے ہیں۔ کبھی یہی جذبے انسان کی زندگی اجاڑ دیتے ہیں انسان کی روح کو زخمی اور وجود کو کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ رسوائی کی تاریک قبروں میں دفن کر دیتے ہیں۔

سارہ خان

جذبہ اگر سچا ہو تو انسان اندھا بن جاتا ہے، اسے اس بات کا احساس تک نہین رہتا کہ وہ اپنی منزل کیلئے کن کانٹوں بھری راہوں پر سے گزر رہا ہے، کس بھنور میں بغیر سفینے کے تیرتا چلا جا رہا ہے۔ باوجود اسکے یہ دم نہیں توڑ دیتا، دھڑکنوں کا لباس اوڑھے سانسیں لیتا ہے اور اپنے خوابوں کو حقیقت میں بدل دیتا ہے۔

کشاف اقبال

احساس و جذبات وہ آلہ کار ہیں جن کے بغیر نوح انسانی کا تصور ہی ممکن نہیں کہ احساس و جذبات ہی تو انسان و حیوان میں امتیاز کا ذریعہ اول ہیں۔ احساس اگر مردہ ہو جائیں تو جذبات کی لو بھی مدہم پڑنے لگتی ہے کہ زندگی کی ہر رونق جذبات سے ہی مشروط ہے اب چاہے وہ جذبہ ایثار، جذبہ ہمدردی، جذبہ نفرت، جذبہ دل لگی ہو یا دل کی لگی سب ہی احساس سے جڑے جذبات سے منسلک زندگی کے روگ و سنجوگ کے سلسلے ہیں اور جب تک احساس زندہ ہیں دوسرے کا دکھ بھی دکھ ہے اور جب احساس کی موت ہو جائے تو جذبات سرد پڑ جاتے ہیں اور اپنا دکھ ہی بس دکھ ہے باقی سب تماشہ۔۔۔ اسلئے کبھی احساس کو مرنے نہ دیں کہ یہ جذبات کی ابیاری کا ذریعہ ہے اور جذبہ اگر صادق ہو تو منزل خود قدموں سے لپٹتی ہے کہ منزل پر پہنچنے کیلئے راستے و ہمسفر کی نہیں جذبوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

سعدیہ عابد

کسی بھی شے کے حصول کیلئے جذبہ وہ واحد ہتھیار ہے کہ جس کے ساتھ میدان میں اترا جائے تو آپ اپنے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کر کے لوٹتے ہیں۔ جذبہ وہ واحد طاقت ہے جو تلواروں کی کمی کو پورا کرنے کے علاوہ تلواروں سے لیس فوج کے سامنے بھی آپکے حوصلے پست نہیں ہونے دیتی۔ جذبہ جب انسان میں موجود ہو تو وہ میدان نہیں صدیاں اور زمانے فتح کر لیتا ہے۔

کوثر ناز

جذبہ سٹرائڈ کا انجکشن نہیں کہ ادھر لگا اور ادھر جسم جوش سے بھر گیا۔ نہیں، بلکہ جذبہ وہ الہامی کیفیت ہے جو قلب پہ وارد ہوتی ہے اور رگوں میں لہو کی جگہ گردش کرنے لگتی ہے اور پھر آپ ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ بھی ماونٹ ایورسٹ کو سر کر کے وہاں اپنی فتح کا جھنڈا گاڑ آتے ہیں۔

عامر نذیر بلوچ

محبت ایک لافانی جذبہ ہے جو زمان و مکان کی قید سے ازاد، ایک شوریدہ دریا کی مانند اپنی راہ میں آئی ہر رکاوٹ اور ہر شے کو بہا کر لے جاتا ہے۔

عائشہ پرویز

محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کے اندر ایک کونپل کی صورت اگتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ ایک تناور درخت کی طرح انسان کی نس نس میں سما جاتا ہے۔ اسکی شاخیں اتنی مضبوطی سے اندر پھیل جاتی ہیں کہ اگر اسکو کاٹا بھی جائے تو شاخیں مرجاتی نہیں اور یہ جذبہ محبت اداسی سے لے کر خوشی محرومی دکھ سے تک کی سوغاتوں کی سیر کراتا ہے۔

سید عبادت کاظمی

محبت کا سچا جذبہ بارش کی طرح جب دل کی بنجر زمین پر اترتا ہے تو دل کے ساتھ ساتھ روح بھی اسکی پھوار سے بھیگ جاتی ہے۔ جذبہ سچا ہو، خدا پر کامل یقین ہو تو منزل ملنا مشکل نہیں ہوتی۔ شرط سرف اتنی ہے کہ اس خالص جذبے میں بے ایمانی کی کھوٹ شامل نہ ہو۔

ماہم علی

کامیاب زندگی کیلئے سچا جذبہ شرط ہے۔ عبادت، محبت، محنت۔۔۔۔ زندگی کے اہم ترین پہلوں ہیں اور ان سب میں اپنے اصل مقام تک پہنچنے کیلئے جذبہ ہی اصل زاد راہ ہوتا ہے۔

سعد خان

جذبہ چاہے کوئی بھی ہو اگر اس میں شدت نہ ہو تو آپ اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جذبہ سچا ہو تو پ اس سے غافل نہیں ہو سکتے۔ اسکیلئے آپ کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتے۔ جو لوگ قسمت کو اپنی ناکامی کا ذمہ داری سمجھتے ہیں انکو یہ جان لینا چاہیئے کہ جذبے میں صدق ہو تو اللہ تعالیٰ خود آپکو آپکی منزل تک پہنچاتے ہیں بس نیت میں خلوص کی ضرورت ہے۔

زینب فرخ

محبت کا جذبہ سب جذبوں سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے اس میں انسان کو بہت کچھ پانے کیلئے بہت کچھ کھونا پڑتا ہے جب یہ جذبہ عشق مزاجی کی صورت میں انسان پر حاوی ہوتا ہے تب انسان بہت کچھ کھوتا ہے اور ناکامی و مایوسی کے بعد یہ عشق حقیقی کا رخ کر لیتا ہے مگر یہ جذبہ جب عشق حقیقی اور کرب الہی کی تلاش اور اس ذات کو پا لینے کا ہوتا ہے تو انسان کھوتا کچھ بھی نہیں صرف اور صرف پاتا ہے بلکہ انسان کو صرف اور صرف نوازا جاتا ہے۔

امامہ مغل

جذبہ وہ شے ہے کہ ہماری راہ میں آئی رکاوٹوں کو بڑی دلیری سے اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ پاؤں میں چبھے کانٹوں سے رستا خون ہو یا دل پہ لگے زخموں سے اٹھتی ٹیس ہو۔ ہر ایک کو ہی اپنے اندر سمو لیتا ہے اسفنج کے اس خشک ٹکڑے کی طرح جو فرش پہ آئی نمی کے چھوٹے بڑے قطروں کو اپنے اندر اتار لیتا ہے۔ ہمارا جذبہ جتنا گہرا ہوگا رکاوٹیں اتنی ہی اندر تک اترتی چلی جائیں گیں اور راہ ہموار ہوتی جائے گی۔

فاطمہ شیخ

جذبہ زندگی کی اساس ہے، پاوں کو اٹھا کر قدم بنانے والا محرک۔ یہ وہ جزو ہے جو زندہ اور مردہ میں سانس کے فرق جیسا ہے لیکن ایسا مخفی جزو جو سرف اس وقت عیاں ہوتا ہے جب یہ جاں بہ لب شخص کی انکھوں میں دم توڑ رہا ہوتا ہے۔

شبینہ گل

نماز

نماز ہمارے پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔
نماز مومن کی معراج اور دین کا ستون ہے۔
پانچ فرض نمازیں ہیں۔
نماز فجر: فجر کی نماز پڑھنے سے چہرہ روشن ہوجاتا ہے اور دن اچھا گزرتا ہے۔
جس نے فجر کی نماز ترک کی اس کے چہرے سے نور ختم کر دیا جاتا ہے۔
نماز ظہر: ظہر کی نماز پڑھنے سے رزق میں اضافہ ہوتا ہے اور دولت میں برکت ہوتی ہے۔
جس نے ظہر کی نماز ترک کی اس کی روزی سے برکت ختم کر دی جاتی ہے۔
نماز عصر: عصر کی نماز پڑھنے سے اولاد فرمانبردار ہوتی ہے۔
جس نے عصر کی نماز ترک کی اس کے بدن سے طاقت ختم کر دی جاتی ہے۔
نماز مغرب: نماز مغرب پڑھنے سے دعائیں جلد قبول ہوجاتی ہیں۔
جس نے مغرب کی نماز ترک کی اس کو اولاد سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔
نماز عشا: عشا کی نماز پڑھنے سے نیند پرسکون آتی ہے اور دن اچھا گزرتا ہے۔
جس نے نماز عشا ترک کی اس کی نیند سے راحت ختم کر دی جاتی ہے۔

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم

سنہری باتیں

❁ بچہ دنیا میں صرف ایک ہنر لے کر آتا ہے اور وہ ہے رونا، بچہ رو رو کر اپنی ماں سے ہر بات منوالیتا ہے مگر بد نصیب ہیں وہ لوگ جو رو رو کر اپنے رب سے گناہوں کی بخشش نہ کرا سکیں، وہ رب جو ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے۔
❁ منافق کی بات خوب صورت مگر اس کا عمل درد ناک ہوتا ہے۔
❁ لوگوں سے اس طریقے سے ملو کہ اگر مرجاؤ تو تم پر روئیں اور زندہ رہو تو تمہارے مشتاق ہوں۔
❁ گناہ کو پھیلانے کا ذریعہ مت بنو، کیونکہ ہوسکتا ہے آپ توبہ کرلو مگر جس کو آپ نے گناہ پر لگایا ہے وہ آپ کی آخرت کی تباہی کا سبب بن جائے۔
❁ دن کی روشنی میں رزق تلاش کرو اور رات میں اسے تلاش کرو جو رزق دیتا ہے۔
❁ مصائب سے نہ گھبرائیے کیونکہ ستارے اندھیرے میں ہی چمکتے ہیں۔
❁ دعا کی قبولیت کا انحصار الفاظ پر نہیں اخلاص پر ہے۔

محمد یاسر...... رحیم یار خان

غم اور مسکراہٹ

غم اس لیے نہیں ہوتے کہ انہیں آنسوؤں کی صورت میں سجا کر دوسروں کے سامنے پیش کر دیا جائے، یہ دل کے لیے ہوتے ہیں اور دل ہی دل میں پھلتے اور پروان چڑھتے ہیں۔ جب غم اشکوں کی مالا بن کر بکھرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس وقت انہیں زمانے میں سمیٹنے والا کوئی نہیں ملتا کیونکہ یہ دنیا تو خوشیوں کی ساتھی ہے، اس نے کب روتے ہوئے چہروں کو ہنسایا ہے بلکہ ہمیشہ ہنستے ہوئے چہروں کو رلایا ہے اس لیے بہتر ہے انسان اپنے دکھوں کو چھپا کر ہر دم مسکراہٹ سجائے رکھے اور زندگی کے دن پورے کرے۔

احسان سحر...... میانوالی

یادیں

یادیں انسان کی بہترین ساتھی ہیں جسے دنیا کی کوئی طاقت جدا نہیں کرسکتی، یادیں ابتدا میں کچے دھاگے کی مانند ہوتی ہیں مگر بعد میں آہستہ آہستہ لوہے کی تار بن جاتی ہیں جن کے پنجرے میں انسان کی شخصیت محصور ہو کر رہ جاتی ہے۔ خوب صورت یادیں ماضی کا انمول خزانہ ہیں جو حال کی تلخیوں پر مرہم کا کام دیتی ہیں، یادیں مایوسی میں امید کا جلتا ہوا چراغ ہیں، خوشگوار یادیں ایک ایسے پھول کی مانند ہوتی ہیں جن کی خوشبو زندگی کے آخری لمحے تک محسوس کی جاتی ہے۔ یادیں اس حنا کی مانند ہوتی ہیں جو سوکھ جانے کے بعد رنگ لاتی ہے یادیں تصویر کے پیکر میں نہیں بلکہ دل میں ایک خیال بن کر رہتی ہیں۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال

اف یہ بیویاں

☺ بعض بیویاں طالبان کی طرح ہوتی ہیں، نہ آدمی آپریشن کرسکتا ہے اور نہ مذاکرات کامیاب ہوتے ہیں۔
☺ عورت کی آدھی زندگی خاوند کی تلاش میں اور باقی آدھی خاوند کی تلاشی میں گزر جاتی ہے۔
☺ اپنے ہر فیصلے پر الزام مقدر کو نہ دو، قبول ہے، قبول ہے، قبول ہے کس نے کہا تھا؟
☺ اچھی بیوی دنیا کے ہر کونے سے مل جاتی ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ دنیا گول ہے اور کونا نہیں ملتا۔
☺ پسند کی شادی کے لیے اپنی امی کے پاؤں دبائیں اور دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی کا گلا دبائیں۔
☺ صدقہ ہر بلا ٹال سکتا ہے سوائے اس کے جس سے آپ کا نکاح ہوچکا ہو۔
☺ ایک بات ہمیشہ یاد رکھیں، جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں مگر ذلیل زمین پر ہوتے ہیں۔

فلک شیر ملک...... رحیم یار خان

سوال

علم ایک خزانہ ہے اور اس خزانے کی کنجی سوال ہے کیا ہمیں معلوم ہے کہ اس مبارک کنجی تک رسائی کیوں کر ہوتی ہے اور یہ کنجی کہاں رکھی ہوتی ہے۔ جب تک ہم انتہا پسندانہ، فرقہ وارانہ منافرت اور سرداری و جاگیرداری کے جور و جبر سے آزادی حاصل نہیں کرتے ہیں اس کنجی کے بارے میں کوئی شعور حاصل نہ ہوگا۔

جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی

حالات

لوگ جو کچھ ہیں اس کی ذمہ داری حالات پر ڈالتے ہیں میں حالات پر یقین نہیں رکھتا۔
اس دنیا میں جن لوگوں نے نام پیدا کیا ہے وہ ایسے لوگ ہیں جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہے بلکہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ان حالات کو ڈھونڈا جن کی انہیں ضرورت تھی اگر وہ انہیں نہیں ملے تو انہوں نے ان کو پیدا کیا۔

اشفاق شاہین...... کراچی

خواہش

زندگی میں انسان کسی چیز کی دل سے خواہش کرسکتا ہے لیکن اسے حاصل نہیں کرسکتا۔ کچھ خواہشات حسرت میں تبدیل ہو کر رہ جاتی ہیں اور یہ حسرتیں ایک گہرا زخم بن جاتی ہیں اور زندگی میں دو باتیں بڑی تکلیف دہ ہوتی ہیں، ایک جس کی خواہش ہو اس کا نہ ملنا اور دوسری جس کی خواہش نہ ہو اس کا مل جانا۔
کاش......
خواہشات جو ہم نہیں ہمارا دل کرتا وہ پوری ہوسکتی......!

احمد عباس...... کوٹ ادو

قلم کی نوک

انسان جب قلم سے کچھ لکھتا ہے تو وہ تحریر کسی کے لیے خوشی تو کسی کے لیے غم کا باعث ہوتی ہے۔ کسی کے لیے امرت تو کسی کے لیے زہر۔ کسی کی تقدیر بدل سکتی ہے تو کسی کا مقدر مٹا سکتی ہے۔ قلم کی نوک سے کسی کا سر قلم ہوتا ہے تو کسی کو سربلند بھی کیا جاتا ہے۔ قلم کی نوک سے کسی کے لیے آزادی کا سندیسہ ملتا ہے تو کسی کے لیے موت کا فرمان جاری ہوتا ہے۔ قلم سے کسی کے نصیب کو چار چاند لگائے جاسکتے ہیں تو اسی قلم سے کسی نے نصیب پر سیاہی بھی مل دی جاتی ہے۔

خنساء عبدالمالک...... راولپنڈی

مہکتی کرنیں

♦ اچھا انسان وہ ہے جو کسی کا دیا ہوا دکھ تو بھول جائے پر کسی کی دی ہوئی خوشی نہ بھلا۔
♦ کسی کو اپنی صفائی نہ دو کیونکہ جو آپ سے پیار کرتا ہے اس کو ضرورت نہیں اور جو نفرت کرتا ہے وہ یقین نہیں کرے گا۔
♦ دوست پیار کے لیے ہوتے ہیں اور چیزیں استعمال کے لیے، بات تب بگڑتی ہے جب چیزوں سے پیار اور دوستوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔

نادیہ یٰسین...... ساہیوال

خوشبوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

اس ماہ کا انعام یافتہ کلام

محبت ہے......!
جبھی تو کچھ بھی کہتے ہو
تمہاری سردمہری کے سمندر میں پڑے
چپ چاپ سہتے ہیں
محبت ہے......!
جبھی تو ہم پرندوں کی طرح سے لوٹ آتے ہیں
تمہاری ذات کے گنجان برگد میں
جہاں پر کوئی ٹہنی بھی
ہماری خواہشوں کو گھونسلا رکھنے نہیں دیتی
محبت ہے......!
جبھی تو ہم نے تیری یاد کا جگنو حسیں،
روپہلے چہروں کی ضیاء میں آج تک کھویا نہیں
جبھی تو ہم دیے کی طرح جلتے ہیں سلگتے ہیں
تمھارے ہجر کی تاریک راتوں میں
ہماری خاک کو گر ہواؤں میں اڑاؤ گے
تو واپس لوٹ آئیں گے
ہمیں تو راکھ ہو کر بھی "تیرے قدموں میں رہنا ہے"
محبت ہے

ظل ہما......فیصل آباد

غزل

زندگی کو برت کر اس کے راز سے واقف ہوئی
میں خاموش ہوئی تو ہر آواز سے واقف ہوئی
سر اٹھا کر اڑتے پنچھیوں کو دیکھنا تھا آساں
خود پرواز کی تو کرب پرواز سے واقف ہوئی
مجھے دکھ و خوشی کی موسیقی میں نہ تھی تمیز
خود پر گزری تو دونوں کے ساز سے واقف ہوئی
مجھ پر لوگ ہنستے ہنستے کر جاتے طنز بہت
میں ناداں کب ریاکار الفاظ سے واقف ہوئی
لہجے میں پیار دل میں ہر شخص عداوت رکھتا
بہت دیر بعد میں اس شہر کے انداز سے واقف ہوئی
دور رہ کر نہ جان سکی اس کی فطرت
قریب رہ کر میں اس دغاباز سے واقف ہوئی
ابتداء میں ہی تو نے انجام اپنا دکھا دیا
اے محبت میں کب تیرے آغاز سے واقف ہوئی
دو قدم چلی تو وہ چار قدم چل کر آیا فرح
میں اب جا کر اپنے رب کارساز سے واقف ہوئی

شاعرہ: فرح بھٹو......شہر حیدر آباد

غزل

وہ عشق کہ غالب کو بھی بسمل کیا جس نے
وہ عشق کہ ہر قیس کو غافل کیا جس نے
وہ عشق کہ دنیا کو سخن ور کیا جس نے
وہ عشق کہ محفل کو منور کیا جس نے
وہ عشق جو افسردہ خیالی سے بچائے
وہ عشق جو جینے کی نئی راہ دکھائے
وہ عشق کہ بربادی کا ڈر جس کو نہیں ہے
وہ عشق کوئی خوف خطر جس کو نہیں ہے
وہ عشق جو ہر اک کو میسر نہیں ہوتا
اونچا سر نیزہ پہ ہر اک سر نہیں ہوتا
وہ عشق کہ دنیا کی طلب جس نے مٹا دی
وہ عشق کہ جس نے سر نیزہ بھی صدا دی
وہ عشق نظر آتا نہیں دنیا میں نیر
وہ عشق کہ جس پہ ہوئے قربان بہتر

نیر رضوی......لیاقت آباد، کراچی

نظم

ایک بھی مانی نہیں جا
شہر جنوں تھا اور دشت سی وحشت تھی
آشفتہ سروں کے کچھ لوگ سر کاٹ رہے تھے
حسرتوں کے مقبروں میں دبے تھے کچھ بدن
زرد موسموں میں کرب شمر کاٹ رہے تھے
مخلصی بھی ہنر ہے ہر کوئی جانتا نہیں یہ
اس ہنر سے بھی زیست کچھ ہمسفر کاٹ رہے تھے
وہ پھل نہیں تو کیا سایہ تو دے رہا ہے
سمجھتے نہیں تھے وہ جو شجر کاٹ رہے تھے
چہروں پہ گرد سفر بھی دیکھی ہے ان کے
جو مسافر تھے خلوت سفر کاٹ رہے تھے
سیف غیب کا حال خدا کو معلوم ہے پھر بھی ہم
امیدوں پہ اندازوں پہ زیست سر بسر کاٹ رہے تھے

سیف الاسلام......لیاقت آباد

سردیوں کے موسم میں

بارشوں کی بوندوں نے
خنک سرد ہواؤں نے
دل میں بیتی یادوں کا
میلہ اک لگایا ہے
مجھ کو ایک بھیگا سا
لمحہ یاد آیا ہے
شام وہ جدائی کی
ڈوبتا ہوا سورج
دسمبر کی بارش میں
جب جدا ہوا تھا تو
ہاں......تیری جدائی کا
وہ لمحہ یاد آیا ہے

صبا جرال......بحرین

دل دکھتا ہے

آباد گھروں سے دور کہیں، جب بنجر بن میں آگ جلے
پردیس کی بوجھل راہوں میں، جب شام ڈھلے
دل دکھتا ہے
جب رات کا قاتل سناٹا، پر ہول فضا کے وہم لیے
قدموں کی چاپ کے ساتھ چلے
دل دکھتا ہے
جب وقت کا نابینا جوگی کچھ ہنستے بستے چہروں پر
بے درد رتوں کی راکھ تلے
دل دکھتا ہے
جب شہہ رگ میں محرومی کا نشتر ٹوٹے
جب ہاتھ سے ریشم رشتوں کے دامن چھوٹے
دل دکھتا ہے
جب تنہائی کے پہلو سے، انجانے درد کی لہر پھوٹے
زرد آب رتوں کے سائے میں جب پھول کھلیں
دل دکھتا ہے
جب زخم دمکنے والے ہوں اور خوشبو کے پیغام ملیں
اور اپنے دریدہ دامن کے جب چاک ملیں
دل دکھتا ہے
جب آنکھیں خود سے خواب بنیں خوابوں میں بسرے چہروں کی
جب بھیڑ لگے اس بھیڑ میں جب تم کھو جاؤ
دل دکھتا ہے
جب حبس بڑھے تنہائی کا، جب خواب جلیں
جب آنکھ بجھے تم یاد آؤ
دل دکھتا ہے
دل دکھتا ہے

شاعر: محسن نقوی

فلک شیر ملک......رحیم یار خان

نظم

اک آس سی جیسے ہے مجھ کو
وہ سب کچھ تم کو یاد ہی ہوگا
یہ باتیں اپنے گاؤں کی ہیں
جس گاؤں میں ایک مکتب تھا
سارے گاؤں کی شوخ سی کلیاں
اس مکتب میں کھلتی تھیں
اک مکتب ساتھ اور بھی تھا
پھول جو سارے گاؤں کے تھے
اس مکتب میں آتے تھے
پھر کچھ عجب سی بات ہوئی
وہ جو پھولوں والا مکتب تھا
اس مکتب کے اک پھول کو
کلیوں والے مکتب میں سے
اک معصوم کلی بھا سی گئی
وہ کلی بھی چپکے چپکے سے
اس پھول سے چاہت رکھتی تھی
وہ دن بھی سمجھو عید کے تھے
دیدار کے تھے اور دید کے تھے
جتنا اس سے ہو سکتا تھا
کلی نے پھول کو پیار دیا
اپنی جیت نہ دیکھی اس نے
سب کچھ پھول پر وار دیا
وہ پھول اور کلی جب ملتے تھے

تو الفت کے قصے چھڑتے تھے
مگر یہ ہوائیں محبت کی
کچھ دیر چلیں اور تھم ہی گئیں
اس کے بعد فضاؤں نے
بدلے رنگ جب اپنے اپنے
قسمیں اور وعدے ٹوٹ گئے
مجبور ہوئے دونوں کے سپنے
پھر ظالم وقت نے دستک دی
اور ورق محبت پھاڑ دیا
پھول اور کلی کو ملنے سے پہلے
اس ظالم وقت نے مار دیا
ہاں ظالم وقت نے

عمر فاروق ارشد......فورٹ عباس

نظم

اک مدت سے آس کے آنگن میں
زباں پہ قفس ڈالے
ہم راہ دیکھ رہے ہیں
کہ طور پہ اک معجزہ ہو گا
پھر وہاں سے کلیم آئے گا ہماری طرف
ہاتھ میں عصاء لیے
ہم بے زبانوں
ہم ناتوانوں
کا ہاتھ تھامنے کو
وقت کے فرعونوں کے سامنے کو
اندھیروں سے ایک پو پھوٹے گی
روشن ہو گی یہ وادی بھی
پانی پھر سے راستہ دے گا
اور ہم
اس کی انگلی تھامے
آس کے صحن سے
کوچ کریں گے
اپنی حسرتوں میں
حقیقت کے رنگ بھریں گے

عرشان نذر......اوکاڑہ

نظم

اک بات کہوں گر سنتے ہو
تم مجھ کو اچھے لگتے ہو
کچھ چنچل سے، کچھ چپ چپ سے
کچھ پاگل پاگل لگتے ہو
ہیں چاہنے والے اور بہت
پر تم میں ہے اک بات
تم اپنے اپنے لگتے ہو
یہ بات بات پہ کھو جانا
کچھ کہتے کہتے رک جانا
کیا بات ہے کیوں چپ رہتے ہو
اک بات کہوں گر سنتے ہو
تم مجھ کو اچھے لگتے ہو

منشی محمد عزیز مئے......ضلع وہاڑی

رو لیتے ہیں

غمگساروں سے تیرا، پوچھ کے رو لیتے ہیں
ہم ستاروں سے تیرا، پوچھ کے رو لیتے ہیں
جن میں دیکھے تھے کبھی پیار کے سپنے مل کر
ان بہاروں سے تیرا پوچھ کے رو لیتے ہیں
جو تیرے دیس میں جاتے ہیں مشقت کرنے
ایسے یاروں سے تیرا پوچھ کے رو لیتے ہیں
جن کو بخشی تھی تیرے حسن رعنائی بھی
ان نظاروں سے تیرا پوچھ کے رو لیتے ہیں
جو سر شام کہیں لوٹ کے گھر جاتی ہیں
ایسی ڈاروں سے تیرا پوچھ کے رو لیتے ہیں
تو سمندر میں کہیں دور جزیرے پہ بسا ہے
ہم کناروں سے تیرا پوچھ کے رو لیتے ہیں
تیری آنکھیں بھی تو ایسے ہی بہا کرتی تھیں
آبشاروں سے تیرا پوچھ کے رو لیتے ہیں

عائشہ اعوان......رحیم یار خان

غزل

آوارگی میں تابش پیمانے ہوا نہیں کرتے
اہل خرد لوگوں کے لیے میخانے ہوا نہیں کرتے
در بہ در بھٹکتے ہیں لوگ یہاں اکثر
لیکن سبھی تو دیوانے ہوا نہیں کرتے
اپنے ہی نفس کے یہ سب کھیل ہیں پیارے

وگرنہ بدنام یوں قحبہ خانے ہوا نہیں کرتے
بھول جاتے ہیں لوگ ہی اک دوسرے کو تابش
یاد ماضی کے اوراق تو پرانے ہوا نہیں کرتے

ڈاکٹر علی حسنین تابش......چشتیاں

غزل

نا گھر ہے، نا جھونپڑا بالکل ہی نہتے ہیں
پھر بھی رئیس ہیں ہم کہ ترے دل میں رہتے ہیں
سنتے نہیں وہ حیرانگی ہے کہ بہرے بھی نہیں
برسوں سے دو بول پیار کے جو کہتے ہیں
پیوستہ ہے تیر دل میں جو نکلتا ہی نہیں
دن رات تو کیا ہر لمحہ عذاب سہتے ہیں
دکھتے نہیں ہیں دکھ مجھ کو کہ نیم بینا ہو گیا میں
بد پرہیزی بھی غضب کی کہ ہر دم اشک بہتے ہیں
اس کی طلب میں سجدے کیے جو سب رائیگاں
سجدہ کرو تو طلب خدا میں یہی سب سے کہتے ہیں
ہماری تو نا ہی پوچھو کہ ہم مقید ہیں راز
ہر ایک دل میں چھپکے سے قید رہتے ہیں

مومن راز......اسلام آباد

دوستوں کی خوشبو

حال دل دوستوں سے چھپایا نہیں کرتے
جو دیتے ہیں دغا وہ دوست کہلایا نہیں کرتے
یوں تو ہر ایرے غیرے کو دوست بنایا نہیں کرتے
اگر بن جائے دوست کوئی تو اسے بار بار آزمایا نہیں کرتے
آتی ہو جن سے ذرا بھر دوستی کی خوشبو
ایسے دوستوں کو جھٹلایا نہیں کرتے
جو رکھتے ہیں دوستی کا بھرم عمر بھر نیلم
ایسے دوستوں کو بھلایا نہیں کرتے

نیلم آرزو......گوجرانوالہ

غزل

اشکوں کے مجھے ہار پرونے نہیں دیتا
مارے بھی اگر مجھ کو تو رونے نہیں دیتا
میں فوم پہ سوؤں یا کھری کھاٹ پہ لیٹوں
مجھ کو غم فرقت کبھی سونے نہیں دیتا
جو دور کنارے پہ کھڑا دیکھ رہا ہے
منجدھار میں کشتی کو ڈبونے نہیں دیتا
وہ پلک جھپکتے ہی گزر جائے نظر سے
آنکھوں میں وہ منظر کو سمونے نہیں دیتا
وہ قوم کے معمار کہاں دے گا وطن کو
وہ باپ جو بچوں کو کھلونے نہیں دیتا
خود ڈال کے رکھتا ہے جو پانی میں مدھانی
وہ ہم کو یہاں دودھ بلونے نہیں دیتا
لکھتا ہے قمر ایسے گلابوں کی کہانی
گل جبیں تر و تازہ جنہیں ہونے نہیں دیتا

ریاض حسین قمر......منگلا ڈیم

غزل

ایک کہرام سا مچا ہے یہاں
سارا ماحول ایک سا ہے یہاں
جگمگاتے ہیں عرش پر تارے
ایک بجھتا ہوا دیا ہے یہاں
ہر پرندہ خزاں کے موسم میں
تلخ لہجے میں بولتا ہے یہاں
کیسے ابھریں صدائیں نغموں کی
ساز شعلے اگل رہا ہے یہاں
نرم لہجے کی یہ عطا ہے جمال
دل پہ جو زخم اک لگا ہے یہاں

سمیع جمال......کراچی

قسط نمبر 1

زادِ سفر

ناصر ملک

ایک سفر ہے اور یہ سفر ہے کٹھنائیوں کا جسے ہر ذی نفس نے طے کرنا ہے۔ ہر سفر کے لیے قدرت زادِ سفر مہیا کرتی ہے جو نہ صرف سفر کی دلچسپی کا سبب بنتا ہے بلکہ سانس بہ سانس، جو بہ جو گامزن رہنے کی مکمل ترغیب کا درجہ بھی رکھتا ہے۔ وہ معاشرے کا ایک روندا ہوا کردار تھا جسے قدرت نے طویل سفر اور زادِ سفر مہیا کر کے دنیا کے اونچے نیچے راستوں پر روانہ کر دیا تھا۔ سماج ہر موڑ پر اس کے سفر کو کھوٹا کرنے کے درپے تھا جبکہ اس کی سوچ اس کے آہنی وجود کی طرح پختہ اور مستحکم تھی۔ گوشت پوست کا انسان ہوتے ہوئے اسے پتھروں سے سر ٹکرانا اور اپنا زادِ سفر بچانا تھا۔ وہ قدم بہ قدم سہنت کرر کھتے ہوئے چلتا رہا، ٹھوکریں کھا کر سنبھلتا رہا اور اپنی گٹھڑی کی دل و جاں سے حفاظت کرتا رہا۔

وہ پہلے پڑاؤ پر کامیابی سے پہنچ گیا تو اس سے پہلا سفر اور پہلا زادِ سفر چھین کر نئی مسافتیں اور نیا رخت تھما دیا گیا۔

لمحہ بہ لمحہ اپنے سحر میں جکڑتی ہوئی داستان جذبات و محسوسات جسے آپ کے محبوب قلم کار نے کسی اور ہی کیفیت میں رقم کیا۔

ناصر ملک کے قلم سے ایک اور شہکار ناول۔

آفس ٹیبل کے گرد آلود شیشے پر بکھرے ہوئے چنبیلی کے پھول نظروں کو خوشنما نہیں لگتے۔ مالا میں پروئے جانے کے بعد کھلی آنکھوں کے سامنے ایک بار لہراتے ہیں اور بند آنکھوں کو شب بھر گدگداتے رہتے ہیں۔ اِس کے برعکس اینٹوں کا ڈھیر کبھی خوب صورت دکھائی نہیں دیتا۔ ایک مرتبہ دیکھ لینے کے بعد دوسری مرتبہ دیکھنے کی طلب نہیں رہتی مگر جب اُنہی اینٹوں کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیروں تلے بچھا دیا جائے، زمین سے آسمان کی طرف توازن کے ساتھ اُٹھا دیا جائے یا سر پر پھول دار چادر کی طرح سایہ کشا کر دیا جائے تو دیکھنے والی آنکھ ہٹنے کا نام نہیں لیتی۔

گرلز کالج کی مرکزی عمارت سے بیرونی گیٹ تک ایسے ہی توازن کے ساتھ سینہ پھیلائے لیٹی ہوئی چھوٹی اینٹوں پر برابر قدموں سے چلتی ہوئی دونوں لڑکیاں بھی قدرت کے قانونِ توازن کی جیتی جاگتی مثالیں تھیں۔ دراز قد والی لڑکی اپنا چاند چہرہ سیاہ نقاب میں چھپائے ہوئے تھی۔ بدن کالج کی دبیز یونیفارم میں لپٹا ہوا تھا مگر قدم قدم پر بے خود رِند کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے جام کی طرح ہر پَل چھلک جانے کو بے قرار تھا۔ توت کی گیلی ٹہنی کی طرح لچکتی تو بدن کمان بن جاتا اور دیکھنے والوں پر ایک پل میں خوب صورت سیاہ آنکھوں سے اَن گنت تیر چھوٹ جاتے جو آن کی آن میں سر سے پاؤں تک چھلنی کر دیتے۔

گھر کے اندر، گھر کے باہر، ہر جگہ اُسے بانو کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ شعور پاتے ہی یہی لفظ اُس کی شخصیت کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔ اسکول کے ریکارڈ میں اُس کا پورا نام رضیہ بانو درج تھا۔ رضیہ کہہ کر پکارنے والے کو وہ معمر دکھائی دیتی تھی جبکہ ہر لڑکی کی طرح وہ بھی سولہویں سال سے اوپر دکھائی دینے کی روادار نہیں تھی۔ بانو بھی اگرچہ پرانا نام تھا مگر اپنی قدامت سمیت کلاس کی تمام تر لڑکیوں کو پسند تھا۔

نقاب سے بے نیاز سرخ و سپید چہرے والی لڑکی نسبتاً فربہ مائل تھی مگر ایسی بھی نہیں کہ دیکھنے والا گوبھی کا پھول قرار دے کر اپنے ہونٹ سکیڑ لیتا۔ وہ عین بہار میں کھلے ہوئے تروتازہ اور صحت مند گلاب کی مانند تھی۔ آندھی کے بعد ریگزار کے بے آب و گیاہ ٹیلوں کی طرح بھرے بھرے رُخسار، اتنے ملائم اور پُرگداز کہ سرمست ہوا کی آخری اٹھکیلیوں کے نشانات کو بھی اگلی آندھی تک کے لیے محفوظ کر لیتے تھے۔ بھوری اور مے بھری آنکھوں اور چمکدار سنہرے سوتوں کی آمیزش والے ڈارک براؤن بال بدن شکن چال کو ہر پَل آگے کی جانب جھول کر سہارا دیتے اور حسن کو توازن کا تڑکا لگا دیتے تھے۔ ایک ادائے خاص سے کلاس میں دوسرے شہر سے مائیگریٹ ہو کر آنے والی لڑکی کی اوور ایکٹنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ اچانک ٹھٹک کر چپ ہو گئی۔ یوں لگا جیسے اُس کے لبوں کی مسکراتی حرکت پر تھرکتی ہوئی کائنات یک لخت کومے میں چلی گئی ہو۔

اُس کا نام سنتے ہی پرانا زمانہ یاد آنے لگتا تھا۔ تب والدین نے بڑے شوق سے اُس کا نام قراۃ العین رکھا تھا۔ عہدِ موجود میں اتنا بھاری بھرکم نام اُس کی شخصیت سے میل نہیں کھاتا تھا۔ جسمانی طور پر دُبلی پتلی نہیں تھی مگر نام کے معاملے میں فطری طور پر اختصار پسند واقع ہوئی تھی۔ اپنا نام عینی بتلاتے ہوئے وہ مطمئن ہو جاتی تھی جیسے اُس نے عنوان کے ساتھ ساتھ جوانی بھری کتاب کو بھی سکیڑ دیا ہو۔ اٹھارہ سال پرانے فیشن پر 'عینی' کی چولی پہنا کر اس نے نئے فیشن کی بیخ لگا دی تھی۔ انگریزی کی لیکچرر جب اُسے قراۃ العین کہہ کر پکارتی تو اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اُسے نہیں، کسی اور کو مخاطب کر رہی ہے۔

کالج کا مین گیٹ ابھی سوڈیڑھ سو فٹ کے فاصلے پر تھا۔ دراز قد حسینہ نے چونک کر اُسے دیکھا۔ اُس کی نظروں کے ارتکاز کو بھانپ کر نیم وا گیٹ کے پار دیکھا۔ گیٹ کے عین سامنے، سڑک کے اُس پار، ہر روز کی طرح وہ موجود تھا۔ خلافِ عادت بیزار لہجے میں بولی۔

''اُس نے آج تک تمھیں آنکھ بھر کر نہیں دیکھا، منہ بھر کر بلایا نہیں اور تم ہو کہ اُس کے لیے اپنی آنکھوں میں نفرت کی آگ ہر وقت بھڑکائے رکھتی ہو۔ بھلے کسی وجہ کے بغیر اُسے ناپسند کرو مگر یوں چہرے پر ناگواری کے تاثرات سجا کر میری دِل آزاری تو نہ کیا کرو۔''

وہ نادم ہو گئی۔ قدم بڑھا کر اُس کے عین سامنے آ کر پلٹ گئی۔ ہاتھ میں پکڑے فائل کور اُس کے سامنے کر دیا۔ بہتے ہوئے پانی کو ہتھیلیوں سے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''ہر روز ارادہ کرتی ہوں کہ آئندہ اُسے دیکھ کر خود پر، اپنی زبان پر قابو پا لیا کروں گی۔ اپنے تاثرات چھپا لیا کروں گی مگر ہر روز اُس کی شکل دیکھنے پر بھول جاتی ہوں۔

کبھی کبھی یہ خیال بھی کرتی ہوں کہ اگر میں تمھاری دوستی سے دستبردار ہو جاؤں تو اُسے دیکھنے کے بعد بھگتنے والے عذاب سے چھٹکارا پا سکتی ہوں مگر شاید میں ایسا نہیں کر سکتی، تمھارے بغیر ایک پیریڈ گزارنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔''

وہ کالج کے گیٹ کی طرف پشت کیے فائل کور کی مدد سے اُسے روکے کھڑی تھی۔ روک لی جانے والی نے ایڑیاں اُٹھا کر اُس کے کندھے کے اوپر سے درخت کے سائے میں کھڑے ہوئے اپنے منتظر کو دیکھا، دل میں تأسف اور دکھ بھر گیا، بولی۔ ''عینی! تم مجھے بہت پیاری ہو، دل سے تمھاری قدر کرتی ہوں کہ تم آسمان پر براجمان ہوتے ہوئے زمینی پستی پر جھک آتی ہو۔ کالج لڑکیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک یہاں موجود ہے اور ہر ایک نہیں تو کئی ایک ضرور تمھاری دوستی کی طلبگار رہتی ہیں۔ تم اُنھیں نظر انداز کر کے مجھے اپنے ساتھ چلاتی ہو، احسان کرتی ہو، مگر پلیز! اُس کے بارے میں کچھ مت کہا کرو۔ اگر تضحیک کرنا تمھاری فطری ضرورت ہے تو یہ شوق میری ذات پر پورا کر لیا کرو مگر اُسے نفرت سے نہ دیکھا کرو۔ تم جانتی ہو، میں زمانہ چھوڑ سکتی ہوں، تمھیں بھی چھوڑ سکتی ہوں مگر اُس کی پیشانی پر کوئی سلوٹ نہیں چھوڑ سکتی۔''

عینی نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں نمی تیرنے لگی تھی۔ اُسے دکھ ہوا۔ چند لمحے کھڑی اُسے دیکھتی رہی پھر شرمسار لہجے میں بولی۔ ''میں معافی چاہتی ہوں اور آئندہ محتاط رہنے کا وعدہ بھی کرتی ہوں مگر تم بھی میری دِل آزاری نہ کیا کرو۔ دیکھو! رونے سے کاجل بہنے لگے گا اور......''

اُس نے بڑی آہستگی سے اُسے دھکیلا اور اُس پر توجہ دیے بغیر کالج کے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ عینی چند لمحے وہیں کھڑی رہی پھر تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے اُس کے برابر پہنچ کر بولی۔ ''تمھارا گھر میرے راستے میں پڑتا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ اُسے تکلیف نہ دیا کرو اور میرے ساتھ کار میں چلی جایا کرو، تب تم پر خودداری کا بھوت سوار ہو جاتا ہے۔ میں اُسے دیکھ کر خود پر قابو نہیں رکھ پاتی، کچھ کہہ بیٹھتی ہوں، تب بھی تمھارا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ میرے ساتھ سفر کرنا تمھیں پسند نہیں، تمھارا ہم سفر مجھے پسند نہیں، حساب برابر ہے۔ دھاندلی کر کے رعب جمانے کی کوشش نہ کیا کرو ورنہ میں مرد بن کر تمھارا راستہ روکوں گی اور تمھیں تماشا بنا کر رکھ دوں گی۔''

جام بلاتا نہیں، چھلک کر اپنا آپ دکھاتا ہے اور اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔ وہ بھی منہ سے کچھ نہیں بولی مگر نقاب سے جھانکتی آنکھوں سے خفگی بھرا شکوہ چھلکانے لگی۔ عینی نے قریب ہو کر کندھا ملایا، شرارت سے مسکرا کر چھیڑا، پھر کندھے اُچکائے اور گیٹ عبور کرتے ہی اُس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ غیر محسوس انداز میں 'بائے' کر کے ڈارک بلو کلر کی نئے ماڈل کی کار کی طرف بڑھ گئی۔ اُس کا پیچھے مُڑ کر نہ دیکھنا اُس کی خفیف سی برہمی کو ظاہر کرتا تھا۔

وہ بھی عینی سے لاتعلق سی ہو کر کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر سڑک پار کر کے درخت کی گھنی چھاؤں تک پہنچنا چاہتی تھی مگر سڑک پر رواں دواں ٹریفک نے اُس کا راستہ روک لیا۔ وہ سڑک پار کرنے کے معاملے میں خاصی ڈرپوک واقع ہوئی تھی۔ چھاؤں تلے کھڑا مرد اُس کی مشکل کو بھانپ کر مسکرایا۔ اسٹینڈ پر لگی سائیکل کو ہینڈل سے پکڑ اور کھینچتے ہوئے سڑک پار کر کے اُس کے پاس آ گیا۔ شرارت سے بولا۔ ''میرا بس چلے تو اپنی بانو کے قدم روکنے والی ٹریفک کو آگ لگا دوں مگر کیا کروں؟ اِسی چلتے پھرتے لوہے کے جسموں پر اپنی دال روٹی چلتی ہے۔ پہیہ رُک گیا تو سمجھو پیٹ اور نوالے کا رابطہ ٹوٹ گیا۔''

وہ بہ صد کوشش بھی مسکرا نہیں پائی۔ لگے بندھے معمول کے مطابق کوئی وقت ضائع کیے بغیر قدم بڑھا کر سائیکل پر سوار نہیں ہوئی بلکہ بت کی طرح اپنی جگہ پر ساکت کھڑی رہی۔ آنکھیں پھاڑے ایک ٹک اُسے دیکھتی رہی۔ سوچنے لگی کہ عینی اُسے ناپسند کیوں کرتی ہے؟

وہ گہری سنولائی ہوئی رنگت کا مالک تھا۔ نقوش میں جاذبیت نہیں تھی۔ جوان العمر ہونے کے باوجود کسی جوانی کو اپنی جانب کھینچ لینے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا اور نہ ہی کسی چھلکتے ہوئے پیمانے کو دیکھ کر اُس کی طرف لپکنے کی جرأت رکھتا تھا۔ اُلجھے ہوئے غیر چمکدار بال، گریس اور گھسے ہوئے موبل آئل سے لتھڑا ہوا لباس جو ہر روز اُس نے زیب تن کیا ہوتا تھا اور پیروں میں اَدھ گھسی ہوائی چپل...... وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے دل میں بولی۔ ''عینی ہاتھ لگانے سے میلا ہونے والا کانچ ہے، تبھی ہر میلی چیز کو میلی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ ہاں! وہ ٹھیک ہے، میں غلط

ہوں۔ گدڑی میں لعل، کیچڑ میں کنول اور اسپتال میں خوب صورت نرس کی اُجلی مسکراہٹ ہر کسی کو نظر آتی ہے مگر آٹو ورکشاپ میں کام کرنے والے سیاہ تن ہنر مند کے سینے میں دھڑکتا ہوا محبت بھرا دِل کسی کو دکھائی نہیں دے سکتا۔ میں دُنیا کو کس طرح قائل کر سکتی ہوں کہ میرا بالی دُنیا سے خوب صورت ہے۔ وہ ویسا ہرگز نہیں ہے، جیسا دکھائی دیتا ہے......''

وہ پریشان ہو کر پوچھ رہا تھا۔ ''کیا بات ہے بانو؟ تم آج خاصی بدلی ہوئی دکھائی دے رہی ہو۔''

وہ جلدی سے سائیکل کے کیریئر پر بیٹھنے کی پوزیشن لیتے ہوئے بولی۔ ''نہیں، میں تو اپنے بالی کو دیکھ رہی تھی۔ چلو!''

بالی نے عادتاً سر جھٹکا اور سائیکل پر سوار ہو گیا۔ اُس کے بیٹھ جانے پر سائیکل بڑھا کر آگے پیچھے دیکھتا ہوا سڑک پر چڑھ گیا۔ خاموشی کے ساتھ سائیکل چلانے کا عادی تھا۔ راستے بھر میں اُس نے کبھی بھی بانو کو مخاطب نہیں کیا تھا۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر دونوں سائیکل سے اُترے، بالی نے ننگی اور سیم زدہ اینٹوں والی دیوار کے ساتھ سائیکل کھڑی کی اور قفل لگا کر چابی پہلو والی جیب میں ڈال لی جبکہ اِس دوران میں بانو نے سالخوردہ دروازے پر لگا ہوا قفل کھول دیا۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔

بانو چند قدم چل کر رُک گئی۔ عجیب سی نگاہوں سے نہایت مختصر آنگن والے، ایک بڑے کمرے اور باتھ پر مشتمل گھر کو دیکھنے لگی۔ نگاہوں میں عینی کا طویل و عریض بنگلہ گھوم گیا جہاں پہلی مرتبہ عینی کے ساتھ جانے پر اُس کی زبان نے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ٹی وی کی بلیک اینڈ وائٹ اسکرین پر ڈراموں میں دکھائے جانے والے گھروں سے مرعوب ہونے والی بانو کے لیے یہ بھرپور، حقیقی اور رنگین منظر کسی حیرت کدے سے کم نہیں تھا۔ اُس کی آنکھوں میں اِس نامناسب موازنے نے موٹے موٹے آنسو بھر دیے۔

وہ سر جھٹک کر بہ دقت تمام بالی کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی۔ بالی نے کمرے کے عین وسط میں کھڑے ہو کر انگڑائی لی اور تھکے لہجے میں کہا۔ ''بانو! میں نہانے کے لیے جا رہا ہوں۔ تم کپڑے بدل کر اچھی سی چائے پلا دو۔ سارا دِن بازار کی چائے پی پی کر منہ کا ذائقہ ہی خراب ہو جاتا ہے۔''

وہ کتابوں اور فائل کور کو دو چوبی خانوں والی الماری میں رکھتے ہوئے بولی۔ ''بازار والی چائے معدے کو خراب کر دیتی ہے، تبھی کہتی ہوں کہ زیادہ نہ پیا کرو۔ صبح اور دوپہر کو کام پر جاتے ہوئے چائے بنوا کر تھرماس میں لے جایا کرو۔ اِس طرح بچت بھی ہو گی اور صحت بھی خراب نہیں ہو گی۔''

وہ قمیص کھونٹی پر لٹکاتے ہوئے بولا۔ ''تھرماس میں چائے کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے۔''

بانو نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اُس کے باتھ روم میں جانے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ کمرے سے نکلا تو اُس نے مستعدی سے چینج لیا اور کمرے کے ایک گوشے میں پڑے چولھے پر بیٹھ گئی۔ یہ اُس کا چند برتنوں پر مشتمل چھوٹا سا کچن تھا۔ دو آدمیوں کا کھانا تیار کرنے کے لیے کافی تھا۔

چھیلے ہوئے بازو سے پیشانی رگڑ کر پسینہ پونچھنے لگی تو اپنے عقب میں دیوار کے ساتھ ٹنگی ہوئی بالی کی میلی چیک قمیص پر نگاہ پڑ گئی۔ قمیص کا پچھلا گھیرا دکھائی دے رہا تھا۔ اگلا حصہ دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر اُسے دیکھنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ ہر جمعہ کو وہ اپنے ہاتھوں سے بالی کی اِس یونیفارم کو رگڑ رگڑ کر دھوتی تھی۔ اُس نے تو قمیص کے اگلے حصے میں موجود اَن گنت چھوٹے بڑے سوراخوں کا بھی شمار کر رکھا تھا جو ویلڈنگ کرتے ہوئے یا لوہا گرائنڈ کرتے ہوئے اُڑ کر پڑنے والی چنگاریوں نے بنا رکھے تھے۔ ہر آنے والے دِن میں اِن کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ بالی عموماً کہا کرتا تھا کہ اُس کی قمیص کی طرح اُس کا سینہ بھی چھلنی ہوتا جاتا ہے۔ لوگوں کے منہ سے پھوٹنے والی چنگاریاں اُسے داغتی رہتی تھیں۔ وہ لوگوں کے، بالخصوص اپنی ورکشاپ کے مالک کے رویے سے شاکی رہتا تھا۔

اچانک دِل بھر آیا۔ یاد آیا، جب اُس نے ایک دن بالی سے کہا تھا۔ ''تم دوسرے کپڑے پہن کر مجھے لینے کے لیے آیا کرو، میری دوست تمھارا لباس اور حلیہ دیکھ کر مجھ پر ہنستی ہیں۔''

بالی اُس کی کسی بات پر ہنس رہا تھا۔ یہ سُن کر اچانک چپ ہو گیا۔ یوں لگا جیسے وہ بجلی پر چلتا ہوا اور اچانک بجلی چلی گئی ہو۔ عجیب سے انداز میں اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ ''بانو! بار بار کپڑے بدلنے میں بہت سارا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ چار دِن ایسا کروں گا تو ورکشاپ کا مالک ماں بہن کی گالیاں بکتے ہوئے دکان سے بھگا دے

گا۔ ویسے بھی کام کے دوران ہاتھوں پیروں پر لوہے کی میل، تیل اور گریس لگی ہوتی ہے۔ جو لباس بھی پہنوں گا، وہ چند دِنوں میں ہی ایسا ہو جائے گا۔ تم اپنی سہیلیوں سے کہہ دیا کرو کہ میں تمھارا نوکر ہوں۔''

بانو شدید خفگی کے باعث کچھ بھی نہیں کہہ سکی تھی۔ وہ کہتا رہا۔ ''میں اَن پڑھ آدمی ہوں، ورکشاپ میں کام کرتا ہوں اور بہ مشکل اتنا کما پاتا ہوں کہ تمھاری پڑھائی کے اخراجات پورے ہوتے ہیں۔ عیاشی میں پڑوں گا تو تم بھی میری طرح زندگی بھر دھکے کھاتی رہو گی۔''

وہ بہت کچھ کہتا رہا جسے بانو سن کر اَن سنا کرتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ بالی نے اپنی زندگی میں ایک ہی خواہش کو جان کا روگ بنا کر پال رکھا ہے، اُسے بہت سارا پڑھا لکھا کر بڑی سی سرکاری کرسی پر براجمان کرنا...... وہ اکثر سوچا کرتی کہ اگر بالی کی اتنی بلند و بالا توقعات پر پورا نہ اُتر پائی تو کیا بالی زندہ رہ پائے گا؟

اپنے اندر، اپنی چہار جانب، ہر سُو یہی جواب پاتی۔

''نہیں!''

پھر ایک موقع پر بالی نے اُسے بانہوں میں بھر کر گھماتے ہوئے کہا تھا۔ ''بانو! تم مجھے پیار سے بالی کہتی ہو، بازار میں ہر شخص مجھے نفرت اور حقارت سے بالی کہتا ہے۔ جب تم بہت پڑھ لکھ کر افسرنی بن جاؤ گی، تمھاری شادی اپنے جیسے کسی اَفسر سے ہو جائے گی تو دیکھنا، ہر کوئی مجھے اقبال حسین کہہ کر پکارا کرے گا۔ میری کالی وردی اُتر جائے گی اور پھر میں بھی لٹھے کا کلف لگا سفید سوٹ پہنا کروں گا۔''

بانو نے مزاحمت کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''نہیں بالی! کوئی بھی تم سے نفرت نہیں کرتا۔ میں تمھیں پیار سے بالی کہتی ہوں، ہر کوئی میری دیکھا دیکھی تمھیں بالی کہنے لگتا ہے۔''

بالی نے بے چارگی سے رُخ پھیر لیا۔ لہجہ مدھم رکھتے ہوئے مایوسی سے بولا۔ ''جب تم پیدا نہیں ہوئی تھیں، لوگ تب بھی مجھے بُرا سا منہ بنا کر بالی کہا کرتے تھے۔''

وہ ناچار مسکرا کر اُس کی دل جوئی میں لگ گئی۔ جانتی تھی کہ بالی سچ کہتا ہے۔ بہ خوبی سمجھتی تھی کہ کڑوے سچ پر جھوٹے بہلاووں کا پردہ تاننا بے سود ثابت ہوتا ہے۔ ایسے میں پیار کا مرہم رکھ کر دُکھتے ہوئے زخموں کو سلا دیا کرتی تھی۔

وہ نہا کر آ گیا۔ غیر معمولی سیاہ بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ قمیص پہن کر انگلیوں سے کنگھی کرتا ہوا اُس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اپنی جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اُس کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔ ''جیب خرچ کے لیے رکھ لو، کیا یاد کرو گی، کس سخی سے پالا پڑا ہے۔''

اُس نے نوٹ گود میں رکھا، پیالے میں چائے انڈیلی اور پیالہ اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ چائے پینے لگا۔ وہ نوٹ کی سلوٹیں درست کرنے لگی۔ نئے نوٹ پر سلوٹوں کے ساتھ ساتھ دو تین سیاہ دھبے پڑے ہوئے تھے۔ بے دھیانی میں اُس نے ایک دھبے کو چوم لیا۔ پوچھنے لگی۔ ''ایڈوانس لیا ہے؟''

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں۔ آج ایک امیر زادے کی کار کا انجن باندھا ہے، جاتے ہوئے خوش ہو کر انعام دے گیا۔ شکر ہوا کہ نائیک نے مجھے نوٹ پکڑتے ہوئے نہیں دیکھا ورنہ شاید یہ تم تک نہیں پہنچ پاتا۔''

بانو کو اچنبھا ہوا۔ ''کیا وہ اتنا لالچی ہے؟''

''لالچی؟'' بالی نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''وہ نہایت کمینہ شخص ہے۔''

وہ کہنا چاہتی تھی کہ ایسے کمینے آدمی کی نوکری چھوڑ کر کسی اور ورکشاپ میں کام پر لگ جاؤ، مگر خاموش رہی۔ وہ بالی کے جواب سے آگاہ تھی۔ بالی نے بارہا مرتبہ اُس کے ایسا کہنے پر جواب دیا تھا۔ ''سبھی ورکشاپوں کے مالک کمینگی اور کنجوسی میں ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں۔ اُستاد پھجا سب سے زیادہ تنخواہ دیتا ہے مگر گالیاں بکنے کے ساتھ ساتھ ہاتھ بھی چلاتا رہتا ہے۔ گاہکوں کے ساتھ اُس کا رویہ بھی خاصا درشت ہوتا ہے مگر کہتے ہیں ناں کہ قسمت بن دیکھے مہربان ہو جاتی ہے۔ اُس پر قسمت کی دیوی مہربان ہوئی ہے۔ گاہکوں کو جتنا جھڑکتا اور گالیاں بکتا ہے، اتنا ہی زیادہ کام اُس کی ورکشاپ پر آ جاتا ہے۔''

چائے پینے کے بعد جیب میں سائیکل کی چابی کو ٹٹولتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ جاتے ہوئے دروازہ بند کرنے کا حکم دینا نہیں بھولا تھا۔ وہ کنڈی چڑھا کر پلٹی اور کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ بائیں ہاتھ کی بند مٹھی میں بالی کا دیا ہوا پانچ سو کا نوٹ دبا ہوا تھا جو چلتی نبض کی طرح پَل پَل بالی کی بے پایاں محبت کو اُس کے بدن کے دوڑتے ہوئے خون میں سرایت کرتا جاتا تھا۔ محبت کا احساس سرور بخش ہوتا ہے۔ وہ کیف کی

حالت میں آنکھوں کو نیم وا کیے جی ہی جی میں اپنے پاس پرائز بانڈز کی شکل میں اکٹھی ہونے والی رقم کا شمار کرنے لگی۔ اُس نے ارادہ کرلیا تھا کہ اِن پانچ سو روپوں میں سے چار سو روپے کے بانڈ خرید کر رقم کو محفوظ کرلے گی۔ باقی رقم سے اُس کا ہفتہ بآسانی گزر سکتا تھا۔

سال بھر پہلے جب اُس نے اپنی دوست عینی کو بالی کے بارے میں بتلایا تھا تو عینی نے اُسے کہا تھا۔ ''وہ کب تک نوکری کرتا رہے گا؟''

بانو نے مایوسی کے عالم میں ٹھنڈا سانس سینے میں کھینچتے ہوئے کہا تھا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ وہ میری خاطر یونہی تمام عمر بدتمیز لوگوں کی جھڑکیاں سنتا رہے گا۔ نہ جانے ہمارے حالات کے اندھے غار کے دہانے پر رکھا ہوا دیو ہیکل پتھر کبھی ہٹے گا یا ہم یونہی دَم گھٹنے سے مرجائیں گے۔ ہمارے پاس تو پتھر ہٹانے والے کو دکھانے کے لیے بھی کچھ نہیں ہے۔''

عینی نے کچھ دیر سوچا، پھر کہا۔ ''اپنی ورکشاپ بنانے کے لیے کتنی رقم کی ضرورت ہوتی ہے، جانتی تو ہوگی؟''

تب بانو نے چونک کر ٹٹولتی ہوئی نگاہوں سے اُسے گھورا۔ سوچا، کہیں مدد کرنے کا ارادہ تو نہیں رکھتی؟...... نفی میں سر ہلا کر اپنے اندازے کو غلط قرار دیا۔ ایسی امداد چاہنے کے باوجود کوئی نہیں دے سکتا۔ بولی۔ ''میں یقین سے تو کچھ کہہ نہیں سکتی مگر میرے اندازے کے مطابق لاکھ سے اوپر خرچ آتا ہے۔''

عینی نے منہ بنایا۔ ''یہ تو کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔''

فوراً ہی خیال آ گیا کہ اُس کی اور بانو کی معاشی حیثیت میں زمین و آسمان کا فرق حائل تھا۔ جلدی سے بولی۔ ''میرا کہنے کا مطلب ہے کہ اگر تم کوشش کرو تو دو تین سالوں میں اتنی رقم اکٹھی کرسکتی ہو۔''

بانو کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ تیر گئی۔ بولی۔ ''میں جب تک ایک لاکھ روپے جمع کروں گی، تب تک ورکشاپ میں زیرِ استعمال آنے والی مشینوں اور اوزاروں کی خریداری کے لیے دو لاکھ سے اوپر رقم درکار ہوگی۔ بالی کہتا ہے کہ ہم روز بہ روز بڑھنے والی مہنگائی کے دور میں کسی چیز کو حاصل کرنے کے لیے پیچھے سے دوڑ کر نہیں پہنچ سکتے۔ شارٹ کٹ لے کر، آگے پہنچ کر مطلوبہ چیز کا راستہ روکنا پڑتا ہے۔''

عینی سوچ میں مستغرق ہوگئی۔ شاید شب بھر سوچتی رہی تھی، تبھی صبح دَم بانو کو کلاس روم سے باہر نکال کر سمجھانے لگی۔ ''بانو! میں نے سوچا ہے کہ تم اپنے جیب خرچ میں سے پس انداز کر کے تھوڑی بہت بچت کیا کرو اور جب ایک پرائز بانڈ خریدنے کے لیے رقم جمع ہوجائے، بانڈ خرید کر اپنے پاس رکھ چھوڑا کرو۔ بانڈ اکٹھے ہوتے جائیں گے۔ ایک نہ ایک دِن مطلوبہ ہدف حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاؤ گی۔ بہ فرضِ محال ایسا نہ بھی ہوا تو بھی منزل کے حصول میں اپنا حصہ ڈالنے کے قابل ضرور ہوجاؤ گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پتھر ہٹانے والے کو تمھاری اِسی کوشش پر پیار آ جائے، جیسے مجھے تمھاری بھولی سی صورت پر پیار آتا رہتا ہے، اور وہ ایک ہی جست میں تمھارے دلدر دور کردے، کسی بانڈ پر انعام لگ جائے اور......''

وہ ہنسی۔ ''بس کرو عینی! چمکتے سورج تلے خواب دکھانے کی کوشش مت کرو۔ ہم غریب لوگ تو خواب دیکھنے کی سکت بھی نہیں رکھتے۔''

عینی نے اُس کی مایوسی کی پروا نہ کرتے ہوئے پرائز بانڈ کے بارے میں مکمل آگہی دی۔ پیار بھری ڈانٹ کے ساتھ سمجھایا اور تیسرے پیریڈ کے بعد اُسے ساتھ لے کر قومی مرکز بچت میں پہنچ گئی۔ پانچ ہزار روپے کے بانڈ خرید کر اُس کے ہینڈ بیگ میں ٹھونستے ہوئے بولی۔ ''میری پیاری سی بہنا! زادِ راہ کی پہلی پوٹلی میری جانب سے قبول کرو۔ پانچ ہزار کو پانچ لاکھ بنانے کا حوصلہ دل میں رکھو، اللہ زمین کو سمیٹ کر منزل کو قریب کردے گا۔''

بانو اُس کی امداد کو قبول کرنے سے قطعی طور پر گریزاں تھی مگر عینی کے سامنے اُس کی ایک نہ چل سکی۔ کلاس روم میں بیٹھی تو پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ کانوں میں لیکچرر کی آواز پڑ رہی تھی مگر وہ سمجھ نہیں رہی تھی بلکہ وہ سمجھ رہی تھی جو عینی اُسے سمجھانے کی کوشش کررہی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اتنی بڑی رقم اُس کے ہاتھ لگی تھی۔ متعدد مرتبہ اُس نے اپنے ہینڈ بیگ پر بے دھیانی میں ہاتھ پھیرا تھا۔

عینی کے کہنے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اُس نے بالی سے اپنا بچت منصوبہ پوشیدہ رکھا تھا۔ تنخواہ، کبھی کبھار ملنے والی ٹپ اور چھٹی کے دِن کسی اور ورکشاپ میں کام کرنے کی اجرت کی رقم میں سے وہ کچھ نہ کچھ بچا لیا کرتی تھی۔ عینی بھی گاہے

لگا ہے حیلے بہانوں سے اُس کی بچت میں اضافہ کرتی رہتی تھی۔ سال گزر گیا۔ وہ اپنی طے شدہ منزل کا نصف راستہ طے کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اُمید بندھ گئی۔

وہ اکثر سوچا کرتی۔ ”اگر ہر امیر آدمی عینی کی طرح فراخ دل ہوجائے تو ملک سے غربت دور ہو، نہ ہو، غریبوں کو احساسِ تنہائی اور کربِ محرومی سے نجات ضرور مل جائے گی۔“

شام تک اُس کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام نہیں تھا۔ شام کو بالی ہوٹل سے سالن خرید لایا۔ وہ انگڑائیاں لیتے ہوئے چولھے پر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

کالج کا گیٹ پیچھے رہ گیا۔ راستے الگ ہونے کا مقام آ گیا مگر عینی اُس کے ہمراہ چلتی ہوئی سڑک کے کنارے پر آ کر ٹھہر گئی۔ بانو نے استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ ”میں آج تمھیں اپنے گھر لے کر جانا چاہتی ہوں۔ جانتی ہوں کہ تمھیں کہوں گی تو تم اِس کالے دیو کی وجہ سے انکار کردو گی۔ میں نے سوچا کہ میں پیاری سی پَری کو اپنے بھیانک پنجوں میں جکڑ کر رکھنے والے دیو سے براہ راست پوچھ لوں۔ دیکھو! وہ سائیکل کو کان سے پکڑ کر تمھاری طرف آ رہا ہے۔ تم خاموش رہنا، میں خود اُس سے بات کروں گی۔“

بالی سڑک عبور کرکے اُن سے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا۔ عینی کی وجہ سے قریب نہیں آیا تھا۔ بانو نے کہا۔ ”میں پھر کسی وقت تمھارے ساتھ چلوں گی۔ اَب نہیں۔“

”اَب کیوں نہیں؟“ عینی نے گھورا۔

”میرا موڈ نہیں ہے۔“ اُس نے ٹالنے کی کوشش کی۔

وہ ایک غصیلی نگاہ ڈال کر چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتے ہوئے بالی کے پاس آ گئی۔ بولی۔ ”آج میری سالگرہ ہے۔ میں بانو کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں مگر وہ تمھاری ناراضی کے احتمال سے میرے ساتھ چلنے پر تیار نہیں۔“

وہ ہونقوں کی طرح کبھی عینی کو، کبھی بانو کو دیکھ رہا تھا۔ عینی نے کہا۔ ”میں بانو کو ساتھ لے جانے کی اجازت مانگ رہی ہوں۔“

بہ ہزار سعی عینی اپنے لہجے میں ناگواری کی آمیزش کو پوشیدہ نہیں رکھ پائی۔

بالی نے ہکلا کر کہا۔ ”م...... میں کک...... کیا کہہ سکتا ہوں۔“

عینی نے کہا۔ ”تم نے صرف ’اجازت ہے‘ یا ’اجازت نہیں ہے‘ کہنا ہے۔“

بالی نے گھبرا کر مدد طلب نگاہوں سے بانو کو دیکھا۔ وہ اِس دوران میں اُس کے قریب آ گئی تھی۔ بولی۔ ”عینی خواہ مخواہ ضد کر رہی ہے۔ اگر کل بتلا دیتی تو میں صبح تم سے اجازت لے لیتی۔“

اچانک بالی کے لبوں پر مسکراہٹ تیرنے لگی۔ گدی کے اوپر سے ٹانگ گھما کر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے بولا کب تک گھر آ جاؤ گی؟“

بانو کی بجائے عینی نے جلدی سے جواب دیا۔ ”شام تک میں اِسے گھر پہنچا دوں گی، تم فکرمند نہ ہونا۔“

بالی کو دیکھے بغیر بانو کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اپنی کار کی طرف بڑھ گئی۔ بالی نے سائیکل کے پیڈل پر پاؤں کا زور بڑھاتے ہوئے الوداعی نگاہ بانو پر ڈالی اور سیٹی بجاتے ہوئے اکیلا ہی گھر کی طرف چل دیا۔

بند شیشوں والی کار میں عینی کی ہنسی کی جلترنگ بج رہی تھی۔ وہ ہنس ہنس کر بے حال ہو رہی تھی۔ بانو نے خفگی سے ڈانٹا۔ ”بے وقوفوں کی طرح کیوں ہنسے جا رہی ہو؟“

وہ ہنسنے کے بیچ میں بولی۔ ”اور تم عقلمندوں کی طرح اتنی سنجیدہ کیوں ہو رہی ہو؟“

اُس نے منہ پھیر لیا۔ عینی نے اُس کے بازو میں چٹکی بھری۔ ”خدا کے لیے نقاب الٹ دو۔ کار میں نقاب پوش لڑکی ایک نظر دیکھنے میں پکی ڈاکو دکھائی دیتی ہے۔“

وہ جھینپ کر بولی۔ ”نہیں عینی! میں ایسا نہیں کر سکتی۔“

عینی نے ضد نہیں کی۔ بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ اپنا موڈ تو ٹھیک کر سکتی ہو۔“

”تم نے جھوٹ کیوں بولا؟“

”میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔“

”کیا آج واقعی تمھارا برتھ ڈے ہے؟“

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ”یار! تم بھی نری بور ہو۔ جوانی میں ہر دِن برتھ ڈے ہوتا ہے، بڑھاپے میں ہر دِن برسی کہلاتا ہے۔ اتنی سی بات بھی تمھارے مختصر سے دماغ میں نہیں آتی۔“

”بالی کو پتہ چلے گا تو وہ ناراض ہوگا۔“

”کیا تم اُسے بتلاؤ گی؟“

وہ بیزاری سے بولی۔ ”ہاں! میں نے آج تک اُس سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔“

”کیا اپنے بوائے فرینڈ کی باتیں بھی اُس سے شیئر کرتی ہو؟“

وہ دانت پیس کر بولی۔ ”تم جانتی ہو کہ میرا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے۔ ہمارے جیسے لوگ اِس عیاشی کے متحمل نہیں ہوتے اور اگر کسی کو دِل دے بھی بیٹھیں تو اپنے تئیں ہمیشہ شرمسار رہتے ہیں۔ تمھاری سوسائٹی کی روایات بہت مختلف ہیں۔“

”ہیں؟“ عینی نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ ”یعنی تم نے آج تک کسی کو اپنے بے مثال حسن کو سراہنے کا موقع نہیں دیا۔ چچ...... چچ...... کتنی غلط بات ہے۔ مصور کی بنائی ہوئی مورت کو کوئی نہ دیکھے، کوئی تعریف نہ کرے تو وہ اپنی موت آپ مرجاتی ہے۔ اتنی جاں آویز اور دِل کو لگنے والی مورت کو بنانے والا بھی تم پر نالاں ہوگا۔ اِس کلموئی چادر نے چاند کی تاب پر، جوانی کی آگ پر، دریافت کیے جانے کی خواہش رکھنے والے امریکا پر گمنامی کے اندھیرے مسلط کر رکھے ہیں۔ میرا بس چلے تو اِسے بیچ چوراہے آگ لگا دوں۔ ہائے بانو! تم بھی کتنی خشک ہو۔ میں مرد ہوتی تو تمھاری رگ رگ میں جوانی کی آگ بھر دیتی اور ہر رُکاوٹ کو تمھارے حسن کی تاب میں جلا کر خاکستر کردیتی۔“

ماحول اور عینی کی شوخ باتوں نے اُس پر گھبراہٹ طاری کردی۔ وہ سر جھکا کر سوچ میں پڑ گئی۔ غیر ارادی طور پر اپنا اور عینی کا موازنہ کرنے لگی۔ ایسے میں عینی کے ہینڈ بیگ میں پڑا ہوا موبائل فون بجنے لگا۔ اُس نے فون نکالا، کال ریسیو کی اور کان سے لگا کر شرارت بھری نگاہوں سے بانو کی طرف دیکھنے لگی۔ اُس نے آنکھیں چُرا لیں۔ کان عینی کی طرف لگے ہوئے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”بھیا! تھوڑا انتظار اور میں بس پہنچنے ہی والی ہوں۔“

فون کے اسپیکر سے عینی کے بڑے بھائی شہزاد کی آواز نکل کر بانو کے کانوں تک بھی پہنچنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”میں نے کہا بھی تھا کہ مجھے کہیں پہنچنا ہے اِس تم ٹیکسی سے گھر آ جانا مگر تم ہمیشہ اپنی ضد منوا کر رہتی ہو۔ وقت کم ہے اور اگر میں میٹنگ میں شامل نہ ہو سکا تو......“

عینی نے کہا۔ ”بہن ٹیکسی میں گھر پہنچے، بھائی ٹھاٹھ باٹھ سے اپنی کار میں گھر سے نکلے، کتنا عجیب لگتا ہے مگر تمھیں کیا؟ تمھیں تو اپنے بزنس اور دوستوں کی فکر ہر دَم ستاتی رہتی ہے۔ اَب زیادہ غصہ مت دکھانا، میرے ساتھ میری دوست بیٹھی ہوئی ہے اور تمھاری باتیں سُن رہی ہے۔ کیا سوچے گی تمھارے بارے میں؟“

شہزاد نے کہا۔ ”آئی ڈونٹ کیئر اباؤٹ اینی باڈی...... کہیں رُک نہ جانا پلیز!“

عینی نے کال منقطع کرتے ہوئے بانو سے کہا۔ ”بھیا بھی تمھاری طرح نہایت بور آدمی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُسے گیارہویں صدی کے مُردوں نے ہماری جاسوسی کے لیے بھیج رکھا ہے۔ ہاہ! بڑا آیا کہنے والا آئی ڈونٹ کیئر اباؤٹ اینی باڈی...... تمھیں ایک مرتبہ دیکھ رکھا ہوتا تو منہ پھاڑ کر یہ کہنے کی جرأت نہ کرتا۔“

بانو نے اُس کے بھائی کو اَبھی تک نہیں دیکھا تھا۔ عینی نے بارہا بتلایا تھا کہ وہ بہت خوب صورت شخصیت کا مالک ہے۔ اُس کے کہے پر یقین کرتے ہوئے بھی اُس کے دِل میں شہزاد سے ملنے کی کوئی خواہش پیدا نہیں ہوئی تھی۔

عینی کے گھر کے مین گیٹ پر پہنچنے تک بانو نے خاموشی اختیار کیے رکھی۔ کار رُکی تو گیٹ کے باہر ہی شہزاد کو بے قراری کے عالم میں ٹہلتے ہوئے پایا۔ لپک کر کار کے قریب آیا اور پچھلا گیٹ کھولتے ہوئے جھک کر طنزاً ادب کے ساتھ بولا۔ ”آ جائیں بیگم صاحبہ! اِس خادم کو بھی کار میں بیٹھنے کا موقع دیں۔“

عینی ہنستی ہوئی کار سے نکلی۔ بانو نے تقلید کی۔ شہزاد عینی کی سائیڈ والا دروازہ تھام کر کھڑا تھا۔ اُسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ جلدی سے عینی کی اوٹ میں ہو کر گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ شہزاد کی گردن مُڑتی گئی۔ اُس کے اوجھل ہونے پر بھی وہ کئی ساعتوں تک ساکت کھڑا رہا پھر کھلے دروازے میں گھستے ہوئے ڈرائیور سے مخاطب ہوا۔ ”دیر ہو رہی ہے، جلدی چلو!“

اَبھی اُسے محض دیر ہونے کا احساس ہوا تھا۔ اُسے کچھ دیر کے بعد پتہ چلنے والا تھا کہ اِس دیر کے ساتھ ہی ’درست

آیڈ' کا نعرہ لگاتے ہوئے وہ اُس کی دُنیا میں وارد ہوگئی تھی جو اپنی ادھوری جھلک دکھلا کر دل میں بے قراریاں بھرنے لگی تھی۔ دل کی دُنیا تہہ وبالا ہونے لگی تو اُس نے پلٹنا چاہا۔ بزنس میٹنگ اُس کے نزدیک بہت اہم تھی۔ آنکھوں کے آگے کا جہان دیکھنا بھی جوانی کی بقاء کے لیے ضروری تھی۔ ایسے میں بہانہ سوجھ گیا۔ وہ اپنا بریف کیس اٹھانا بھول گیا تھا۔ اُس میں ایسے کاغذات موجود تھے جن کے بغیر میٹنگ میں شامل ہونا بے کار تھا۔

وہ عینی کے ہمراہ چلتے ہوئے ارادتاً ماحول سے نظریں چُرا رہی تھی۔ پچھلی مرتبہ آنے پر آنے والے کئی دِنوں تک وہ اِس گھر کے تصور سے پیچھا نہیں چھڑا پائی تھی اور مکمل نیند سے محروم رہی تھی۔ اُس تجربے کے پیشِ نظر وہ کسی بھی شئے کو توجہ کے ساتھ دیکھنے سے گریز کر رہی تھی اور اُس کی دانست میں یہی اُس کے لیے بہتر تھا۔ عینی کے پاپا اور ماما سے مل کر، دعائیں لے کر وہ عینی کے بڑے سے کمرے میں آ گئی۔ عینی نے اُس کے ہاتھ سے کتابیں چھین کر اسٹڈی ٹیبل پر پٹختے ہوئے کہا۔ ''اَب تو اِس لفافے کو اُتار پھینکو۔ آدھے گھنٹے سے برداشت کرتی آ رہی ہوں۔''

اُس نے مسکراتے ہوئے چادر اُتار کر بیڈ پر رکھ دی اور دوپٹے کو درست کرتے ہوئے بیٹھ گئی۔ عینی کا کمرہ بے حد خوب صورت اور سجا سنورا ہوا تھا مگر بانو کو بے طرح کے حبس کا احساس ہو رہا تھا۔ عینی اُسے جوتے اُتار کر بیڈ میں بیٹھنے کا اشارہ کرتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ شاید بانو کی تواضع کے احکامات جاری کرنے گئی تھی۔

وہ پانی پینا چاہتی تھی۔ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ پانی کی تلاش میں اطراف میں نگاہ دوڑاتے ہوئے اُس کی نگاہ کمرے کے گوشے میں پڑی ہوئی منقش تپائی پر پڑی۔ جسے چند منٹ قبل گیٹ پر ٹہلتے ہوئے دیکھا تھا، وہی اپنی دل کش شباہت کے ساتھ اُس کی نگاہوں کے سامنے براجمان تھا۔ کہتے ہیں کہ تصویریں بولا نہیں کرتیں مگر وہ دیکھ رہی تھی کہ شہزاد فریم کے چوکھٹے کو کھلی ہوئی کھڑکی کی روزن بنا کر اُس سے مخاطب ہو رہا تھا۔ خاموشی کی زبان میں اُس پر حالِ دل عیاں کرنے کو بے تاب تھا۔ اُسے ماننا پڑا کہ عینی نے اپنے بھائی کی پرسنالٹی کی جاذبیت کی تعریفیں کرنے میں کسی جھوٹ کا سہارا نہیں لیا تھا۔

کمرے میں اچانک روشنی پھیل گئی۔ وہ پلٹ کر دیکھے بغیر سمجھ گئی کہ عینی نے دروازہ کھولا ہے۔ شہزاد کی تصویر پر نگاہیں جمائے بولی۔ ''ہائے عینی! تم نے سچ کہا تھا۔ تمھارا بھائی بہت اچھا ہے۔''

''اچھا! مگر کیا صرف اچھا؟'' عینی کی بجائے مردانہ آواز کانوں میں پڑی تو اُس نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ دیکھنا قیامت ثابت ہوا۔ پورے بدن کا خون جیسے نچڑ کر چہرے میں سما گیا۔ کھلے ہوئے دروازے میں عینی کا بھائی کھڑا مسکرا رہا تھا۔

زبان ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ اُٹھ کر کمرے سے بھاگ نکلنا چاہتی تھی مگر قدموں نے بھی ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ چند لمحوں تک اُسے سہمی سہمی نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر سر جھکا کر سمٹ گئی۔ دل میں عینی کے جلد لوٹنے کی دعائیں مانگنے لگی۔ دروازے کی جانب دیکھے بغیر شہزاد کی شخصیت کے بارے میں کومنٹس دینے کی غلطی کر بیٹھی تھی۔ غلطی کو نبھانے کا طریقہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایسے میں عینی شہزاد کے عقب میں پہنچ گئی۔ تعجب بھرے لہجے میں بولی۔ ''بھیا! آپ تو بہت جلدی میں تھے۔ پھر؟''

شہزاد نے کہا۔ ''میں اپنا بریف کیس بھول گیا تھا۔ لینے کے لیے آیا تو سوچا کہ تم سے دریافت کرتا چلوں کہ تم نے شام میں کوئی پروگرام تو ترتیب نہیں دے رکھا۔ میرا کسی اچھے سے ہوٹل میں زبردست ڈنر کا ارادہ تھا۔ جلدی میں مجھے تمھاری دوست کی موجودگی کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ ویری سوری!''

عینی نے سمٹ کر بیٹھی ہوئی بانو کو دیکھا، کمرے میں داخل ہوئی اور پلٹ کر شہزاد کو دیکھا۔ کچھ سمجھ نہ پائی۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ ''بھیا! یہ میری بہت پیاری سی دوست ہے، بانو...... اور بانو! یہ میرا بڑا بھائی ہے، شہزاد سلطان...... یہی وہ دقیانوسی انسان ہے جس کے بارے میں تجھے بتلاتی رہتی ہوں۔''

بانو نے سر نہیں اُٹھایا، اثبات میں سر ہلایا اور کم بلند آواز میں کہا۔ ''مجھے تمھارے بھائی سے مل کر خوشی ہوئی۔''

شہزاد نے عینی کی نظر بچا کر اُسے بھرپور انداز میں دیکھا اور پلٹ کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا راہداری میں آگے کی طرف نکل گیا۔ عینی نے راہداری میں جھانک کر دیکھا اور

لبوں پر شرارت بھری مسکراہٹ لیے بانو کے پاس آ گئی۔ بانو کا ہاتھ تھام کر دباتے ہوئے بولی۔ ''کیا کہتا تھا؟ یہی ناں کہ 'آئی ڈونٹ کیئر اباؤٹ اینی باڈی' ہیں ناں؟ اَب دیکھتی ہوں، کیسے پروا نہیں کرتا۔''

وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

''اتنا ہینڈسم ہونے کے باوجود بھائی کی کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔ کیا بہت عجیب نہیں ہے؟'' عینی نے بات بڑھائی۔

وہ بولی۔ ''یہ انوکھا پن نہیں، اچھائی ہے اور اِسے سراہنا چاہیے۔''

''تم تو ایسا کہو گی ہی......'' عینی نے بُرا سا منہ بنایا۔

''کیوں؟ میں ایسا کیوں کہوں گی؟''

''کیونکہ تم بھی میرے بھائی کے جیسی ہو۔ ایک دَم فضول!''

''چھوڑو اِس تذکرے کو، مجھے پانی پلوا دو۔ زور کی پیاس لگی ہوئی ہے۔'' بانو نے جان چھڑانے کے سے انداز میں کہا تو عینی کو ایک مرتبہ پھر کمرے سے نکلنا پڑا۔

عینی کے والدین سے وہ تھوڑے وقت میں ہی گھل مل گئی۔ وہ عینی کے پاپا، سلطان احمد سے بالخصوص بہت متاثر ہوئی۔ اُنہوں نے بانو کو کافی وقت دیتے ہوئے بہت کچھ دریافت کیا۔ وہ پہلے گھبراتی رہی، پھر پُراعتماد لہجے میں اپنے بارے میں بتلانے لگی۔ کھلتے کھلتے کھلتی گئی۔ لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ زبان کا قفل کھولتی ہیں تو پھر بلا تکان بولے چلی جاتی ہیں۔

گھر میں دو گاڑیاں تھیں۔ ایک ورکشاپ میں تھی۔ جس گاڑی پر وہ کالج سے واپس آئی تھی، وہ اَب شہزاد کے زیرِ استعمال تھی۔ ملازم کو عینی نے ٹیکسی لانے کے لیے کہا۔ وہ حکم کی تعمیل کے لیے نکلنا ہی چاہتا تھا کہ شہزاد آ گیا۔ عینی کو اچنبھا ہوا۔ پہلے وہ کہیں جایا کرتا تھا تو لوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ آج غیر متوقع طور پر جلد گھر پہنچ گیا تھا۔ اُس کا بریف کیس ملازم اُٹھا کر کمرے تک لاتا تھا۔ آج وہ خود اُٹھائے ہوئے تھا۔ عینی کے کمرے میں کبھی کبھار قدم رکھتا تھا۔ آج دِن میں دوسری مرتبہ کمرے کے دروازے میں آن کھڑا ہوا تھا۔ شگفتہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''عینی! میں تمھاری وجہ سے جلد آ گیا ہوں، یہ سوچ کر کہ کہیں تمھاری دوست کو گھر لوٹنے کی جلدی نہ ہو۔''

عینی کے جواب دینے سے پیشتر ہی وہ صوفے تک آیا۔ بیٹھتے ہوئے گہری نظروں سے بانو کا جائزہ لینے لگا۔ عینی نے کہا۔ ''بھیا! خاصے بدلے بدلے دکھائی دے رہے ہو، خیر تو ہے؟''

وہ شکایت بھری نگاہ ڈال کر بولا۔ ''تمھارے لیے وقت نہیں نکال پاتا، ناراض ہوتی ہو۔ آج چند لمحے تمھارے کمرے میں بیٹھنے کا ارادہ کر کے آیا ہوں تو الٹے سیدھے سوال کرنے لگی ہو۔ دماغ چاٹنے کی بجائے اپنی اچھی سی دوست کے بارے میں کچھ بتلاؤ۔''

عینی نے بانو کی طرف دیکھا۔ اُس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہوگئے تھے۔ شاید وہ شہزاد کی موجودگی کے باعث نروس ہو رہی تھی۔ لڑکیاں جوانی میں نادان ہوتی ہیں، عینی بھی نادان تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ بانو میں اپنے بھائی کی دلچسپی کو بھانپ نہ پاتی۔ یہ پریشانی کی نہیں، خوشی کی بات تھی مگر اُسے اندیشہ تھا کہ کہیں بانو کو شہزاد کی مداخلت ناگوار نہ گزر رہی ہو۔ وہ تھی بھی ایسی۔ اپنی ذات کے خول میں سمٹ کر ماشہ دکھائی دیتی تو اگلے ہی پَل میں بل کھاتی اور بَل کھول کر تولہ بن جاتی تھی۔ کن انکھیوں سے بانو کو دیکھتے ہوئے بھائی کو اُس کے بارے میں بتلانے لگی۔

خود کو عینی اور شہزاد کی گفتگو سے لاتعلق ظاہر کرنے کے لیے وہ عینی کے موبائل کے ساتھ کھیلنے لگی مگر قیامت کی نظر سے تاڑنے والا دیکھ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ وہ لاتعلق نہیں تھی بلکہ ایک ایک لفظ کو توجہ سے سُن رہی تھی۔ چند منٹ بیٹھنے کے بعد ایک عجیب سی نگاہ بانو پر ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ عینی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''دُنیا میں کئی لوگ ایسے بھی پائے جاتے ہیں جنہیں گنوا کر انسان عمر بھر پچھتاتا رہتا ہے، شاید تمھاری دوست کا شمار بھی اُنہی لوگوں میں کیا جاتا ہے۔ میں چلتا ہوں۔ جب جانا چاہو، چلی جانا، گاڑی گیراج میں موجود ہے۔''

عینی کے لبوں پر معنی خیز دلکش مسکراہٹ اُبھری جو شہزاد کے کمرے سے نکلنے پر دل آویز قہقہے میں بدل گئی۔ اُس نے جھپٹ کر بانو کو پکڑا، کھینچ کر سینے سے لگایا اور والہانہ انداز میں دیکھتے ہوئے عاشقانہ لہجے میں بولی۔ ''دیکھ! میں نہ کہتی تھی کہ تمھارے سامنے کسی پتھر کو رکھ دیا جائے تو وہ بھی بولنے

پر مجبور ہو جاتا ہے۔ شہزاد جیسے شخص کے دل پر بھی تمہارے حسن کی تلوار چل گئی ہے اور وہ کٹ کر قطرہ قطرہ تمہارے قدموں میں بہنے لگا ہے۔ ہائے بانو! تم کتنی پیاری ہو۔"
اُس نے عینی کو ایک جھٹکے کے ساتھ پرے دھکیل دیا اور ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ چھپا کر رونے لگ گئی۔

☆☆

گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بالی دکان سے آچکا تھا۔ وہ کمرے میں آئی، چادر اُتاری اور چارپائی پر نیم دراز بالی کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ پوچھے بغیر اُسے عینی کے جھوٹ اور اُس کے والدین کے پیار بھرے رویے کے بارے میں بتلانے لگی۔ اچانک اُسے محسوس ہوا کہ بالی اُس کی باتوں پر توجہ نہیں دے رہا۔ غور کرنے پر بالی کو تکلیف میں پایا۔ پوچھنے پر اُس نے بتلایا کہ اُس کی آنکھوں میں ویلڈنگ کی روشنی پڑ گئی ہے اور شدت کی چبھن بے چین کیے جا رہی ہے۔
ایسا پہلی مرتبہ نہیں ہوا تھا۔ بانو کو علم تھا کہ ایسے موقع پر اُسے کیا کرنا ہے۔ اُس نے چینی لیے بغیر چائے بنائی۔ بالی کو پیالہ تھمایا اور چھاننی اور کیتلی میں موجود چائے کی استعمال شدہ پتی کو ایک برتن میں نکال کر ٹھنڈا کرنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد وہ پتی کو ململ کے پتلے سے کپڑے میں باندھ کر بالی کی آنکھوں پر مہارت سے باندھ رہی تھی۔ بالی کچھ ہی دیر میں شانت ہو گیا۔ سچ کہتے ہیں کہ آنکھیں بند ہوں، آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہو یا کچھ بھی سجھائی نہ دے رہا ہو تو انسانی ذہن پُرسکون ہو جاتا ہے۔ وہ چارپائی پر پیروں کے بل بیٹھ گئی اور والہانہ پیار کے ساتھ اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ بیچ میں اُس کے شیو زدہ گالوں کو بھی سہلانے لگتی۔ بالی نے اُس کا ہاتھ تھام لیا، لبوں سے لگایا اور بولا۔ "ویلڈنگ کا بہانہ بن گیا ورنہ میری آنکھیں تو پھوٹ پڑنے کو پہلے ہی بے تاب ہو رہی تھیں۔"
اُس نے معصومیت سے پوچھا۔ "وہ کیوں؟"
"آج دوپہر میں تمہیں جی بھر کر دیکھا جو نہیں تھا۔"
"جھوٹ! تم نے کالج کے گیٹ پر مجھے دیکھا تھا، باتیں بھی کی تھیں، کیا بھول گئے ہو؟"
"ہونہہ! وہ بھی کوئی دیکھنا تھا؟" بالی نے منہ بنا کر کہا۔
"تو اور کیا تھا؟" وہ فرحت سے مسکرائی۔
وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ پایا۔ اکثر بولتے بولتے رُک جایا کرتا تھا۔ شاید اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے اُس کے پاس مطلوبہ الفاظ جمع نہیں ہو پاتے تھے تبھی خاموش ہو جاتا تھا۔
بانو کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر اپنے گالوں پر پھیرتے ہوئے شکوہ کناں ہوا۔ "مجھے دیکھتے ہی تمہاری سہیلی کے چہرے پر ناگواری کا اظہار جھلکنے لگتا ہے۔"
بانو نے جلدی سے کہا۔ "وہ سوچتی ہے کہ تم مجھ پر بے حد سختی کرتے ہو، مجھ پر پابندیاں عائد کرتے ہو اور فطرتاً بہت سخت گیر انسان ہو۔"
اُس کے سیاہی مائل ہونٹ بھنچ گئے۔ تھوڑے توقف کے بعد مبہم سی بے یقینی سے بولا۔ "کیا میں واقعی ایسا ہوں؟"
"نہیں۔ میرا بالی تو دُنیا سے جدا ہے۔ مجھے اپنے بالی کے جیسا کہیں بھی دکھائی نہیں دیتا۔"
"پھر وہ ایسا کیوں سوچتی ہے؟"
"سچ بتاؤں؟"
"ہمارے درمیان کبھی جھوٹ نہیں رہا۔"
"وہ جب بھی مجھے اپنے گھر لے جانا چاہتی ہے، میں تمہارا نام لے کر انکار کر دیتی ہوں۔ اُسے کہہ دیتی ہوں کہ بالی مجھے کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ مجھے لنچ یا ڈنر کی دعوت دیتی ہے تو میں کہہ دیتی ہوں کہ بالی کو میرا ہوٹل میں جانا بہت بُرا لگے گا۔ وہ شاپنگ پر نکلنے کا ارادہ کرتی ہے تو مجھے ساتھ لے جانے پر مصر ہو جاتی ہے۔ میں اُسے ٹالنے کے لیے کہہ دیتی ہوں کہ اگر مجھے بازار میں بالی نے دیکھ لیا تو وہ ناراض ہو جائے گا۔ اُس کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو گیا ہے کہ تم نے مجھ پر بے جا پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ تبھی وہ تمہیں اچھا نہیں سمجھتی۔" بانو نے اپنی دانست میں اُسے مطمئن کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی۔
وہ بولا۔ "تم ایسا کیوں کہتی ہو؟ اُس کے ساتھ چلی جایا کرو۔ میں نے تمہیں کہیں جانے سے کبھی روکا تو نہیں......"
"نہیں بالی!" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "وہ بہت اچھی ہے، بہت پیار کرتی ہے مگر نہ جانے کیوں اُس کی موجودگی میں میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ میں کسی بھی جگہ پر اُس کی برابری نہیں کر سکتی۔ ہوٹل میں، شاپنگ سنٹر میں یا اُس کی کوٹھی میں...... کہیں بھی...... ایسے میں اُس کے ساتھ زیادہ دیر تک چپکی رہوں گی تو وہ مجھ سے اُکتا جائے گی اور میں اُس کی نظروں میں بے وقعت ہو جاؤں گی۔"

وہ کچھ سمجھا، کچھ نہیں سمجھ پایا مگر سر ہلا کر خاموش ہو گیا۔
بانو نے پیار سے اُسے دیکھا۔ اُس نے جب سے شعور پایا تھا، بالی نے کبھی مار پیٹ تو در کنار، اُسے جھڑکا تک نہیں تھا۔ اُس کے منہ سے نکلا ہوا، جیسے بھی ممکن ہو پایا، پورا کیا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک اُس کے وجود کے لیے پیکرِ التفات اور سراجِ منیر ثابت ہوا تھا۔ چہرے سے خاصا سخت گیر اور درشت مزاج دکھائی دینے والا بالی حقیقت میں بڑے نرم دل اور ٹھنڈے دماغ کا مالک تھا۔
پٹی آنکھوں پر باندھنے سے چبھن میں کمی واقع ہو گئی تھی۔ کئی مرتبہ پوچھنے کے بعد دل کو تسلی ہوئی تو اُس کے لیے کھانا تیار کرنے لگی۔ آج بالی کو اکیلے ہی کھانا تھا کیونکہ وہ عینی کے ہاں سے سیر شکم ہو کر آئی تھی۔ بالی آنکھوں سے پٹی اُتارنا چاہتا تھا مگر بانو نے منع کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے کھلانا شروع کر دیا۔ نو بجے کے قریب بالی کو نیند آ گئی۔ بانو نے بڑی آہستگی سے اُس کی پٹی کھولی، بند آنکھوں اور اطراف کی جلد کو رومال سے صاف کیا اور پتی کو ڈسٹ بن میں پھینک کر ململ کی پٹی دھو ڈالی۔ اپنی چارپائی پر لیٹنا ہی چاہتی تھی کہ بالی کے سرہانے تلے دبا ہوا موبائل فون بجنے لگا۔ بانو نے لپک کر فون اُٹھا کر اسکرین پر نگاہ ڈالی۔ عینی کال کر رہی تھی۔ بالی کی خمار آلود آواز سنائی دی۔ "بانو! دیکھو تو کون ہے؟ اگر رفیق ہو تو کہہ دینا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے آج اوورٹائم نہیں لگا سکتا۔"
وہ بولی۔ "عینی مجھے فون کر رہی ہے۔"
"اوں!" آنکھیں کھولے بغیر بالی نے کروٹ بدل لی۔
اُس نے کال ریسیو کی۔ عینی کی شوخ آواز کانوں میں اُتری۔ "ہیلو جانم! کیسی ہو؟ دیوزاد کیسا ہے؟"
وہ بالی کی نیند کا دھیان رکھتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ "سب ٹھیک ہے۔ تم کہو؟"
"میں کیا کہوں؟ بھیا کان کھائے جا رہا ہے، ایک ہی سوال کا بار بار جواب مانگے جا رہا ہے۔ مجھے قائل کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ تم دُنیا کی خوب صورت اور دلکش لڑکی ہو۔ یہ بات وہ مجھے کیا بتلائے گا، میں تو عرصہ دراز سے اس قاتل جوانی کے تپش پرور جسم پر آنکھیں اور ہاتھ سینک رہی ہوں۔ مجھ سے زیادہ تمہیں کوئی کیا جانے گا، ہاں!" عینی کے لفظ لفظ میں شرارت بھری ہوئی تھی۔
بانو نے قدرے ناگواری سے کہا۔ "کیا یہ بتلانے کے لیے مجھے فون کرنے کا تکلف کر رہی ہو؟"
"کیا یہ معمولی بات ہے؟" عینی نے مصنوعی حیرت کا مظاہرہ کیا۔ "بھیا نے سیکڑوں لڑکیاں دیکھ رکھی ہیں۔ ہر حسن کی جولانی کو اِس ظالمانہ انداز میں رد کیا ہے کہ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ اُسے دُنیا میں کوئی لڑکی بھی پسند نہیں آئے گی۔ اُس کی نظروں نے آج تمہیں پسندیدگی کی سند دی ہے تو یہ عام سی بات نہیں، ملکہ عالیہ! بہت خاص بات ہے۔"
"تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟" اُس نے چوٹ کی۔
"تمہیں خود کو مزید بنا سنوار کر رکھنا چاہیے تاکہ شہزاد بھیا تمہیں دوسری مرتبہ دیکھے تو بس دیکھتا ہی رہ جائے۔" عینی نے کہا۔
"یعنی ماڈل بن جاؤں؟" اُس کا لہجہ طنز سے معمور ہو گیا۔
"ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ تم پہلے سے ہی ماڈل ہو، مشرقی روایات اور برصغیر کے حسن کا جیتا جاگتا شاہکار ہو۔ کھلے گلے والے کپڑے اور کندھوں تک ننگے بازوؤں والے کرتے پہننے والیوں کے لیے ماڈل ہو، حسن کی تلوار پر عریانی کی پان چڑھا کر روشن خیالی کی دعوے داروں کے منہ پر طمانچہ ہو کہ چھپ کر رہتی ہو، چھاتی پر چڑھ کر وار کرتی ہو اور آن کی آن میں دیکھنے والے کے دل کی دُنیا کو تہہ و بالا کرتی جاتی ہو۔ تمہیں کچھ بھی بننے کی کوئی ضرورت نہیں...... بس میں یہ چاہوں گی کہ جیسے قسمت نے تجھے میری دوست بنایا ہے، ایسے ہی کسی دن اچانک مہربان ہو جائے اور تمہیں میری بھابھی بنا دے۔ سچ! ایک یہی صورت ہے کہ ہم دونوں عمر بھر علیحدہ نہیں ہو پائیں گی۔"
وہ بولتی تھی تو سننے والے کو دخل دینے کا موقع نہیں دیتی تھی۔ بانو کے ٹوکتے رہنے کے باوجود اُس نے اپنی بات پوری کر لی۔ بانو کا نفس بے قابو ہونے لگا تھا۔ عینی کے منہ سے نکلنے والا لفظ لفظ اُس کی سماعت میں اُتر کر خون میں گھل گیا تھا۔ وہ سمجھ نہ پائی کہ دل نے جسے پکڑ رکھا ہے، سرور وکیف کی الوہی کیفیت میں بے خود ہوتا جاتا ہے یا ایک امیر زادی کے دکھائے گئے تشنہ خوابوں کی پیدا کردہ گھٹن میں موت کی سی جانکنی کا شکار ہونے لگا ہے۔ وہ کافی دیر تک نہیں

بولی تو عینی نے پکارا۔ "بانو! کوئی بات کرو۔ تم یوں خاموش ہوگئی ہو جیسے میں نے تمھارے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنے بھائی کے نام کی انگوٹھی تمھاری انگلی میں ڈال دی ہے۔"

وہ بدقت تمام بولی۔ "بس کرو عینی! کیا تم مجھے یوں مضحکہ خیز مذاق کا نشانہ بنانے کے لیے اپنے گھر لے کر گئی تھیں؟ اللہ تمھارے بھائی کو لمبی عمر دے، اُس کے لیے تمھارے شایانِ شان رشتوں کی کوئی کمی نہیں اور مجھے یقین ہے کہ تمھاری سوچ سے بھی کہیں اچھی بھابھی تمھیں ملے گی۔ میں ٹاٹ کا ٹکڑا ہوں، مجھے کسی نہ کسی دِن ٹاٹ میں ہی ٹانک دیا جائے گا۔ تب جانے تم کہاں ہوگی، جانے میں کہاں ہوں گی۔"

بولتے بولتے اُس کا لہجہ بھرا گیا تھا۔ عینی پر اُس کی اُداسی کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بانو کے کانوں میں مترنم جلترنگ بج اُٹھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "سچ کہتی ہوں بانو! تم بہت پیاری ہو۔ اتنی کہ مجھے پیدا کرنے والے پر بھی کبھار گلہ پیدا ہونے لگتا ہے کہ اُس نے اگر مجھے تم سے ملوانا ہی تھا تو مجھے تمھارا مرد بنا دیا ہوتا۔ اُس کی اتنی نایاب صناعی کو مرد کا دِل ہی پوری سچائی سے سراہ سکتا ہے، کوئی عورت نہیں......"

"تم مجھ سے کہیں زیادہ پرکشش ہو عینی!" اُس نے مزاحمت کی۔

"ہاں! مگر میری تمام ترکشش کے عقب میں دولت اور دولت کے بل پر حاصل کی جانے والی رعنائیاں کارفرما ہیں۔ میں باقاعدگی سے بیوٹی پارلر جاتی ہوں۔ اپنے آئی بروز کو باریک اور نفیس بنانے کے لیے اچھی خاصی رقم خرچ کرتی ہوں، کئی ہاتھوں کا ہنر خرید کر اپنی پلکوں کو خمیدہ کرتی ہوں جبکہ تم...... پتھروں کے زمانے کے تاریک غار جیسے گھر سے نکل کر کالج پہنچتی ہو، تم نے آج تک اپنے اَبرو کا ایک بال بھی کھینچنے کی زحمت نہیں کی۔ قدرت نے ایک بال بھی بلاضرورت نہیں اُگایا۔ دھندلی سرحد والے آئی بروز کے نیچے لانبی لانبی پلکیں جنھیں موڑنے اور خم دینے کی ضرورت ہی نہیں، خدا نے بنانے کے ساتھ ساتھ ہی سنوار بھی دیا تھا۔ ہائے بانو! تم سمجھتی نہیں ہو۔ میرا بھائی ایسے ہی حسن کا برسوں سے منتظر تھا۔ ایسا حسن جسے تصنع اور بناوٹ کی ضرورت نہ ہو۔ ایسا سونا جسے مشینوں سے گزار کر چمکایا نہ جائے۔ ایسا پھول جسے مزید خوب صورت بنانے کے لیے پتیوں کو تراش خراش کے مرحلے سے گزارنا نہ پڑے۔ ہاں! میں درست کہتی ہوں۔ وہ تمھاری تلاش میں تھا اور پھر اُس کی خوش قسمتی دیکھو، اُس نے تمھیں دیکھ ہی لیا۔"

بانو نے غیر اختیاری طور پر بالی کی طرف دیکھا۔ روہانسی ہو کر بولی۔ "خدا کے لیے عینی! اتنے سنجیدہ لہجے میں میرا مذاق مت اُڑاؤ، کہیں مجھے اپنے وجود سے ہی نفرت نہ ہوجائے۔ بالی کہتا ہے کہ ہم دونوں زمین پر رینگنے والے کیڑے مکوڑے ہیں، عمر بھر کی محنت سے خود کو بہ مشکل گھٹنوں کے بل اوپر اُٹھا پائیں گے۔ آسمانی بلندیوں کے خواب دیکھیں گے تو زمین کو بھی گنوا بیٹھیں گے۔"

"بالی سراسر بکواس کرتا ہے۔" عینی کے اَٹل لہجے میں ناگواری رچ بس گئی۔ "وہ تمھیں روزِ اول سے دیکھتا آرہا ہے، آج بھی اُس کی نظروں میں وہی پونی بندھوائی، ریں ریں کرتی ہوئی ننھی سی بچی رچی بسی ہوئی ہے۔ وہ تمھاری اُٹھان سے شناسا نہیں ہے اور نہ ہی اُس بنجر انسان کے پاس دیکھنے والی آنکھ موجود ہے۔ وہ لوہے کو سُدھاتا ہے۔ لوہے کو آہنی ہاتھوں سے کاٹتا ہے۔ تمھارے گرم روٹی جیسے پُرگداز بدن کی نزاکتوں کو کیا جانے؟"

وہ حد سے بڑھ رہی تھی۔ بانو کو علم تھا کہ وہ حد سے تجاوز کرتے ہوئے بہت دور تک جائے گی اور اُسے پسینے میں نہلا دے گی۔ اُس نے جھٹ سے کال منقطع کردی۔ جانتی تھی کہ وہ باز نہیں رہ پائے گی اور بار بار کال کرے گی اِس لیے اُس نے فون کو پاور آف کرتے ہوئے اس پر اپنا دروازہ بند کردیا۔

عینی سے چھٹکارا مل گیا مگر اُس نے جو کرنا تھا، کر گزری تھی۔ اُس کے مساموں نے نمی کو اُگلنا شروع کردیا تھا۔ وہ چارپائی کی بانہہ کو چھاتی سے لگا کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ بند آنکھوں کے عقبی پردے میں شہزاد کی اُجلی اُجلی شبیہ لہرانے لگی۔ وہ منقش تپائی پر فریم کے چوکھٹے میں سج کر بولنے سے باز نہیں آیا تھا۔ دل کے فریم میں بیٹھ کر کہاں چپ رہ سکتا تھا۔ آنکھوں کے والہانہ پن کو اجاگر کرنے لگا۔ "اے آنکھ سے دِل میں اُترنے والی حسینہ! آئینہ تمھیں دیکھتا ہے مگر اُس کے پاس جذب کرنے والا دِل نہیں ہوتا وگرنہ کرچی کرچی ہوکر تمھارے قدموں میں ڈھیر ہوجاتا۔ میں انسان ہوں، پہلی مرتبہ دیکھ کر ہی قدموں میں ڈھیر ہونے کو بے تاب ہورہا ہوں، کبھی مجھے بھی دیکھنے کے لیے میری دُنیا میں یوں آؤ جیسے تم آئینے کو دیکھنے کے لیے اُس کے سامنے بیٹھ جاتی ہو۔"

بانو کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی، کچھ سننا نہیں چاہتی تھی مگر سامنے بیٹھے کو بھگا سکتی تھی یا خود اُس سے پَرے ہٹ سکتی تھی، دِل میں جاگزیں ہونے والے سے دور ہونے پر قادر نہیں تھی۔ وہ دِل میں بیٹھ کر دل سے نکلنے والی شریانوں سے کھیل رہا تھا، لہو کو گرما کر سمجھا رہا تھا۔ "مجھے پہچاننے کی کوشش کرو، میں وہی ہوں جسے تمھاری دل لگی کے لیے قدرت نے دُنیا میں بھیج رکھا ہے ورنہ تو میں کائنات میں بلاضرورت واقع ہوں۔ میں نے آج تک کسی لڑکی کو اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا۔ یہ میرا کمال نہیں ہے، تمھارا ہے کہ تم نے اپنا آپ دکھائے بغیر برسوں سے مجھے اپنی مٹھی میں جکڑ رکھا ہے۔ بند مٹھی میں وقت نے حرارت زدہ حبس بھر دیا ہے، میرا دَم گھٹ رہا ہے۔ مجھے رَگوں میں، دل میں، جان کی ہر شکن میں اُترنے کی اجازت دے دو کہ میرا وجود تمھاری ضرورت بن کر اہم ہوجائے۔"

بانو نے گھبرا کر کروٹ بدل لی کہ شاید اُس حزنِ جاں سے چھٹکارا ملتا ہو۔ آنکھیں کھولنے پر عافیت کا در عارضی طور پر کھلا مگر جونہی آنکھیں بند ہوئیں، وہ پھر دھڑلے سے آن وارد ہوا۔ کم بخت شیشے کی تنگ منہ والی صراحی میں بیٹھ کر چھیڑتا تھا، باریک جالی والے پنجرے میں بیٹھتا تھا اور ہاتھ کی پہنچ سے دور ہوکر بنا سُنے بولے چلا جاتا تھا۔ عجیب عجیب لفظ سماعت میں اُتار کر بے خود کرنے لگتا تھا۔ وہ مزاحمت کرتے کرتے ہار گئی۔ لڑکیاں ایسے ہی ہار جاتی ہیں اور ہار کر بھی جیت کی خوش گمانی کا شکار ہوجاتی ہیں۔

عینی کے ساتھ اُس کے گھر تک جانے پر پچھتاوے کا احساس ہلکان کیے دے رہا تھا۔ نہ جانے عینی اور اُس کے بھائی کو اُس میں کیا دکھائی دے گیا تھا جو آج تک خود اُسے دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ خود کو غیر معمولی نہیں سمجھتی تھی، عینی اُسے دُنیا سے الگ تر خیال کرتی تھی جبکہ اُس کے بھائی نے اُسے اپسرائی تخت پر براجمان کرکے اپنا سر جھکا دیا تھا اور اُس کے سر پر تاج رکھ کر ممتاز کردیا تھا۔ چھت پر نگاہ ڈالی تو یوں محسوس ہوا جیسے پنکھے کے پَر ہوا دیے بغیر پھڑ پھڑانے لگے ہوں۔ جسم کا جو حصہ چارپائی پر بچھے روئی کے گدے سے مس کرتا، آگ پکڑ لیتا۔ پہلے پہلوؤں میں انگارے بھر گئے تھے، اَب کمر سلگنے لگی۔ اوندھی ہو کر لیٹی تو چھاتی دہکنے لگی۔ بے آب ماہی کی طرح تڑپنے سے بھی قرار نہیں آیا تو گھبرا سی گئی۔ "ہائے اللہ! یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟ میں کبھی بھی ایسی تو نہیں تھی۔ یک لخت زمانہ بدل گیا ہے یا میری جون بدل گئی ہے۔ اُس نے مجھے کچھ بھی نہیں کہا، کسی غلط نگاہ سے دیکھنے کی غلطی بھی نہیں کی پھر میرا ذہن اتنا بُرا کیوں ہوا جارہا ہے؟ مانا کہ وہ بہت اچھا ہے، بہت خوب صورت ہے مگر وہ دُنیا کا پہلا خوب صورت مرد تو نہیں جو مجھے دکھائی دیا ہے۔ اَبھی تو یہ بھی طے نہیں ہوا کہ عینی اور اُس کا بھائی میرا مذاق اُڑا رہے ہیں، میری جھوٹی ستائش کر رہے ہیں یا واقعی مجھ پر فریفتہ ہوگئے ہیں۔"

بدن کو لگی آگ کو پسینے نے بجھا دیا مگر پھر تپش کا مقابلہ نہ کرتے ہوئے ہوا میں تحلیل ہو کر بے وجود ہوگیا۔ وہ کروٹیں بدلتے بدلتے تھک گئی تو بغیر کوئی آواز پیدا کیے سرکنڈوں کا بنا ہوا موڑھا اُٹھائے کمرے سے باہر چھوٹے سے آنگن میں آگئی۔ نصف رات کو شہر سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ سڑک پر سے آنے والے ہارنوں کی تیز اور ناگوار آواز کے تسلسل میں خاصی کمی واقع ہوچکی تھی۔ آسمان پر بکھرے تاروں تک نظر کسی دھوئیں اور آلودگی کو عبور کیے بغیر پہنچ رہی تھی۔ بائیں دیوار کے ساتھ موڑھا رکھ کر بیٹھ گئی اور پشت ٹکا کر گہرے سانس لینے لگی۔

لامحدود غربت نے اُسے ناک کی سیدھ میں چلنا سکھایا تھا۔ اردگرد دیکھ کر چلنے کی کبھی بھی عادی نہیں رہی تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ ہر امتحان میں کوئی نہ کوئی پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتی تھی۔ دھیرے دھیرے بیتنے والی رات کے پہلو میں کئی اُداسیاں سمیٹ کر وہ عینی کے مقابل میں اپنے حالات کو کھڑا کرکے ناقدانہ نگاہوں سے جائزہ لینے لگی۔ بچپن میں جہاں تک نگاہ جاتی، غربت اور محرومیوں کا راج دکھائی دیتا تھا یا بالی کا گہرا سانولا، عمر سے بڑی مشقتوں کی نقاہت سے چور چہرہ دکھائی دیتا جو اپنی ہر مترشح تھکن کو پسِ پشت ڈال کر اُس کی دلجوئی کرتا رہتا تھا۔

اُس کی بند آنکھوں میں تائی بشیراں کا بے دانت، جھریوں بھرا بوڑھا چہرہ اور استخوانی ہاتھ لہرا گئے۔ چھوٹے سے بے نام گاؤں کی تنگ سی گلیاں اور گلیوں میں جابہ جا

پڑے گوبر کے ڈھیر دکھائی دینے لگے۔ یہ اُس کے شعور کے ابتدائی دِن تھے۔ دھندلی تصویروں سے وہ اپنا بچپن منسوب کرتے ہوئے کبھی بھی تائی بشیراں کے علاوہ کسی شبیہہ کو کوئی نام نہیں دے سکی تھی۔

تائی بشیراں، بالی اور وہ...... ایک کمرے والے ناپختہ گھر میں رہتے تھے۔ تب سارا دِن تائی کا ہاتھ بٹانے، گلیوں میں بھاگنے دوڑنے اور بالی کو تنگ کرنے کے علاوہ اُس کے پاس کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ البتہ اُسے یہ احساس ضرور کچوکے دیتا رہتا تھا کہ گاؤں بھر کی عورتیں اور اُس کی ہم عمر لڑکیاں اُس سے کترائی رہتی تھیں۔ کوئی بھی اُسے پیار سے گلے نہیں لگاتا تھا۔ حتیٰ کہ تائی بھی پیار نہیں کرتی تھی۔ اِنہی دِنوں میں بالی گاؤں کے واحد لوہار کے ہاں دیہاڑی پر کام کرنے لگا تھا۔ نہ جانے اُس کے دِل میں بانو کو پڑھانے کا خیال کیسے آ گیا؟ گاؤں سے نصف کلومیٹر کے فاصلے پر واقع پرائمری اسکول میں بانو کو لے گیا اور پہلی کلاس میں داخل کروادیا۔ وہ پڑھنا نہیں چاہتی تھی مگر بالی اُس کے بال کھینچ کر، ننھے ننھے گالوں پر ہم وزن چٹولے لگا کر اسکول چھوڑ آتا، دوپہر کو واپس لے آتا۔

پانچویں کلاس کا امتحان پاس کرنے کے ساتھ ہی اُس کی تعلیم کا سلسلہ رُک گیا کیونکہ سوائے اُس پرائمری اسکول کے دور دور تک کوئی اور اسکول نہیں تھا۔ اِس طویل دورانیے میں اُس نے بالی کو بارہا مرتبہ بوڑھے لوہار کے ہاتھوں، اپنے ہم عمر لڑکوں اور بڑوں کے ہاتھوں بُری طرح پٹتے دیکھا۔ وہ اُس سے محض چند سال ہی تو بڑا تھا۔ رات بھر روتا رہتا، سسکتا رہتا اور چارپائی پر کروٹوں پر کروٹیں بدلتا رہتا۔ ایسے میں بانو ایک کچی مٹی کے ڈھیلے پر کپڑا لپیٹ کر گرم کرتی، مضروب بدن کی ٹکور کرتی اور بے دریغ اشک بہاتی رہتی۔ تب اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بالی کو ہر آدمی کیوں بُری طرح پیٹ دیتا ہے، اَب سمجھ رہی تھی کہ بالی کو گاؤں والے نہیں، اُس کی غربت اور خالی پشت مارتی تھی۔

جب ایک دِن بڈھے کالو لوہار نے بھٹی سے سرخ لوہا نکال کر اُس کے بازو پر لگا دیا اور پھر اُسی گرم سلاخ کی مدد سے اِس بے دردی سے مارا کہ وہ دو ہفتے تک چارپائی سے ہی اُٹھ نہ سکا تو بانو نے بالی کو بدلا ہوا دیکھا۔ چلنے کے قابل ہوا تو گاؤں سے غائب ہوگیا۔ جیسے تائی کا گدھا کبھی کبھار گم ہوجاتا تھا۔ کوئی بھی گدھے کو تلاش نہیں کرتا تھا، چند دِن گزار کر خود بخود لوٹ آتا تھا، ایسے ہی بالی بھی چند دِنوں کے بعد لوٹ آیا۔ دن بھر عجیب سے معمولات میں مشغول رہا۔ اُس نے آدھی رات کو بانو کو چوروں کی طرح جگایا، کپڑوں کی ایک پوٹلی اُٹھائی اور گاؤں کی ہر خوابیدہ آنکھ سے چھپتا چھپاتا گاؤں سے نکل آیا۔ وہ بُری طرح سہمی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں بالی سے چمٹ کر چلتے ہوئے اُس نے بالکل بھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ اُسے لے کر کہاں جارہا ہے؟

شاید دونوں پختہ سڑک پر رات بھر چلتے رہے تھے۔ بانو کے کانوں میں کتوں کے بھونکنے کی دل دہلانے والی آوازیں، جھینگروں کی ڈراؤنی صدائیں اور خوف سے اپنے دِل کی بڑھی ہوئی دھڑکن آج تک گونجتی آئی تھی۔ تھکی ہوئی رات اپنی بساط لپیٹنے کو ہی تھی جب اُس نے شہر کی بتیاں پہلی مرتبہ دیکھی تھیں۔ بالی کئی گلیوں میں چکراتے ہوئے ایک گھر کے دروازے پر رُک گیا۔ دوروازے سے کان لگا کر کچھ سننے لگا۔ بانو نے بھی تقلید کی۔ صحن سے کسی عورت کے جھاڑو دینے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد بالی نے دروازے پر دستک دی۔ دریافت کرنے پر اُس نے بتلایا۔ ”چاچی! میں ہوں۔“

اُس نے اپنا نام نہیں بتلایا تھا مگر سننے والی نے آواز سے ہی پہچان لیا۔ دروازہ کھل گیا۔ جھاڑو ہاتھ میں پکڑے صاف ستھرے لباس میں ملبوس ایک عورت دکھائی دی۔ اُس نے دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور گھر میں بلالیا۔ بانو کو چند دنوں میں ہی پتہ چل گیا کہ بالی گاؤں سے بھاگ کر یہاں شہر میں پہنچا تھا۔ چاچا عبدالکریم، جس کے دروازے پر بالی نے دستک دی تھی، موٹر سائیکلوں کی مرمت کا کام کرتا تھا۔ اُسے ایک ملازم کی ضرورت تھی اور اتفاق سے کام کا پتہ کرتے ہوئے بالی اُس کے پاس پہنچ گیا۔ چاچا عبدالکریم اُسے دیکھ کر فوراً ہی بھانپ گیا تھا کہ لڑکا کام کرنے والا ہے۔ اُس نے اُسے اپنی دکان پر رکھ لیا۔ ساتھ ہی اُسے اپنے گھر میں سونے کی جگہ دے دی۔

دوسرے تیسرے دن اُس نے چاچی کے پوچھنے پر اپنے اور بانو کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بتلا دیا۔ چاچی نے فوراً ہی حکم صادر کردیا کہ کوئی وقت ضائع کیے بغیر بانو کو یہاں لے آؤ۔ اُس کا گاؤں میں اکیلے رہنا کسی بھی لحاظ سے

مناسب نہیں ہے۔ وہ یہی چاہتا تھا۔ بن مانگے مراد پوری ہوتی دکھائی دی تو اُس نے گاؤں جانے میں دیر نہیں لگائی۔ چاچی کے گھر میں سوائے اولاد کے سب کچھ موجود تھا۔ شاید اُن کے اپنے بچے ہوتے تو دونوں کو سر چھپانے کی جگہ میسر نہ آتی۔

وہ بانو کو اسکول میں داخل کروانے کے حق میں نہیں تھی مگر بالی نے ضد کر کے اُسے زنانہ اسکول میں داخل کروا دیا۔ بالی تمام دِن دکان پر کام کرتا، وہ آدھا دِن اسکول میں گزارتی اور بقیہ دِن چاچی کے ساتھ کام میں ہاتھ بٹاتی۔ چاچی کا رویہ دونوں کے ساتھ بہت شفقت آمیز تھا۔ ڈانٹتی تھی تو پیار بھی کرتی تھی۔ جب وہ ساتویں کلاس میں تھی تو اُسے پوری معنویت سمیت احساس ہوا کہ بالی اور اُس کا دُنیا میں کوئی بھی رشتہ دار نہیں ہے۔ بالی ہی بتلایا کرتا تھا کہ ماں اور باپ بانو کے پیدا ہونے کے دو چار ماہ بعد بیمار ہو کر مر گئے تھے۔ کوئی رشتہ دار نہیں تھا اِس لیے دونوں کو زمانے میں اپنی جگہ خود بنانا پڑ رہی تھی۔ تائی بشیراں بھی اُن کی کچھ نہیں لگتی تھی۔ اُس نے خدا ترسی کرتے ہوئے یا اپنی تنہائی کو دور کرنے کی خاطر اُنھیں اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔

گاؤں سے نکلنے کے بعد بالی بہت بدل گیا تھا۔ وہ بانو کے لیے دُنیا جہان کی آسائشیں اکٹھی کرنے کا جنون رکھتا تھا، اختیار نہیں رکھتا تھا مگر پھر بھی وہ جو مانگتی، کسی نہ کسی طرح خرید لاتا تھا۔ کبھی کبھی جب وہ گاؤں میں گزارے ہوئے ایام کو یاد کر بیٹھتی تو بالی کا چہرہ بجھ جاتا۔ آہ بھر کر کہتا۔ ''بانو! اُن دنوں کو یاد نہ کیا کرو۔ تم جانتی ہو کہ میں نے وہ وقت کیسے گزارا ہے۔''

چاچی اور چاچا اُنھیں تین سالوں تک سہارا دیے زندہ رہے پھر دو ماہ کے مختصر عرصے میں یکے بعد دیگرے دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ چاچی کو ہیضہ ہوا تھا۔ بروقت علاج نہ ہونے کے باعث وہ جانبر نہ ہو پائی۔ چاچا بالی کی نگاہوں کے سامنے بڑی اندوہ ناک موت کا شکار ہوا تھا۔ وہ اپنی دکان کے باہر بنچ پر بیٹھ کر چائے پی رہا تھا جب چار دُکانیں پرے پڑی ہوئی ہوا بھرنے والی ٹینکی زوردار آواز کے ساتھ پھٹ گئی۔ ٹینکی پر نصب شدہ پمپ گولی کی رفتار سے اُڑتا ہوا چاچا عبدالکریم کے سر میں لگا۔ اُسے چیخنے اور تڑپنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ بالی جب بھی اُس کی بات کرنے لگتا تو نگاہوں میں وہ خون آلود بنچ، وہ نہ سمجھ میں آنے والا ہنگام اور آنکھیں پوری وسعت میں کھولے لیٹا ہوا عبدالکریم لہرا جاتا اور وہ بے اختیار آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے بیٹھ جاتا تھا۔

بانو کو جہاں اور بہت سی باتیں یاد تھیں، وہیں چاچا اور چاچی کے رشتہ داروں کا لالچ بھرا درشت رویہ اور خون آشام نظریں بھی یاد تھیں۔ دکان، مکان اور گھر کا تمام تر سامان بانٹتے ہوئے بھوکے کتوں کی طرح ایک دوسرے پر غراتے ہوئے کتنے عجیب لگتے تھے۔ اُنھیں عبدالکریم کی فوتگی کی رسومات یاد نہیں تھیں، ایک ایک سامان یاد تھا۔ بالی اور بانو چاچا کی تدفین کے عین آٹھویں دِن ایک مرتبہ پھر بے آسرا ہو کر کھلے آسمان تلے کھڑے ہو گئے۔ بانو کو ہمسائے گھر میں چھوڑ کر بالی نئی لاٹھی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

دو تین دِنوں کی کوشش رنگ لائی اور اُسے آٹو مارکیٹ کی ایک ورکشاپ میں نوکری مل گئی۔ یہاں اُسے ویلڈنگ کا کام اور لیتھ مشین کی آپریٹنگ سیکھنے کا بہترین موقع میسر آیا۔ ورکشاپ میں کام کرنے والے کاریگروں اور شاگردوں نے مل کر ایک مکان کرایہ پر لے رکھا تھا۔ وہ بانو کو لے کر اِس مکان میں آ گیا۔ اُسے نسبتاً الگ کمرہ سونپ دیا گیا۔ اِس دوران بانو کو ہائی اسکول میں داخلہ مل گیا۔

ایک مہینے بعد اُسے چھوٹا سا مکان کرایہ پر مل گیا۔ مکان کی حالت اتنی اچھی نہیں تھی مگر کرایہ بہت معقول تھا۔ وہ بانو کو لے کر اِس مکان میں منتقل ہو گیا۔ دیکھنے میں مکان کے دو کمرے تھے، عملی طور پر ایک تھا کیونکہ ایک کمرے میں مالک مکان کا ذاتی سامان پڑا ہوا تھا اور دروازے پر بڑا سا قفل لٹک رہا تھا۔ ورکشاپ میں جوں جوں وہ اپنے متعلقہ امور میں مہارت حاصل کرتا جاتا تھا، تنخواہ میں آپوں آپ اضافہ ہوتا چلا جاتا تھا۔ نائیک نہایت عیاش فطرت اور جھگڑالو طبیعت واقع ہوا تھا مگر وہ اپنے ہاں کام کرنے والوں کا حق مارنا سخت گناہ خیال کرتا تھا۔ کبھی اپنی ترنگ میں ہوتا تو کھلے ہاتھوں ملازموں پر بے دریغ پیسہ خرچ کر دیا کرتا تھا۔

جن دِنوں بانو نے میٹرک کا امتحان دینے کے بعد کی فراغت پائی، اِنھی دِنوں میں نہ جانے کہاں پر بالی کے نائیک کی ہوس بھری نگاہ نے اُسے دیکھ لیا۔ اُس کی بے خبری میں پائنچہ پکڑ کر اُس کے گھر تک پہنچ آیا۔ جب اُسے پتہ چلا کہ وہ

بالی کی بہن ہے تو اُس نے اپنا انداز بدل لیا۔ یکا یک بالی پر بے حد مہربان ہو گیا۔ چند ہفتوں میں ہی اُس نے بالی کو اپنی انگلی پر ریشم کی ڈوری کی طرح لپیٹ لیا۔ پھر ایک دِن اُس نے بالی کو علیحدگی میں بیٹھا کر اپنا دستِ سوال دراز کر دیا۔ ''دیکھ بالی! لڑکیاں کانچ کے نازک برتن کی طرح ہوتی ہیں۔ سانسوں کے لمس سے بھی میلی ہو جاتی ہیں۔ تمھاری پوزیشن ویسے بھی خاصی ناگفتہ بہ ہے۔ تم سارا دِن دکان پر کام کرتے ہو، تمھاری جوان بہن گھر میں اکیلی رہتی ہے اور سارا محلہ تم دونوں کے معمولات سے بہ خوبی آگاہ ہے۔ کسی نے اپنے گندے پیر تمھارے آنگن میں رکھنے کی جرأت کر لی تو تم کہیں کے نہیں رہو گے۔''

نائیک رفیع اللہ کی بات کان پڑتے ہی آگ کا گولہ بن گئی۔ بالی کا سکون آن کی آن میں غارت ہو گیا۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''استاد! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''میں جو کہہ رہا ہوں، تم بخوبی سمجھ رہے ہو۔ اگر نہیں سمجھ رہے تو سمجھنے کی کوشش کرو ورنہ بہت بڑے نقصان سے دوچار ہو جاؤ گے۔ اپنی بہن کے ہاتھ پیلے کرنے کی سوچو، اُسے مزید پڑھانے اور گھر میں بیٹھانے کا خیال دِل سے نکال دو۔'' نائیک کا لہجہ بتدریج سختی پکڑتا جاتا تھا۔

''یہ کیسے ممکن ہے اُستاد؟'' بالی کا دِل بیٹھنے لگا تھا۔ ''میرے پاس اَبھی اتنی رقم نہیں ہے کہ اُس کی شادی کر سکوں۔ ویسے بھی اُس کی اَبھی شادی کی عمر نہیں ہے۔''

''تم بے وقوف آدمی ہو۔ اگر تمھارے ماں باپ زندہ ہوتے تو اُس کی شادی ہوئے کو سال بیت چکا ہوتا۔''

''مگر استاد......''

''کیا اگر مگر لگا رکھی ہے تم نے؟'' استاد نے محبت آمیز جھڑکی دی۔ ''کھل کر بات کرو، ہو سکتا ہے کہ میں اِس مشکل وقت میں تمھارے کام آ جاؤں۔ تم جانتے ہو کہ میں نے کبھی بھی تمھیں اپنا نوکر نہیں سمجھا۔ ہمیشہ اپنا چھوٹا بھائی خیال کرتا ہوں۔''

بالی نے ممنون انداز میں اُسے دیکھا، سچا پایا، تبھی پھوٹ پڑا۔ ''استاد! میرا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ اگر کوئی ہے بھی تو ماں باپ کے مرنے کے بعد میں نے اُس کی شکل تک نہیں دیکھی۔ ایسے میں کون مجھ سے رشتہ مانگے گا؟ اگر کسی نے مانگ بھی لیا تو میرے پاس منگنی بیاہ کے لیے پھوٹی کوڑی تک موجود نہیں ہے۔ بھلا خالی جیب اتنا بڑا کام کیسے کیا جا سکتا ہے؟''

نائیک گہری سوچ میں منہمک ہو گیا۔ اسکریو گیج کی عقبی ناب کو گھماتا رہا، اپنے منصوبے کو حتمی شکل دیتا رہا پھر کسی نتیجے پر پہنچ کر بڑے مہربان لہجے میں بولا۔ ''دیکھ بالی! تمھارے سامنے ایک نہیں، دو مسئلے سر اُٹھائے کھڑے ہیں۔ نہ صرف تمھاری بہن کی شادی ضروری ہے بلکہ تمھیں بھی اَب شادی کر لینا چاہیے۔ دُنیا بڑی عجیب ہے۔ دودھاری تلوار کی طرح گردن مارنے کے لیے ہر وقت بے تاب رہتی ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ تمھیں اور تمھاری بہن کو کوئی بھی اپنانے پر تیار نہیں ہوگا۔ لوگوں کے برعکس میں تمھاری حیثیت کو نہیں، تمھاری شرافت کو سامنے رکھ کر تم سے محبت کرتا ہوں۔ محبت کرنے اور اپنانے میں بہت فرق ہوتا ہے مگر محبت کرنے والا ہی اتنا بڑا قدم اُٹھا سکتا ہے۔ میں تمھاری بہن سے شادی کرنے پر تیار ہوں اور آنے والے وقت میں کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر تمھاری شادی بھی کر دوں گا۔ روپے پیسے کی تم کوئی فکر نہ کرو۔ تم دونوں کی شادیاں میں اپنی گرہ سے کروں گا۔''

بالی کو یوں محسوس ہوا جیسے نائیک نے پگھلا ہوا سیسہ اُس کے کانوں میں انڈیل دیا ہو۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر اُٹھا اور گھر آ کر لیٹ گیا۔ بانو کے بارہا دریافت کرنے پر بھی اُس نے ٹال دیا۔ اُسے رہ رہ کر اپنی کم مائیگی اور بے سروسامانی پر رونا آ رہا تھا۔ پھر نہ جانے کیسے وہ خود پر ضبط نہ رکھ سکا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بانو اُس کو چپ کرانے کی کوشش میں خود بھی رونے لگ گئی۔ دونوں رات بھر جاگتے رہے۔

اُس پر نائیک کا مہربان رویہ اپنا مقصد کھول چکا تھا۔ رفیع اللہ چالیس کے پیٹے میں تھا۔ تین بیٹوں اور ایک بیٹی کا باپ ہونے کے باوجود اُس کی بہن پر بُری نگاہیں گاڑے بیٹھا تھا۔ اگر چاہتا تو اُس پر تھوک کر چلا آتا مگر وہ جانتا تھا کہ وہ رفیع اللہ کے غیض وغضب کا سامنا کرنے کا یارا نہیں رکھتا تھا۔ نہ جانے کتنے اوباش فطرت لوگ رفیع اللہ کی مٹھی میں بند تھے جن کی مدد سے وہ بالی اور بانو کا جینا حرام کر سکتا تھا۔ اُس نے بانو کا سر اپنی گود میں رکھا، پیشانی کا بوسہ لیا اور گلوگیر لہجے میں بولا۔ ''چندا! ایک اور اندھی ہجرت کے لیے خود کو تیار رکھو۔ چند دِنوں میں ہی ہمیں یہاں سے بوریا بستر

لپیٹ کر رات کی تنہائی میں چل نکلنا ہوگا۔“

بالی نے آخر دم تک رفیع اللہ کو دھوکے میں رکھا تھا۔ ایک ٹرک ڈرائیور سے اُس کی سال بھر پرانی شناسائی تھی۔ اُسی کی مدد سے اُسے دوسرے صوبے کے ایک وسطی شہر میں نوکری اور رہائش میسر آ گئی۔ تین ماہ بعد اُسے چوروں کی طرح رفیع اللہ کے شہر میں آخری مرتبہ آنا پڑا۔ ہائی اسکول سے بانو کا رزلٹ کارڈ اور کریکٹر سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے بعد اُس نے زندگی بھر یہاں کا رُخ نہیں کیا۔ اُس نے کئی مہینوں کے بعد بانو کے اصرار پر اُسے تائیک رفیع اللہ کی خواہش کے بارے میں بتلایا تھا۔

نئے شہر میں اُس کی تنخواہ پہلے سے زیادہ تھی۔ معقول کرایہ پر ملنے والے مکان کی حالت بھی کافی بہتر تھی۔ یہاں سوئی گیس کا کنکشن بھی موجود تھا۔ گرلز کالج گھر سے چند منٹوں کے فاصلے پر واقع تھا۔ بانو نے میٹرک کے امتحان میں اچھے نمبر حاصل کیے تھے جس کی وجہ سے اُسے بغیر کسی دِقت کے داخلہ مل گیا۔ یہیں اُس نے اپنا شناختی کارڈ بنوایا۔ رفیع اللہ کی مداخلت سے زندگی کے الجھنے والے قدموں نے پھر تسلسل پکڑ لیا تھا۔

ورکشاپ کا مالک، محمد رمضان جسے پوری مارکیٹ استاد جاناں کہہ کر پکارتی تھی، دیکھنے میں بستہ بے کا پکا بدمعاش تھا مگر حقیقت میں اپنے حلیے سے قطعی برعکس نہایت شریف النفس انسان تھا۔ اتفاق سے بالی کو جو مکان کرایہ پر ملا، وہ استاد جاناں کے محلے میں ہی واقع تھا۔ دو تین ہفتوں میں ہی استاد نے اُسے اور بانو کو اپنے گھر کا فرد بنالیا۔ اُس کی بیوی اور بچے بھی اُن کے ساتھ بہت کم وقت میں مانوس ہوگئے۔ پانچ بچوں میں سے ایک بیٹا اور بڑی بیٹی جوانی کی دہلیز پر پاؤں رکھے کھڑے تھے۔ بانو اور بالی کا اِس بات پر اتفاق تھا کہ اُن کی زندگی کا بہترین وقت اس سادہ لوح خاندان کی معیت میں گزرا تھا۔

رفتہ رفتہ گھلتے ملتے وہ ایک دوسرے پر کھل گئے۔ ایک دِن چاچی نے بالی اور بانو کے سامنے اپنا دِل کھول کر رکھ دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ بانو کو بہو اور بالی کو اپنا داماد بنالے۔ دونوں نے سوچنے کے لیے کچھ وقت طلب کیا۔ اپنی تنہائی میں بیٹھ کر شرمائی لجائی بانو سے بالی نے بڑے پیار سے پوچھا۔ ”ہمارا کوئی ہوتا تو شاید میں تم سے یہ سوال کبھی نہ کرتا۔ مجبوراً پوچھ رہا ہوں کہ تمھیں یہ گھر کیسا لگتا ہے؟“

سوال براہِ راست نہیں کیا گیا تھا۔ اُس نے جواب بھی گھما پھرا کر دیا۔ ”بھائی! میرے لیے اِس سے بڑھ کر خوشی کی بات کیا ہوگی کہ میرے بھائی کی شادی اچھی جگہ پر ہوجائے۔“

بالی نے آنے والے کئی روز سوچنے میں بتادیے۔ چاچی نے پھر بات چھیڑی تو اُس نے بڑی سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”چاچی! بانو ابھی کم عمر ہے۔ اسی سال کالج میں گئی ہے، اُسے دو تین سال تک مزید پڑھانا چاہتا ہوں تاکہ وہ کسی نوکری کے قابل ہوجائے۔ زندگی میں حالات کے بدلنے میں دیر نہیں لگتی۔ نوکری پر لگ جائے گی تو آڑے وقت میں وہ چولھا جلائے رکھنے کے قابل ہوجائے گی۔ اگر آپ چاہیں تو میری اور بانو کی منگنی کردیں۔ چند سالوں کے بعد جب میں اُسے رخصت کرنے کے قابل ہوجاؤں گا، وداع کردوں گا۔“

چاچی نے اُسے قائل کرنے کی بہتیری کوشش کی مگر اُس کا جواب جوں کا توں رہا۔ چاچی نے اپنے میاں سے مشورہ کرنے کے بعد اُس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے پتر! میں تمھاری بات مان لیتی ہوں۔ بانو کی عمر شادی کی ہے مگر تم کہتے ہو تو میں دو چار سال انتظار کرلیتی ہوں مگر تمھاری شادی میں سال کے اندر اندر کردوں گی۔ تمھیں اِس پر تو کوئی اعتراض نہیں ہے ناں؟“

وہ استاد جاناں کے خاندان کے خلوص کا تہہ دِل سے قائل ہوگیا۔ اُس نے ہامی بھرلی۔ دس پندرہ دِنوں کے بعد منگنی کے کچے دھاگوں میں چاروں جوانیوں کو باندھ دیا گیا۔ بانو کو اضطراب بھری لمبی راتیں بہ خوبی یاد تھیں جن کی طویل تنہائی میں وہ بالی سے چھپ چھپ کر روتی رہتی تھی۔ وہ شادی کے خیال سے ہی خوفزدہ ہوگئی تھی۔ وٹہ سٹہ کی شادیوں کے نتائج کے بارے میں اُس نے کافی حوصلہ شکن باتیں سن رکھی تھیں۔ دل ڈرتا تھا۔ اپنے واہموں پر چادر ڈالنے کے لیے اُس نے یہی سوچا تھا کہ اُسے کسی نہ کسی گھر میں جانا ہی ہوگا، پھر اُس کے جانے پر اگر اُس کے بھائی کا گھر بس جائے تو کتنی اچھی بات ہوگی۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اُس کے اندیشے دم توڑتے گئے۔ اُسے اور بالی کو اتنی پذیرائی اور محبت ملی کہ وہ شب و روز خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرنے لگی۔ پہلے اُس کا بالی کے علاوہ کوئی بھی اپنا نہیں تھا، ایک انگوٹھی نے انگلی سے پکڑ کر کئی اپنوں کے درمیان لا کھڑا کیا تھا۔ خوشیوں کے جھولے میں جھولتے جھولتے سال کا عرصہ پلک جھپکنے کی سی دیر میں گزر گیا۔ چاچی نے بنا بتلائے اپنی بیٹی کی شادی کی تیاریاں شروع کردی تھیں۔

وقت کا ساگر اِسی بہاؤ میں بہتا رہتا تو زندگی سے کوئی گلہ نہ رہتا مگر جیسے ہر صبح کی چمک کو سیاہ شام نگل لیتی ہے، ایسے ہی اُن کی خوشیوں کو بھی گہنا دیا گیا۔ ایک دن بالی ورکشاپ میں لیتھ مشین پر کام کر رہا تھا جب پیلے دانتوں والا ایک سیاہ فام ڈرائیور اپنے ٹرک سے اُتر کر دکان میں داخل ہوا۔ بالی کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس نے نووارد کو پہلے بھی کہیں دیکھ رکھا ہے۔ کہاں؟ یہ یاد نہ آیا۔ وہ اُس پر ایک نگاہ ڈال کر ورکشاپ کے عقبی حصے میں استاد کے پاس چلا گیا۔ بڑے پائیوں والی چارپائی پر استاد کے پہلو میں بیٹھ کر اُس نے متعدد بار ناقدانہ نگاہوں سے بالی کو دیکھا۔ شاید وہ بھی پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالی نے کچھ دیر تک اُس کے بارے میں سوچا پھر سر جھٹک کر اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ ورکشاپ کی دُنیا ایسی ہی ہوتی ہے۔ اَن گنت اجنبی ملتے ہیں، شناسائی کا مرحلہ طے کرتے ہی بچھڑ جاتے ہیں۔ اُن میں سے کوئی زندگی کے کسی موڑ پر مل جاتا ہے، کوئی زندگی بھر دکھائی نہیں دیتا۔ وہ بھی شاید کوئی پرانا گاہک تھا جو اپنے ٹرک کے انجن کا چھوٹا موٹا کام کروانے کے بعد رخصت ہوگیا۔

خلافِ معمول اُس کے جانے کے فوراً بعد استاد جاناں بھی دکان سے نکل گیا۔ لیتھ مشین دکان کے بیرونی حصے میں رکھی ہوئی تھی۔ دکان سے نکلنے والا یا داخل ہونے والا بالی کے سامنے سے گزرتا تھا۔ اُس نے استاد کو سست قدموں سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ استاد کے چہرے پر شدید پریشانی کے تاثرات دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ اُس کے جانے پر کچھ دیر تک استاد کے بنا بتلائے دکان سے جانے کے بارے میں سوچتا رہا پھر اپنے کام میں جُت گیا۔ جوں جوں شام ہوتی جاتی تھی، دل کو گھبراہٹ لاحق ہوتی جاتی تھی۔ کوئی بے معانی بے قراری دماغ کو اپنی لپیٹ میں لیتی جاتی تھی۔

گھر پہنچا تو اُستاد کے چھوٹے بیٹے کو اپنا منتظر پایا۔ وہ اُسے لینے کے لیے آیا تھا۔ وہ کھانا کھائے بغیر اُس کے ساتھ استاد کے گھر میں چلا آیا۔ اُس نے سرسری نظر میں ہی بھانپ لیا تھا کہ گھر کا ماحول خاصا بدلا ہوا تھا۔ استاد اُسے لے کر علیحدہ کمرے میں چلا گیا۔

اِس سے پہلے بانو ڈھلتی شام میں وہاں گئی تھی۔ اُس نے بھی سبھی گھر والوں کا رویہ کھنچا ہوا پایا تھا۔ بالی کو بلائے جانے پر اُس کا دِل گھبرانے لگا تھا۔ دروازے پر نظریں جمائے بالی کے آنے تک گُنگ بیٹھی رہی۔ جب بالی گھر میں داخل ہوا تو وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوگئی۔ بالی کے سُتے ہوئے چہرے پر نگاہ ڈال کر کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”سوہنا رَب خیر کرے!“

بالی نے آزردہ لہجے میں زیرِ لب کہا ”سوہنا رَب خیر کرتا ہے، رَب کو ماننے والے خیر نہیں کرتے۔“

اپنی عادت کے مطابق اُس نے بانو کو استاد جاناں کے ساتھ تنہائی میں ہونے والی بات کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ نصف شب تک ضد کرتی رہی، پھر سسکتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”میں کب تک سامان باندھ لوں؟“

بالی چونک کر پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا۔ دکھ سے دِل بھر آیا۔ جس معصوم کو وہ دُنیا کی ہر تندی و تیزی سے بچاتا آ رہا تھا، حالات نے اُس کے دل میں کتنے بھیانک اندیشے بھر دیے تھے۔ وہ سر جھکا کر بولا۔ ”بانو! یہاں پر بھی اپنا دانہ پانی ختم ہوگیا ہے مگر اِس مرتبہ ہم چوروں کی طرح نہیں بھاگیں گے بلکہ دِن کے اُجالے میں رختِ سفر باندھیں گے۔“

بولتے بولتے گلا رُندھ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بانو اُس کے سینے میں چہرہ چھپائے سسکنے لگی۔ اُس رات کے بعد آج تک اُس نے بالی سے استاد جاناں کی ورکشاپ چھوڑنے کی وجہ دریافت نہیں کی تھی اور نہ ہی یہ پوچھا تھا کہ گھر بسنے سے پہلے اُجڑ کیوں گیا؟

وہ موڑھے پر بیٹھے بیٹھے تھک گئی۔ ماضی کے پُر اندوہ خیالات کے حصار سے نکلی تو اُسے اپنی آنکھوں سے اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کا احساس ہوا۔ وہ ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں پونچھتی ہوئی نڈھال قدموں سے چلتے ہوئے کمرے میں آ گئی۔ بالی نیند میں مستغرق تھا۔ موڑھا اپنی جگہ پر رکھنے کے بعد چارپائی پر لیٹ گئی۔ اُس کا ماضی اتنا غم بار تھا کہ اُس کے مستقبل کے سنہرے خوابوں کو بھی آنِ واحد میں

نکل گیا تھا۔

☆☆☆

ٹاٹ میں مخمل کا پیوند مشکل سے لگتا ہے مگر ٹاٹ کی روزن سے جھانکنے پر مخمل کا دکھائی دینا تعجب کا باعث نہیں ہوتا۔ بالی کو گھر کے کھلے دروازے کے باہر عینی کھڑی دکھائی دی تو بانو کو آواز دے کر متوجہ کرتے ہوئے جلدی سے باتھ روم میں گھس گیا۔ بانو نے کمرے سے نکل کر دیکھا۔ کچھ دکھائی نہیں دیا۔ کچھ سجھائی نہیں دیا تو دہلیز پر تھم گئی۔ پھر دروازہ عبور کر کے اپنی جانب آتی ہوئی عینی دکھائی دی تو بری طرح گھبرا گئی۔ اُس کا اتنی صبح میں یوں منہ اُٹھائے چلے آنا بے سبب ہرگز نہیں ہوسکتا تھا۔ دل پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''خیر تو ہے ناں!''

وہ مسکرائی۔ ''کیا میرا آنا کڑے وقت کی دلیل ہے؟''

وہ شرمندہ ہو کر بولی۔ ''نہیں عینی! دراصل مجھے تمھاری بن بتلائے آمد پر حیرانی ہوئی ہے۔''

''تم نے فون بند کر رکھا ہے ورنہ میں اطلاع دے کر آتی۔'' عینی نے کہا اور اُسے ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوگئی۔ کچھ بھی اُس کے شایانِ شان نہیں تھا مگر اُسے جیسے پروا نہیں تھی۔ بڑی بے تکلفی سے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''گھر آئے مہمان کو، خواہ جیسا بھی ہو، چائے پانی پوچھا جاتا ہے۔ اگر مہمان خوب صورت اور وضع دار ہو تو پوچھے بغیر خدمت خاطر شروع کر دی جاتی ہے۔''

وہ سنبھل کر چائے بنانے لگی۔ ساتھ ساتھ باتیں بھی کرنے لگی۔ عینی کی شرارت بھری نظروں سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ اپنے ہی کمرے میں اجنبیت محسوس کرنے لگی تھی۔ عینی چوکی گھسیٹ کر اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''کیا تمھاری ماں تمھاری طرح بہت خوب صورت تھی؟''

وہ چونکی۔ ''پتہ نہیں۔ مجھے اُس کی شکل یاد نہیں ہے۔''

''کیا تمھارا باپ بالی کی طرح 'اچھا بھلا' تھا؟'' عینی نے اچھا بھلا پر زور دیتے ہوئے کہا کیونکہ بانو عموماً اُس کے طنز کے جواب میں بالی کو 'اچھا بھلا' قرار دیا کرتی تھی۔

ایک شکوہ کناں نگاہ اُس پر ڈالتے ہوئے بولی۔ ''میرے شعور میں باپ کی شبیہہ بھی کبھی نہیں اُبھری۔ نہ جانے کیسا تھا؟ شاید بالی کے جیسا ہی تھا۔''

''کیا تمھارے پاس ماں باپ میں سے کسی کا فوٹو بھی نہیں ہے؟''

''نہیں۔''

''کسی رشتہ دار کے پاس بھی نہیں ہے؟''

''ہمارا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔'' وہ یاس بھرے لہجے میں بولی۔

''تمھارے ماں باپ جہاں رہتے تھے، وہاں رہنے والوں نے بھی تمھیں اُن کے بارے میں کچھ نہیں بتلایا؟'' عینی نے کریدا۔

وہ کوئی جواب دیے بغیر پیالیوں میں چائے انڈیلنے لگی۔

''بالی تم سے کتنا بڑا ہے؟''

''چھ یا سات سال!''

''اُسے بھی کچھ یاد نہیں؟''

''نہیں۔ اگر اُس کے ذہن میں کچھ نقش ہے بھی تو وہ بتلانے سے قاصر ہے۔'' بانو نے جواب دیا۔ ''میرا دماغ مت چاٹو اور چائے پیو۔''

''میرا خیال ہے کہ بالی کی شادی اَب تک ہو جانی چاہیے تھی۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔''

''تو پھر اَب تک ہوئی کیوں نہیں؟'' عینی چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولی۔

''کیا سب کچھ آج ہی پوچھنے کا ارادہ لے کر آئی ہو؟'' بانو نے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''کیا گاڑی میں آئی ہو؟''

''تو کیا سائیکل پر آتی؟'' وہ ہنسی۔ ''ڈرائیور کو مین روڈ پر کھڑا کر کے آئی ہوں۔ اِس گلی میں کار تو درکنار، شاید رکشا بھی نہیں آسکتا۔''

''عینی! ایک بات کہوں؟''

''کہو!''

''تم یہاں مت آیا کرو۔'' بانو نے بہ دقت تمام کہا۔

''کیوں؟'' عینی کے خوب صورت چہرے پر تحیر ثبت ہوگیا۔ ''کیا میں بُری لڑکی ہوں کہ تمھیں بُری راہ پر لگا دوں گی یا سماج میں بدنام کر دوں گی؟''

وہ گھبرا کر بولی۔ ''نہیں پلیز! میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ تم آسمان ہو، میں زمین ہوں۔ یہاں کے لوگوں نے

کبھی زمین وآسمان کا ملاپ نہیں دیکھا، دیکھ کر دانتوں تلے انگلیاں کاٹ بیٹھیں گے اور......''

''اور تمھیں محلے داروں کی انگلیاں بہت عزیز ہیں...... مجھ سے بھی زیادہ...... ہیں؟ یہی بات ہے ناں!'' عینی کے چہرے پر خفگی کے تاثرات مترشح ہونے لگے۔

''مم...... میرا کہنے کا مطلب ہے کہ اگر کسی نے تمھارے پاپا اور بھیا کو بتلا دیا تو بہت غلط ہوگا۔'' بانو نے بے چارگی سے کہا۔

''اوہ نو ڈارلنگ!'' عینی نے گہرا سانس سینے میں کھینچتے ہوئے کہا۔ ''پاپا یا میرے خاندان کے کسی بھی فرد کے پاس اتنا وقت نہیں کہ ایرے غیروں کی فضول باتوں کو سنتا پھرے۔ بالی باتھ روم سے نکل رہا ہے، چلو کالج چلیں۔ آج میں تمھیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔ کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔''

''مگر میں نے تو اَبھی تک بالی کو ناشتہ بھی نہیں کروایا۔ خود بھی نہیں کیا۔ تم چلو، میں بالی کے ساتھ آجاؤں گی۔'' بانو نے جلدی سے کہا۔

بالی نے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اپنے بالائی نصف عریاں وجود کو تولیے میں لپیٹ لیا تھا۔ یہ احتیاط اُس نے عینی کی موجودگی کے باعث برتی تھی۔ کھونٹی پر لٹکتی ہوئی میل بھری شلوار قمیص اُتار کر دوبارہ باتھ روم میں گھس گیا۔ واپس آنے پر مؤدبانہ انداز میں عینی کو سلام کرنے کے بعد اُس کی جانب پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔ عینی بانو کو فوراً چل پڑنے پر اصرار کر رہی تھی جبکہ وہ بالی کو ناشتہ کرانے کا بہانہ کر رہی تھی۔

اُس نے تصفیہ کراتے ہوئے کہا۔ ''بانو! اپنی سہیلی کے ساتھ چلی جاؤ، میں ورکشاپ پر ناشتہ منگوالوں گا۔''

بانو نے جلدی جلدی تیاری کی اور عینی کے ساتھ گھر سے نکل آئی۔ تنگ گلیوں سے نکل کر مین روڈ پر آئی۔ عینی نے لمبا سانس پھیپھڑوں میں اُتارتے ہوئے نخوت سے کہا۔

''یار! اِن تنگ گلیوں میں تو دم گھٹنے لگتا ہے۔''

وہ شرمندگی سے گویا ہوئی۔ ''دم ہے تو گھٹتا ہے، ہمارے سینے میں تو شاید دم ہی نہیں ہے۔''

عینی نے اُس کا ہاتھ تھاما اور اُس پر یک لخت چھا جانے والی قنوطیت کو نظر انداز کرتے ہوئے کار میں بیٹھ گئی۔ بانو کو چند لمحے پیشتر اپنا کہا نامعتبر لگنے لگا۔ دم نہ ہوتے ہوئے بھی سینے میں گھٹن سی محسوس ہونے لگی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ڈرائیور کی بجائے شہزاد بیٹھا ہوا تھا جو عقب نما پر نظریں جمائے اُسے وفورِ شوق سے دیکھ رہا تھا۔ اُس سے نگاہیں چُرا کر بانو نے شکایت بھری نظروں سے عینی کو دیکھا جو نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبائے لاتعلق سی بیٹھی اپنی مخروطی انگلیوں کو دیکھ رہی تھی۔

کن اکھیوں سے تلملاتی ہوئی بانو کو دیکھ کر عام سے لہجے میں بولی۔ ''کار چلانے والے کو ڈرائیور ہی کہتے ہیں ناں؟''

وہ دانت کچکچا کر رہ گئی۔ شہزاد موجود نہ ہوتا تو اُس کے خوب لتے لیتی۔ شہزاد نے کالج پہنچنے تک کوئی معیوب حرکت نہیں کی۔

وہ گیٹ کھول کر اُترنے لگی تو شہزاد نے گردن موڑ کر کہا۔ ''خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے مگر شاید عینی کا رنگ بہت پکا ہے، اتنے عرصے میں بھی نہیں اُترا۔''

وہ ٹھٹک گئی۔ تعجب آمیز لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ''میں سمجھی نہیں!''

''عینی بہت باتونی لڑکی ہے جبکہ تم نے سارے راستے میں کوئی بات نہیں کی۔ اِس کا ایک ہی مطلب ہے کہ تم کم گو لڑکی ہو۔'' شہزاد کا لہجہ بہت دل آویز تھا۔ چپ ہونے پر بھی یوں لگتا تھا جیسے اَبھی تک بول رہا ہے۔ عینی پر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ عجلت میں اُتری اور عینی کی پروا کیے بغیر کالج کا گیٹ عبور کر گئی۔ عینی بھاگ کر اُس کے پہلو میں پہنچی۔ ہاتھ پکڑ کر روکتے ہوئے بولی۔ ''اے! تمھارے پیچھے پولیس نہیں، محترمہ قراۃ العین صاحبہ لگی ہوئی۔ آہستہ چلو، میرا سانس پھولنے لگا ہے۔''

وہ جھینپ کر رُک گئی پھر سست قدموں سے چلنے لگی۔ عینی بول رہی تھی۔ ''بھیا بہت اچھا انسان ہے۔ میں اُس کی آنکھوں میں تمھارے لیے پسندیدگی دیکھتی ہوں تو میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔ اُس کے انتخاب کی داد دیتی ہوں۔ ہائے! قربان جاؤں اُس جذبے پر جو بھیا کے دِل میں تمھیں دیکھنے کے بعد پیدا ہوا۔ ہائے! میرے جان و دل نثار اِس سوہنی پر جو اپنے مہینوال کے لیے گھڑوں پر بھی بھروسہ کرنے کو تیار نہیں ہے......''

''بکواس نہ کرو عینی! تمھیں اپنے کہے لفظوں کی ہلاکت خیزی کا علم نہیں ہے۔ میں ایسی نہیں ہوں کہ چمکتی ہوئی شے کو

دیکھ کر اُٹھانے کے لیے جھک جاؤں اور دُنیا کی نظروں میں گر جاؤں۔ وہ بہت اچھا ہے، اُسے اچھا ہونا بھی چاہیے مگر اُس کی بہن کو ایک حد میں رہنا چاہیے۔ مجھے اپنی حد میں رہنا چاہیے۔" بانو کے لہجے میں درشتی ہرگز نہیں تھی بلکہ عجیب سی بے بسی رچی ہوئی تھی جسے کوئی عنوان نہیں سونپا جاسکتا تھا۔

عینی رُک گئی۔ چند لمحوں تک کھڑی اُس کی نقاب سے جھانکتی خوب صورت آنکھوں میں لرزاں اندیشوں اور خوف کی پرچھائیوں کو دیکھتی رہی، پھر اُس کا ہاتھ پکڑ کر کنٹین کی طرف بڑھ گئی۔ دونوں نے آج کی صبح میں ناشتہ نہیں کیا تھا۔

روبرو بیٹھ کر دونوں اپنے اپنے حصے کی سوچوں سے نبرد آزما ہوگئیں۔ بانو نے گفتگو میں پہل کی۔ "عینی! تم بڑے گھر کی بڑی بیٹی ہو، لاڈ کرو تو تم پر سجتا ہے، بات کرو تو ہر کوئی سنتا ہے، مذاق کرو تو دُنیا کھلکھلا کر ہنسنے لگتی ہے اور آنسو بہانے پہ آؤ تو زمانہ بہہ جانے کو بے تاب ہوجاتا ہے۔ میں، جس کے پاس کچھ بھی نہیں سوائے ایک بھائی کے، جس کی زندگی شام کے دھندلکے سے شروع ہوکر چراغوں کے ساتھ تمام ہوجانے کے لیے بنائی گئی ہو، تمھاری تضحیک کو اپنی عادت سے مجبور ہوکر سیدھا دِل پر لیتی ہوں۔ دل میں سوراخوں کی پہلے بھی کوئی کمی نہیں، تمھارے لفظوں کے چھید کو برداشت نہیں کر پاؤں گی، مر جاؤں گی۔ نہ جانے، جانتے بوجھتے ہوئے تم ایسا کیوں کرتی ہو؟"

عینی اُسے ایک ٹک دیکھتی رہی۔

بانو کا لہجہ گلوگیر ہوگیا۔ "تمھیں اپنے کھلنڈرے پن میں وہ جذبہ دکھائی نہیں دیتا جو میرے قلب میں تمھارے اور تمھارے خاندان کے لیے موجزن رہتا ہے۔ تمھیں اُس جذبۂ تشکر کی آگہی حاصل نہیں جو تمھارے التفات کے باعث میری آنکھوں میں تیرتا رہتا ہے۔ تمھاری اور میری حیثیتوں میں اتنا تفاوت ہے کہ تم لاکھ خلوصِ دل سے اپنے بھائی کے جذبات کی ترجمانی کرو، میں یہی سمجھوں گی کہ وہ میرے ساتھ فلرٹ کررہا ہے۔ تمھاری محبت کی قیمت وصول کرنا چاہتا ہے۔ تم بہن بھائی سیڑھیاں اُتر کر میری جانب مت بڑھو، میں بہت نیچے ہوں اور مزید نیچے اُترنا نہیں چاہتی۔ عینی پلیز! میں تو محض اتنا جانتی ہوں کہ جس انسان کو قدرت نے جہاں رکھا ہے، اُسے وہیں رہنا چاہیے۔"

عینی مداخلت کیے بغیر بڑے غور سے اُس کی تقریر سن رہی تھی۔ بانو نے سانس لیا، بولی۔ "میں کیا ہوں؟ تم جانتی ہو۔ میری اوقات کیا ہے؟ تم نہیں جانتیں۔ تم نے پوچھا تھا کہ بالی کی شادی کیوں نہیں ہوئی۔ سنو! اُس کے پاس کیا ہے جس کی بدولت کوئی اُسے اپنی بیٹی کا ہاتھ تھمادے؟ تم کہتی ہو کہ وہ بدصورت ہے، میں کہتی ہوں کہ وہ خالی ہاتھ اور اَن پڑھ ہے۔ رشتہ کروانے والیاں کہتی ہیں کہ تمھارے بھائی کے پاس نہ تو دولت ہے، نہ شکل، نہ گھربار اور نہ ہی اُس کا مستقبل روشن دکھائی دیتا ہے، پھر ہم کس مان پر لڑکی والوں کے آگے جھولی پھیلائیں۔ وہ لڑکی والوں کو ایسا کوئی باغ نہیں دکھاسکتیں جس پر باتوں سے سبز رنگ پھیرا جاسکتا ہو۔ کوئی کہتا ہے کہ بالی کے بدن کی سیاہی اُس کی چاند جیسی بیٹی کی زندگی کو میلا کردے گی۔ کوئی کہتا ہے کہ کرایہ دار مہاجروں کی سی زندگی گزارتا ہے۔ آج یہاں، کل وہاں۔ ہم اپنی بیٹی کو ابنِ بطوطہ کے حوالے کیسے کرسکتے ہیں؟ کسی کو یہ خوف لاحق ہے کہ اِس کا نہ کوئی آگے نہ پیچھے، کل کلاں کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو کون ذمہ دار ہوگا۔ میں نے اَن گنت باتیں سن رکھی ہیں۔ تم بتلاؤ! وہ جیسا بھی ہے، میری نظر میں اُس سے خوب صورت کوئی اور ہوسکتا ہے؟ کیا کبھی کسی بہن نے اپنے بھائی کو بدصورت اور میلا کچیلا سمجھا ہے؟"

ایک لایعنی سی مسکراہٹ عینی کے لبوں پر ساکت ہوگئی۔

بانو نے جھنجلا کر کہا۔ "کیا تم میری بکواس نہیں سن رہی ہو؟"

"میں بڑے خشوع وخضوع سے تمھاری بے تکی بکواس سن رہی ہوں اور بیچ میں دخل بھی نہیں دے رہی ہوں۔ پورے شوق سے بکتی رہو، میں سنتی رہوں گی۔"

بانو کی آنکھیں شعلہ بار ہوگئیں۔ دانت پیس کر خاموش ہوگئی۔ اسی اثنا میں ویٹر نے ٹیبل سجادی۔ عینی دل آویز مسکراہٹ کے جلو میں بڑے مدھم لہجے میں گنگنانے لگی۔

"ریت کے نیچے جَل کی دھارا، ہر ساگر کا یہاں کنارا، راتوں کے آنچل میں چھپا ہے سورج پیارا......"

ناشتہ کرنے کے بعد عینی نے کہا۔ "اگر تمھاری تقریر ختم ہوگئی ہو تو میں بھی کچھ کہنے کی جسارت کروں؟"

بانو ٹشو پیپر سے انگلیاں صاف کرتے ہوئے بولی۔ "تمھارے پاس سوائے گنگنانے کے کچھ بھی نہیں ہے۔"

"اور تم پر کلام نرم ونازک بیکار جاتا ہے۔ ہیں ناں!" عینی نے آنکھیں نچائیں۔ "تم نے بالی کے بارے میں

بہت کچھ بتلادیا، میں نے توجہ کے ساتھ سُن کر مان لیا۔ اَب جرأت کرتے ہوئے اپنی شخصیت پر بھی چار حرف بھیج دو۔"

وہ برانگیختہ ہوگئی۔ "میری شخصیت چار حرفوں کے اہل بھی نہیں ہے۔"

"میرے پاس سوائے تمھارے ریمارکس پر یقین کرنے کے کوئی چارہ نہیں اور کچھ؟" عینی نہ جانے آج دِل میں کیا ارادہ پختہ کیے بیٹھی تھی، اُس کی ناراضی کی پروا کیے بغیر مسلسل کچوکے دیتی جاتی تھی۔

وہ ناراض ہوکر کھڑی ہوگئی۔ عینی نے لپک کر ہاتھ پکڑا اور کرسی میں بیٹھا دیا۔ بولی۔ "کم آن ڈارلنگ! تمھاری زبان سے کہیں اچھا تمھارا بدن بولتا ہے۔ خاموش رہو، مجھے سننے دو۔"

"سنتی رہو، میں کلاس میں جارہی ہوں۔" وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں چیخی۔

"جسٹ اے منٹ پلیز!" عینی کے لبوں پر مسکراہٹ دَم توڑ گئی۔ وہ لحظہ بھر کو رُکی پھر سنجیدگی کے ساتھ مخاطب ہوئی۔ "تم اپنے بارے میں سوائے جھوٹ کے کچھ بھی بول نہیں سکتی ہو میری جان! میں جانتی ہوں۔ تم جو کچھ نہیں جاننا چاہتی ہو، میں بتلاتی ہوں۔ تم کیا ہو؟ نرم اور پُرگداز ماس سے بنی ہوئی ایک لڑکی......بس! ایسی کروڑوں لڑکیاں دُنیا میں موجود ہیں۔ ایسی اَن گنت جوانیاں کہانیاں بن کر تحلیل ہوگئیں۔ تم کیا ہو؟ اچھے مستقبل کی متلاشی کالج کی ایک لڑکی......بس! صرف اِسی کالج میں سیکڑوں لڑکیاں کتابیں اُٹھائے آتی ہیں اور علم کی تھکن چہرے پر سجائے گھروں کو لوٹ جاتی ہیں۔ تم کیا ہو؟ بہت محبت کرنے والے بھائی کی اکلوتی بہن......بس! میری ماما کے دو بھائی ہیں جو ماما کی شادی سے پہلے اُن پر جان چھڑکتے تھے۔ پاپا کی دو بہنیں تھیں جو انھیں آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھیں۔ اَب سب لوگ ایک دوسرے کو فون پر عید کی مبارک باد دیتے ہیں۔ ایسے اَن گنت بھائی دُنیا میں موجود ہیں جو بال بچوں کے بکھیڑوں میں پڑ کر بہنوں کو یکسر فراموش کر بیٹھے ہیں۔"

بانو نے جلدی سے کہا۔ "مگر میں اور بالی ایسے نہیں ہیں۔"

"ہاں! تم واقعی ایسے نہیں ہو کیوں کہ تم اِس دُنیا کے انسان نہیں، کوئی ماورائی مخلوق ہو۔ مانتی ہوں مگر پورا زمانہ اِس بیان کو جھوٹ سے تعبیر کرتا ہے۔ مس رضیہ بانو! یہ سچ ہے کہ تم بھی لاکھوں ہزار لوگوں جیسی ہی ہو۔ اپنی ذات پر سِپست چڑھا کر خود کو بہت محفوظ خیال کرتی ہو۔ خوش خیالی کا شکار ہو۔ تمھیں ہر عورت کی طرح پھولوں کے بیچ سیج پر سجنا ہے۔ تمھیں ماتھے پر جھومر باندھ کر کسی ماتھے کا جھومر بننا ہے۔ جیسے تم اوروں سے مختلف نہیں ہو، ایسے ہی دوسری تمام لڑکیاں بھی تم سے مختلف نہیں ہیں۔ ہر ایک کی فزیبلٹی رپورٹ ایک جیسی ہی ہے۔ پھر اگر میں، میرا بھائی یا میرا خاندان تجھے محبت دیتا ہے، تجھے زمین سے اُٹھا کر آسمان تک پہنچانا چاہتا ہے تو تمھیں ہماری یہ محبت تضحیک کیوں دکھائی دیتی ہے؟ تمھیں میری محبت پر بھروسہ کیوں نہیں ہے؟ صرف اِس لیے کہ تم نامکمل ہو، تم خام ہو کیوں کہ تم کسی سے محبت نہیں کرتی ہو۔ تم نے کبھی بغیر ساز کے کوئی گیت سنا ہے؟ نہیں سنا......کبھی سننا۔ بالکل تمھارے جیسا پھیکا اور سپاٹ ہوتا ہے۔"

بانو، عینی کو اپنی ذات کی دھجیاں اُڑاتے ہوئے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بات کو بڑھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "بھیا کے لیے رشتوں کی کوئی کمی نہیں ہے، خاندان میں بھی اُس کی گنجائش موجود ہے مگر کیا ہے کہ وہ اُس خوش گلو کا متلاشی ہے جس کے پاس ساز نہ ہو اور وہ ساز بن کر اُس کی مدھر آواز کو اپنے اندر سمولے۔ میں نے آج تک تمھیں نہیں دیکھا، میرے چہرے پر بھیا کی آنکھیں تمھیں دیکھتی اور سراہتی آئی ہیں۔ میں نے پہلے دِن سے ہی یہ خواب اپنی آنکھوں کو دکھانا شروع کردیا تھا کہ تم میری بھابھی بن کر ہمیشہ میری نظروں کے سامنے رہو گی۔ یہ غلطی میری ہے کہ میں نے بھیا کے سامنے تمھاری تعریفوں کے لمبے چوڑے پُل باندھے اور وہ اُن پلوں پر چلتا ہوا تم تک پہنچ گیا۔ تم بلاجواز پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی ایک ہی ہلے میں گزارنا چاہتی ہو۔ کھل کر کہتی ہوں، سمجھو یا نہ سمجھو، میرا بھیا تمھیں پسند کرنے لگا ہے۔ اُس نے بلاجھجک مجھے اپنی دِلی کیفیت سے آگاہ کردیا ہے اور یہ بھی سن لو کہ میں اپنے بھیا کی یہ خواہش ضرور پوری کروں گی۔ چلو، کلاس میں چلتے ہیں!"

وہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑی ہوئی اور بانو پر ایک نگاہِ سرد ڈال کر کنٹین سے نکلتی چلی گئی۔ اُس نے یہ پروا نہیں کی تھی کہ

بانو اُس کے پیچھے آ رہی ہے یا کرسی میں بیٹھی رہی ہے۔ اُس نے جو کہنا تھا، انجام کی پروا کیے بغیر ڈنکے کی چوٹ پر کہہ دیا تھا۔

کلاس میں بھی وہ بانو سے لاتعلق رہی۔ بانو نے متعدد بار اُسے متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر اُس نے سردمہری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ اُس نے تیسرا پیریڈ نہیں لیا بلکہ برآمدے میں آ گئی۔ فون پر ڈرائیور کو فوراً پہنچنے کا حکم دے کر سست قدموں سے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

اُس کا رویہ غیر متوقع تھا۔ بانو کافی دیر تک اُس کی باتوں کو دل میں دہراتی رہی۔ اُس کے لہجے کی بے ساختگی پر غور کرتی رہی۔ وہ جھوٹ ہرگز نہیں بول رہی تھی مگر اُس کی کہی ہوئی باتوں پر یقین کرنے پر بھی دل آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ اُس نے ایسے بے جوڑ ملن پڑھ سُن نہیں رکھے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ قسمت میل کرانے پر آتی ہے تو آگ اور پانی کو بھی ملا دیتی ہے۔ زمین اور آسمان کو ایک ہتھیلی پر اکٹھا کر دیتی ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ آسمان بلا کچھ دیکھے زمین پر جھکنے کو بے قرار ہو رہا تھا۔ وہ بہ ہر حال اتنی بھی خوب صورت نہیں تھی۔ کم از کم وہ یہی سوچتی تھی۔

وہ کلاس میں بیٹھ کر بھی غیر موجود رہی۔ اپنے وقت پر کلاس چھوڑ کر گیٹ پر آ گئی۔ بوکھلا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ آج پہلا موقع تھا کہ بالی اور اُس کی پرانی سائیکل گیٹ کے سامنے درخت کے نیچے موجود نہیں تھی۔ وہ پریشان ہو گئی۔ پندرہ بیس منٹ انتظار کیا مگر بالی نہ آیا تو اُس نے خالی رکشا پکڑا اور بالی کی ورکشاپ کی طرف چل دی۔ رکشا دکان کے سامنے رُکا۔ اُس نے جھانک کر دکان کے اندر دیکھا۔ بالی دیوار کے ساتھ پشت ٹکائے خراد مشین کے سامنے کھڑا تھا۔ اُسے تسلی ہوئی۔ سوچا۔ ”شاید بالی اِس لیے مجھے لینے کے لیے نہیں آیا کہ مجھے عینی نے صبح گھر سے پک کیا تھا، وہی ڈراپ کر جائے گی۔“

اُس نے رکشا ڈرائیور کو گھر کا پتہ بتلایا اور چلنے کا کہا۔ رکشا موڑ کاٹ ہی رہا تھا جب اُس نے بے ساختگی سے پھر دکان میں جھانکا۔ اوپر کا سانس اوپر رہ گیا۔ بالی کے سامنے شہزاد کھڑا اُس سے محوِ گفتگو تھا اور اُس کی کار ورکشاپ کے باہر کھڑی تھی۔ غیر ارادی طور پر بڑبڑانے لگی۔ ”شہزاد یہاں کیا کر رہا ہے؟ کار کو دیکھ کر بھی بالی مجھے لینے کے لیے کالج نہیں پہنچا، یہ کیا چکر ہے؟“

وہ چکرا سی گئی۔ یہ سمجھ نہیں رہی تھی کہ چکر بالی یا شہزاد نہیں، وہ خود ہی چلا چکی ہے۔ اُس کی معصوم اور دلکش صورت نے شہزاد اور عینی کو ایسا چکر دیا تھا کہ وہ ایک ہی دائرے میں گھومے چلے جاتے تھے اور ہر سُو اُسی کی شبیہہ دیکھے جا رہے تھے۔

وہ بالی کو ورکشاپ میں شہزاد سے باتیں کرتے ہوئے چھوڑ کر گھر پہنچ گئی۔ بالی کو اُس کے یوں آنے اور چلے جانے کا گمان تک نہیں تھا۔ وہ کام کرتے ہوئے ہمیشہ اپنی دُنیا میں مگن رہتا تھا جس میں آج شہزاد بار بار مداخلت کر رہا تھا۔ ”استاد بالی! تمھارے ہنر کو دیکھ کر تمھاری تنخواہ بہت کم دکھائی دیتی ہے۔ تم اپنی ورکشاپ کیوں نہیں بنا لیتے؟“

بالی نے تول کستے ہوئے کہا۔ ”ورکشاپ کے لیے کاریگری کی نہیں، رقم کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ میرے پاس نہیں ہے۔“

”کتنی رقم سے کام چل سکتا ہے؟“ شہزاد اُسے مسلسل کرید رہا تھا۔

”بابو جی! جس منزل پر جانا نہ ہو، اُس کا پندھ پوچھنے کا کیا فائدہ۔“

”پھر بھی؟“

”استاد عبدالرحمٰن نے پچھلے ماہ نئی ورکشاپ بنائی تھی۔ کہہ رہا تھا کہ پورے دو لاکھ روپے لگے ہیں۔ خدا جانے سچ ہے یا جھوٹ...... اگر جھوٹ ہے تب بھی میں ورکشاپ نہیں بنا سکتا اِس لیے یہ خواب دیکھتا ہی نہیں۔“ بالی کے لہجے میں دکھ، یاس یا حسرت نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ ”آپ بڑے آدمی ہیں، مجھ جیسے چھوٹے آدمی کے ہنر کو بڑا کہہ رہے ہیں مگر آپ کو یہ علم نہیں کہ ہنر کی آج کے دور میں کوئی قدر نہیں۔ اِس مارکیٹ میں مجھ سے بھی سینئر خرادیے نوکری کر رہے ہیں۔ وہ سامنے خراد مشین پر استاد رحمت کام کر رہا ہے، وہ دکان اُس کی نہیں، اُس کے شاگرد کی ہے۔ یہی قدر ہے ہنر مند کی دُنیا میں بابو جی!“

”جلد ملاقات ہوگی استاد بالی!“ شہزاد نے کہا اور ہپ پاکٹ سے پرس نکالا، چند نوٹ کھینچ کر لیتھ مشین پر پڑے ہوئے ورنیئر کیلیپر کے نیچے رکھ دیے اور ستائشی نگاہ اُس پر

ڈال کر ورکشاپ سے نکل گیا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے اُس نے ناقدانہ نظروں سے اپنے لباس کا جائزہ لیا۔ ورکشاپ میں گھنٹہ بھر وقت گزارنے پر بھی اُس کے لباس نے کوئی دھبہ نہیں پکڑا تھا۔

بالی نے نوٹ جیب میں ڈالے اور تشکرانہ نگاہ ڈال کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لیور کھینچ کر بیلٹ چھوٹی پلی پر چڑھائی۔ ایسا کرنے سے مشین کا فولادی پہیہ تیز چلنے لگتا ہے اور لوہے کو لوہا تیزی سے کاٹنے لگتا ہے۔ فولاد میں جھریاں ڈالنے والے ہاتھوں کی جھریاں میل سے اَٹی ہوئی تھیں اور کوئی لکیر شناس اِن میں لکھی ہوئی تحریر کو پڑھ نہیں سکتا تھا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کا دھیان کام کی طرف نہیں ہے۔ اُس نے لیور کھینچ کر دائیں ہاتھ کو فولادی پہیے کے عقبی حصے میں رکھ دیا۔ چر کی ناگوار سی آواز کے ساتھ پہیہ رُک گیا۔ اُسے یوں لگا جیسے اُس کی بے مقصد زندگی بھی کسی دِن ایسی ہی آواز کے ساتھ تھم جائے گی۔

نائیک کی بیوی بیمار تھی۔ وہ اُسے لے کر اسپتال گیا ہوا تھا۔ ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ بالی نے شاگردوں کو کام سمجھایا اور سائیکل پر بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اُس کی جیب گرم تھی۔ آج کے دِن میں آنے والا امیر زادہ اُسے امیر کر گیا تھا۔ جی ہی جی میں شمار کرنے لگا۔ گاڑی کا کام بہ مشکل پانچ سو روپے کا تھا مگر امیر زادے نے چار نوٹ اُس کے ہنر کی دہلیز پر دھرے تھے۔ پانچ سو نائیک کے، پندرہ سو اُس کے...... خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اُس نے خواہش کی تھی کہ ہر روز ایک آدھا ایسا گاہک لگ جائے اور جب وہ پیسے دینے لگے، نائیک کی آنکھیں بند ہو جائیں، وہ مسجد میں چلا جائے یا اُس کی حاجتِ ضروریہ اُسے دکان سے نکال لے جائے...... مگر ایسا ہر بار نہیں ہوتا، کبھی کبھار ہوتا ہے اور کبھی کبھار ہی ہوتا رہے تب بھی غنیمت ہے۔

گھر میں داخل ہوا تو بانو بھاگ کر قریب آئی۔ چہرہ سرخ تھا۔ لگتا تھا کہ شدید غصے میں ہے۔ ”بالی! تم یہ بتاؤ......“

بالی نے چونک کر دیکھا۔ وہ بولتے بولتے رُک گئی۔ سوچ میں پڑ گئی۔ ”یہ میں کیا بے وقوفی کرنے چلی ہوں۔ بالی سے کیا پوچھوں گی؟ یہی کہ شہزاد کیوں تمھاری دکان میں کھڑا تھا۔ وہ پوچھے گا تم شہزاد کو کیسے جانتی ہو؟ میں کیا جواب دوں گی؟“

چند قدم پیچھے ہٹی اور پیٹھ کر کے پوچھنے لگی۔ ”تم آج مجھے لینے کے لیے کیوں نہیں آئے تھے؟“

وہ بات بڑی کامیابی سے بدلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ ایسے میں دِل بیٹھنے لگا۔ بالی سے آج تک اُس نے سوائے پرائز بانڈز کے کچھ بھی چھپایا نہیں تھا، آج چھپایا تو یوں لگا جیسے کسی جرم کا ارتکاب کر بیٹھی ہے۔ بالی نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”غلطی ہو گئی مگر وجہ سنو گی تو غصہ تھوک دو گی۔ یہ دیکھو! کیا لایا ہوں۔“

وہ پلٹنا نہیں چاہتی تھی۔ چہرے اور آنکھوں سے دِل کا جھلکتا ہوا احوال چھپانا چاہتی تھی مگر تجسس کے مارے پلٹ کر بولی۔ ”کیا ہے؟“

اُس نے جیب سے نوٹ نکال کر ہوا میں لہرائے، ایک نوٹ واپس جیب میں رکھ لیا، تین اُس کے ہاتھ میں تھما دیے اور چہکا۔ ”آج پھر ایک امیر زادہ آیا تھا۔ جاتے ہوئے پندرہ سو روپے انعام میں دے گیا۔“

اُس نے نوٹ تھامے تو شہزاد کا چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا۔ عجیب سی نظروں سے بالی کو دیکھتے ہوئے بھاگ کر کمرے میں آ گئی۔ بالی سائیکل کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے سیدھا باتھ روم میں چلا گیا۔ وہ کمرے میں آ کر نوٹوں کو دیکھنے لگی۔ نوٹوں کی مخصوص مہک کے ساتھ اُس کی اپنی خوشبو بھی کمرے میں پھیلنے لگی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ جو کچھ وہ سوچ رہی تھی، وہ نہ ہوا ہو مگر جب دِل یقین پکڑ لیتا ہے تو کسی اندیشے کو خاطر میں نہیں لاتا۔ کسی وجہ کے بغیر اُسے یقین ہو گیا تھا یہ نوٹ شہزاد نے ہی بالی کو دیے تھے۔ وہ بے دھیانی میں نوٹوں کو گالوں پر پھیرنے لگی۔ کاغذ کے بے جان ٹکڑوں میں کتنی جان ہوتی ہے؟ کبھی خط بن کر، کبھی پھول بن کر، کبھی جدائی کا سندیسہ بن کر اور کبھی ملاپ کا اجازت نامہ بن کر زندگی بدل دیتے ہیں۔ نوٹوں کا لمس آنکھوں میں اُس امیر زادے کا عکس سجانے لگا۔ وہ عکس بن کر مسکرانے لگا، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر قریب آنے لگا۔ جوں جوں قریب آ رہا تھا، توں توں دل کی دھڑکن کا اعتدال ٹوٹتا جاتا تھا اور سانسوں کی مالا ٹوٹ کر موتی موتی ہوتی جاتی تھی۔ وہ موتیوں کے پیچھے لپکتے لپکتے بکھرنے لگی، آنکھیں بند کر کے مسکرانے لگی اور سلگتے لبوں سے گنگنانے لگی۔ ”کون یہ جانے کون گھڑی میں کوئی کہیں پہ آئے، بانٹ لے میرے دل کی

دھڑکن دردمیرا اپنائے......"

بالی قمیص پہنتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور اُسے نوٹ آنکھوں پر رکھ کر ساکت کھڑے دیکھ کر ہنسنے لگا۔ "اے! میں نہ کہتا تھا کہ تم میرے کالج نہ پہنچنے کی وجہ جان کر اپنی ناراضی بھول جاؤ گی۔ اِن بے جان نوٹوں کو چھوڑو، یہ تمھارے ہیں۔ اِس جاندار کے لیے ایک کپ دودھ پتی والی چائے بنا دو۔"

وہ چونک کر اپنی الماری کی طرف بڑھی۔ نوٹ چھپا کر رکھتے ہوئے دل دھڑکنے لگا۔ اُس کی چوری دکھائی دینے والی نہیں تھی مگر دھڑکا سا لگا ہوا تھا۔ بالی سُن نہ لے، وہ جو اُس کے وجود سے نغمہ بن کر پھوٹ پڑنے کو بے تاب تھا۔ بالی دیکھ نہ لے، وہ مستی بھری روشنی جو اُس کی آنکھوں کو آنِ واحد میں خیرہ کر گئی تھی۔ بالی سونگھ نہ لے، وہ خوشبو جو نوٹوں میں لپٹ کر اُس کے کمرے میں آن پہنچی تھی اور مدہوش کیے دے رہی تھی۔ بالی پکڑ نہ لے، وہ چوری جو جاگتے میں سرانجام پائی تھی اور اُس کی پسلیوں کا قفس خالی کر گئی تھی۔ جب وہ چائے پی کر حسبِ سابق اُسے چھیڑتے ہوئے کام پر چلا گیا تو اُس کی جان میں جان آئی۔ لوہے کو توڑنے موڑنے والا سخت فولادی وجود نرم اور پوشیدہ ماس کی پھڑپھڑاہٹ کے رموز سے بے خبر واقع ہوا تھا۔

☆(۲۱)☆

طویل دورانیے پر محیط بجلی کے بریک ڈاؤن کے باعث آٹو مارکیٹ میں گہما گہمی نہیں تھی۔ بالی کے آس پاس کی ورکشاپوں پر کام کرنے والے بالی کی دکان کے سامنے ایستادہ شیشم کے گھنی چھاؤں والے درخت کے نیچے بیٹھ کر خوش گپیوں میں محو تھے۔ بالی بھی وہاں موجود تھا جب کسی نے پچھلے دنوں کسی دور دراز کے علاقے سے ہجرت کر کے آنے والے سید منظور حسین شاہ المعروف شاہ سائیں کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ بات سے بات نکلی تو پتہ چلا کہ شاہ سائیں عوام میں بہت دور تک چلا گیا تھا۔ کسی نے بتلایا۔ "جب سے دکان میں شاہ سائیں کا دیا ہوا تعویذ لٹکایا ہے، کام اتنا بڑھ گیا ہے کہ شب گیارہ بارہ بجے تک ہم فارغ ہی نہیں ہو پاتے۔ لوگ ٹھیک کہتے ہیں، شاہ سائیں بہت پہنچے ہوئے ہیں۔"

دوسرا بولا۔ "مجھے پیروں فقیروں پر یقین نہیں تھا۔ اپنا ایک سوال لے کر شاہ سائیں کے پاس گیا۔ بے یقین گیا تھا، پھر بھی جھولی میں مُراد بھر کر پلٹا ہوں۔ اللہ کے پیاروں کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔"

کسی نے شاہ سائیں کے پُرنور حلیے کی تعریف میں قلابے ملائے۔ کسی نے گفتگو کے انداز کو سراہا۔ اُستاد مجیدے نے سگریٹ کو زبان پر رگڑ کر گیلا کیا، سلگایا اور مخصوص انداز میں انگلیوں میں دبا کر گہرا کش لیا۔ بولا۔ "مجھ پر اللہ کا خاص کرم رہا ہے۔ اَن گنت پہنچے ہوؤں کے دیدار کا فیض بخشا ہے اُس نے مجھے۔ مگر شاہ سائیں کی کیا بات ہے! میں نے اُن کے سوا بھری جوانی میں ولایت کے اِس مقام پر کسی کو فائز نہیں دیکھا۔ جوانی تو دیوانی ہوتی ہے۔ ڈھنگ کا کوئی کام نہیں کرنے دیتی، کجا معرفت کی یہ منزلیں...... سبحان اللہ! ایک نظر ڈالتا ہے، اندر تک روشنیاں بھر دیتا ہے۔"

بالی سُن رہا تھا۔ سن کر متجسس ہو رہا تھا۔ کبھی ایسے کسی در پر سر نہیں جھکایا تھا۔ اردگرد بیٹھ کر بولنے والے اپنی خوش قسمتی کا واویلا کر رہے تھے۔ اُسے خاموش دیکھ کر استاد مجیدے نے پہلو میں کہنی چبھوئی "کیوں بے بالی استاد! تمھارا مُرشد کون ہے؟"

وہ خالی خالی نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں نے کسی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔ کبھی روٹی ٹک سے فرصت ملتی تو کسی اللہ کے پیارے کے دروازے پر جا کر دستک دیتا۔"

"ہائیں!" مجیدے کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "یعنی تم اَبھی تک بے مُرشدے ہو؟ ...... ہاہ......ہا...... بے اُستادے ہنرمند، بے مُرشدے انسان اور بن باپ کے بچے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دُنیا کے کام تو ہوتے ہی رہتے ہیں، تم پہلا کام یہی کرو کہ کسی کے ہاتھ پر بیعت کرلو۔ میری مانو تو شاہ سائیں کے پاس چلے جاؤ۔ تمھاری جھولی مرادوں سے بھر جائے گی۔ دیکھنا، تم ایسے نہیں رہو گے، جیسے اَب ہو۔"

وہ نہیں جانتا تھا کہ اُس میں کیا تبدیلی رُونما ہو جائے گی مگر دِل سے مجیدے کی باتوں پر یقین کر رہا تھا۔ یہی آج تک سنتا آیا تھا۔ شام کو وہ مجیدے کو ساتھ لے کر شاہ سائیں کے آستانے کی طرف چل دیا۔ اُسے حیرانی ہوئی کہ شاہ سائیں اُسی کے محلے میں رہائش پذیر تھا۔ سائیں جی کے سامنے دوزانو بیٹھ کر وہ اپنی کم علمی کا ماتم کرنے لگا۔ دیر سے آنے پر متاسف ہو رہا تھا۔ آستانے میں معتقدین کا ہجوم تھا۔ بھیڑ چھٹ گئی تو مجیدے نے بڑے اَدب سے کہا۔ "شاہ سائیں! بالی بہت اچھا آدمی ہے۔ آپ کے حلقۂ ارادت میں داخلے کی اجازت مانگتا ہے۔ اِس پر نظرِ کرم کیجیے اور اِس کا سینہ روحانیت کے نور سے معمور کر دیجیے۔"

پُرآسائش ماحول میں بھینی بھینی خوشبو رَچی ہوئی تھی۔ ہلکی روشنی، دبیز قالین، اَدب آمیز خاموشی اور شاہ سائیں کا پُرنور چہرہ...... دل پر دبدبہ طاری کر رہا تھا۔ مجیدے کے ہاتھ کا اشارہ پا کر بالی قالین پر آگے کی سمت گھسکا اور شاہ سائیں کے گھٹنے سے لگ بیٹھا۔ اُستاد مجیدا تجربہ کار مرید تھا۔ بالی کا ہاتھ پکڑ کر شاہ سائیں کے ہاتھ میں دیتے ہوئے غیر معمولی ادب کے ساتھ گویا ہوا۔ "لیجیے شاہ سائیں! کرم کیجیے اور اِس دُنیادار کو دین دار بنانے کے لیے بیعت کر لیجیے۔ بسم اللہ کیجیے......"

شاہ سائیں کی گمبھیر آواز بالی کی سماعت میں گونجی۔ "تمھارا نام کیا ہے جوان؟"

"بالی......" اُس کے منہ سے نکلا۔

"اوں ہوں...... وہ نام بتلاؤ جو تمھاری ماں نے رکھا تھا۔"

بالی نے چونک کر شاہ سائیں کی طرف دیکھا۔ عجیب سا مدوجزر چہرے پر اُترنے لگا۔

"کیا بات ہے جوان؟ تم نے جواب نہیں دیا۔"

"جج...... جی سائیں جی...... میرا پورا نام اقبال حسین ہے۔" بالی کو اپنی آواز بھی ناشناسا لگی۔ یوں کہ جیسے اُس کی زبان سے کوئی اور بولا ہو۔

"اقبال حسین...... اچھا اچھا...... تم کون ہو؟" شاہ سائیں اَب پوری طرح اُس کی جانب متوجہ تھا۔

بالی کے اندر، باہر، ہرسُو حبس بھرنے لگا۔ وہ کون تھا؟...... انسان، مگر اُس کا یہ وصف تو شاہ سائیں سمیت دُنیا کے ہر شخص کو دکھائی دیتا تھا۔ مسلمان، مگر اِس خوبی کا اظہار تو اُس کا نام کر دیتا تھا۔ ورکشاپیا، مگر اُس کا حلیہ اور لباس دیکھ کر ہر کوئی بہ خوبی اندازہ لگا لیتا تھا کہ وہ کالے لوہے سے کھیلنے والا شخص ہے۔ پھر اُس سے کس پہچان کا حوالہ مانگا جا رہا تھا؟ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ متعجب سوالیہ نگاہوں سے شاہ سائیں کو دیکھنے لگا۔ بے بسی سے بولا۔ "مم...... مم...... میں، میں ہی ہوں۔"

شاہ سائیں کے لبوں پر دل آویز مسکراہٹ اُبھری۔

"میں تمھاری ذات کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔"

وہ فوری طور پر کوئی جواب نہ دے پایا۔ اُس کی کوئی ذات نہیں تھی۔ اُس کا کوئی قبیلہ نہیں تھا۔ تائی بشیراں کی ذات اور تھی، چاچا عبدالکریم کی ذات اور تھی۔ پھر یاد آیا، اُس نے شناختی کارڈ کا فارم بھرتے ہوئے اپنی ذات کیا لکھوائی تھی۔ اٹک اٹک کر بتلا دی۔ دل کو ٹھوکا سا لگا۔ یوں لگا جیسے وہ اپنا ہی کوئی عیب بیان کرنے لگا ہو۔

"تمھاری ماں کا نام کیا ہے اقبال حسین؟"

بالی کا سانس اٹکنے لگا۔ پہلی مرتبہ کسی نے پورا نام لے کر پکارا تھا۔ پہلی مرتبہ کسی نے اُس سے ماں کا نام دریافت کیا تھا۔ کن اکھیوں سے اُستاد مجیدے کو دیکھا اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

شاہ سائیں نے اپنا سوال دہرایا، جواب نہ پا کر سر ہلایا اور بولا۔ "میں سمجھ گیا ہوں اقبال حسین۔ تم گھر چلے جاؤ اور اپنے اندر کو تنہائی میں بیٹھ کر اچھی طرح ٹٹولو۔ بیعت لینے والا، بیعت کرنے والا، دونوں سچے ہوں تو رَب اپنا کرم کرتا ہے۔ سوہنا سچا رَب منافقوں اور جھوٹوں کو پسند نہیں کرتا۔ سچ بولنے کی طاقت اور کچھ پانے کی سچی لگن دل میں پاؤ تو میرے پاس چلے آنا ورنہ پیچھے مُڑ کر بھی نہ دیکھنا۔ مجھے تم پر خاصی محنت کرنا پڑے گی کیونکہ تمھارے اندر انگارے بھرے ہوئے ہیں۔ یوں کرنا، اِسی جمعرات کو شام چار سے پانچ بجے تک یہاں پہنچ جانا۔ اَب جاؤ!"

زبان کی طرح ٹانگیں بھی بے جان ہونے لگیں۔ وہ اُٹھتے ہوئے بری طرح ڈگمگا گیا۔ مجیدے نے سہارا دیا، باہر آنے تک کمر میں بازو حمائل کیے رکھا بولا۔ "دیکھ بالی اُستاد! میں نہ کہتا تھا کہ شاہ سائیں انسان کی روح تک میں نور بھر دیتا ہے۔ تمھارا قصور نہیں، یہاں آنے والے بڑے بڑوں کی حالت دگرگوں ہو جاتی ہے۔ تم بڑے خوش قسمت واقع ہوئے ہو کہ سائیں جی نے تمھیں تنہائی میں بلایا ہے۔ تمھارے دِن پھرنے والے ہیں، ٹھان رکھو۔"

بانو نے بالی کو کھوئی کھوئی کیفیت میں پایا تو مستفسر ہوئی۔ وہ شاہ سائیں سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں تفصیلاً بتلانے لگا۔ پوری بات سُن کر بانو نے کہا۔ "بالی!

تم اِن چکروں میں مت پڑو۔ ہماری زندگی بڑے اچھے طریقے سے گزر رہی ہے۔ جو مل رہا ہے، غنیمت ہے، جو نہیں مل رہا، اُس کے پیچھے دوڑنا تکلیف دہ ثابت ہوگا۔ تم اَن پڑھ ہو، میں چار لفظ پڑھ چکی ہوں، جانتی ہوں کہ محنت اور پالیسی کے بغیر کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ دُنیا میں جادوئی چھڑیوں کا وجود نہیں ہے۔ ہتھیلیوں پر سرسوں جمانے والے آنکھوں پر برف جما دیتے ہیں اور آنکھوں کی روشنی ہتھیا کر چلتے بنتے ہیں۔"

"مگر شاہ سائیں ایسے نہیں ہیں۔ بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔"

"کہاں پہنچے ہوئے ہیں؟" بانو نے تلخ نوائی کی۔ "تم کہتے ہو کہ وہ بہ مشکل پچیس تیس سال کی عمر کا ہے یعنی جوان شخص ہے۔ پھر کہتے ہو کہ وہ بزرگ ہے۔ یہ کیسی بزرگی ہے؟...... اَن پڑھوں والی باتیں نہ کرو اور عقل کے ناخن لو۔ کاغذ کا پرزہ، پھونک یا لامعانی بڑبڑاہٹ واقعات کو بدل کر حالات کے موافق نہیں کرتی بلکہ انسانی نفسیات کو بدل کر جیب خالی کر دیا کرتی ہے۔ میں تمھاری شب و روز کی محنت میں سے کسی کو ناجائز حصہ نہیں دوں گی۔"

"لیکن شاہ سائیں نے مجھ سے کچھ مانگا تو نہیں ہے ناں!"

"نہیں مانگا تو مانگ لے گا۔ تب، جب تم انکار کرنے کی حالت میں نہیں ہو گے۔" وہ ناگواری سے بولی۔

"کتابوں نے تمھارا دماغ خراب کر دیا ہے۔ پورا زمانہ کہتا ہے کہ شاہ سائیں کی دعا میں بڑا اثر ہے۔ جن لوگوں نے بھی تعویذ لے کر دکانوں میں لٹکائے ہیں، اُن لوگوں کا کاروبار بڑھ گیا ہے۔ میں بھی شاہ سائیں سے تعویذ لوں گا۔"

"کس کام کے لیے؟" بانو نے تعجب سے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے، شاہ سائیں کے تعویذ اور دُعا کی بدولت میں اپنی ورکشاپ بنانے میں کامیاب ہو جاؤں۔" بالی نے بڑے یقین سے کہا۔

"کیا تعویذ میں سے روپے جھڑیں گے؟" بانو پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی اور نہ ہی بالی کی طرح اندھا اعتقاد رکھنے والی تھی۔

"ہونے کو بہت کچھ ہو سکتا ہے میری بے وقوف جان!"

بالی نے اُس کے گال پر ہلکی سی چپت لگائی۔ "آزمانے میں کیا ہرج ہے۔ بولو!"

"ہرج ہے۔ ایمان خراب کرنے کے ساتھ ساتھ حق حلال کی کمائی بھی گل ہو جائے گی۔"

"میں سائیں جی کو کوئی رقم نہیں دوں گا۔ وعدہ رہا!"

"پھر وہ تعویذ ہی نہیں دے گا۔"

"میں اُنھیں کہہ دوں گا کہ کام ہونے پر نذرانہ پیش کر دوں گا۔"

"ایسے لوگ اُدھار نہیں کیا کرتے۔"

"مجھے یقین ہے کہ وہ ایسا ہی کریں گے کیونکہ وہ سچے ہیں۔" بالی نے سمجھایا۔ "ہاتھوں کی پانچوں انگلیوں میں فرق ہوتا ہے پھر انسانوں میں کیوں فرق نہیں ہوگا۔ تم نے اُنھیں دیکھا نہیں ورنہ ایسی باتیں نہ کرتیں۔ کیا نور برستا ہے اُن کی صورت پر۔ لال سرخ رنگ، ایک دَم اپنی جانب کھینچ لینے والی آنکھیں اور مسام مسام سے خوشبو چھوڑتا وجود...... سچ بانو! اُن پر اللہ راضی ہے۔ وہ ہم جیسے نہیں ہیں۔"

"بالی! انگلیاں بڑی چھوٹی ضرور ہوتی ہیں مگر لقمہ توڑتے وقت سبھی اکٹھی ہو جایا کرتی ہیں۔ اچھا کھانے، اچھا پہننے اور مشقت نہ کرنے والا لال سرخ ہوتا ہی ہے۔ جس نور کا ذکر تم کر رہے ہو، وہ شمالی علاقہ جات کے قبائلیوں اور یورپین باشندوں کے چہروں پر بے دریغ برستا دکھائی دیتا ہے۔ کیا اُن سب پر اللہ راضی ہو گیا ہے؟ کیا افریقی حبشیوں پر قدرت ازل سے ناراض ہے؟ یہ بچگانہ باتیں ہیں۔ تم اِن چکروں میں مت پڑو۔ سیدھا دُکان پر جایا کرو، دُکان سے گھر آیا کرو اور ہاں! آئندہ شاہ سائیں کے آستانے پر جانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ میں بہت بُری طرح پیش آؤں گی۔"

بالی نے منہ بنا کر خاموشی اختیار کر لی۔ صاف دکھائی دیتا تھا کہ اُس نے بانو کی باتوں کو دِل پر نہیں لیا تھا۔ بانو بھی اُس کی کیفیت کو تاڑ گئی۔ کتابیں کھول کر پڑھنے بیٹھ گئی مگر دماغ میں بالی کی باتیں گونجتی رہیں۔ اُسے بہ خوبی احساس تھا کہ بالی اُس کے روکنے کے باوجود شاہ سائیں کی آستانے پر جائے گا اور پیسے کو ہاتھوں کا میل سمجھ کر سائیں کے سامنے جھاڑتا رہے گا۔ سر جھٹک کر بڑبڑائی۔ "سچ کہتے ہیں، جب تک دُنیا میں احمق لوگ موجود ہیں، چالاک بھوکے نہیں

مریں گے۔"

بالی نے سُن لیا۔ مسکرا کر کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ ایسے میں اُس کا فون گنگنا اُٹھا۔ سیلولر فون کا ڈسپلے دیکھا۔ گلاب کا پھول جل بجھ رہا تھا۔ وہ اَن پڑھ تھا اور فون پر آنے والے کا نام اور نمبر نہیں پڑھ سکتا تھا اِس لیے بانو نے عینی کے فیڈ شدہ نمبر کے ساتھ گلاب کا پھول آویزاں کر دیا تھا۔ وہ بانو کی طرف فون بڑھاتے ہوئے بولا۔ "تمھاری نک چڑھی سہیلی کا فون ہے۔ اَب اُسے شاہ سائیں کے بارے میں بتلانے نہ بیٹھ جانا۔"

بانو نے جھپٹنے کے سے انداز میں فون تھاما اور کال ریسیو کی۔ عینی کہہ رہی تھی۔ "اے حسن کی تند زبان ملکہ! فون تو جلدی اٹینڈ کر لیا کرو۔ سچ کہتی ہوں، فون میں سے میرا دل نکل کر تمھارے ہونٹوں کو چھونے کی جسارت نہیں کرے گا۔"

وہ مسکرائی۔ "کیا پتہ؟"

"تو کیا بھیا کو تمھارا نمبر دے دوں؟" وہ شرارت سے بولی۔ "اُس کا دل ویسے بھی پسلیاں چیر کر تمھاری قدم بوسی کو بے قرار رہتا ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ یہ بتلاؤ، فون کیوں کیا ہے؟"

"آگ لگی ہوئی ہے۔ بھیا کی حالت غیر ہے اور میں حالت غیر کرنے والی کی حالتِ زار کا جائزہ لینے کے لیے فون کر رہی ہوں۔"

وہ فوری طور پر سمجھ نہیں پائی۔ "کیا ہوا اُسے؟"

"تیز بخار میں بُری طرح بھنک رہا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا، گولیاں کھاؤ، ٹھیک ہو جاؤ گے۔ وہ بولا، نہیں بلکہ مجھے کوئی تیز اثر دوائی دو۔ ڈاکٹر انجیکشن لگانے لگا تو پھر اَڑ گیا۔ بولا، وہ دوائی لاؤ جسے دیکھتے ہی بخار اُتر جائے۔ اَب تم ہی بتلاؤ، دُنیا میں ایسی کوئی دوا ہوگی کیا؟" عینی یک لخت سنجیدہ ہو گئی۔

بانو نے پریشانی سے کہا۔ "کہیں بخار دماغ پر نہ چڑھ گیا ہو؟"

"یقیناً ایسا ہی ہوا ہے۔"

بانو کو، دور اپنے بچپن میں، بالی کا بخار یاد آ گیا۔ جسم کیسے انگارے کی طرح دہکنے لگا تھا۔ چاچا عبدالکریم اور چاچی کی بے چینی یاد آ گئی۔ وہ تمام رات بالی کے سرہانے بیٹھی رہی، جاگتی رہی اور سر دَباتی رہی تھی۔ بے چینی سے بولی۔ "عینی! یہ بخار بہت ظالم ہوتا ہے۔ تم ڈاکٹر کی باتوں پر اعتبار نہ کرنا اور ساری رات شہزاد کے سرہانے بیٹھی رہنا۔"

عینی بولی۔ "پوری بات تو سنو...... ڈاکٹر نے کئی دوائیاں دکھائیں مگر وہ اَپنی ہٹ پر قائم رہا۔ آخر ڈاکٹر نے زِچ ہو کر پوچھا کہ تم ہی بتلاؤ، کون سی دوائی ایسی ہے جسے دیکھنے سے بخار اُتر جاتا ہے۔ بھیا نے دوائی کا نام بتلا دیا۔ اور تمھیں پتہ ہے بانو! ڈاکٹر نے پیشانی پر تاسف سے ہاتھ مارا اور کہا ہاں واقعی! میں اِس دوائی کو تو بھول ہی گیا تھا'...... تب مجھے بھی یقین ہو گیا کہ واقعی اُس دوائی کو دیکھ کر بھیا ایک دَم ٹھیک ہو جائے گا۔"

بانو کا حیرت سے دماغ پھٹنے کو آ رہا تھا۔ فرطِ استعجاب سے پھٹ پڑی۔ "ایسی کون سی دوائی ہے؟"

"بھیا نے ڈاکٹر کو بتلایا کہ دوائی کا لیبل اتنا دل کش ہے کہ مریض کا دِل چاہتا ہے کہ لیبل کو اُتار کر پھینک دے اور اپنا وجود بوتل پر اوڑھا دے۔ اور بوتل کی دل آویزی...... ہائے کیا کہنے اُس نفاست کے جو بنانے والے نے اُس میں پِرو دی۔ کہتے ہیں کہ بوتل ہاتھ میں لینے والا جھوم کر ناچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آنکھ میں مے، ہاتھ میں آگ اور دل میں بے خودی بھر جاتی ہے اور بخار...... بخار تو سارے کا سارا ایک ہی پل میں بوتل چوس لیتی ہے۔" عینی کی زبان چل پڑی۔

بانو اَب بھی نہیں سمجھ پائی۔ بولی۔ "دوائی کا نام کیا ہے؟"

"ہائے ڈارلنگ! تم بھی نام پوچھنے لگی ہو۔ وہ چیز ہی ایسی ہے، جو سنتا ہے، دیکھنے کو بے قرار ہو جاتا ہے۔ جو دیکھتا ہے، وہ چھونے کو لپکنے لگتا ہے اور جو ایک مرتبہ چھو بیٹھتا ہے، وہ خود کو غرق کرنے پر تُل جاتا ہے۔ بھیا بھی ایک مرتبہ اُس بوتل کو دیکھنے کی غلطی کر چکا ہے۔"

"بکواس کیے جا رہی ہو۔ میں فون بند کر رہی ہوں۔"

"کیا تم دوائی کا نام نہیں سنو گی؟"

"اَب بتا ہی دو۔" بانو نے جان چھڑانا چاہی۔

"سنو ڈارلنگ! اُس پیاری سی دوائی کا نام 'رضیہ بانو' ہے۔" عینی کی آواز میں زندگی کی تمام تر شوخی سمٹ آئی۔

"اے! تم بہت بدتمیز ہو عینی!" بانو نے اپنا سر پیٹ ڈالا۔ اتنی سامنے کی بات پر اُسے عینی نے اُلو بنا کر رکھ دیا تھا۔ فوراً فون آف کر دیا، یوں جیسے سامنے کھڑی عینی کے منہ

پر اُس نے ہاتھ رکھ دیا ہو۔
وہ اپنے دھیان میں بیٹھی عینی سے باتیں کرتی رہی تھی۔ نہیں جانتی تھی کہ بالی کے کانوں میں عینی کی باتیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح پڑ رہی تھیں۔ شکر تھا کہ وہ شاہ سائیں کے خیالات میں مگن تھا۔ سن کر بھی نہیں سن رہا تھا۔ بانو نے کن انکھیوں سے اُسے دیکھا، پھر اپنے سامنے کھلی پڑی کتاب پر جھک گئی۔ حرفوں نے اُس کا مذاق اُڑانا شروع کردیا۔ جو لفظ بھی پڑھتی، اُسی کا نام بن جاتا۔ ایسے میں خاموشی بھی طعنہ زن ہوگئی۔ ''ہم جسے گنگنا نہیں سکتے، وقت نے ایسا گیت کیوں گایا'' ...... وہ بے عنوان آہ بھر کر سامنے ایستادہ دیوار کو دیکھنے لگی۔ عینی کی باتیں یاد آنے لگیں۔ مذاق ایک وقت کا ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک دِن تک زندہ رہتا ہے، پھر آپوں آپ ہی مر جاتا ہے۔ عینی کا مذاق مرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ کیا واقعی یہ مذاق تھا؟ اگر مذاق نہیں تھا تو پھر کیا تھا؟ ...... ایسی باتیں سوچنے سے سمجھ میں نہیں آتیں۔ آنکھیں بند کرنے پر پل بھر میں عقدہ بنتی ہیں اور کھلنے میں عمر بتا دیتی ہیں۔ اُس نے آنکھیں بند کر کے دیکھا۔ شہزاد دکھائی دیا۔ شوق کی انگلیوں سے محبت کی گرہیں کھول رہا تھا۔ ''تمھیں میری محبت پر یقین نہیں آتا۔ سوچتی ہو، میں کیونکر تم پر فریفتہ ہوگیا۔ یہی بات ہے ناں؟ تم نے کبھی آئینہ نہیں دیکھا۔ دیکھا ہے تو غور سے نہیں دیکھا۔ غور کیا ہے تو اُسے کسی مرد کی نگاہ سے نہیں سوچا۔ سوچا ہوتا تو تمھیں اپنے چاہے جانے پر تعجب نہ ہوتا بلکہ تم اپنے غیر معمولی حسن کا حق خیال کرتیں۔''
اُس کے کانوں کی لوئیں تک جھنجنا اُٹھیں۔ گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ کوئی فرق نہیں پڑا۔ اندر، باہر، چہار سُو وہی تھا جس سے چھپنا چاہتی تھی۔ چھپتے چھپتے سامنے آرہی تھی۔ ایسا کرنے میں مزہ آنے لگا۔ تیز تیز سانس لیتے ہوئے یوں لگا جیسے سانس رک گیا ہو، دل ٹھہر گیا ہو، جان دور کہیں رَگوں میں اٹک گئی ہو۔
برابر میں بچھی ہوئی دونوں چارپائیوں پر بچھے ہوئے انسانوں کے اندر کی دُنیا مخالف سمت میں گامزن تھی۔ وہ اُسے سوچ رہی تھی جسے سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ ''ہائے اللہ! اُسے سوچتی ہوں تو پسینے میں نہا جاتی ہوں۔ دیکھتی ہوں تو دل گدگدانے لگتا ہے۔ کتنا ہی اچھا ہو کہ یہ مذاق نہ ہو، سچ ہو، شہزاد مجھے اتنا ہی چاہتا ہو، جتنا عینی ظاہر کرتی ہے۔ اور اگر یہ مذاق ہو تو پھر کتنا ہی اچھا ہو کہ عینی اِس خواب کے طلسم کو کبھی نہ توڑے۔ ہمیشہ کہتی رہے کہ شہزاد مجھ سے محبت کرتا ہے۔''
بالی شاہ سائیں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اپنی زندگی کو ایک آنِ واحد میں بدلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ دل ہی دِل میں دعا کر رہا تھا۔ ''کیا ہی اچھا ہو کہ شاہ سائیں مجھے ایسا تعویذ دے دیں جسے دکان میں لٹکاؤں تو قسمت مجھے اپنی دکان دے دے۔ گھر میں لٹکاؤں تو میری بانو کا خوب صورت سا گھر بن جائے۔ گلے میں لٹکا کر سینے سے چپکاؤں تو میرے اندر کا اندھیرا کسی پُر وجود مشعل سے روشن ہو جائے اور میرے دل کا بنجر مکان اپنی نوعیت بدل کر گھر کی شکل اختیار کر جائے۔''
جس کا مَن علم کی کرنوں سے روشن تھا، وہ نثار ہونے والا ایک پروانہ طلب کر رہی تھی۔ جس کی آنکھ میں اندھیارا اُترا ہوا تھا، وہ روشنی کی کرن مانگ رہا تھا۔ رات اُن کی خواہشوں سے یکسر بے نیاز اَپنی دھیمی چال چل رہی تھی۔
☆☆☆
تمام ورکشاپیے استاد مجیدے کو دانشور کہتے تھے۔ وہ مشکل باتیں آسان لہجے میں سمجھاتا تھا۔ سبھی اپنی فراست کے مطابق سمجھ جاتے تھے۔ بالی کو اُس نے سمجھایا تھا کہ جمعرات منتوں کی قبولیت اور مرادوں کی تکمیل کا دِن ہوتا ہے۔ شاہ سائیں نے بالی کو جمعرات کے دِن میں بلایا تھا تو اِس میں مصلحت پوشیدہ تھی۔ اُس کی مُرادیں بَر آنے والی تھیں۔
بالی نے بانو سے شاہ سائیں کے پاس جانے کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ اپنی دانست میں اُس نے بانو کو نہ بتلا کر دانش مندی کا ثبوت دیا تھا۔ اُس نے شکر کیا تھا کہ بانو کو عینی اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئی تھی اور شام کو دیر سے گھر پہنچنے پر اُسے کسی بازپرس کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اُستاد مجیدے نے اُس کا حوصلہ بندھایا اور سائیکل پر بیٹھا کر آستانے کی طرف روانہ کردیا۔ دھڑکتے دِل کے ساتھ شاہ سائیں کے سامنے قالین پر دوزانو بیٹھ گیا۔ حسب سابق مریدوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا پھر وفورِ شوق سے شاہ سائیں کے پُرنور چہرے کی تلاوت کرنے لگا۔ آنکھ کی چھلنی عقیدت کے چھان سے بند ہوگئی تھی۔ ایسے میں سب کچھ اُجلا اور نکھرا نکھرا دکھائی دیتا ہے۔

کچھ دیر کے بعد شاہ سائیں اُسے اپنے ہمراہ لے کر خاص حجرے میں آ گیا۔ دونوں روبرو بیٹھ گئے۔ شاہ سائیں نے آنکھیں بند کرلیں اور ایک دم ساکت ہوگیا۔ بالی کے لیے نہ صرف یہ ماحول نیا تھا بلکہ شاہ سائیں کی حرکات وسکنات بھی دل دھڑکانے کا موجب بن رہی تھیں۔ کچھ دیر کے استخارے کے بعد شاہ سائیں نے آنکھیں کھولیں، عجیب نظر سے اُسے گھورا اور بولا۔ ''دل میں کوئی میل رکھتے ہو تو اَبھی وقت ہے، لوٹ جاؤ ورنہ نقصان اُٹھاؤ گے۔''
اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں شاہ سائیں جی! میں دِل کو آئینہ بنا کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ حکم کیجیے!''
بالی کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے شاہ سائیں کی نظریں اُس کے بدن کے آر پار ہوتی جاتی ہیں۔ بولا تو اپنی آواز بھی ایک دم اجنبی سی لگی۔ شاہ سائیں کافی دیر تک اُسے ایک ٹک دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''اقبال حسین! کوئی بہت بڑا راز تم اَپنے سینے میں چھپائے پھرتے ہو۔ وہ راز اتنا بڑا گھاؤ بن گیا ہے کہ نہ تو تمھیں ہرا ہونے دیتا ہے اور نہ خاکستر کرتا ہے۔''
بالی کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ ایک ذرا جھجک کر بولا۔ ''ج ...... جی سائیں جی ...... میں کچھ سمجھا نہیں۔''
شاہ سائیں کی آنکھوں میں چند لمحوں کے لیے خفگی بھری، پھر محو ہوگئی اور وہ رَسان سے بولا۔ ''تم چاہو بھی تو میری نظروں سے چھپ نہیں سکتے۔ چھپنے کی کوشش میں اپنا نقصان کرو گے۔ کھلنے کی صورت میں اپنی مُراد پاؤ گے۔ فیصلہ تمھارے ہاتھ میں ہے۔''
وہ گھبرا گیا۔ ایسا کون سا راز تھا جس کی طرف شاہ سائیں اشارہ کر رہا تھا۔ اُس نے اپنے مَن کو ٹٹولا۔ کالے تَن میں اُجلا مَن بے دھبہ دکھائی دیا تو جھجک کر بولا۔ ''سائیں جی! میں نے آج تک کوئی جھوٹ نہیں بولا، چوری نہیں کی اور نہ ہی مجھے مزدوریوں نے اِدھر اُدھر دیکھنے کی مہلت دی ہے۔ میرے اندر ایسا کچھ بھی نہیں ہے جسے میں آپ سے چھپانا چاہوں گا۔''
شاہ سائیں کو اُس کی بات ناگوار گزری۔ چند لمحے برہم نگاہوں سے اُسے گھورتا رہا، پھر آنکھیں بند کر کے سیدھا بیٹھ رہا۔ کافی دیر گزر گئی۔ بالی کا دِل ہولانے لگا۔ کہیں شاہ سائیں ناراضی میں دھکے دے کر باہر نکال نہ دے۔ کہیں وہ نامراد لوٹا نہ دیا جائے۔ اندیشے حد سے متجاوز ہونے لگے تو اُس نے ہمت باندھی۔ نہایت ادب سے بولا۔ ''سائیں جی! ہاتھ پکڑ کر سہارا لینے کے لیے آپ کے دروازے پر آیا ہوں۔ خالی ہاتھ لوٹوں گا تو تماشا بن جاؤں گا۔''
ایسے میں شاہ سائیں کا ملازم شربت لے آیا۔ بالی نے ایک ہی سانس میں بھرا ہوا گلاس حلق میں اُتار دیا۔ ذائقہ کچھ عجیب سا لگا پھر یہ سوچ کر مطمئن ہوگیا کہ اِس جہان کدے میں کیا چیز عجیب نہیں ہے؟
نہ جانے یہ شربت کا اثر تھا، شاہ سائیں کی خلوت کا طلسم تھا یا بالی کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا خوف تھا جس نے بالی کی زبان کو کھول دیا۔ وہ بولنے لگا۔ اُسے یہ اندیشہ بھی لاحق نہیں رہا تھا کہ شاہ سائیں اُس کی بے ربط گفتگو سن رہا تھا یا نہیں ...... وہ بس اپنی رو میں بہکتا جاتا تھا۔
جمعرات کا دِن محض بالی پر نہیں اُترا تھا بلکہ بانو کے حصے میں بھی برابر آیا تھا۔ وہ عینی کے ساتھ کار میں بیٹھی دل کے تاروں کو چھیڑنے والے دیوانے کے پاس جارہی تھی۔ ایسے میں دھڑکتے دِل سے سوچ رہی تھی۔ ''کیا ہوا جو میں عینی کی باتوں میں آجاتی ہوں۔ لوگ یہ جانتے ہوئے بھی کہ سگریٹ کا دھواں کینسر اور دِل کی بیماری کا سبب ٹھہرتا ہے، وقتی لطف اور آسودگی کے حصول کے لیے حلق میں اتارتے چلے جاتے ہیں۔ اگر شہزاد مذاقاً مجھ سے پیار کرتا ہے تو بھی اُس سے ملنے پر میرا کیا جاتا ہے؟''
عینی دِل کی باتیں کرتی تھی۔ آدھی بات زبان سے، آدھی آنکھوں سے سمجھایا کرتی تھی اور بانو نہ چاہتے ہوئے سمجھتی جاتی تھی۔ عینی کی زبان نے اُسے سمجھایا تھا کہ جمعرات کو شہزاد کی واقعتاً سالگرہ ہے۔ شہزاد نے بالخصوص بانو کو ہمراہ لانے کی فرمائش کی تھی۔ اُس نے یہ بھی جتلایا تھا کہ اِس برتھ ڈے پارٹی میں اُس کے علاوہ کسی کو بھی مدعو نہیں کیا گیا۔ اُس کی نگاہیں سمجھا رہی تھیں کہ وہ دل کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اُس کا انتظار کرے گا۔ وہ آئے گی تو پارٹی سجے گی، نہیں آئے گی تو بن چاند کی رات کوٹھی میں اُتر آئے گی اور پارٹی کا دُلہا انتظار کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں سر پٹکتا رہ جائے گا۔
شہزاد کو گیٹ کے اندر بجری کی رَوش پر ٹہلتے ہوئے پایا تو

عینی کی زبان ونظر کے کہے پر یقین ہونے لگا۔لپک کر گاڑی کے قریب آیا۔ بانو کو دیکھ کر عینی کو مخاطب کرکے کہہ رہا تھا۔
''بے وقوف لڑکی! تم نے آنے میں اتنی دیر لگادی۔''
بانو کے لبوں پر مسکراہٹ اُبھری۔ اپنی شخصیت پر قدرے اعتماد کا احساس ہوا۔عینی کے ساتھ چلتی ہوئی ٹی وی لاؤنج میں آئی۔ برتھ ڈے پارٹی کا یہیں پر اہتمام کیا گیا تھا۔وہ عینی کی ماں سے ملی، باپ سے ملی اور دعائیں سمیٹ رہی تھی جب عینی اُسے بازو سے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے آئی۔ وارڈ روب سے ایک قیمتی اور ایمبرائڈری کا دل آویز شاہکار سوٹ نکالا۔اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔
''بھیانے اسپیشلی تمھارے لئے تیار کروایا ہے۔اُس کی خواہش ہے کہ تم اِسے چند گھڑیوں کے لیے پہن کر خوش قسمت کردو۔پلیز بانو! مجھے ایسی نظروں سے نہ دیکھو۔تم پر ہر سوٹ جچتا ہے۔یہ بھی جچے گا۔پلیز......''
وہ اپنا آپ اِس طرح بدلنا نہیں چاہتی تھی مگر عینی کی ملتجیانہ نگاہوں کے آگے ہار گئی۔ پیار بھرا لباس اوڑھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی تو حیران رہ گئی۔ٹاٹ اتارتے ہوئے دل کو دُکھ ہوا تھا۔مخمل پہن کر ہواؤں میں اُڑنے لگی۔ عقب میں عینی آن کھڑی ہوئی۔ بانہوں کے شکنجے میں کستے ہوئے بولی۔
''سچ بانو! تم سا دُنیا میں کوئی نہیں۔شب بھر سوچتی رہی تھی کہ تمھارے حسن کو تیز رو کرنے کے لیے پیراستہ کروں گی۔ اَب سوچ میں پڑ گئی ہوں کہ کہیں کریم لگانے سے تمھاری جلد کی چمک معدوم نہ ہوجائے۔ کہیں لپ اسٹک تمھارے ہونٹوں کے اِن ننھے ننھے جزیروں کو چھپا نہ لے جن کی پھسلن پر عشق کی ہر نظر قربان جاتی ہے۔کہیں کاجل اِس شوخی پر سیاہی نہ پھیر دے جس کو دیکھ کر جینے کی تمنا جاگتی ہے۔ سچ بانو! میرے بیوٹی باکس میں ایسا کوئی رنگ موجود نہیں جو تمھارے رنگوں کو تیز کرے۔''
وہ جھینپ رہی تھی۔ اُس کے ہاتھوں پر تھوڑی رکھ کر نیچے کی اَور جھک گئی۔ جھولی میں اَن گنت سنہرے موتی جگمگا رہے تھے جو شہزاد نے اُس کے لیے کپڑے پر آویزاں کرائے تھے۔اپنے نرم نرم لبوں کو عینی کے ہاتھوں کی پشت پر رگڑتے ہوئے بھرّائے ہوئے لہجے میں بولی۔
''عینی! مجھے اگر اپنی قسمت کی دَین پر اعتماد ہوتا تو میں اُٹھ کر ناچنے لگتی۔ ہواؤں میں اُڑتی پھرتی مگر جانتی ہوں کہ جب اپنے پیروں سے اوپر اُٹھنے چلوں گی تو نیچے سے زمین ہمیشہ کے لیے سرک جائے گی۔تم بہت اچھی ہو۔تمھارا بھیا بہت اچھا ہے مگر شاید میں اچھی نہیں ہوں، میری قسمت اچھی نہیں ہے۔ اگر یہ مذاق ہے تو خدارا اِسے مختصر نہ کرنا۔ اِسی بہلاوے میں میری زندگی کو تمام ہونے دینا۔''
وہ عینی کے دونوں بازو تھام کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایسے میں شہزاد دستک دے کر کمرے میں چلا آیا۔ اُسے روتے دیکھ کر سوالیہ نگاہوں سے عینی کو دیکھنے لگا۔عینی بولی۔
''بھیا! اِسے تمھاری محبت پر یقین نہیں ہے۔یہ سمجھتی ہے کہ تم اِس سے فلرٹ کررہے ہو۔میں فریزر سے کیک نکالتی ہوں، تم اِسے احساسِ کمتری سے نکال کر لاؤنج میں لے آؤ۔''
بانو اَبھی صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش ہی کررہی تھی کہ وہ تیز تیز قدموں سے کمرے سے نکل گئی۔شہزاد اُس کے قریب آگیا۔ وفورِ شوق سے اُسے ایک ٹک دیکھنے لگا۔ وہ مزید نروس ہوگئی۔بولی۔ ''مجھے جانے دیجیے پلیز!''
وہ تھوڑا پَرے ہٹ گیا۔راستہ خالی ہوگیا۔وہ اُٹھ کر باہر جانا چاہتی تھی کہ اچانک شہزاد نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔اپنی جانب موڑتے ہوئے آہستگی سے بولا۔''صرف ایک بات سن لو، پھر چلے جانا۔''
وہ تھم گئی۔پورا جسم لرزتے ہوئے کان بن کر ہمہ تن گوش ہوگیا۔وہ کہہ رہا تھا۔''بانو! محبوبہ کو اپنی محبت کا یقین دِلانے کے لیے مرد کے پاس سوائے باتوں اور وعدوں کے کچھ نہیں ہوتا۔میں اِن چیزوں کا سہارا بھی نہیں لینا چاہتا۔جو مَن میں ہے، کھولے دیتا ہوں۔ مجھے نہ بدلی جانے والی چیز کی طلب ہے۔تم نے لباس بدل لیا، کیا اپنا تَن بھی بدلنے میں کامیاب ہوسکتی ہو؟ ہرگز نہیں۔ بالوں کا رَنگ بدل سکتی ہو، آنکھوں اور چہرے کی تاب بدل سکتی ہو مگر اپنے دماغ کو نہیں بدل سکتی ہو۔ زبان بدل سکتی ہو مگر ذہن سے پھوٹنے والے بدن بھر کے جذبات کو کبھی بھی بدل نہیں سکتی ہو۔سچ کہتا ہوں، مجھے نہ بدلی جانے والی شئے کی ضرورت تمھارے سامنے جھکانے پر مجبور کرتی ہے۔ میرے پاس جو بھی ہے، تمھارا ہے۔میری بنو یا نہ بنو۔میں آزمائش کی ایک بساط تمھارے سامنے رکھتا

ہوں۔ جانتا ہوں کہ یہ بازی بہت زیادہ وقت مانگتی ہے مگر زندگی وقت سے بھری ہوئی ہے۔ آزمالینا کہ میری زندگی میں تمھارے سوا کوئی عورت داخل نہیں ہوگی۔دِل میں بے جا اندیشوں کو جگہ مت دو، مجھے دل میں جگہ دو۔''
بانو کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ایک نظر اُٹھا کر بولنے والے کو دیکھا۔ ہر طرف سچ کی فصل لہلہاتی دکھائی دی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ پائی۔ وہ حوصلہ پاکر کہنے لگا۔
''تم کیا ہو؟ میں جانتا ہوں۔ میں کیا ہوں؟ تم نہیں جانتی ہو مگر جاننے کی کوشش کروگی تو کتاب کی طرح تم پر کھل جاؤں گا۔سبق سبق میں تمھیں بار بار اپنا دُہرائے جانے والا وجود ہی ملے گا۔ جو پوچھنا چاہتی ہو، کھل کر پوچھو۔ میں پورے کا پورا جواب بن کر تمھاری شخصیت میں تحلیل ہوجانا چاہتا ہوں۔''
وہ جتنی مضبوط بنتی آئی تھی، اتنی ہی کمزور ثابت ہوئی۔ کچھ بھی نہ کہہ پائی تو عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔ ''تمھارا رِی ایکشن بالکل نیچرل ہے اور میں نیچر کا دیوانہ ہوں۔ میں سمجھ رہا ہوں کہ تم کچھ بھی نہیں کہہ پاؤ گی۔ مجھے تمھاری اَن کہی سننا پڑے گی۔ آنکھیں جھکا کر یا آنکھیں چُرا کر میرے ایک سوال کا جواب دے دو۔میں نے تمھارا ہاتھ تھام رکھا ہے، کیا یہ ہاتھ زندگی بھر اِسی طرح میرے ہاتھ میں رہ سکتا ہے؟''
تب بانو کو احساس ہوا کہ اُس کا پسینے سے تر ہاتھ شہزاد کے ہاتھ میں دَبا ہوا ہے۔ جھینپ کر اپنے ہاتھ کو دیکھنے لگی۔ خاموش ہاتھ کپکپانے لگا۔یوں جیسے اُس میں اچانک زندگی عود کر آئی ہو۔ ہاتھ چھڑانا چاہتی تھی، چھڑا نہ پائی۔اثبات میں سر ہلانا چاہتی تھی، ہلا نہ پائی بلکہ سر جھکا کر ساکت ہوگئی۔ اچانک جیسے اُس کا وجود سرشاری میں نہا گیا ہو۔اُس نے جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور سرخ چہرہ لئے بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔ اسٹیج نما بڑی سی ٹیبل پر جھکی ہوئی عینی سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔اپنے حد سے بڑھے ہوئے تنفس پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ''عینی! تم نے اچھا نہیں کیا۔''
اُس نے چونک کر بانو کی آنکھوں میں جھانکا۔چند لمحے شہزاد کے لکھے ہوئے شبد پڑھتی رہی پھر مسرت سے چیخ کر بانو سے چمٹ گئی۔ والہانہ انداز میں چومتے ہوئے بولی۔
''بانو! میں نے اچھا کیا یا بُرا، تم نے میری جھولی میں اپنی تمام تر اچھائیاں ڈال کر مجھے اور بھیا کو خرید لیا ہے۔آئی لو یو...... آئی لو یو!''
چند قدموں کے فاصلے پر کھڑے بابا اور ماما نے عینی اور بانو کو دیکھا۔ کچھ سمجھے، کچھ سمجھ نہ پائے مگر اُن کے لبوں پر جاندار مسکراہٹ تیرنے لگی۔
انتظامات مکمل ہوگئے۔ گھر کے جملہ ملازمین بھی رنگ برنگ کپڑوں میں ملبوس بڑے خوش دکھائی دیتے تھے۔ بانو چوری چھپے شہزاد کو دیکھ لیتی اور ڈرنے لگتی، مبادا کہ اُس کی چوری پکڑی جائے۔ پھونکوں کی زَد میں بجھتی موم بتیاں اور مبارکباد کے شور میں اپنا جملہ۔ ''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو!'' بھی اجنبی سا لگا۔ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ کیسے کوئی آنِ واحد میں حصارِ جان کو توڑتے ہوئے شخصیت میں بہت دُور تک گھس جاتا ہے۔ وہ آنکھیں کھولتی تو شہزاد کی مسکراتی ہوئی شبیہہ دکھائی دیتی۔ آنکھیں بند کرتی تو شہزاد کی آنکھوں کی شوخیاں اُسے گدگدانے لگتیں۔ محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔دَم بہ دَم انکار کرتے دِل پروا رَس کی طرح اپنی 'ہاں' کا سست چڑھا دیتی ہے۔ وہی دِل پھر اثبات میں دھڑکنے لگتا ہے۔
مسلسل آنکھیں چُراتی ہوئی رضیہ بانو کا دِل بھی دھک دھک کرنے کی بجائے اقرارِ محبت کا نغمہ الاپنے لگا تھا۔اُسے اندازہ تھا کہ بدن توڑنے والی بے نیند کی رات اپنی سیج سجائے اُس کی منتظر ہوگی۔

☆ ☆

شاہ سائیں نے ایک تعویذ دُکان میں لٹکانے کے لیے دیا تھا۔ بالی نے اپنی نظروں کے سامنے لٹکا دیا تھا۔ لیتھ مشین کے ٹول پر جمی ہوئی نگاہ چند لمحوں کے لیے اُٹھتی اور تعویذ کا طواف کرکے پھر ٹول پر جا ٹھہرتی۔ دِل کوئی کرامت مانگتا تھا۔ پھر اُس کی خوابیدہ قسمت ہڑبڑا کر بیدار ہوگئی۔ انگلی میں کی رِنگ گھماتا ہوا امیر زادہ دکھائی دیا تھا۔ اُس کے عقب میں اُس کی چمکیلی کار بھی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ وہی امیر زادہ تھا جو اُسے پانچ سو کے تین نوٹ ٹِپ میں دے گیا تھا۔ وہ لیتھ مشین پر اُس کے عین سامنے آن کھڑا ہوا۔ تبادلۂ احوال کے بعد بولا۔ ''انجن عجیب نامانوس سی آوازیں نکالنے لگا ہے۔ اگر تمھارے پاس وقت ہو تو اُسے چیک کرلو۔''
اُس نے جلدی سے مشین کا آہنی پہیہ روک دیا۔ دیوار پر نصب شدہ بڑے سے سوئچ بورڈ پر لگا لیور کھینچ کر موٹر

خاموش کرادی۔ مسکرا کر بولا۔ ''کیوں نہیں بابو جی! آپ اِدھر نائیک کے پاس بیٹھیں، میں چیک کرآتا ہوں۔''

''نہیں بالی اُستاد!'' اُس نے ایک نگاہ نائیک پر ڈالی اور نفی میں سر ہلا کر کہا۔ ''تمھیں ایسے پتہ نہیں چلے گا۔ میں ڈرائیونگ کروں گا،تم انجن پر توجہ دینا۔''

بالی نے اجازت طلب نگاہوں سے نائیک کی طرف دیکھا۔ نائیک نے آنکھ کے اشارے سے جانے کا حکم دیا۔ وہ امیرزادے کے پیچھے چلتا ہُوا کار کی اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ کار چل پڑی۔ اُس کے کانوں میں انجن کی خرابی کو ظاہر کرنے والی کوئی آواز نہیں پڑی تو متعجب ہوکر بولا۔ ''انجن تو بالکل ٹھیک ہے بابو جی! میں نے بڑی احتیاط سے آپ کی گاڑی کا کام کیا تھا۔ شاید آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔''

اُسے کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ مسکرا کر بولا۔ ''ہم ایک ہوٹل میں جا رہے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر چند باتیں کریں گے اور پھر تمھیں ورکشاپ پر چھوڑ دوں گا۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو، انجن بالکل ٹھیک ہے۔''

اُس نے بہت پیسے والوں کو دیکھ رکھا تھا۔ ٹپ دے کر بھول جاتے تھے۔ ہاتھ سخاوت برتا کرے مگر زبان ہر فقرے پر اُس کی اوقات یاد دلاتی رہتی تھی۔ یہ امیرزادہ مختلف ثابت ہُوا تھا۔ ٹپ دے کر گیا تھا اور پلٹ کر باتیں کرنے کے لیے آیا تھا۔ عجیب بات تھی۔ ہوٹل کی میز پر سمٹا سمٹا بیٹھا رہا اور اُس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ آخر انتظار ختم ہوا، وہ پوچھ رہا تھا۔ ''ہاں تو بالی اُستاد! تم نے بتلایا تھا کہ استاد عبدالرحمٰن نے دو لاکھ رُوپے لگا کر اپنی ورکشاپ بنائی ہے۔ ہے ناں؟''

وہ ہونق بنا اُسے دیکھنے لگا۔ یہ اتنی اہم بات تو نہیں تھی جس کے لیے اتنی حجت کی گئی تھی۔ مایوسی سے بولا۔ ''اُس نے بتایا تو یہی تھا۔''

''میرا نام شہزاد ہے۔ اِسی شہر میں رہتا ہوں۔ تمھارے ہنر کو دیکھ کر دل میں تمھاری مدد کا ارادہ جاگا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی ورکشاپ بنالو۔ اُس کے لیے تمھیں دو لاکھ روپوں کی ضرورت ہوگی۔ میں تمھیں تین لاکھ روپے دیتا ہوں۔ دل لگا کر کام کرنا، پیسہ کمانا اور اپنی ضرورت سے بڑھا ہُوا پیسہ جمع کرنا۔'' اُس نے کہا تو بالی کا منہ حیرت اور مسرت سے کھل گیا۔ کافی دیر تک اُس کے لبوں سے کوئی لفظ برآمد نہ ہوا۔ کوئی اتنا مہربان ثابت ہو، کبھی دیکھا سنا نہیں تھا اور نہ ہی اپنی قسمت پر یقین تھا۔ ایسے میں شاہ سائیں کا تعویذ نگاہوں کے سامنے لہرا گیا۔ شاہ سائیں نے تعویذ دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''تم چند ہی دِنوں میں اِس کی کرامتیں دیکھنے لگو گے۔''

کرامت نظر آ گئی تھی۔ اُس کا یکبارگی جی چاہا کہ اُٹھ کر بھنگڑا ڈالے۔ ہوٹل کی ہر ہر ٹیبل پر جا کر لوگوں کو بتلائے کہ شاہ سائیں کے تعویذ میں کتنا اثر پنہاں ہے۔ شہزاد اُس کے خال وخد سے پھوٹتی مسرت کو بھانپ کر بولا۔ ''استاد بالی! کیا آٹو مارکیٹ میں کوئی دُکان خالی پڑی ہے؟''

بالی کی نگاہوں میں فدا حسین جھلملا گیا۔ ریڈی ایٹرز مرمت کرنے میں اُس جتنی مہارت کسی کے پاس بھی نہیں تھی مگر اپنے ہمسایہ شومیکر کی معاندانہ شرارتوں کی بدولت شہر چھوڑ گیا تھا۔ اُس کی دکان تاحال خالی پڑی تھی۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''استاد فدا کی دُکان خالی ہے۔ وہ مل سکتی ہے مگر بابو جی! آپ مجھ پر اتنا بڑا احسان کیوں کر رہے ہیں؟''

شہزاد نے مسکرا کر کہا۔ ''بتا دیا کہ دِل تم پر آ گیا ہے۔''

بالی کے دِل نے کہا۔ ''تم جھوٹ کہتے ہو امیرزادے۔ یہ شاہ سائیں کے تعویذ کی کرامت ہے ورنہ تمھارا دِل مجھ سے پہلے کسی پر کیوں نہیں آیا۔''

دونوں نے بیٹھ کر ورکشاپ کے قیام پر صلاح مشورہ کیا۔ اُٹھنے سے پیشتر شہزاد نے اُس کے سامنے پُر شدہ چیک رکھتے ہوئے کہا۔ ''استاد بالی! میں بہت مصروف آدمی ہوں۔ یہ چیک کیش کروالو اور فوری طور پر کام شروع کردو۔ ایک ہفتے کے بعد میں آٹو مارکیٹ میں آؤں گا اور تمھیں اپنی دکان میں کام کرتے ہوئے دیکھنا چاہوں گا۔''

فولاد کو موڑنے توڑنے والے ہاتھوں پر چیک تھامتے ہی لرزہ طاری ہوگیا۔ نم اور متشکر آنکھوں سے شہزاد کو ایک ٹک دیکھنے لگا۔ انسان کے رُوپ میں پہلی مرتبہ کسی فرشتے کو دیکھا تھا۔ ہمت کی اور آگے بڑھ کر شہزاد کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ ''بابو جی! میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں اُتار سکوں گا۔ جونہی میری دُکان چل نکلی، میں تھوڑی تھوڑی کرکے آپ کی رقم لوٹا دوں گا مگر......''

شہزاد نے مسکرا کر اپنے ہاتھ چھڑائے، کندھا تھپتھپایا اور سمجھایا۔ ''یہ رقم میں نے تمھیں بطور قرض نہیں دی، بطور مدد دِی ہے۔ لوٹانے کی بجائے اپنے حالات کو سدھارنے کی کوشش کرنا۔ چلو! تمھیں آٹو مارکیٹ میں ڈراپ کردوں۔ تم

آج ہی اپنے بدتمیز نائیک سے جان چھڑا لو۔''

بالی بڑی عقیدت اور محبت سے دل ہی دل میں شاہ سائیں کا شکریہ ادا کرتا ہوں شہزاد کی گاڑی میں آن بیٹھا۔ دُنیا اچانک اتنی خوب صورت ہوجائے گی، اُس نے زندگی میں کبھی بھی نہیں سوچا تھا۔ شاہ سائیں کے تعویذ نے اُس کی کایا پلٹ دی تھی۔ سچ کہتے ہیں، اللہ والوں کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔

بالی اُس کے ہاتھ کو چوم کر کار سے اُتر گیا تو وہ عجیب نظروں سے اُس کی پشت کو گھورنے لگا تھا۔ اُس نے بالی پر کوئی احسان نہیں کیا تھا اور نہ ہی بالی کی ورکشاپ سے اُس کی ذاتی دلچسپی وابستہ تھی۔ وہ تو بس اتنا چاہتا تھا کہ اُسے بانو مل جائے...... کاروباری آدمی تھا۔ جانتا تھا کہ دُنیا کی سب سے مضبوط فصیل نوٹوں سے ہی کھینچی جاسکتی ہے۔

بالی کا نائیک اُس کا منتظر تھا۔ اُسے دیکھتے ہی اشتیاق بھری نگاہوں سے اُسے گھورنے لگا۔ وہ لیتھ مشین پر اپنی مخصوص جگہ پر جا کھڑا ہوا۔ سوئچ لیور کھینچا اور بیلٹ بڑی پلی پر چڑھاتے ہوئے بولا۔ ''نائیک جی! میں کل سے کام پر نہیں آیا کروں گا۔ تم کسی اور خرادیے کا بندوبست کرلینا۔''

نائیک بھونچکا رہ گیا۔ سمجھ گیا کہ کار والے نے دال میں کچھ کالا کالا ڈال دیا تھا۔ بڑی سی گالی دے کر چلایا۔ ''اَبے او...... اُس براھکر لونڈے نے کون سی ایسی گیدڑ سنگھی تمھارے نتھنوں سے لگادی ہے جو تم اپنی لگی بندھی روزی پر لات مارنے لگے ہو؟''

وہ نظریں اُٹھا کر شاہ سائیں کے تعویذ کو بڑی محبت اور عقیدت سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''غصہ کیوں کرتے ہو نائیک جی! جب تک دانہ پانی تمھاری ورکشاپ میں قسمت نے میرا لکھ رکھا تھا، میں کام کرتا رہا۔ اَب کہیں اور لکھا ہے جس کے پیچھے مجھے نکلنا پڑے گا۔''

نائیک کی پیشانی سلوٹ زدہ ہوگئی۔ بالی بہت محنتی اور نیک نیت کاریگر تھا۔ سارا دِن بنا کہے کام پر جُتا رہتا تھا۔ اُس کی عدم موجودگی میں دکان کا سارا انتظام بھی سنبھالے رکھتا تھا۔

نوکری کا سورج شام کے اُفق میں ڈوب گیا۔ بالی کی زندگی کا معمول پہلی بار تغیر پذیر ہوا۔ وہ اتنی بڑی خوشی کو بہ دقت تمام سنبھالتا ہوا بانو کے پاس جانے کی بجائے شاہ سائیں کے آستانے پر پہنچا۔ فرطِ عقیدت وتشکر سے شاہ سائیں کے ہاتھوں کو نم آنکھوں سے لگالیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''آپ رب سوہنے کے سچے ولی ہیں۔ آپ کے منہ سے نکلا قدرت مان لیتی ہے۔ اِدھر آپ نے دعا فرمائی، اُدھر میرے سوئے لیکھ جاگ اُٹھے۔ آپ کا بھیجا ہُوا فرشتہ......''

بالی نے شاہ سائیں کو دیکھے بغیر تمام ماجرا کہہ سنایا۔ سائیں زیرِ لب مسکراتا رہا، سنتا رہا، بات مکمل ہونے پر بے پروائی سے بولا۔ ''چل پَرے ہٹ! تم مجھے وہ باتیں بتلانے کے لیے بھاگے چلے آئے ہو جو کسی اور جہان میں گذشتہ رات میری موجودگی میں طے پائی تھیں۔ جا! موج کر۔''

بالی نے سر اُٹھانے کی بجائے اور جھکا لیا۔ دل میں سوچنے لگا۔ ''سائیں جی کی خلوت میں لبوں سے لگنے والے جام کا ذائقہ اَبھی تک محسوس ہوتا ہے۔ کاش! سائیں جی ایک گلاس اور پلادیں......''

شاہ سائیں نے اُس کے سر کے بال مٹھی میں بھرے اور کھینچ کر چہرہ اوپر اُٹھادیا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟''

''میں اپنی دُکان کی رسم بسم اللہ آپ کے ہاتھ سے کرواؤں گا سائیں جی!'' بالی کے منہ سے بدقّتِ تمام لفظ ادا ہو رہے تھے۔ ''آپ آئیں گے ناں؟''

شاہ سائیں نے اُس کے بال چھوڑ دیے۔ اپنے دائیں ہاتھ پر رکھی نوٹ بک میں سے کاغذ کا ایک چوکور ٹکڑا نکالا۔ اُس پر ننھے ننھے خانے بنے ہوئے تھے جن میں نہ پڑھی جاسکنے والی تحریر موجود تھی۔ پیتل کے ایک چھوٹے سے منقش پیالے میں زعفران رکھا تھا۔ انگلی کی اگلی پور گھلے ہوئے زعفران میں ڈبوئی، کاغذ کے وسط میں رکھی اور پھر ایک اَدا سے کاغذ کے ٹکڑے کو لپیٹ کر تعویذ بنادیا۔ کچھ پڑھ کر پھونکا اور اُس کی کھلی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''اِسے اپنی بہن کے گلے میں ڈال دینا۔''

بالی نے سائیں جی کے ایک تعویذ کی کرامت دیکھ رکھی تھی۔ جھٹ سے دوسرے کو آنکھوں سے لگایا، چوما اور بڑی احتیاط سے رومال میں لپیٹ کر جیب میں ڈال لیا۔ پھر بانو کا خیال آیا۔ دل میں تشویش بھر گئی۔ بولا۔ ''سائیں جی! ایک

مشکل ہے۔"

"کیا؟"

"وہ کملی تعویذ دھاگوں پر یقین نہیں رکھتی۔ میرے کہے پر وہ تعویذ گلے میں نہیں ڈالے گی۔ زبردستی کروں گا تو راستے میں کہیں پھینک کر گستاخی کر بیٹھے گی۔ دراصل پڑھائی نے اُس کا دماغ خراب کردیا ہے۔"

سائیں کی آنکھوں میں چمک عود کر آئی۔ بولا۔ "وہ بھی مان جائے گی۔ چڑھا ہوا سورج، بہتا ہوا ساگر اور آتا ہوا شخص ہر کسی کو دکھائی دیتا ہے۔ وہ شاید اُن لوگوں میں سے ہے جو دیکھ کر یقین کرتے ہیں۔ کوئی بات نہیں، وہ دیکھ کر مانے گی تو کبھی جھٹلانے کی جرأت نہیں کرے گی۔"

بالی نے اثبات میں سر ہلا دیا، بولا۔ "آپ بالکل ٹھیک فرماتے ہیں شاہ سائیں مگر وہ تعویذ پہنے گی تو کچھ دیکھ سکے گی۔"

"ہاں ہاں! تم اِس تعویذ کو نظر بچا کر اُس کے سرہانے میں چھپا دینا۔ اُسے میرے حوالے سے سمجھا دینا۔"

وہ اُٹھا، ہزار روپے کا ایک نوٹ سائیں جی کے قدموں میں رکھ کر الٹے قدموں آستانے سے نکل آیا۔ وہ خوش تھا کہ آج بانو کو قائل کرنے کے لیے اُس کی جیب میں تین لاکھ روپے کا چیک موجود تھا۔ بانو کو بانہوں سے پکڑا اور اپنے مقابل میں بٹھا لیا۔ بولتے ہوئے اُس کا لہجہ خوشی سے بے قابو ہو رہا تھا۔ "اے کملی لڑکی! تم پڑھ لکھ کر خود کو بڑی شئے سمجھنے لگی ہو۔ میں ناں کہتا تھا کہ شاہ سائیں بہت پہنچی ہوئی ہستی ہیں۔ اُن کا دیا ہوا تعویذ جونہی دکان میں لٹکایا، ایک امیر زادہ کسی وجہ کے بغیر مجھے ورکشاپ بنانے کے لیے تین لاکھ روپے کا چیک دے گیا۔ اَب ہمارے مشکل دِن کٹ گئے ہیں۔ چند ہی دِنوں میں میں اپنی ورکشاپ بنا لوں گا۔"

بانو کا اوپر کا سانس اوپر کہیں اَٹک گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بالی کو دیکھنے لگی۔ وہ فرطِ جذبات میں بول رہا تھا۔ "شاہ سائیں نے اُس کے دِل میں میرے لئے سخاوت بھر دی اور ہاں! جب میں سائیں جی کو بتلانے کے لیے گیا تو اُس نے مجھے پتہ ہے کیا کہا؟...... کہا کہ وہ سب کچھ جانتا ہے کیونکہ اُسی کی کوششوں سے میری قسمت میں یہ خوشی لکھی گئی ہے۔"

بانو کے ہونٹ لرزنے لگے۔ نفی میں سر ہلا کر کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "بالی! میں نے تمھیں کہا تھا ناں کہ تم نے شاہ سائیں کے پاس نہیں جانا۔ پھر کیوں گئے؟ تم کسی بہت بڑی مشکل میں پھنسنے والے ہو۔"

بالی نے جھٹ سے جیب میں سے چیک نکالا اور اُس کی گود میں رکھ دیا۔ "کوئی مصیبت نہیں آنے والی۔ اُس امیر زادے نے مجھے کھلم کھلا کہا تھا کہ وہ مجھے قرض نہیں دے رہا بلکہ میری امداد کر رہا ہے۔"

بانو نے چیک اُٹھایا۔ آنکھوں کے سامنے کر کے پڑھنے لگی۔ بالی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ چاندنی اور چمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے مگر چیک پر درج سیاہ ہندسے آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ چیک پر 'اقبال حسین' اور چیک دینے والے کے دستخط بھی دکھائی دے رہے تھے۔ دستخطوں کو غور سے دیکھنے پر پتہ چلتا تھا کہ وہ 'شہزاد سلطان' کے ہیں۔ اُس نے ہونٹ بھینچ لئے اور نیم مُردہ آواز میں بولی۔ "بالی! تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ تمھیں یہ امداد نہیں لینی چاہیے تھی۔"

"مگر کیوں؟" بالی کو اُس کا ردِعمل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"ہم کوئی خیرات صدقے والے تھوڑا ہیں۔ اللہ کا دیا سب کچھ تو ہے ہمارے پاس، پھر تم نے یہ امداد کیوں قبول کر لی۔" وہ رونے کو آ گئی۔

"اللہ کی قسم! میں نے اُس سے مانگے نہیں تھے اور اُس نے بن مانگے......" بالی بُری طرح گڑبڑا گیا۔

بانو اُس کی بات سُنے بغیر مسلسل نفی میں سر ہلاتی جا رہی تھی اور موٹے موٹے آنسو بہاتی جاتی تھی۔ ایسے میں بڑبڑانے کے سے انداز میں کہتی جاتی تھی۔ "ہائے بالی! تم نے بہت بُرا کیا۔ تم نے بہت بُرا کیا۔"

بالی ہونقوں کی طرح اُسے دیکھنے لگا۔ وہ بجائے خوش ہونے کے، بُری طرح ناراض ہو گئی تھی۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "بانو! یہ امداد سائیں جی کی دُعا سے مجھے ملی، تبھی میں نے وصول کر لی۔ اگر تم خوش نہیں ہو تو میں اَبھی جا کر اُسے واپس کر دیتا ہوں۔"

بانو کا رونا ایک دَم تھم گیا۔ جلدی سے بولی۔ "ہاں بالی! تم اَبھی جا کر اُسے یہ چیک واپس کر دو۔"

بالی کی حالت غیر ہونے لگی۔ قسمت نے پہلی بار ہاتھ تھاما تھا اور بانو ہاتھ جھٹکنے کا حکم دے رہی تھی۔ سوچ میں پڑ گیا۔ "ایک بار دروازہ بند کیا تو پھر قسمت کی دیوی کبھی نہیں آئے

گی۔ بڑی منتوں مُرادوں سے اپنی دُکان کا خواب پورا ہونے چلا ہے، بلاوجہ آنکھ کھول دی تو پھر نیند ہمیشہ کے لیے بے خواب ہو جائے گی۔ بانو کی بات پر کان نہیں دھرنا چاہیے۔ وہ تو کملی ہے۔ نہیں جانتی کہ اپنی دکان کرنے اور نوکری کرنے میں کتنا فرق ہوتا ہے۔"

دل نے فوراً سوچ کی زبان پکڑ لی۔ "اے بے وقوف! آج تک بانو کی مانتا آیا ہے، آج بھی مان لے۔ وہ تیرا بھلا سوچتی رہتی ہے۔ تو اُس کو ہنستا مسکراتا دیکھنا چاہتا ہے تو اُسے ناراض مت کر۔ دُنیا میں کوئی اتنی بڑی رقم بلا وجہ نہیں دیتا۔ آج دے رہا ہے، کل مانگنے کے لیے چلا آئے گا اور نہ جانے کیا چھین کر جائے گا۔ اُس کی رقم اُسے لوٹا دینے میں ہی عافیت ہے۔"

بانو اُسے جھنجوڑ رہی تھی۔ "بالی! اے بالی! کیا سوچ رہے ہو؟"

وہ خالی خالی نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "ڈرتا ہوں کہ قسمت دروازے سے لوٹ گئی تو زندگی بھر نہیں آئے گی۔"

وہ چلائی۔ "بالی! یہ قسمت نہیں، یہ دھوکا ہے، فریب ہے۔"

"تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"اور تم کیسے اِسے قسمت قرار دے سکتے ہو؟"

"یہ شاہ سائیں کے خاص کرم سے......"

"بکواس کرتا ہے وہ بھی۔ تم جانتے ہو، تمھیں چیک دینے والا کون ہے؟" بانو کا چہرہ غیض و غضب کا مظہر بن گیا۔

"ہاں۔ اُس نے اپنا نام شہزاد بتایا تھا۔ بہت امیر آدمی ہے۔"

"تم عجیب ورکشاپیے ہو، تمھیں یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ جس گاڑی میں تمھاری دُکان پر آتا ہے، وہی گاڑی روزانہ عینی کو کالج چھوڑنے اور لینے کے لیے آتی ہے۔ تم نے متعدد بار کالج کے گیٹ پر دیکھ رکھی ہے۔"

بالی کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھیل سی گئیں۔ "اوہ ہو...... تو کیا وہ عینی کا کچھ لگتا ہے؟"

"کچھ لگتا نہیں، اُس کا سگا بھائی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تم کون ہو، اِس لئے تم پر رحم کھا رہا ہے اور تم اِسے شاہ سائیں کی کرامت قرار دے کر خوش ہو رہے ہو۔ سچ بالی! تمھارے جیسا بے وقوف آدمی دُنیا میں شاید ہی کوئی ہو۔" بانو کا غصہ مہمیز ہو گیا۔

بالی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "یہ تو واقعی غلط ہوا ہے۔"

اُس کے دماغ نے چپکے سے سمجھایا۔ "یہ غلط نہیں ہوا، بالکل ٹھیک ہے۔ اگر اُسے بہن کی سہیلی کا اتنا ہی خیال تھا تو اُس نے پہلے یہ چیک کیوں نہیں دیا تھا۔ اَب وہ شاہ سائیں کے بھیجنے پر میرے پاس آیا ہے تو اُسے ناراض نہیں کرنا چاہیے ورنہ سائیں جی بھی ناراض ہو جائیں گے اور مجھے کہیں کا نہ چھوڑیں گے۔"

اُس نے بانو کو اتمامِ حجت کے طور پر کہا۔ "میں نے تو نائیک کو بھی کام سے جواب دے دیا ہے۔ اَب کیا ہو گا؟"

وہ بولی۔ "اللہ کوئی اور سبیل نکال دے گا۔"

"اُس نے سبیل تو نکال دی ہے......"

بانو نے برہمی سے بات کاٹ دی۔ "یہ سبیل نہیں، فراڈ ہے۔ تم سمجھتے کیوں نہیں ہو بالی! دُنیا میں کسی لالچ اور مطلب کے بغیر کوئی شخص ایک روپیہ دینے کو تیار نہیں۔ ایسے میں کوئی تمھیں اتنی خطیر رقم کیونکر کسی خرچ کے بغیر دے سکتا ہے؟ میں نے کہہ دیا کہ ہم یہ رقم نہیں لیں گے تو اِس کا ایک ہی مطلب ہے کہ تم فوراً جاؤ اور چیک اُس امیر زادے کو لوٹا دو۔ انسانوں کے دینے سے پیٹ نہیں بھرتا، خدا کے دینے سے پیٹ بھرتا ہے۔ تمھاری محنت کی کمائی سے اگر میرا پیٹ نہ بھی بھرا تو شکایت نہیں کروں گی۔"

وہ بانو کے سامنے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ بنا کھانا کھائے چیک لوٹانے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اُس نے گھر کا پتہ بانو سے بہ خوبی سمجھ لیا تھا۔ کھلی سڑک پر آ کر سوچنے لگا۔ "کیا مجھے چیک لوٹانے کی حماقت کرنی چاہیے یا نہیں؟...... تین لاکھ روپے کی رقم معمولی نہیں ہوتی۔ لیتھ مشین، ڈرلر، گرائنڈر، ویلڈنگ پلانٹ اور ٹول باکس...... سب کچھ نیا خریدنے کے بعد بھی کافی رقم بچ جائے گی۔ بانو بے چاری کو کیا پتہ؟"

اپنے سامنے توجیہہ رکھی۔ "میں یہ رقم ماہانہ قسطیں بنا کر لوٹا دوں گا تب تو یہ خیرات نہیں رہے گی۔ قرض تو بڑے بڑے آدمی لیتے رہتے ہیں۔"

دل نہیں مان رہا تھا، سمجھا رہا تھا۔ ”تمھارا دُنیا میں بانو کے سوا کوئی بھی نہیں۔ اگر اُسے ناراض کر بیٹھے تو یہ رقم تمھارے کس کام آئے گی؟“

اُس کی سائیکل سست رَوی سے عینی کے گھر کی سمت سفر کررہی تھی اور وہ دِل ودماغ کی کھینچا تانی میں پاگلوں کی طرح دوڑ رہا تھا۔ کہتے ہیں، دل اپنی منوا کررہتا ہے۔ وہ بھی دِل کے آگے ہار گیا۔ دماغی توجیہات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے عینی کے خوب صورت گھر کے بڑے سے آہنی گیٹ پر پہنچ گیا۔ کوٹھی کا جاہ وحشم دیکھ کر امیرزادے کی امارت سے مزید مرعوب ہوگیا۔ بیٹھے ہوئے دل سے گھنٹی کا بٹن پش کیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد اُسے چوکیدار نے ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا۔ شہزاد کے آنے پر مؤدبانہ انداز میں کھڑا ہوگیا۔ لرزیدہ ہاتھوں سے چیک بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”بابو جی! خدا آپ کو بہت زیادہ دے مگر میں آپ کی یہ امداد قبول نہیں کرسکتا۔“

شہزاد کے چہرے پر تعجب کے تاثرات رقصاں ہوگئے۔

”مگر کیوں؟“

”میری بہن مجھ سے ناراض ہوگئی ہے۔ کہتی ہے کہ اَبھی جا کر چیک واپس کردوں اور بابو جی! میں اپنی بانو کو روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔“

شہزاد نے بہ غور بالی کو دیکھا۔ استعجاب کی جگہ بے پایاں مسرت نے لے لی۔ مسکرا کر بولا۔ ”وہ اور کیا کہتی ہے؟“

”وہ کہتی ہے کہ یہ امداد ہے اور ہمیں کسی کی امداد کی ضرورت نہیں ہے۔“ بالی نے ایک ذرا جھجک کر کہا۔

”وہ ٹھیک کہتی ہے۔ تم یہ رقم بطور قرض اپنے پاس رکھ چھوڑو۔ اپنی متوقع آمدنی کے مطابق قسط کا تعین کرلو اور ہر ماہ تواتر کے ساتھ میرے پاس جمع کراتے رہنا۔ ایک دِن قرض بے باق ہوجائے گا۔ یہ امداد نہیں، کاروباری معاہدہ ہے جس پر اُسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

بالی نہیں مانا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بانو اِس شرط کو بھی قبول نہیں کرے گی۔ شہزاد نے ایک اور راہ دکھلائی۔ ”تم بانو کو بتلائے بغیر ورکشاپ بنا سکتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تھوڑے عرصہ میں ہی تم اور عینی اُس کا ذہن بنا کر منا لوگے۔ تب تک تمھارا کام بھی چل چکا ہوگا۔“

بالی نے انکار میں سرہلایا۔ ”نہیں بابو جی! میں اُسے دھوکا نہیں دے سکتا۔ اُس کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میں اگر زیادہ کمانا چاہتا ہوں تو صرف اُس کی خاطر، وگرنہ مجھے دولت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اُسے ناراض کرکے نوٹوں کے ڈھیر پر بیٹھ بھی گیا تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں تنہا رہ جاؤں گا۔“

شہزاد نے چیک نہیں پکڑا تو اُس نے سوفے کے آرم ریسٹ پر رکھ دیا اور آنکھیں ملائے بغیر ڈرائنگ روم سے نکل آیا۔ شہزاد نے اُسے روکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ مسکراتی ہوئی آنکھوں سے اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اُس کے اندازے کے مطابق بالی نے اَبھی بیرونی گیٹ عبور نہیں کیا تھا کہ عینی ہاتھ میں موبائل تھامے اُسے ڈھونڈتی ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ بولی۔ ”بھیا! میں نے کہا تھا ناں کہ وہ بُرا مان جائے گی۔ اَب وہ بار بار فون کررہی ہے اور میں فون اٹینڈ نہیں کررہی ہوں۔“

شہزاد نے کہا۔ ”میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ اَب فون آئے تو اٹینڈ کرنا، وائڈ اسپیکر آن کرکے اُس سے باتیں کرنا۔ اُسے سمجھانے کی کوشش کرنا۔“

وہ بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد فون کا بزر بج اُٹھا۔ ایک نظر شہزاد کو دیکھا اور کال اوکے کرتے ہی وائڈ اسپیکر آن کردیا۔ بانو ہیلو ہیلو کررہی تھی۔ عینی بولی۔ ”ہاں کیا بات ہے میری اَپسرا، میری جان؟“

بانو کی آواز سنائی دی۔ ”عینی! تمھیں پتہ ہے کہ تمھارے بھائی نے کیا کیا ہے؟ پتہ ہوگا کیونکہ وہ تم سے پوچھے بغیر کوئی قدم نہیں اُٹھاتا۔“

”کیا ہوا؟ پہلیاں بجھوانے کی بجائے سیدھی سیدھی بات کرو۔“ عینی نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

”میں کہتی تھی ناں کہ میں زمینی پستی ہوں، تم لوگ آسمانی مخلوق ہو۔ تم کہتی تھیں کہ ہمارا ہاتھ تھامو، تمھیں آسمان پر براجمان کردیں گے۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے تمھاری بات مان لی۔ اَب ایک ہاتھ تھما کر دوسرے ہاتھ سے میرے منہ پر مٹی کیوں پھینک رہی ہو؟“

عینی نے کن اکھیوں سے شہزاد کو دیکھا اور جبڑا کھینچ کر کہا۔ ”میں اَب بھی کچھ سمجھ نہیں پائی بانو! دیکھو، کھل کر بات کرو ناں۔“

”تمھارے بھائی نے بالی کو تین لاکھ روپے دیے ہیں۔ خدا جانے ہماری غربت پر ترس کھا کر بھیک دی ہے یا میری

قیمت لگائی ہے۔“ بانو کی آواز رُندھ گئی۔ ”عینی! جب میں اپنی حیثیت کو پہچانتی ہوں، تمھاری قامت کو مانتی ہوں تو پھر پھر......“

اُس کا لہجہ ٹوٹ گیا۔ بات بکھر گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ گئی۔ عینی کے دلاسوں کو اُس نے سُنا اور نہ ہی کال منقطع کی۔ عینی کا سر جھک گیا، لفظ تمام ہوگئے اور ایک نگہِ شکایت شہزاد پر ڈال کر کھڑی ہوگئی۔ فون اُس کی جھولی میں پھینک کر تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔

شہزاد کے کانوں میں بانو کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے پوری کائنات ایک دم ہی رونے چلانے لگی ہو۔ وہ سمجھانے لگا۔

”پلیز بانو! تم نے میری ذات پر غلط اندازوں کی بنیاد پر شک کی عمارت کھڑی کردی ہے۔ میں نے نہ تو تمھارے بھائی کی جھولی میں خیرات ڈالی ہے اور نہ ہی تمھارے دام لگانے کا بھیانک جرم کیا ہے۔ دُنیا قرض لیتی ہے، لوٹاتی ہے، میں نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ نوکری کرتے کرتے اُس کے ہاتھ شل ہوجائیں گے مگر اپنی دکان کا خواب پورا نہیں ہوپائے گا۔ میرے تعاون سے وہ ورکشاپ کا مالک بن جائے گا اور آنے والے دو چار سالوں میں میری رقم لوٹا دے گا۔“

وہ شہزاد کی آواز سُن کر ٹھٹک کر خاموش ہوگئی تھی۔ ایک ایک لفظ اپنی سماعت میں اُتارتی گئی۔ تشفی نہیں ہوئی۔ زہر خند لہجے میں بولی۔ ”آپ بڑے ہیں، آپ کی سوچ اور ظرف بھی بڑا ہے مگر میرے ذہن میں اتنی وسعت نہیں ہے۔ میں اِس رقم کو بھیک اور قیمت کے علاوہ کوئی نام نہیں دے سکی۔ خدارا! مجھ پر ایک رحم اور کیجیے اور چیک واپس لے لیجیے۔“

”چیک میرے پاس پہنچ چکا ہے۔ چند منٹ قبل تمھارا بھائی میرے منہ پر مار گیا ہے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی شہزاد کے لہجے میں ہلکی سی تلخی گھل گئی۔

”پلیز! ناراض نہ ہوں۔ میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کریں۔“ وہ پھر رونے کو پَر تول رہی تھی۔

”بانو! تم بڑی خوش قسمت ہو۔ فضول باتوں پر دِل کو جلانے کی بہ جائے ناز کرو کہ تمھیں بالی جیسا بہت پیار کرنے والا بھائی اور عینی جیسی مخلص دوست ملی ہے۔ مجھے نہ مانو، اِن دونوں کی نیتوں پر شک نہ کرو ورنہ تمھارے دونوں ہاتھ خالی ہوجائیں گے۔“

وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر یہ سوچ کر کہ کہیں وہ پھر رونے نہ بیٹھ جائے، گڈبائے کہہ کر فون بند کردیا اور خالی خالی نگاہوں سے فون کی اسکرین کو گھورنے لگا۔ کچھ دیر یونہی بیٹھے رہنے کے بعد بے دِلی سے اُٹھا اور عینی کے کمرے میں آگیا۔ وہ سر تھامے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ اُسے دیکھ کر بولی۔ ”بھیا! میں بہت شرمندہ ہوں۔ نہ جانے بانو کے دِماغ میں کیوں یہ سما گیا ہے کہ ہم اُس پر ترس کھاتے ہیں۔“

شہزاد نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔ ”تمھیں شرمندہ ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے ڈیئر! دونوں بہن بھائی جن حالات سے گزر کر یہاں تک پہنچے ہیں، وہ اِن شک آلود رویوں کے متقاضی ہیں۔“

”تو کیا اُنھیں اُن کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔“ عینی نے معصومیت سے دریافت کیا۔

شہزاد نے کندھے اُچکائے۔ ”کچھ کیا بھی تو نہیں جاسکتا۔ مگر...... مگر یہ طے ہے کہ بانو ہی تمھاری بھابھی بنے گی۔“

عینی نے ترحم آمیز نظروں سے اپنے وجیہہ اور خوبرو بھائی کو دیکھا۔ اُس کی آنکھوں سے ایک موہوم سا پچھتاوا بھی ہویدا تھا کہ اُس نے اُسے بانو سے متعارف کرانے کی غلطی کیوں کی تھی۔ ماما ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی اُسے دکھلا رہی تھی۔ یہ سلسلہ اُس کے انکار کے باوجود تعطل یا توقف کا شکار کبھی نہیں ہوا تھا۔ آج نہیں تو کل...... کبھی...... وہ ماما کی کسی پسند پر سر جھکا دیتا۔

زندگی ایسی ہی بے مہر اور بے اعتبار بساط پر لا بٹھاتی ہے۔ کبھی انسان مایوسی اور تضحیک کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گرتا ہے۔ کبھی نظر کی آخری حدوں تک آکاش میں براجمان ہوکر دیکھنے والوں کی نگاہوں میں چمکتا ہوا نقطہ بن جاتا ہے۔ کبھی ستارہ...... کبھی تارا...... تارا ٹوٹ کر آنکھوں میں بھی گر پڑتا ہے۔ بالی کی آنکھوں میں بھی کرچیاں بھر گئیں۔ گود میں بانو کا سر رکھ کر بار بار یقین دلانے کی کوشش کررہا تھا کہ وہ آئندہ ایسی غلطی نہیں کرے گا جو بانو کا دل دکھانے کا باعث ہو۔ وہ مان رہی تھی مگر ایک تسلسل کے ساتھ روئے جارہی تھی۔ واویلا کیے جارہی تھی۔ ”بالی! تمھیں مجھ سے پیار نہیں

رہا۔ تم مجھ سے اُکتا گئے ہو ورنہ میرے روکنے کے باوجود شاہ سائیں کے آستانے پر نہ جاتے۔ میرے کہنے کے باوصف چیک واپس کرنے میں اتنی لیت ولعل نہ کرتے۔ تم کہتے تھے کہ میں تمھاری قسمت ہوں۔ پھر تم کس قسمت کی تلاش میں شاہ سائیں کے پاس گئے تھے؟ تم کہتے تھے کہ میں ہی تمھاری دولت ہوں، پھر کس مایا کی کھوج میں شہزاد کے احسان کے بوجھ تلے دَبے تھے؟ بول بالی بول! کیا بوجھ بن گئی ہوں تم پر؟"

بالی نے کوئی جواب دیے بغیر اپنے سیاہی مائل ہونٹ اُس کی پیشانی پر رکھ دیے کہ اِس سے زیادہ معتبر جواب اُس کے پاس نہیں تھا۔

☆☆☆

نائیک کی جلی کٹی باتوں نے لیتھ مشین پر کام کرتے بالی کے چہرے کو مزید تاریک کر دیا تھا۔ جانے والا اپنے قدموں پر چلتا ہوا لوٹ آئے تو اسی طرح بے توقیر ہو جاتا ہے۔ بالی پیدائش کے حادثے سے لے کر اَب تک بے وقعتی اور استہزائیہ رویوں کا شکار ہوتا آرہا تھا۔ عادی ہو گیا تھا مگر نہ جانے آج نائیک کے طنزیہ جملے کیوں اُس کا دل چیرتے جاتے تھے۔ تمام دِن وہ اپنے شاگردوں سے بھی نظریں چراتا رہا۔ شام کو اُستاد مجیدے کے پاس چلا آیا۔ مایوسی سے بولا۔ "شاہ سائیں نے کرم کیا تھا مگر شاید میں کسی کرم کے قابل ہی نہیں ہوں۔ چلو! شاہ سائیں کے آستانے پر چلتے ہیں۔ دِل بوجھل بوجھل ہے، کچھ قرار ہی آجائے گا۔"

دونوں سائیکل پہ آستانے کی طرف چل دیے۔ بالی کے دِل میں پشیمانی کا احساس بھی اُترا ہوا تھا۔ گذشتہ شب میں اُس نے بانو سے عہد باندھا تھا کہ وہ سائیں جی کے پاس کبھی نہیں جائے گا۔ ایک دِن بھی اپنے عہد پر قائم نہ رہتے ہوئے وعدہ خلافی کر رہا تھا۔ اپنی کم فہمی کے سبب یہ نہیں جان سکتا تھا کہ عقیدت ہمیشہ محبت پر بھاری پڑ جاتی ہے۔

شاہ نے اُس کی اُتری ہوئی شکل پر کڑی نگاہ ڈالی اور دَبنگ لہجے میں کہا۔ "اقبال حسین! تم نے میری محنت پر پانی پھیر دیا ہے ناں!"

بالی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ شاہ سائیں دِلوں کے بھید جاننے کی قدرت رکھتا تھا۔ سر جھکا کر بولا۔ "سائیں جی! اپنی آنکھیں پھوڑ آیا ہوں۔"

شاہ سائیں نے مزید کچھ بھی دریافت نہیں کیا۔ مراقبے میں چلا گیا۔ "اقبال حسین! دوسرے تعویذ کا کیا کیا؟"

"وہ اَبھی تک میری جیب میں ہے جی!"

"کیوں؟"

"سرھانے میں رکھنے کا موقع نہیں ملا بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا۔" وہ شرمندگی سے بولا۔

"یاد رہے تو موقع ڈھونڈ لینا۔" سائیں جی کا لہجہ قدرے مشفقانہ ہو گیا "اَب کیوں آئے ہو؟"

"دیدار کے لالچ میں آیا ہوں شاہ سائیں!"

"ہو گیا، اَب جاؤ۔"

"کچھ دیر تو آنکھوں کی پیاس بجھانے دیں سائیں جی۔" بالی کے لہجے میں التجا گھل گئی۔

وہ مسکرا کر ایک مُریدنی کی طرف متوجہ ہو گیا جس کی گود میں نرینہ اولاد آج تک نہیں ہمکی تھی۔ بالی باری باری آکر دوزانو بیٹھنے والے مریدوں کو دیکھتا رہا۔ شاہ سائیں کے قدموں میں نوٹوں کا ڈھیر بلند ہوتا جاتا تھا اور وہ یکسر بے نیازی سے پاؤں سے مایا کو پَرے دھکیلتا جاتا تھا۔ وہ کچھ نہ دے کر دونوں ہاتھوں سے سمیٹ رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے دُنیا جہان کی غیر مادی دولت بانٹ رہا تھا۔ پُرسکون ماحول، دل میں بھری حد سے متجاوز عقیدت اور لوگوں کا مؤدبانہ رویہ بالی کو عجیب کیف آگیں کیفیت سے دوچار کر رہا تھا۔ جی نہیں بھرا مگر بانو کی تنہائی اور خفگی یاد آگئی۔ وہ سائیں جی سے بادلِ نخواستہ اجازت لے کر استاد مجیدے کے ہمراہ آستانے سے نکل آیا۔

گھر داخل ہوتے ہیں بانو نے شک آمیز انداز میں پوچھا۔ "تم نے آنے میں بہت دیر کر دی، کام زیادہ تھا؟"

اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے معمول کے مطابق لباس تبدیل کرنے لگا جبکہ بانو تشکیک آلود نظروں سے گھورتی ہوئی کھانا گرم کرنے کے لیے چولھے پر بیٹھ گئی۔

کھانا کھا کر وہ کتابیں کھول کر بیٹھ گئی۔ بالی روز کی طرح اُس کے چہرے کی تلاوت کرنے لگا۔ منہ پھیر کر مستفسر ہوا۔ "کالج میں دِن کیسا گزرا؟"

وہ چونکی پھر بولی۔ "ٹھیک ہی رہا۔"

"تمھاری سہیلی نے کچھ کہا؟"

وہ سمجھ گئی کہ بالی کیا پوچھنا چاہتا ہے۔ بولی۔ "آج عینی کالج نہیں گئی تھی۔"

"کیوں؟"

"ملی تو پوچھوں گی اور تمھیں بتلا دوں گی۔" وہ بے نیازی سے بولی۔

"ناراض تو نہیں ہو گئی تم سے؟"

"خدا جانے۔ ہو بھی گئی تو کیا ہو گا۔ چند دِن بات نہیں کرے گی، پھر مناؤں گی تو مان جائے گی۔"

"اور اگر نہ مانی تو؟"

بانو نے ایک ذرا حیرت سے سر اُٹھایا، ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "تو میں کسی اور کو دوست بنا لوں گی۔ کلاس میں صرف میں اور عینی ہی نہیں پڑھتے، پچپن لڑکیاں اور بھی پڑھنے آتی ہیں۔"

بالی نے منہ بنا کر کروٹ بدل لی۔ بانو کی آواز کانوں میں پڑی۔ "کیا تمھیں پیسے لوٹانے پر پچھتاوا محسوس ہو رہا ہے بالی؟"

وہ نیم دِلی سے گویا ہوا۔ "نہیں مگر آج نائیک کے سامنے نوکری کی درخواست کرتا دل کو بہت بُرا لگا۔"

بانو کو بھی افسوس ہوا مگر خاموش رہی۔ پھر عینی کا خیال آنے پر بالی کے سرھانے تلے دَبا موبائل فون نکال کر رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ عینی نے کال ریسیو کرنے کی بجائے منقطع کر دی۔ اُس نے پھر کال ملائی، عینی نے پھر کاٹ دی۔ وہ فون کو نچلے ہونٹ پر پھیرتے ہوئے سوچ میں پڑ گئی۔ مطلب واضح تھا کہ عینی اُس سے خفا تھی۔ شہزاد کی بات یاد آئی کہ "تمھارا بھائی چیک میرے منہ پر مار گیا ہے۔" وہ بھی ناراض تھا۔ دل بھر آیا۔ اُس نے کچھ بھی غلط نہیں کیا تھا مگر دونوں کو ناراض کر بیٹھی تھی۔ پھر بار بار کال ٹرائی کرنے لگی مگر ناکام رہی۔

وہ تھک کر سو گئی مگر بالی کا ارادہ جاگتا رہا۔ اُس کے پُرنیند سونے کا یقین ہوا تو آہستگی سے اُٹھا۔ تعویذ کو اُس کے سرھانے کے غلاف میں ڈال دیا۔ اندیشہ پیدا ہوا کہ وہ جب صبح سرھانے کو جھاڑے گی تو تعویذ نیچے گر جائے گا۔ اُسے پتہ چل جائے گا، ناراض ہو گی۔ ایسے میں کیا ہو کہ وہ تعویذ کی موجودگی سے بے خبر رہے۔ سوچنے سے عمل کی راہ کھل گئی۔ اُس نے تعویذ نکالا اور بڑی احتیاط سے سرھانے کے روئی والے تھیلے میں کسی نہ کسی طرح ڈال دیا۔ اب وہ آسانی سے بانو کی نگاہ میں نہیں آسکتا تھا۔ مطمئن ہو کر اپنی چارپائی پر آکر لیٹ گیا۔ دل کو تسلی اور یقین ہو گیا کہ پہلے کی طرح تعویذ اپنی کرامت دکھائے گا اور آن کی آن میں بانو کی جھولی میں ڈھیر ساری خوشیاں لا پھینکے گا۔ اگر ایسا ہو گیا تو اُسے اپنے تعویذ کے رائیگاں جانے کا افسوس نہیں رہے گا۔ یہ سوچ کر اُس نے خود کو ازحد مطمئن کر لیا۔

صبح اُٹھا تو بانو کو گہری نیند میں مستغرق پا کر پریشان سا ہو گیا۔ وہ عمومی طور پر اُس کے جاگنے سے قبل بستر چھوڑ دیتی تھی۔ جگانے کے لیے آوازیں دیں مگر وہ 'اوں آں' کر کے کروٹ بدل گئی۔ غور کیا تو اُس کا چہرہ متورم محسوس ہوا۔ ہاتھ لگانے پر پتہ چلا کہ وہ بخار کی شدید حدت میں بھنک رہی تھی۔ وہ گھبرا کر دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ "کیا تعویذ اُلٹا تو نہیں پڑ گیا؟"

تعویذ اُلٹے یا سیدھے نہیں پڑتے، اتفاقات اُن کی ہیئت اور حیثیت کو بدلتے رہتے ہیں۔ وہ اِس نزاکت کو سمجھ نہیں سکتا تھا۔ محلے کی دُکان سے پیراسیٹامول کی گولیاں اور بسکٹ خرید لایا۔ چائے بنا کر اُسے جگانے لگا۔ "اے بانو! اَب جاگ جا۔ چائے کے ساتھ چند بسکٹ کھا لو پھر دو گولیاں نگل لینا۔ خالی پیٹ دوائی نہیں کھانی چاہیے۔"

وہ طوعاً و کرہاً اُٹھی۔ ٹمپریچر کافی زیادہ تھا تبھی تو اُٹھتے ہوئے اُس نے چارپائی کی بانہوں کا سہارا لیا تھا۔ بولی۔ "بالی! میرا سر چکرا رہا ہے۔"

بالی نے پیار سے پچکارتے ہوئے اُس کے ہاتھ میں چائے کا پیالہ تھمایا۔ بسکٹوں سے بھری پلیٹ جھولی میں رکھ دی۔ بولا۔ "زیادہ غصہ کرو گی تو یہی کچھ ہی ہو گا۔ کہتا رہتا ہوں کہ دماغ کو ٹھنڈا رکھا کرو، کم پڑھا کرو مگر تم ہو کہ ماننے کا نام ہی نہیں لیتی ہو۔"

وہ گہری گہری سانسیں سینے میں اُتارتے ہوئے منہ چلانے لگی۔ نظر بار بار دھندلا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے حواس میں نہ ہو۔ بالی کو فکر دامن گیر ہوئی۔ اُسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا ارادہ باندھا اور چلنے کے لیے تیار ہونے کا حکم دیا۔ ایسے میں بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ چونکا۔ گمان ہوا کہ عینی نے دروازہ کھٹکھٹایا ہو گا کیونکہ اُس کے علاوہ صبح دَم کسی کی یوں آمد متوقع نہیں تھی۔ دروازہ کھولا تو استاد مجیدے کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ بولا۔

''استاد! تم اور اتنی صبح؟ خیریت تو ہے ناں؟''
وہ ہنسا۔ ''خیریت ہی ہے۔ میں دکان پر جا رہا تھا، سوچا، تمھیں ساتھ لیتا جاؤں۔''
''مگر میں تمھارے ساتھ نہیں چل سکتا۔'' بالی نے کہا۔ وہ ابھی تک اُس کی آمد پر متعجب دکھائی دیتا تھا۔ ''میری بہن بیمار ہے۔ اُسے لے کر ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا۔ دوا دارو کے بعد کی صورتِ حال دیکھوں گا۔ اگر وہ ٹھیک ہوئی تو دکان پر آؤں گا۔ اگر اُس کی حالت تسلی بخش نہ ہوئی تو آج ناغہ کرلوں گا۔ تم ایسا کرنا کہ میرے نائیک کو بتا دینا ورنہ وہ پریشان ہوگا اور میرے دَم کو کوستا رہے گا۔''
استاد مجیدے نے اُس سے بیماری کی نوعیت دریافت کی، اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے بولا۔ ''میرے پاس وقت نہیں ورنہ میں دکان پر جانے کی بجائے سیدھا شاہ سائیں کے پاس جاتا، دعا کرواتا اور چٹکی بجاتے میں تمھاری بہن ٹھیک ہو جاتی۔ میری مانو تو کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کے بہ جائے آستانے پر چلے جاؤ۔''
اُستاد مجیدا رخصت ہوگیا۔ بالی کا ذہن بدل گیا۔ بانو کو شاہ سائیں کے پاس چلنے کا کہا تو وہ پھٹ پڑی۔ وہ کسی بھی حالت میں وہاں نہیں جانا چاہتی تھی۔ بالی اُسے سائیکل پر بیٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے گیا جس نے دوا انجیکشن لگائے اور گولیاں تھما کر رخصت کر دیا۔ ڈاکٹر کو یقین تھا کہ وہ شام تک بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ اُسے گھر اُتار کر اُس کے لیے پھل اور دودھ لینے کے لیے بازار کی طرف نکلا۔ راہ میں راہ بدل کر آستانے پر پہنچ گیا۔ شاہ سائیں سے دعا کی درخواست کی۔ وہ حسبِ معمول مراقبے میں چلا گیا۔ کچھ توقف کے بعد سر اُٹھا کر بولا۔ ''اقبال حسین! مجھے تو یہ معاملہ خاصا بگڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ دعا دارو سے تمھاری بہن ٹھیک نہیں ہوگی۔''
وہ گھبرا گیا۔ ''تو پھر کیا ہوگا شاہ سائیں؟''
''اُسے دَم کرنا پڑے گا۔ تم ایسا کرو کہ اُسے چند منٹوں کے لیے یہاں لے آؤ۔''
''شاہ جی! میں نے آپ کو بتلایا تھا کہ وہ دم اور تعویذ وغیرہ کو سرے سے مانتی ہی نہیں ہے۔ میں نے اُسے یہاں آنے کے لیے کہا تھا، وہ نہیں مانی اور مجبوراً اُسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا پڑا۔'' بالی نے شرمندہ ہو کر کہا۔ ''آپ مجھ پر رحم کریں اور پانی دَم کر کے مجھے دے دیں، کسی نہ کسی طرح اُسے پلا دوں گا۔''
شاہ سائیں کے پُرنور چہرے پر خفگی اُبھری مگر اُس نے کمال ضبط کا مظاہرہ کیا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ چلو، میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔ دیکھتا ہوں اُسے سچے کلام اور اُس کے اثر پر یقین کیوں نہیں ہے۔''
بالی دَم بخود رہ گیا۔ اتنی بڑی ہستی اُس پر اچانک مہربان ہوگئی تھی۔ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔ ''آپ شاہ سائیں..... آ..... آپ.....''
وہ مسکرایا۔ ''ہاں میں..... تم میرے لو لگے ہو، تمھارا دھیان تو رکھنا پڑے گا۔ مُرید مشکل میں ہو، مُرشد اپنی دُنیا میں مگن ہو، اپنا آپ گروی رکھنے کا پھر کیا فائدہ ہوا؟..... وہ نادان ہے، میں نہیں۔ بچہ ضد کرتا رہتا ہے، ماں باپ اُس کا فائدہ سوچتے رہتے ہیں۔ چلو اقبال حسین!''
بالی کے منہ سے اظہارِ تشکر کے لیے بھی الفاظ بھی برآمد نہیں ہو پا رہے تھے۔ سائیں جی کے ساتھ مؤدبانہ انداز میں چلتے ہوئے اپنے گھر میں داخل ہوا۔ سینے تک کھیس اوڑھے لیٹی بانو کی چارپائی تک شاہ سائیں کو لایا اور عقیدت بھرے انداز میں بولا۔ ''شاہ سائیں جی! یہ میری کملی سیانی بہن ہے۔ کالج میں پڑھتی ہے۔ رات دِن پڑھتے رہنے کی وجہ سے کبھی کبھی بیمار پڑ جاتی ہے۔ سمجھانے سے سمجھتی نہیں ہے۔ آپ اِس کے لئے دعا فرمائیں۔ آپ کی دُعا سے اِس کے بھاگ جاگ جائیں گے۔''

ان شاءاللہ باقی آئندہ ماہ